پھر چلا مسافر

بھارت کے چار سفر

ڈاکٹر محمد مشتاق احمد مانگٹ

پھر چلا مسافر

بھارت کے چار سفر

ان جگھوں کو دیکھنے کے لیے جن سے میرا ماضی جڑا ہوا ہے !

(حصہ دوم)

ڈاکٹر محمد مشتاق احمد مانگٹ

AASIM PUBLICATIONS
LAHORE - PAKISTAN

پھر چلا مسافر:
بھارت کے چار سفر (حصہ دوم)

ڈاکٹر محمد مشتاق احمد مانگٹ
mushtaq.mangat@gmail.com

اہتمام اشاعت : وقار ندیم احمد

اشاعت اول : 2022ء

ایڈیٹنگ : اویس ضیار

ٹائیٹل : مسز سُندس اویس

پرنٹرز : تسکینِ ذوق پرنٹرز، لاہور

PHIR CHALA MUSAFIR
Bharat Ke Char Safar (Part-Two)
Dr. Muhammad Mushtaq Ahmad Mangat

Published by:
Aasim Publications
296-B, Revenue Employees Cooperative
Housing Society, Lahore - Pakistan.

یہ کتاب ای بک کی شکل میں انٹرنیٹ پر رکھی گئی ہے۔ آپ اسے ڈاؤنلوڈ کر سکتے ہیں اور کسی کو بھی دے سکتے ہیں۔ اس کتاب کی فروخت سے حاصل ہونے والی تمام تر آمدنی غزالی ایجوکیشن ٹرسٹ میں تعلیم حاصل کرنے والے ضرورت مند طالبعلموں کی تعلیمی ضروریات پوری کرنے کیلئے خرچ کی جاتی ہے۔ یہ کتاب درج ذیل ویب سائٹ پر موجود ہے۔

https://taawun.org.pk/
downloads/, and
www.scribd.com

انتساب

عاصم الٰہی مانگٹ کے نام

1989-2020

ایک سورج تھا کہ تاروں کے گھرانے سے اٹھا

آنکھ حیران ہے کیا شخص زمانے سے اٹھا

ترتیب مضامین

حرفِ آغاز

فروری 1999ء میں بھارت کے شہر چنائی میں ٹیکسٹائل انسٹیٹیوٹ برطانیہ کی سالانہ کانفرنس منعقد ہونا تھی۔ اس کانفرنس میں شریک ہونے کا پروگرام بنایا۔ کانفرنس میں شرکت تو ایک بہانہ تھی، اصل مقصد تو بھارت کی سیر تھا۔ اس سفر میں میرے ساتھ انتہائی قابل احترام برادرم وقاص انجم جعفری کے علاوہ ایک قریبی دوست عمر فاروق شیخ بھی تھے۔ ہم تینوں نے بھارت میں دو ہفتے گزارے۔ پہلے چند دن تو دہلی میں رہے پھر ایک دن کے لیے بذریعہ بس آگرہ گئے۔ دہلی سے چنائی تک ایک طویل سفر ٹرین پر کیا، تین دن چنائی میں رہے، پھر چنائی سے ممبئی اور ممبئی میں دو دن گزارنے کے بعد بذریعہ ٹرین دہلی واپس آ گئے۔ اس طرح سے ہمیں بھارت کے کئی علاقے دیکھنے کا موقع ملا۔ میں اس سفر کی رُوداد آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔

یاد رہے کہ میں اس سفر نامے کے پہلے حصے میں دہلی کے بارے میں کافی تفصیل سے لکھ چکا ہوں لہٰذا اسے یہاں نہیں دہراؤں گا البتہ اس بار ان تمام مقامات کو جنھیں دونوں بھائیوں کے ہمراہ میں نے پہلی بار دیکھا ان کی تفصیل آپ کی خدمت میں ضرور پیش کروں گا۔

بھارت میں گزرے ہوئے وقت کی تفصیل وقاص انجم بھائی نے بھی لکھی ہے جسے میں نے کتاب کے آخر میں درج کیا ہے۔ یہاں میں دہلی کے بعد کے سفر کی روداد ہی درج کر رہا ہوں۔

یہ سفر پندرہ دن پر مشتمل تھا۔ ہم نے بذریعہ ریل دہلی سے چنائی، چنائی سے ممبئی اور ممبئی سے واپس دہلی کا پانچ ہزار سے زائد کلومیٹر کا سفر کیا۔ اس دوران جنوبی ہند کے وہ علاقے بھی دیکھنے کا موقع ملا جن سے پاکستان کے لوگوں کی کم ہی واقفیت ہے۔

جیسا کہ میں نے حصہ اول میں لکھا ہے کہ اس سفر نامہ کو لکھتے ہوئے جو مقاصد سامنے تھے ان میں سے سب سے اہم یہ بات تھی کہ آپ لوگوں کے سامنے مختلف علاقوں میں رونما ہونے والے تاریخی واقعات کا ذکر کیا جائے اور بتایا جائے کہ معاشی ومعاشرتی ترقی کے لیے ان لوگوں نے کیا کیا اقدامات کیے۔ اس سے آپ کو مختلف علاقوں کی تاریخ اور اُن میں ہونے والی معاشی ومعاشرتی تبدیلیوں کو جاننے کا بھی موقع ملے گا۔

میری یہ کوشش رہی ہے کہ میں اپنی ذاتی رائے سے زیادہ حقیقی کرداروں اور مستند کتب کا حوالہ آپکے سامنے پیش کروں تاکہ جانبداری کا عنصر حذف ہوسکے اور میں اس میں کس حد تک کامیاب رہا ہوں، یہ فیصلہ آپ کو کرنا ہے۔

اس کتاب کو مزید بہتری کے لیے آپ کی آراء کا ہمیشہ منتظر رہوں گا۔ اور اگر آپ کوئی بات خلافِ واقعہ پائیں تو ضرور آگاہ کریں، تاکہ اصلاح کی جاسکے۔

محبت واحترام کے ساتھ

ڈاکٹر محمد مشتاق احمد مانگٹ

اپریل 2022

بھارت کا دوسرا سفر

دو عزیز دوستوں کے ہمراہ

Right to Left, Sh. Umer Farooq, Mushtaq Mangat, Sayed Waqas Anjum Jafary

دہلی سے آگرہ براستہ ماتھورا

ہم لاہور سے بذریعہ ہوئی جہاز دہلی پہنچے۔ قارول باغ کے ایک ہوٹل میں قیام کیا۔ دو دن تک دہلی کی سیر کرتے رہے۔ جس کی تفصیل وقاص بھائی نے الگ سے لکھی ہے جسے کتاب کے آخر میں آپ دیکھ سکتے ہیں۔ دہلی میں دو دن گزارنے کے بعد ہم آگرہ گئے۔ اس کتاب میں آگرہ کے سفر سے لیکر واپسی پاکستان تک کے سفر کی روداد بیان کی جائے گی۔

آگرہ، دہلی سے 220 کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہ فاصلہ کم یا زیادہ ہوسکتا ہے جس کا انحصار اس روٹ پر ہے جو آپ اختیار کرتے ہیں البتہ بذریعہ ہوائی جہاز یہ فاصلہ 170 کلومیٹر ہے۔ ہم نے بذریعہ بس آگرہ جانے کا فیصلہ کیا۔ ہوٹل والوں نے ہماری رہنمائی کی اور ہمارے لیے بس میں سیٹوں کا بندوبست کروادیا۔ بس نے سورج نکلنے سے پہلے روانہ ہونا تھا۔ اس لیے ہم صبح صبح، جسے کہتے ہیں منہ اندھیرے ہی بس کے اڈے پر پہنچ گئے اور چار گھنٹے کے سفر کے بعد آگرہ پہنچ گئے۔ اس سے پہلے کہ میں سفر کی کہانی سناؤں، میں چاہتا ہوں کہ دہلی کے ارد گرد علاقوں کاایک مختصر تعارف آپ کی خدمت میں پیش کروں۔

ہمیں ایک مرتبہ دہلی میں واقع پنجاب ہوٹل جانے کا موقع ملا، جس کا تفصیل سے تذکرہ بھارت کے تیسرے سفر میں کروں گا اس ہوٹل کے باہر کی دیوار پر ایک بہت بڑا نقشہ بنا ہوا تھا۔ اس نقشے میں یہ دکھایا گیا تھا کہ پنجاب علی گڑھ سے شروع ہو کر پشاور تک پھیلا ہوا تھا۔ انگریزوں نے پہلے اس علاقے سے صوبہ سرحد، موجودہ کے پی کے کو پنجاب سے الگ کیا۔ تقسیم ہند کے وقت پنجاب دو حصوں میں بٹ گیا ایک پاکستان میں اور دوسرا بھارت لیکن دونوں طرف اس کا نام پنجاب ہی لیا جاتا ہے۔ بعد ازاں بھارتی

حکومت نے پنجاب کو دو حصوں یعنی ہریانہ، اور پنجاب میں تقسیم کر دیا۔اب دہلی کے تینوں اطراف میں جو علاقہ ہے وہ ہریانہ اسٹیٹ ہے۔ بھارت میں صوبے کو سٹیٹ کہتے ہیں۔ جبکہ پاکستان میں ہم صوبہ کہتے ہیں۔ میں سٹیٹ کا لفظ ہی استعمال کروں گا۔

ہریانہ کا رقبہ 41 ہزار مربع کلومیٹر کے قریب اور اس کی آبادی ڈھائی کروڑ ہے۔ اس کی شمالی سرحد چندی گڑھ تک جبکہ جنوب میں فرید آباد سے بھی آگے اورنگ آباد تک پھیلا ہوا ہے۔ مشرق میں اس کی سرحد یوپی کے ساتھ ملتی ہے۔اس کے مغرب کی طرف پنجاب کا علاقہ ہے جس میں پٹیالہ وغیرہ شامل ہیں۔ اس سب سے ظاہر ہوتا تھا کہ ہمارا بہت سا سفر ہریانہ میں ہی ہوگا اور ہریانہ کے بعد آگرہ تک کا سفر ہم یوپی میں طے کریں گے، یوپی یعنی اترپردیش۔اتر ہندی میں شمال کو کہتے ہیں۔یوپی بھارت کی ایک بڑی سٹیٹ ہے۔

ہم جیسے ہی بس میں بیٹھے ہمیں ایک دلچسپ منظر دیکھنے کو ملا جس سے ہم آنکھیں چرا نہ سکے اور وہ سارا دن ہماری نظروں کے سامنے رہا۔ وہ منظر ہم سب کے لیے بہت ہی حیرانی کا باعث تھا اور بہت حد تک قابل افسوس بھی۔ بعد ازاں جب ہم نے کچھ لوگوں سے اس بات کا تذکرہ کیا تو ان کا کہنا تھا کہ یہ ایک عام سی بات ہے۔

واقعہ یوں ہوا کہ ہمارے سامنے والی سیٹ پر ساڑھے چھ فٹ قد کا اور بڑے بھاری بھرکم جسم کا مالک ایک عرب،ایسا ہم نے شکل و صورت دیکھ کر اندازہ لگایا، بعد میں جب ہماری آپس میں بات چیت ہوئی تو ہمارا اندازہ صحیح ثابت ہوا،آکر بیٹھا اور اس کے ساتھ ایک کمزور سی دبلی پتلی لڑکی بھی آکر بیٹھ گئی۔ بھائی صاحب کی عمر ساٹھ سال سے اوپر ہوگی اور ہمارے خیال میں لڑکی کی عمر بیس سال سے بھی کم تھی۔وہ دونوں آپس میں انگریزی میں بات کرتے تھے اور آگرہ سیر کے لیے جا رہے تھے۔ایک گروپ میں ہونے کی وجہ سے ہم نے سفر بھی اکٹھے کیا اور آگرہ میں وقت بھی اکٹھے ہی گزارا بلکہ

ایک جگہ پر انھوں نے عمر فاروق سے یہ بھی کہا کہ وہ اِن کی تصویر بنا دے۔ عمر نے ان میاں بیوی کی تصویر بھی بنائی۔ یہ بات ہمیں بہت عجیب سی لگی کہ یہ سب کیا ہے؟

دہلی میں کچھ لوگوں نے بتایا کہ عرب ممالک سے بڑی عمر کے لوگ تین چار ماہ کے لیے بھارت آتے ہیں اور اس دوران وہ کسی نوجوان لڑکی سے شادی کرتے ہیں اور جاتے ہوئے طلاق دے جاتے ہیں اور ساتھ بہت سارے پیسے بھی دے دیتے ہیں۔ جس سے وہ لڑکی اپنی اگلی شادی کے لیے جہیز وغیرہ کا بندوبست کر لیتی ہے۔اس طرح اس لڑکی کی دوبارہ شادی آسانی سے ہو جاتی ہے۔

اس کام کے لیے بے شمار غریب لڑکیاں ہر وقت تیار ہوتی ہیں۔ یہی معاملہ ان بھائی صاحب کا بھی تھا۔ اس واقعہ کی تفصیلات آج تک یاد ہے حالانکہ اس بات کو بیس سال گزر چکے ہیں لیکن کیا کریں کچھ واقعات ہی ایسے ہوتے ہیں جو بھلائے نہیں بھولتے۔ یہ ٹھیک ہے یا غلط، میں اس کا فیصلہ تو نہیں کر سکتا لیکن اتنا تو کہہ سکتا ہوں کہ مجھے یہ سب مناسب نہیں لگا۔

نوئیڈا: بھارت کا پہلا سمارٹ سٹی

آج سے چار سال قبل یعنی 1996ء جب میں بھارت آیا تھا تو میرے پاس صرف دہلی کا ویزا تھا۔ دہلی کے جنوب مشرق میں پچیس کلومیٹر کے فاصلے پر نیو اوکھلہ انڈسٹریل ڈویلپمنٹ اتھارٹی (نوئیڈا) شہر واقع ہے۔ رنبیر مانگٹ صاحب کا دفتر بھی اسی علاقے میں تھا۔ اُن کا گھر بھی اس علاقے کے ساتھ فریدآباد میں تھا۔انھوں نے مجھے نوئیڈا کے بارے بہت کچھ بتایا جس کی وجہ سے میرے اندر نوئیڈا کو دیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی لیکن ویزا نہ ہونے کی وجہ سے میری وہ خواہش پوری نہ ہو سکی۔

آج جب ہم دہلی سے آگرہ جا رہے تھے تو ہماری بس کو نوئیڈا کے علاقے سے گزر کر جانا تھا، اس لیے مجھے اس شہر کو دیکھنے کا موقع مل گیا۔ اس شہر میں میرے اور آپ کے لیے سیکھنے کی بے شمار چیزیں موجود ہیں۔ پہلی بار جب میں نے شہر کو دیکھا تو مجھے یوں لگا کہ جیسے یہ شہر انتہائی خوبصورت ترتیب سے بسایا گیا ہے ، بہت بڑے بڑے مال نظر آ رہے تھے اور صفائی ستھرائی کی بھی صورتحال بہتر تھی۔ اکثر جگہوں پر میڈیا اور آئی ٹی کے بورڈز لگے ہوئے تھے۔ ان سب چیزوں نے میری دلچسپی میں بہت اضافہ کر دیا۔

پرانی دلی کے جنوب میں واقع یہ شہر بالکل ہی مختلف تصویر پیش کر رہا تھا۔ شہر کی تاریخ جاننا چاہی تو پتہ چلا کہ یہ شہر 1976ء میں سنجے گاندھی کی تجویز پر یوپی اسٹیٹ کے ضلع گوتم بدھ نگر میں بنایا گیا تھا۔ نوئیڈا بھارت کے ان 20 شہروں میں شامل ہے جو صفائی و ستھرائی کے لحاظ سے بہت بہترین ہیں۔ اس شہر کو بناتے وقت یہ سوچا گیا تھا کہ یہ ایک سمارٹ سٹی ہوگا۔ بھارت میں اس وقت کئی سمارٹ سٹی موجود ہیں لیکن سمارٹ سٹی کا پہلا تصور اسی شہر سے لیا گیا۔ یہ شہر بھی دریائے جمنا کے کنارے واقع ہے۔

یہاں اس علاقے کا سب سے بڑا بوٹینیکل گارڈن بھی ہے۔ گریٹ انڈیا پیلیس کے نام سے بھارت کا ایک بہت بڑا شاپنگ مال بھی اسی شہر میں واقع ہے۔ اُس وقت شہر کی آبادی پانچ لاکھ سے زائد تھی اب تو اور بھی زیادہ ہو گئی ہو گی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ یہاں پر تعلیم کی شرح نوے فیصد ہے جبکہ پورے بھارت میں شرح ستر فیصد کے قریب ہے۔ اس علاقہ میں قائم زیادہ تر دفاتر کا تعلق میڈیا اور سافٹ ویئرز ہاؤسز سے ہے۔

جب ہم شہر سے گزر رہے تھے تو صبح کا وقت تھا اس لیے زیادہ رش نہیں تھا لیکن شہر کی صورتحال بتا رہی تھی کہ دن میں خاصہ رش ہوتا ہوگا لیکن اس کے ساتھ ساتھ صفائی ستھرائی کا تصور بھی واضح نظر آ رہا تھا۔ اس بارے میں مزید معلومات ان کی

ویب سائٹ سے مل سکتی ہیں[1]۔ میری دوستوں سے گزارش ہو گی کہ وہ نوئیڈا کی ویب سائٹ ضرور دیکھیں۔ یقیناً اگر ہم ایک اچھی کامیاب کوشش دیکھیں گے تو ہم میں بھی ایسا کرنے کا شوق پیدا ہو گا۔

میری یہ خواہش ہے کہ پاکستان میں بھی ایک سمارٹ سٹی بنایا جائے۔ وہ ایک ایسا شہر ہو جو جدید ترین ٹاؤن پلاننگ کو ظاہر کرتا ہو۔ امید ہے ہم کبھی تو ایسا سوچیں گے۔۔۔

ہم اسی خواہش کے ساتھ اپنا سفر جاری رکھے ہوئے تھے۔اکثر مسافر سو رہے تھے لیکن میرے جیسا فرد جاگنے کی کوشش کرتا ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ چیزیں اور لوگوں کو دیکھ سکے۔

فرید آباد شیخ فرید کے نام پر بسایا ہوا شہر

برٹانیکا انسائکلوپیڈیا کے مطابق جہانگیر کے ایک بہت ہی قریبی درباری جن کو بابا فرید کہا جاتا تھا کی ذمہ داری اُس راستہ کی حفاظت کی تھی جسے ہم اب جی ٹی روڈ کہتے ہیں۔انھوں نے اپنی یہ ذمہ داری خوب نبھائی۔اس پر خوش ہو کر بادشاہ نے ان کے نام پر یہ شہر بسایا اور ان کی وفات کے بعد ان کا مقبرہ بھی اسی شہر میں بنوایا[2]۔

فرید آباد شہر بہت پرانا نہیں ہے۔ یہاں انگریزوں نے 1867ء میں میونسپل کمیٹی قائم کی تھی۔جب ہم اس شہر سے گزر رہے تھے تو میں نے دیکھا کہ یہ شہر بہت ہی زیادہ گنجان آباد ہے۔ محسوس ہوتا تھا کہ ہر جگہ انسان ہی انسان ہیں۔وہاں ایسی

---

[1] https://noidaauthorityonline.in
[2] https://www.britannica.com/place/Faridabad

جگہیں بھی تھیں جہاں بہت زیادہ انڈسٹری لگی ہوئی تھی۔ بہت سے سرکاری دفاتر اس کے علاوہ تھے۔ کئی انٹر نیشنل کمپنیز کے بورڈ بھی وہاں موجود تھے۔

مجھے یہ جان کر حیرانی ہوئی کہ ہریانہ اسٹیٹ کا چوتھائی ٹیکس صرف فرید آباد سے اکٹھا ہوتا ہے۔ ڈبلیو ایچ او کے مطابق یہ دنیا کے گنجان آباد شہری علاقوں میں ایک ہے۔ میں نے پچھلے صفحات میں اسمارٹ سٹی کا ذکر کیا تھا۔ بھارت پورے ملک میں ایک سو سمارٹ سٹی بنا رہا ہے، جن میں ایک فرید آباد بھی ہے۔ یہ شہر بہت تیزی سے ترقی کر رہا ہے اور اس کا شمار دنیا کے چند تیز ترین ترقی کرنے والے شہروں میں ہوتا ہے۔ میں نے راستے میں کئی اور اہم مقامات بھی دیکھے۔ دور ہونے کی وجہ سے ہم بابا فرید کا مزار نہ دیکھ سکے۔

ایک جگہ سے گزرتے ہوئے میں نے ایک ٹاؤن پارک دیکھا جہاں اڑھائی سو فٹ اونچا بھارتی جھنڈا لہرا رہا تھا۔ اس علاقے کی ایک اور اہم بات یہاں پر سائیں بابا کا مندر ہے۔ سائیں بابا بھارت کی ایک مشہور مذہبی شخصیت ہیں۔ میرے ساتھ والی سیٹ پر ایک صاحب جن کا تعلق فرید آباد ہی سے تھا اور وہ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ آگرہ جارہے تھے، بیٹھے ہوئے تھے، میں نے ان سے فرید آباد کے بارے میں جاننا چاہا۔اس پر انھوں نے یہ بتایا کہ یہاں کا سب سے مشہور میلہ سورج کنڈ ہے جو فروری میں لگتا ہے۔ بہت سارے لوگ یہاں آتے ہیں۔ اس میلے میں علاقے کی تہذیب و تمدن کے بے شمار مناظر دیکھنے کو ملتے ہیں۔

ہمارے لیے وہ میلہ تو دیکھنا ممکن نہیں تھا لیکن اُن صاحب کی باتوں سے لگا کہ یہ ایک بہت ہی مشہور میلہ ہو گا۔ مجھے یاد آیا کہ ہمارے ہاں بھی پنجاب میں فروری میں ہی دیہاتی میلے لگتے ہیں۔ اس وقت کسان گندم کی کاشت کاری سے فارغ اور فصل پکنے کا انتظار کرتے ہیں اور موسم بھی خوشگوار ہوتا ہے۔

فرید آباد کی ایک اور خاص بات اس کا دہلی سے ممبئی جانے والی مین ریلوے لائن کے اوپر واقع ہونا ہے۔ یہاں رکنے کا ہمارا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ ناشتے کے لیے ہمیں کہیں اور رکنا تھا۔ فرید آباد سے گزرتے ہوئے مجھے میرے دوست رنبیر سنگھ مانگٹ یاد آئے جو فرید آباد میں ہی رہتے ہیں۔

Baba Fareed Tomb Fareeda Abad Photo Credit: https://www.holidify.com

Noida Inida Photo Credit: Noidancrdelhiskyline.jpg skyline

آگرہ: ایک شہرِ بے مثال

آگرہ کا تاج محل ہماری اصل منزل تھا۔ جیسے ہی ہم آگرہ پہنچے، اس شہر نے بھی ہمیں بے حد متاثر کیا۔ ہم تاج محل سے مناسب فاصلے پر بس سے اتر گئے۔ تاج محل کو آلودگی سے بچانے کے لیے ایک خاص مقام سے آگے کوئی گاڑی نہیں جاتی۔ وہاں پر ایک الیکٹرک گاڑی موجود تھی جو سیاحوں کو تاج محل تک لے جاتی ہے۔ اس کے علاوہ تانگے بھی اس کام کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔

الیکٹرک گاڑی یا تانگہ آپ کو صرف تاج محل کے مین گیٹ تک لے کر جاتا ہے۔ آپ یوں سمجھ لیجئے کہ تاج محل جتنی بڑی بلڈنگ ہے اس سے کئی گنا بڑی عمارتیں اسکے ارد گرد موجود ہیں۔ جنکی شان و شوکت تاج محل جیسی تو نہیں لیکن کم بھی نہیں ہے ۔ یقیناً وہ بھی اپنے زمانے کی بہت شاندار عمارتیں ہوں گی۔ اُن کی دیکھ بھال کم ہونے کی وجہ سے ان کے رنگ و روپ میں کمی واقع ہو گئی ہے۔اس سے پہلے کہ میں آپ کو تاج محل کے بارے میں کچھ بتاؤں، میں چاہوں گا کہ آپ کو آگرہ کی تاریخ کے بارے میں بھی کچھ آگاہی فراہم کی جائے۔

آگرہ: ایک عظیم تاریخ کا حامل شہر

آگرہ بذاتِ خود ایک خوبصورت لفظ ہے جو اپنے اندر بے پناہ کشش رکھتا ہے۔ مجھے ہمیشہ ہی سے یہ لفظ بہت بھلا لگا۔ جیسے ہی ہم آگرہ پہنچے تم مجھے یوں لگا جیسے میری کوئی بہت ہی پرانی خواہش پوری ہو گئی ہے۔ یہ شہر ان شہروں میں سے ہیں جسے مغلوں سے پہلے افغانوں نے آباد کیا۔

ستیا چندر امکھر جی کی کتاب جو 1882ء میں لکھی گئی, آگرہ کی سیاحت کی رہنمائی کے لیے انٹرنیٹ پر موجود ہے، میں درج ہے کہ ابراہیم لودھی کے والد سکندر

لودھی نے 1504ء میں اپنا پایہ تخت دلی سے یہاں منتقل کیا تھا[3]۔اس کے بعد کی آگرہ کی تاریخ کافی حد تک لوگوں کو معلوم ہے۔اس سے پہلے کی تاریخ کا کسی کو صحیح علم نہیں ہے۔ مکھرجی نے لکھا ہے ایک یونانی سیاح جو دوسری صدی میں یہاں پر آیا اس نے شہر کا تذکرہ آگرہ کے نام سے کیا ہے۔مہابھارت میں بھی اس شہر کا ذکر "آگراوانہ" کے نام سے ملتا ہے۔ جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ شہر دو ہزار سال سے بھی زیادہ پرانا ہے۔

محمود غزنوی کے حملوں میں بھی اس شہر کا ذکر ملتا ہے جس سے یہ تاثر بنتا ہے کہ یہ ایک غیر آباد گاؤں تھا اور اس کی کوئی خاص حیثیت نہیں تھی۔ میں نے شہر بھر میں گھوم کر یہ جاننے کی کوشش کی یہاں پر کوئی بہت ہی پرانا مندر ہو لیکن مجھے ایسا کچھ نہیں ملا۔ مکھرجی کے مطابق محمود غزنوی کے وقت یہ ایک بہت چھوٹا سا گاؤں تھا اور اس کے پانچ سو سال بعد ابراہیم لودھی نے اسے آباد کرنا شروع کیا اور جب مغلوں نے اسے اپنا پایہ تخت بنایا تو آگرہ کی حیثیت میں کئی گناہ اضافہ ہو گیا۔ پھر جب یہاں پر تاج محل بنایا گیا، آگرہ فورٹ کی ایک شاندار عمارت تعمیر کی گئی اور اس کے قریب سکندرہ میں اکبر کا مزار بنایا گیا تو ان تین چیزوں نے اس شہر کو چار چاند لگا دیے۔ راجہ جے پال اور محمود غزنوی کی آپس کی جنگوں کے تذکرے میں بھی اس شہر کا ذکر ملتا ہے۔ شیر شاہ سوری نے بھی اس شہر پر قبضے کے لیے مغل حکمرانوں کے ساتھ جنگ لڑی۔

اس وقت آگرہ کی آبادی پندرہ لاکھ کے قریب ہے۔ زیادہ تر لوگ ہندی اور اردو بولتے ہیں لیکن اس علاقے کی اپنی بھی ایک بولی ہے جسے براج کہتے ہیں۔ اس شہر کے قریب ہی بھارت پور کے نام سے جاٹوں نے اپنی ایک چھوٹی سی ریاست بنائی ہوئی تھی۔ان جاٹوں نے جب یہ محسوس کیا کہ مغل کمزور ہو گئے ہیں تو انھوں نے آگرہ پر حملہ

[33]https://archive.org/details/travellersguidet00mukerich/page/6/mode/2up

کر دیا اور جو ممکنہ تباہی ہو سکتی تھی وہ کی اور مغلوں سے اپنے اوپر کیے جانے والے مظالم کا بدلہ لیا۔ یہ ریاست کافی عرصہ تک قائم رہی۔ مغل حکمرانوں کے زوال کے بعد انگریزوں نے اس علاقے پر اپنا قبضہ کر لیا۔ ان کے دور میں یہاں بہت سخت قحط بھی پڑا۔ یہ شہر سطح سمندر سے ساڑھے پانچ سو فٹ بلند ہے اس لیے یہاں پر گرمی پڑتی ہے۔ اس شہر میں مختلف بادشاہوں نے کیا کچھ بنایا؟ اس کا تذکرہ آئندہ صفحات میں آئے گا۔

آگرہ دارالحکومت کیوں؟

میرے ذہن میں بارہا یہ سوال آیا کہ مختلف بادشاہوں نے دلی کی بجائے آگرہ کو کیوں اپنا پایہ تخت بنایا؟ جب میں نقشے میں آگرہ کے محلِ وقوع کو دیکھتا ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ آگرہ ایک ایسے مقام پر واقع ہے جس کے مشرق میں بہت سے ایسے علاقے ہیں جہاں نا صرف مسلمانوں کی آبادی کم تھی بلکہ اِن علاقوں سے مسلمان بادشاہوں کو بہت کم خطرات لاحق تھے۔ اُن لوگوں نے ایسے علاقوں کے پاس اپنا پایہ تخت بنایا جہاں مقامی طور پر ان کو خطرات کم تھے۔ اس کی نسبت دہلی اور لاہور وہ علاقے تھے جہاں پر مغرب سے آنے والے افغان اور وسطی ایشیاء کے لوگ حملہ آور ہوتے تھے۔

اسی لیے آپ دیکھتے ہیں ابراہیم لودھی، جس کا پایہ تخت آگرہ تھا نے بابر کا مقابلہ کرنے کے لیے دلی سے بھی آگے پانی پت کے میدان کا انتخاب کیا۔ بابر پانی پت کے مغرب میں واقع پنجاب اور دیگر علاقہ جات پہلے ہی فتح کر چکا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر ابراہیم لودھی آگرہ میں بابر کا مقابلہ کرتا تو وہ یہ جنگ جیت سکتا تھا۔ اِس کی وجہ مقامی حمایت تھی جو اسے مل سکتی تھی۔

بابر نے بھی دلی کو پایہ تخت بنانے کی بجائے ابراہیم لودھی کے مرکز، آگرہ پر ہی قبضہ کر کے اسے اپنا پایہ تخت بنایا۔ اس سے قبل غوری سے لے کر لودھی تک (تین سو سال سے زائد عرصہ میں) سب حکمرانوں کا پایہ تخت دلی ہی رہا۔ بابر کی وفات کے بعد

اس کے بیٹے ہمایوں کی تاج پوشی بھی آگرہ میں ہی ہوئی اور پھر شیر شاہ سوری نے بھی آگرہ ہی میں ہمایوں کو شکست دی تھی۔ شیر شاہ سوری کو اسے اپنا پایہ تخت بنانے کا موقع نہ مل سکا، اس کا آٹھ سالہ دورِ حکومت ہمایوں کا پیچھا کرتے ہوئے ہی گزرا۔

جب اکبر نے حکومت سنبھالی تو اُس نے بھی آگرہ کو ہی اپنا مرکز بنایا۔ یہ بات بھی درست ہے کہ وہ ضرورت کے تحت لاہور اور فتح پور سیکری میں بھی رہا کرتا تھا۔ اکبر کے بعد جہانگیر نے بھی آگرہ ہی کو اپنا مرکز بنایا۔ شاہ جہاں وہ پہلا مغل بادشاہ تھا جس نے دلی کے پاس شاہجہاں آباد کے نام سے ایک شہر بسانے کا فیصلہ کیا۔ اس نے وہاں لال قلعہ بنوایا اور اپنا پایہ تخت دلی منتقل کر لیا اور اس کے بعد ہمیشہ کے لیے مغلوں نے دلی ہی کو اپنا پایہ تخت بنائے رکھا۔ یہ سب دیکھتے ہوئے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ آگرہ مغلوں کی پسند نہیں تھا بلکہ اسے پہلے ہی سے لودھی خاندان نے اپنا پایہ تخت بنایا ہوا تھا اور مغلوں نے اس سلسلے کو جاری رکھا لیکن جیسے ہی انھیں موقع ملا تو انھوں نے دلی میں لال قلعہ بنا کر اپنا پایہ تخت وہاں منتقل کر لیا۔

جیسا کہ میں نے پہلے بیان کیا ہے کہ تاج محل جانے کے لیے تانگے بھی موجود تھے اور بیٹری سے چلنے والی گاڑیاں بھی۔ ہم نے تانگے کو ترجیح دی۔ یہ شاید ہمارا تانگے سے پرانا رومانس تھا جو اسے دیکھ کر جاگ اٹھا تھا۔

میرے بچپن میں تانگے کی سواری ہی سب سے اہم سواری ہوتی تھی ۔آج ان ہی خیالات کے ساتھ ہم نے تانگے میں بیٹھ کر آگرہ کی تاریخ کو ذہن میں رکھتے ہوئے ممتاز محل کی طرف سفر شروع کر دیا۔

گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز ایک سریلے ردھم کے ساتھ بتا رہی تھی کہ اس شہر میں جہاں محبت کی نشانی تاج محل ہے وہیں پر آگرہ کا قلعہ بھی ہے جہاں پر اپنی بیوی سے

بے انتہا محبت کرنے والے اور محبت کی ایک لازوال نشانی بنانے والے بادشاہ کو قیدِ تنہائی میں رکھا گیا تھا۔

بادشاہوں کے ساتھ ایسا تو ہوتا ہی ہے۔۔۔ کبھی تخت تو کبھی تختہ

شاہ جہاں : مغلوں کا ایک معمار

اس سے پہلے کہ میں تاج محل کے بارے میں بتاؤں میں چاہوں گا کہ تاج محل بنانے والے سے متعلق بھی کچھ معلومات آپ کی خدمت میں پیش کی جائیں۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ جہانگیر کا بہت سارا وقت لاہور میں گزرا۔ شیخوپورہ میں موجود ہرن مینار جو جہانگیر نے ایک اپنے پسندیدہ ہرن کی یاد میں بنوایا تھا وہ اسی دور کی ایک یادگار ہے(بادشاہ تھا کچھ بھی بنوا سکتا تھا)۔ اس کا مقبرہ بھی شاہدرہ، لاہور میں واقع ہے۔ اکبر بادشاہ کی زندگی ہی میں 1592ء جہانگیر کے ہاں میں تیسرے بیٹے کی ولادت ہوئی۔ اکبر نے اپنے اس پوتے کا نام شہاب الدین محمد خرم تجویز کیا۔ یاد رہے کہ شہاب الدین محمد خرم نے اپنے لیے شاہجہاں جس کا مطلب ہے زمانوں کا بادشاہ کا لقب پسند کیا تھا اور اب وہ اسی نام سے جانا جاتا ہے۔

مغل بادشاہوں پر ابراہم ارلی نے ایک بہت ہی مفید اور معلومات سے بھرپور کتاب Emperors of the Peacock Throne: The Saga of the Great Mughals کے نام سے لکھی ہے[4]۔ اس کے مطابق شاہجہاں کی والدہ کا تعلق ایک ہندو راجپوت گھرانے سے تھا جس کا آبائی وطن مارواڑ تھا۔ اکبر کی وفات کے بعد جہانگیر اپنے بھائیوں سے کئی لڑائیاں لڑنے کے بعد 1605ء میں مغلیہ سلطنت کا سربراہ بنا۔ وہ 22

[4]https://books.google.com.pk/books?id=04ellRQx4nMC&pg=PA379&redir_esc=y#v=onepage&q&f=false

سال تک ہندوستان کا بادشاہ رہا اور 1627ء میں اس کی وفات ہوئی۔اس کے بیٹوں کے درمیان میں بھی کئی جنگیں ہوئیں جس میں شاہجہاں کامیاب ہوا اور 35 سال کی عمر میں وہ ہندوستان کے تخت کا وارث بن گیا۔ ہر مغل بادشاہ کی وفات پر جانشین کا فیصلہ میدان جنگ میں ہی ہوتا تھا۔ اس سے لگتا ہے کہ وہ جانشین چننے کا کوئی نظام وضع نہ کر سکے۔ ایسی جنگوں نے مغلیہ سلطنت کو کمزور کرنے میں ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔

عام طور پر مغل بادشاہ آخری دم تک حکمرانی کرتے اور ان کے مرنے کے بعد ہی ان کے وارث تخت پر بیٹھتے لیکن شاہجہاں کا معاملہ بالکل مختلف تھا۔ تقریباً بتیس سال تک وہ بِلا شرکت غیر حکومت کرتا رہا۔ 1657ء میں جب اُس کی عمر پینسٹھ سال ہوئی تو وہ شدید بیمار ہو گیا۔ اس کی بیماری کو بہانہ بنا کر اورنگ زیب نے اپنے بھائیوں سے لڑائیاں لڑیں اور اُن کو شکست دے کر اپنے والد کی زندگی میں ہی ہندوستان کا بادشاہ بن گیا۔

ابراہم مزید لکھتے ہیں کہ شاہ جہاں نے آگرہ قلعے میں اپنی زندگی کے آخری نو سال بیماری سے لڑتے ہوئے اور تنہائی میں گزارے۔ مجھے وہ کمرہ دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے جہاں شاہجہاں نے اپنی زندگی کے آخری سال گزارے اور وہ کمرے کی کھڑکی سے تاج محل کو دیکھ کر اپنا دل بہلاتا تھا۔ اس دوران صرف اس کی بیٹی ہی اس کی خدمت کرتی تھی کیونکہ اُس کے علاوہ کسی کو شاہجہاں کے پاس آنے کی اجازت نہ تھی۔

یہ جاننے کے لیے کہ شاہجہاں کو اس جگہ سے تاج محل کیسا نظر آتا تھا، میں نے اس کمرے کی کھڑکی میں کھڑے ہو کر تاج محل کا نظارہ کیا۔اس کے لیے مجھے سیکورٹی والوں سے خصوصی طور پر اجازت لینا پڑی ۔ یہ ایک ناقابلِ بیان اور ناقابلِ فراموش منظر تھا جو مدتوں سے مجھے یاد ہے اور میں اب بھی تصور میں یہ منظر دیکھ لیتا ہوں جو مجھے آس اور پاس کے درمیان فرق واضح کر دیتا ہے۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ بادشاہ اپنے ہی

بنائے ہوئے محل کو دیکھتے دیکھتے اس دنیا سے رخصت ہوگیا۔ بیٹی کی خواہش کے باوجود عالمگیر نے صرف چند ملازمین کو جن کی تعداد پندرہ سے زائد نہیں تھی شاہجہاں کا جنازہ پڑھنے کے اجازت دی تھی۔ شاہجہاں نے اپنی تدفین کی جگہ پہلے سے طے کر رکھی تھی جو ممتاز محل کے پہلو میں تھی۔

بادشاہ کی خواہش کا احترام کیا گیا اور انھیں اپنی بیوی کے پہلو میں دفن کر دیا گیا۔ اب یہ دونوں قبریں ساتھ ساتھ ہیں، ایک اُس کی جس کی یاد میں تاج محل بنایا گیا اور دوسری اس کی جس نے اس کا خواب دیکھا اور اسے پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ عالمگیر کا اپنے والد سے یہ سلوک کسی کو بھی پسند نہیں آیا، نا ہی کسی دوست کو اور نا ہی کسی دشمن کو۔

شاہجہاں کا دور نسبتاً امن کا دور گنا جاتا ہے، گو کہ اس کے دور میں صفوی خاندان اور پرتگیزیوں کے ساتھ مختصر جنگیں ہوئیں۔ شاہجہاں کے سلطنت عثمانیہ کے ساتھ بہت اچھے تعلقات تھے جو اس کی خارجہ پالیسی کا ایک مظہر تھا۔ شاہجہاں کو مغلوں کا معمار بھی کہا جاتا ہے۔ اس کے دور سے پہلے مغل طرز تعمیر میں سرخ پتھر استعمال ہوتا تھا ، وہ پہلا شخص تھا جس نے سفید پتھر کا استعمال بھی کیا۔ اس کے بعد بھی جو عمارتیں بنائی گئیں ان میں زیادہ تر سرخ پتھر ہی کا استعمال ہوا ہے جیسا کہ بادشاہی مسجد لاہور جو کہ عالمگیر نے بنائی تھی۔ شاہجہاں نے جو مساجد اور قلعہ جات بنائے ان کی ایک طویل فہرست موجود ہے جن میں تاج محل، آگرہ کے قلعے میں توسیع، لال قلعہ دہلی، جامع مسجد دہلی قابلِ ذکر ہیں۔

شاہجہاں وہ شخص ہے جو بیس سال کا ہوا تو اسے ایک صوبے کی ذمہ داری دے دی گئی، 35 سال کا ہوا تو اسے ایک بہت بڑی سلطنت کا وارث بنا دیا گیا، لیکن اس کا انجام یہ ہوا کہ عام لوگوں کو اس کا جنازہ پڑھنے کی بھی اجازت نہ ملی۔ اُس نے اپنی زندگی کے آخری نو سال قیدِ تنہائی میں گزارے۔ کہا جاتا ہے کہ آخری دنوں میں اس نے اپنے فرزند

ارجمند عالمگیر سے کہا کہ مجھے چند بچے دے دیئے جائیں تا کہ وہ اُن کو پڑھا کر اپنا وقت گزار لوں۔ عالمگیر نے جواب دیا ابھی بھی آپ کے دماغ سے بادشاہت کی بو نہیں گئی، آپ اب بھی چاہتے ہیں کوئی تو ہو جس پر آپ اپنا حکم چلا سکیں۔ شاہجہاں نے بھی اپنے بھائیوں کو قتل کرکے بادشاہت سنبھالی اور اس کے بیٹے نے بھی بادشاہ بننے کے لیے اپنے بھائیوں کا قتل کیا۔

سدا ایسا ہی ہوتا آیا ہے، کل بھی، آج بھی اور شاید آنے والے کل بھی۔۔۔اللہ کرے کہ آئندہ ایسا نہ ہو۔۔۔آمین

Agra Horse Cart for Taj Mahal Photo Credit:
http://flashpackatforty.com

Agra City Photo Credit: https://www.agradirectory.com

تاج محل: دنیا کے سات عجوبوں میں شامل عجوبہ

اگر آپ کو تاج محل دیکھنے کا موقع ملے تو یہ آپ کی خوش بختی ہو گی لیکن اگر ایسا نہ ہو سکے تو شاہی قلعہ لاہور میں تاج محل کا ایک مکمل ماڈل پڑا ہوا ہے، آپ اسے تو دیکھ ہی سکتے ہیں۔ تاج محل جانے سے پہلے میں یہ جاننا چاہ رہا تھا کہ شاہجہاں کو ایسا مقبرہ بنانے کا خیال کیونکر پیدا ہوا؟ میں نے مختلف ذرائع سے معلوم کیا تو پتہ چلا کہ مغلوں کے جدّ امجد امیر تیمور کا مقبرہ سمرقند میں بنایا گیا تھا جو اپنی نوعیت کی ایک منفرد عمارت ہے۔ شاہجہاں نے اس عمارت سے متاثر ہو کر ایسی ہی ایک عمارت بنانے کا عزم کیا۔ یاد رہے کہ تاج محل کی تعمیر سے پہلے ہمایوں کا مقبرہ بن چکا تھا۔ میرا خیال ہے کہ تاج محل کی تعمیر خاص طور پر ارد گرد بنائے گئے باغات اور باغیچوں کو ڈیزائن کرتے وقت ہمایوں کے مقبرے کے ڈیزائن سے بھی مدد لی گئی ہے البتہ کچھ باتیں ضرور ایسی ہیں جو تاج محل کو دنیا میں ایک عجوبے کے طور پر پیش کرتی ہیں۔

میدانی علاقے میں دریا کے کنارے اتنی بڑی بلڈنگ بنانے کے لیے، جہاں زمین نرم بھی ہوتی ہے اور بہت گہرائی تک نمی بھی ہوتی ہے، بہت مضبوط بنیاد کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایسی بنیاد بنانے کے لیے محنت اور سرمایہ کے ساتھ ساتھ مہارت کی بھی بے حد ضرورت ہوتی ہے۔ ایسا کوئی بہت ہی حوصلے والا فرد ہی کر سکتا تھا اور جس کے پاس ایسے لوگوں کی ٹیم بھی موجود ہو جو عمارتیں بنانے کا وسیع علم اور تجربہ بھی رکھتے ہوں۔ اسے آپ حسنِ اتفاق کہیے کہ شاہجہاں کے پاس یہ سب کچھ موجود تھا۔

تاج محل کی تاریخ جاننے کے لیے میں نے Architecture of Mughal India, Volume 4 کتاب جس کے مصنفین Catherine Blanshard Asher, Catherine Ella Blanshard Asher, Catherine B. Asher ہیں

اس کتاب کو کیمرج یونیورسٹی پریس نے 1992ء میں چھاپا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ علی جاوید اور تبسم جاوید کی کتاب World Heritage Monuments and Related Edifices in India جسے الگورا پبلیکیشنز نے 2008ء میں امریکہ میں شائع کیا ہے سے بھی مدد لی ہے۔ اس کے علاوہ تاج محل کی اپنی ویب سائٹ پر بھی اس بارے کافی مواد موجود ہے جو کافی مفید بھی ہے اور قابلِ اعتماد بھی۔

ان تمام کتابوں سے پتہ چلتا ہے کہ پہلے دس سال تو صرف تاج محل کی بنیادوں کو پختہ کرنے میں لگے۔ بہت گہرائی تک بنیادیں کھودی گئیں اور انھیں پتھروں کی مدد سے اس قابل بنایا گیا کہ وہ اتنی بڑی عمارت کا بوجھ سہار سکیں اور دریا کے پانی سے بھی محفوظ رہے۔ اسی محنت کا نتیجہ ہے کہ یہ عمارت دریا کے کنارے موجود ہونے کے باوجود پچھلے چار سو سال سے اپنے پاؤں پر کھڑی ہے۔ تاج محل کی تعمیر میں اٹھائیس مختلف اقسام کا پتھر استعمال ہوا ہے۔ یہ پتھر افغانستان، پنجاب، بلوچستان، سندھ، چین اور سری لنکا کے علاوہ بھی کئی ممالک سے منگوایا گیا۔ اُس دور میں اتنے دور دراز علاقوں سے پتھر کی بڑی بڑی سلیٹیں منگوانا کوئی آسان کام نہ تھا۔

ایسا ہی ہوا کیونکہ بادشاہ ایسا ہی چاہتا تھا۔۔۔

عام طور پر مغل دور میں جتنی بھی عمارتیں بنائی گئی وہ زیادہ سے زیادہ پانچ سے دس سال میں مکمل ہو جاتی تھیں۔ تاج محل ایک واحد عمارت ہے جو بائیس سال کے ایک طویل عرصہ میں مکمل ہوئی۔ اس جگہ پر تاج محل اور مسجد کے ساتھ ساتھ مہمان خانہ، استقبالیہ، باغات بھی بنائے گئے۔ اتنی زیادہ عمارات ہونے کی وجہ سے میں اسے تاج محل کمپلیکس کا نام دیتا ہوں۔

تاج محل کمپلیکس کا آغاز 1632ء میں ہوا، اسکا پہلا حصہ 1648ء میں مکمل ہوا۔ اس کے پانچ سال بعد بھی کئی اور عمارتیں بنتی رہیں۔ یاد رہے یہ وہی دور ہے

جب دلی میں لال قلعے کی تعمیر بھی ہو رہی تھی۔ایک محتاط اندازے کے مطابق اس عمارت کو بنانے کے لیے 22ہزار لوگوں نے 22سال کام کیا۔ اتنا عرصہ اس پر کام ہوتا رہا اور بنوانے والا منتظر رہا کہ یہ کب مکمل ہو اور اس کی خواہش پوری ہو۔

اسی کو کہتے ہیں خواب سے تعبیر تک۔۔۔

تاج محل کمپلیکس کی تعمیر میں ایک ہزار ہاتھیوں سے بار برداری کا کام لیا گیا اور سامان کو تاج محل کی چوٹی تک پہنچانے کے لیے ایک پندرہ کلو میٹر لمبا ریمپ بنایا گیا جو بذاتِ خود ایک بڑا پروجیکٹ تھا۔ تاج محل کی دیواروں پر کیلی گرافی کے لیے ماہرین کو ایران سے بلوایا گیا۔ کیلی گرافی کرتے وقت جو آیات اوپر لکھی گئی ہیں ان کا فونٹ (خط کا سائز) بڑا ہے اور جیسے جیسے نیچے آتے جائیں الفاظ کا فونٹ چھوٹا ہوتا جاتا ہے جس سے انھیں پڑھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ تاج محل کمپلیکس دنیا کی اُن چند عمارتوں میں شامل ہے جنھیں دیکھنے کے لیے ایک کروڑ سے زائد لوگ سالانہ آتے ہیں۔

کسی نے عالمگیر سے پوچھا کہ آپ نے اپنے والد کو قید کیوں کیا تھا؟ جواب میں اس نے ایک نامکمل کالے پتھر سے بنائے جانے والے تاج محل کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ اگر میں ایسا نہ کرتا تو مغل سلطنت دیوالیہ ہو جاتی۔۔۔

شاہ جہاں نے کالے پتھر سے دوسرے تاج محل کی تعمیر بھی شروع کر دی تھی، جس کی بنیادیں میں نے بھی دیکھی ہیں۔ کہتے ہیں کہ محبت میں حساب کتاب نہیں کیا جاتا۔۔۔ایک طرف محبت تھی جس کے سامنے رقم کی کوئی حیثیت نہیں تھی اور دوسری طرف مستقبل کا ایک بادشاہ تھا جسے کاروبارِ مملکت بھی چلانا تھا۔

تاج محل: جو دور سے زیادہ خوبصورت لگتا ہے

چند سال پہلے میں نے ایک یورپی سیاح کا ایک قول پڑھا جس نے کہا تھا کہ دنیا میں دو طرح کے لوگ رہتے ہیں، ایک وہ جنھوں نے تاج محل دیکھا ہے اور دوسرے وہ جنھوں نے تاج محل نہیں دیکھا۔ چند لمحوں کے بعد ہم ان لوگوں میں شامل ہونے جا رہے تھے جنھوں نے تاج محل دیکھا تھا۔ یقیناً ہم خوش نصیب لوگ تھے جنھیں تاج محل دیکھنے کا موقع مل رہا تھا اور ہماری خوشی دیدنی تھی۔ اس سے پہلے کہ ہم تاج محل کی طرف جاتے ہمارے گائیڈ نے بتایا کہ تاج محل کے اندر کھانے پینے کی چیزوں پر مکمل پابندی ہے اور وہاں دیر بھی لگ سکتی ہے، اس لیے مناسب ہوگا کہ آپ باہر ہی کھانا کھا کر جائیں تاکہ آپ کو وہاں کوئی دقت نہ ہو۔

ہم سب نے اس بات سے اتفاق کیا اور ایک قریبی ریسٹورانٹ چلے گئے۔ ہم نے دیکھا کہ وہاں پر کھانا ایک تھالی یعنی ایک گول ٹرے میں دیا جا رہا تھا۔ ہم نے سب کے لیے ایک ایک تھالی کا آرڈر کیا۔ مجھے پہلے سے تھالی میں کھانے کا تجربہ تھا۔ وقاص بھائی اور عمر صاحب کو اس کا زیادہ اندازہ نہیں تھا۔ یہ اسٹیل کی بڑی تھالی ہوتی ہے، جس میں سٹیل کی چھوٹی چھوٹی پیالیوں میں مختلف چیزیں رکھی ہوتی ہیں، مثلاً دال، سبزی، چاول، اچار وغیرہ۔ یہ ایک فرد کے لیے مکمل کھانا ہوتا ہے۔ عام طور پر لوگ ایک دوسرے کی تھالی سے کھانا لیکر نہیں کھاتے اور ہندو گھرانوں میں تو خاص طور پر ایسے ہی ہوتا ہے۔ اس کے برعکس ہمارے ہاں عمومی طور پر کھانا کسی بڑے برتن میں دیا جاتا ہے اور ہر شخص اپنی ضرورت کے مطابق اپنی پلیٹ میں کھانا لیتا ہے۔ ہندو کلچر میں اس سے مختلف ہوتا ہے۔

میں نے ایک ہندو سے اس بارے میں پوچھا تو اُس نے مجھے بتایا کہ ایسا کرنا ہمارے دھرم کا حصہ تو نہیں لیکن یہ ہمارے رہن سہن کا ایک لازمی جزو ہے۔ ایسا کرنے

سے ایک سے دوسرے کو بیماری لگنے کے امکانات بہت کم ہو جاتے ہیں۔ اس نے مزید بتایا کہ ہمارے ہاں ہر فرد کے تمام تر برتن الگ ہوتے ہیں حتیٰ کہ پانی پینے کا گلاس بھی الگ ہوتا ہے۔ میں نے پوچھا کہ ہندو لوگ عام طور پر ہاتھ بھی نہیں ملاتے اور گلے ملنے سے بھی گریز ہی کرتے ہیں، اس کی کیا وجہ ہے؟ انھوں نے جواب میں کہا کہ اس کی وجہ بھی بیماریوں کا پھیلاؤ رہی روکنا ہوتا ہے۔ بہر حال یہ ان کا عقیدہ ہے ضروری نہیں کہ ہم اس سے متفق ہوں۔

اختلاف کیا جانا چاہیے نفرت نہیں۔۔۔

نفرت اور اختلاف میں بے حد فرق ہے!

تھالی کا کھانا ذائقہ کے اعتبار سے مختلف نہیں تھا البتہ اس میں گوشت کا نہ ہونا سمجھ میں آنے والی بات تھی۔ ہندو عام طور پر گوشت نہیں کھاتے، ایسا اُن کے دھرم کی وجہ سے ہے۔ کھانے سے متعلق میرا مشاہدہ ہے کہ اگر آپ بر صغیر کے شمال میں، یعنی پشاور سے شروع ہو کر نیپال تک سفر کرتے ہیں تو اس پورے علاقے میں آپ کو کھانوں میں بہت زیادہ فرق محسوس نہیں ہوگا۔ سب لوگ ایک ہی طرح کے کھانے اور ایک ہی جیسے مصالحہ جات استعمال کرتے ہیں لیکن جیسے ہی آپ بر صغیر کے جنوب میں سفر کرتے ہیں جیسے مدراس، بنگال، کلکتہ اور ممبئی وغیرہ کے علاقے تو آپ کو کھانوں میں بہت زیادہ فرق محسوس ہوگا۔ ان علاقوں کے کھانے ذائقہ میں شمال سے بہت مختلف ہوتے ہیں۔ میں نے چنائی میں پلیٹ کی جگہ پر کیلے کے پتے کا استعمال بھی دیکھا ہے اور کیا بھی ہے۔ میں کھانوں کے لحاظ سے برِ صغیر کو دو حصوں میں یعنی شمال اور جنوب میں تقسیم کرنا بہتر سمجھتا ہوں۔

میں جب 2012ء میں پی ایچ ڈی کے لیے چیک ریپبلک میں تھا تو ایک دفعہ میرا پیٹ خراب ہو گیا اس پر ڈاکٹر نے مجھے ہلکی غذا کھانے کو کہا۔ ہسپتال کے سامنے ہی

ایک نیپالی کا ریسٹورانٹ تھا۔ جب میں نے اس سے ہلکی غذا کے بارے میں بات کی تو اس نے کہا میں آپ کو کھچڑی بنا کر کھلاتا ہوں۔ ہمارے ہاں بھی جب بیماری کی حالت میں ڈاکٹر ہلکی غذا کھانے کو کہتا ہے تو کھچڑی ہی کھلائی جاتی ہے۔ کھچڑی چاول اور دال سے بنائی جانے والی ایک ڈش ہے جو زود ہضم ہوتی ہے۔ کھچڑی شائد ہی دنیا میں کسی اور جگہ بنتی ہو لیکن یہ بر صغیر کے شمال میں آپ کو ہر جگہ مل جاتی ہے۔

بات لمبی ہو گئی، کھانا کھانے کے بعد ہم نے تاج محل دیکھنے کے لیے ٹکٹ لیے۔ تفریحی اور تاریخی مقامات کے ٹکٹ مقامی لوگوں سے مقامی کرنسی میں اور غیر ملکیوں کے لیے یہ امریکن ڈالر میں لیے جاتے ہیں۔ یاد رہے پاکستان میں بھی ایسا ہی ہے اور انڈیا میں بھی ہمارے ساتھ ایسا ہی ہوا۔ اس وقت تاج محل کا ٹکٹ کسی بھی بھارتی کے لیے دس روپے جبکہ ہمارے لیے دس امریکی ڈالر کا تھا۔ میرے چوتھے بھارت کے دورہ پر ہمارے ساتھ یونیورسٹی کے بچے بھی تھے اس وقت یہاں ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا جو میں حصہ چہارم میں چوتھے بھارت کے دورہ کی رُوداد پیش کرتے ہوئے بتاؤں گا جو کہ نہایت دلچسپ ہے۔ سن 2018ء میں مجھے چیک ریپبلک سے آئے ہوئے اپنے پروفیسر کے ساتھ کھیوڑہ سالٹ مائن جانے کا موقع ملا، وہاں میرے لیے ٹکٹ بیس روپے کی تھی اور غیر ملکی ہونے کی وجہ سے مجھے اپنے پروفیسر کے لیے بیس ڈالر کی ٹکٹ لینا پڑی۔

تاج محل جانے کے لیے ایک بہت بڑے احاطے سے گزرنے کے بعد ہمیں ایک بڑے گیٹ سے بھی گزرنا تھا اور جس کے فوراً بعد ہمیں تاج محل کا مرکزی حصہ نظر آنا تھا۔ ہم سب نے آپس میں بات کی کہ جب ہم پہلی مرتبہ تاج محل دیکھیں گے تو اُس وقت ہمارے جذبات کیسے ہوں گے؟ سبھی نے کچھ نہ کچھ کہا۔

اس وقت ہمارے پاس ایک بھارتی ہندو لڑکا اور لڑکی بھی کھڑے تھے۔ انھوں نے بھی ہماری بات سن لی۔ ہماری بات سن کر لڑکی بولی کہ تاج محل محبت کی نشانی کے طور پر بنایا گیا ہے اور جو لوگ آپس میں محبت کرتے ہیں ان کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ جب یہاں آئیں تو انھیں یہ دعا مانگنی چاہیے کہ ان کی محبت بھی ایک بادشاہ اور ملکہ جیسی ہو جائے۔ لڑکی نے مزید کہا کہ ہم اپنی آنکھیں بند کرکے پہلے والے بڑے دروازے سے گزریں گے اور جب ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ ہم دروازے سے اندر آ گئے ہیں تو پھر ہم آنکھیں کھولیں گے اور ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیر تک ایک دوسرے کو دیکھتے رہیں گے۔ میں نے حیرانی سے پوچھا کہ کیا یہ عام بات ہے اور اکثر جوڑے ایسا ہی کرتے ہیں؟ جواب میں لڑکے نے کہا کہ یہ بات اتنی عام تو نہیں ہے مگر اکثر لوگ ایسا ہی کرتے ہیں اور ابھی ہماری شادی نہیں ہوئی، ابھی تو محبت کا ہی دور چل رہا ہے۔

مجھے محسوس ہوا کہ ایسا منظر نہایت ہی دلچسپ اور انوکھا ہو گا۔ اسی وجہ سے میں اپنے دونوں دوستوں سے پیچھے ہی رک گیا تاکہ میں یہ منظر دیکھ سکوں۔ میں نے دیکھا کہ جیسے ہی انھوں نے بڑا دروازہ پار کیا وہ ایک دوسرے کی طرف آنکھیں بند کرکے کھڑے ہو گئے اور پھر ایک دم سے انھوں نے اپنی آنکھوں سے ہاتھ اٹھائے اور بڑی دیر سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ جب وہ اس کام سے تھک گئے اور ان کی آنکھوں میں پانی کے قطرے بہنے لگے تو پھر انھوں نے تاج محل کو خوب جی بھر کے دیکھا اور اپنے دل میں محبت کے ارمانوں کو سمویا اور پھر ہماری طرح تاج محل کو دیکھنے میں گم ہو گئے۔

جب لڑکے نے دیکھا کہ میں ان کو دیکھ رہا ہوں تو اس نے مسکرا کر مجھے کہا کہ ہم تاج محل تو نہیں بنا سکیں گے لیکن یہاں سے جاتے ہوئے پتھر کے بنے تاج محل کے ماڈل ضرور لے کر جائیں گے اور اسے اس یاترا کی نشانی کے طور پر سنبھال کر رکھیں گے۔ میں

نے کہا کہ آپ میں سے کون اس ماڈل کو سنبھالے گا کیونکہ ابھی تو آپ کی شادی نہیں ہوئی؟ لڑکے کا جواب لاجواب تھا۔ اس نے کہا شادی سے پہلے میں اور شادی کے بعد یہ۔۔۔ اس پر لڑکی نے پیار بھرے انداز میں لڑکے کی طرف گھور کر دیکھا۔۔۔ وہ شاید یہ کہہ رہی ہو گی کہ مرد سارے ایک جیسے ہی ہوتے ہیں۔۔۔

پھر ہم سب تاج محل کے تاج کو دیکھنے چل پڑے۔۔۔ جسے دیکھنے اس وقت وہاں پہلے ہی سے ہزاروں لوگ موجود تھے۔۔۔ کچھ ہی دیر میں یہ جوڑا بھی اسی بھیڑ میں گم ہو گیا لیکن میری زندگی میں ایک یادگار واقعہ کا اضافہ ہو گیا جو مجھے اب بھی یاد ہے۔

تاج محل پر پہلی نظر

تاج محل میں داخل ہونے کا ایک ہی بڑا راستہ ہے جس سے سب لوگ داخل ہوتے ہیں، جسے مشرقی دروازہ کہتے ہیں۔ ویسے تو یہ دروازہ تاج محل کے جنوب میں واقع ہے لیکن یہ مشرقی دروازے کے نام سے ہی مشہور ہے۔ آپ جیسے ہی اس دروازے سے اندر داخل ہوتے ہیں تو آپ کو تاج محل کی عمارت دکھائی دیتی ہے، جس کے آگے ایک وسیع علاقہ ہے جو چار باغ کہلاتا ہے۔ چار باغ کے درمیان میں پانی کی ایک گزرگاہ اور ارد گرد چار بڑے خوبصورت باغ ہیں۔ پانی کی گزرگاہ کے دونوں اطراف راستے بنے ہوئے ہیں جن پر چل کر آپ مین بلڈنگ تک جا سکتے ہیں۔ درمیان میں ایک چوراہا بھی ہے جہاں سے آپ دائیں یا بائیں بھی مڑ سکتے ہیں۔

ان باغوں کی ہریالی اور تاج محل کے دائیں اور بائیں دو سرخ رنگ کی عمارتیں اور بیچ میں ایک سفید پھول، جس کے چاروں کونے چار پتیوں کی طرح باہر کی طرف کھلے نظر آ رہے ہوں۔ ایسی صورت حال میں نظر کا ہٹانا ناممکن ہوتا ہے۔ میں بھی مبہوت کھڑا دیکھتا رہا۔ آپ اس منظر کو اگر تصور کی نظر سے دیکھنا چاہیں تو لاہور کے شالامار باغ کو

دیکھ سکتے ہیں۔ شالامار باغ اور تاج محل میں داخل ہونے کے بعد کا منظر ایک ہی جیسا ہے۔ ۔پھر ایک آواز آئی بھائی صاحب راستہ۔۔۔اور میں واپس حقیقت کی دنیا میں آگیا۔

مجھے دور سے یہ لگا کہ ایک بہت بڑا چبوترہ ہے، جس کے چاروں کونوں پر مینار ہیں اور میناروں کے درمیان ایک چوکور عمارت ہے اور اس کے چاروں کونوں پر چھوٹے چھوٹے گنبد ہیں اور تمام گنبدوں کے درمیان میں ایک بڑا گنبد ہے۔ درمیان والے گنبد کی ٹاپ پر ایک نشانی بنی ہوئی ہے اور اس کے سب سے اوپر ایک چاند بنا ہوا ہے۔ میں کچھ دیر تک تو یہ سمجھتا رہا کہ اس کی شکل تو بالکل ایک پھول جیسی ہے۔ جیسے پھول کے ارد گرد کھلی پتیاں ہوتی ہیں اور وہ بھی باہر کی طرف جھکی ہوئی ہوں۔۔۔مجھے یہ ایسے ہی لگا۔ بعد ازاں یہ تصدیق بھی ہوئی کہ چاروں مینار باہر کی طرف جھکے ہوئے ہیں۔ ایسا اس لیے کیا گیا تھا کہ زلزلے کے صورت میں یہ مینار اس گنبد پر نہ گریں۔ لیکن مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے ڈیزائنر نے ایک پھول بنایا ہو جسکی پتیاں نیچے سے اوپر کو جاتی ہیں اور اوپر جاکر باہر کی طرف جھک جاتی ہیں اور ان کا آپس میں فاصلہ بھی بڑھ جاتا ہے۔

جب کوئی منظر یا چہرہ مجھے بے حد خوبصورت لگتا ہے تو میں پوری کوشش کرتا ہوں کہ اُس وقت اِس منظر کے علاوہ مجھے اور کچھ بھی نظر نہ آئے اور میں اسے دیر تک دیکھتا رہوں۔ اس طرح یہ منظر یا چہرے کی تصویر میرے دماغ میں نقش ہو جاتی ہے۔ ایسے منظر کو دوبارہ دیکھنے کے لیے مجھے کسی تصویر کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بعد ازاں میں جب چاہوں آنکھیں بند کرکے اس منظر سے دوبارہ لطف اندوز ہو سکتا ہوں۔ ایسا ہی میرے ساتھ وہاں ہوا۔ میں تاج محل کو کافی دیر تک ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ کوشش کے باوجود میں ارد گرد کچھ نہ دیکھ سکا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ آج بھی وہ منظر میرے دماغ پر نقش ہے۔ اگر میں چاہوں آنکھیں بند کرکے اس کی تصویر بنا سکتا ہوں، میں نے بارہا ایسے مناظر کے سکیچ بھی بنائے ہیں ۔ اس لیے مجھے ایسے منظر تادیر یاد رہتے ہیں ۔ ایک

مرتبہ 1978ء کی بات ہے میں بعد نمازِ عصر سید مودودی رحمت اللہ علیہ کی محفل میں موجود تھا اور میں نے کوئی سوال نہیں پوچھا لیکن انھیں ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ ان کا کرسی پر بیٹھنا، سوالوں کا جواب دینا، نماز میں شریک ہونا وغیرہ، اب تک مجھے تفصیل سے یاد ہے۔ اس کے علاوہ بھی چند چہروں کو میں نے اسی نقطۂ نظر سے دیکھا۔ آج بھی میں ان کو یاد کر کے حظ اٹھاتا ہوں۔

میں مشرقی گیٹ پر ہی رک گیا اور میرے دونوں ساتھی آگے نکل گئے۔ اس دوران میں نے دائیں بائیں دیکھنا شروع کیا۔ میں نے دیکھا کہ تاج محل کے مشرق میں ایک عمارت جبکہ مغربی جانب ایک مسجد واقع ہے۔ تاج محل کے تین اطراف میں مختلف عمارتیں ہیں اور چوتھی طرف دریائے جمنا بہتا ہے۔ لال قلعہ دلی بھی دریائے جمنا کے کنارے ہی واقع ہے۔ اگر آپ نقشہ میں دیکھیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ دریا تاج محل کے شمال سے گزرتا ہے۔ لیکن ایسا لگتا ہے جیسے اس کا رخ موڑ کر تاج محل کے پاس سے گزارا گیا ہے۔ یہاں پر اس کی شکل باقاعدہ انگریزی کے حرف یو جیسی ہے۔ میرا خیال ہے کہ پہلے تاج محل کی عمارت بنائی گئی بعد میں اس کی خوبصورتی میں اضافہ کے لیے دریا کا راستہ بدلہ گیا۔ یہ میرا خیال ہے ممکن ہے درست نہ ہو۔

گیٹ کے پاس رکنے کے بعد میں آگے چل پڑا اور چار باغ کے علاقہ میں پہنچ گیا۔ میں جیسے ہی تاج محل کے مرکزی حصے کے مزید قریب ہوا تو مجھے تاج محل کی دیواریں اور پتھر نظر آنے لگے۔ مجھے اب یہ عمارت ایک پتھر کی بنی ہوئی نظر آرہی تھی۔ ہر طرف مختلف اقسام کے پتھر ہی پتھر تھے۔ کچھ پتھر دیوار کی سجاوٹ میں اضافہ کر رہے تھے اور کچھ فرش کی زینت بنے ہوئے تھے۔ مجھے محسوس ہوا کہ یہ تاج محل نہیں بلکہ مختلف پتھروں کی دیواریں اور فرش ہیں اور یہ سب کچھ خوبصورت پتھروں کا ایک مجموعہ ہے۔ مجھے لگا کہ جیسے میرا تاج محل گم ہو گیا ہے۔ میں واپس پلٹا اور پھر وہیں جا کر کھڑا ہو گیا جہاں سے

میں اس علاقے میں داخل ہوا تھا، اور دوبارہ تاج محل کو دیکھنے لگا۔ میری خوشی کی انتہاء نہ رہی جب مجھے میرا تاج محل دوبارہ مل گیا۔

میں دیوار کو ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ میرے ساتھ ایک جرمنی سے آئے ہوئے میاں بیوی بھی بیٹھے تھے جو ریٹائر منٹ کے بعد ہندوستان کی سیاحت پر آئے تھے۔ ہم تینوں خاموش بیٹھے تاج محل کو دیکھ رہے تھے۔ ایک مختصر خاموشی کے بعد آپس میں مسکراہٹ کا تبادلہ ہوا اور گفتگو شروع ہوئی۔ ہماری گفتگو کا خلاصہ یہ تھا کہ یہ وہ عجوبہ ہے جسے جتنا دور سے دیکھیں اتنا ہی خوبصورت اور سندر لگتا ہے۔ قریب سے دیکھیں تو اس کا حسن ماند پڑ جاتا ہے۔ انھوں نے بھی اس بات پر اتفاق کیا اور ہم کافی دیر تک اسی موضوع پر گفتگو کرتے رہے۔ وقت زیادہ ہونے کی وجہ سے مجھے خیال آیا کہ میرے ساتھی مجھے ڈھونڈ رہے ہوں گے اس لیے اب مجھے چلنا چاہیے۔ میں جرمن دوستوں سے رخصت لے کر آگے بڑھ گیا۔

تاج محل: جہاں اور بھی دلکش عمارتیں موجود ہیں

میں مشرقی دروازے کے بعد مین گیٹ سے گزر کر تاج محل کی مین بلڈنگ کی طرف جانے والے راستوں سے ہوتا ہوا مقبرے کے قریب پہنچ گیا۔ وہاں پر میرے دونوں ہمسفر میرا انتظار کر رہے تھے۔ اس سے پہلے کہ میں آپ کو دریائے جمنا کی طرف سے تاج محل دیکھنے کے تجربے سے آگاہ کروں، میں چاہوں گا کہ اس کمپلیکس میں واقع دیگر عمارات کا بھی تذکرہ ہو جائے۔ جس سے آپ کو یہ معلوم ہوگا کہ یہاں صرف تاج محل ہی نہیں ہے بلکہ اس کے علاوہ بھی اور بہت کچھ موجود ہے، جو اپنی جگہ بے حد اہمیت کا حامل ہے لیکن تاج محل کی وجہ سے ان عمارات کی اہمیت میں کمی واقع ہوئی ہے۔

داخلی دربار یا انر کورٹ

ہم تاج محل کے پورے علاقے کو تین بڑے حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ پہلا حصہ ایک چار دیواری پر مشتمل ہے جس کے اندر داخل ہونے کے لیے تین بڑے دروازے ہیں، ایک جنوبی، دوسرا مشرقی اور تیسرا مغربی۔ مغربی دروازہ شہر کی طرف کھلتا ہے یہ دروازہ بادشاہ سلامت نے اپنے لیے بنوایا تا کہ وہ اس طرف سے تاج محل کی طرف جا سکے۔ مشرقی دروازہ عام لوگوں کے لیے جبکہ جنوبی دروازہ کسی خاص مقصد کے لیے بنایا گیا ہو گا، یہ سب میرا خیال ہے۔

اس وقت عام لوگ مشرقی دروازے سے ہی اندر جاتے ہیں۔ جیسے ہی آپ اس دروازے سے اندر جاتے ہیں تو آپ خود کو ایک بہت بڑے احاطے میں پاتے ہیں۔ جس کے چاروں طرف اونچی دیوار ہیں۔ ایک صاحب نے بتایا کہ اس علاقے کو جھروکہ کہتے ہیں۔ مقبرے کی طرف جانے سے پہلے یہاں پر لوگ آ کر تیار ہوتے تھے، اپنی سواری وغیرہ چھوڑتے تھے۔ اب بھی یہ جگہ انھی کاموں کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ یہاں وہ کمرے بھی موجود ہیں جہاں پر آپ اپنا سامان وغیرہ رکھ سکتے ہیں۔ جنھیں کلاک روم کہا جاتا ہے۔ احاطے کے بالکل درمیان ایک بہت خوبصورت فرش ہے جس سے احاطے کی شان میں بے حد اضافہ ہو جاتا ہے۔اس احاطے کے دائیں اور بائیں دونوں اطراف میں کچھ کمرے بنے ہوئے دکھائی دیتے ہیں جو دور ہونے کے باوجود باآسانی نظر آتے ہیں۔ ان سے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ تاج محل کی نگرانی پر معمور لوگوں کی رہائش گاہیں تھیں۔ اب یہ عمارتیں سرکاری دفاتر کے لیے استعمال ہو رہی ہیں۔

مشرقی دروازے کے دونوں اطراف یعنی احاطے کے دونوں کونوں پر دو قبریں بھی ہیں جن سے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ یہ دونوں شاہجہاں کی بیویاں یا کنیزیں تھیں۔ کوئی حتمی بات کہنا مشکل ہے۔ احاطے میں داخل ہونے کے لیے تین بڑے گیٹ، چوتھا

بڑا گیٹ تاج محل کی طرف جانے کے لیے، دو کونوں میں رہائش گاہیں اور باقی دو کونوں میں خواتین کی قبریں اور درمیان میں ایک کورٹ یارڈ ،ان سب نے مل کر اس جگہ کو بھی قابلِ دید بنا دیا ہے۔یہ تمام عمارتیں سرخ اینٹوں سے تیار کی گئیں ہیں۔اپنی بلندی اور وسعت کی وجہ سے ان کی اپنی ہی ایک ہیبت ہے۔

وہ گیٹ جس میں سے گزر کر آپ تاج محل کی طرف جاتے ہیں اسے عظیم دروازہ کہتے ہیں۔ اس دروازے کی لمبائی 130اور چوڑائی 110اور اونچائی 75 فٹ ہے۔ اس گیٹ کی لمبائی ، چوڑائی اور بلندی سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ صرف اس علاقے میں داخل ہونے کے لیے جو گیٹ بنایا گیا کتنا بلند و بالا تھا۔ یقیناً اس کے ارد گرد دیواریں بھی اتنی ہی بلند ہیں۔

آپ ایک عظیم بادشاہ جس کے دور کو ہندوستان کا پرامن اور خوشحالی کا دور کہا جاتا ہے، کی قبر پر جا رہے ہیں جہاں وہ اپنی ملکہ کے ساتھ ابدی نیند سو رہا ہے۔۔۔ تو پھر دروازہ تو بڑا ہونا ہی چاہیے۔۔۔

اس پورے علاقے کو انر کورٹ کا نام دیا گیا ہے۔اس کی لمبائی اور چوڑائی برابر ہے جو کہ 165 فٹ ہے۔ اس کورٹ کا رقبہ ساٹھ کنال سے زائد ہے۔اس کی وسعت بھی اپنی ایک شان رکھتی ہے اور ہر لحاظ سے قابلِ دید ہے لیکن تاج محل کے دیدار کا شوق لوگوں کو یہاں رُکنے نہیں دیتا۔

میرے ساتھ بھی ایسا ہوا۔

مین گیٹ میں داخل ہونے کے بعد مقبرے تک کے حصے کو کمپلیکس کا دوسرا حصہ کہہ سکتے ہیں۔اس علاقے میں کوئی عمارت نہیں ہے۔یہ ایک وسیع علاقہ ہے جس کا رقبہ کم و بیش 25ایکڑ ہے۔ یاد رہے تاج محل کا کل رقبہ 42ایکڑ ہے۔اس طرح سے دیکھا جائے تو نصف سے زیادہ جگہ پر صرف یہ چار باغ موجود ہیں۔ ان میں سے ہر باغ کی

لمبائی اور چوڑائی برابر ہے جو کہ 480 فٹ ہے۔ ان چاروں باغوں کے درمیان پانی کے لیے ایک چینل بنا ہوا ہے اور مرکز میں چوراہا پر ایک تالاب بھی ہے جس نے پورے منظر کو بدل کے رکھ دیا ہے۔ پانی کے چینل میں فوارے لگے ہوئے ہیں اور پیدل چلنے والوں کے لیے فٹ پاتھ بھی بنے ہوئے ہیں۔

یاد رہے ہیں یہاں ارد گرد کوئی بھی عمارت نہیں ہے ۔ میں نے یہ بات محسوس کی ہے کہ ہمایوں کا مقبرہ ہو، جہانگیر کا یا لاہور کا شالامار باغ ان سب میں یہ قدر مشترک ہے کہ جیسے ہی آپ بڑے گیٹ سے اندر داخل ہوتے ہیں تو مین بلڈنگ تک جانے کے لیے پانی کا چینل موجود ہوتا ہے اور جس کے ساتھ پیدل چلنے کے لیے دونوں اطراف میں فٹ پاتھ بھی ہوتا ہے۔ پانی کے چینل میں فوارے لگے ہوتے ہیں جس کے آخر میں پانی کا تالاب ہوتا ہے اور اس کے درمیان میں بیٹھنے کی جگہ بھی ہوتی ہے۔ یہ مغل طرزِ تعمیر کا ایک اہم جزو ہے۔ یہاں پر بھی ایسا ہی تھا۔

مین گیٹ سے لے کر تاج محل کی اصل عمارت تک کم و بیش ایک ہزار فٹ کا فاصلہ ہے۔آپ نے اکثر دیکھا ہو گا کہ تاج محل کے سامنے ایک بینچ پر بیٹھ کر لوگ تصاویر بنواتے ہیں۔ وہ بنچ بھی باغات کے درمیان بنے ہوئے تالاب کے پاس موجود ہے۔اس جگہ سے تاج محل کا نظارہ بہت ہی خوبصورت ہوتا ہے اور اکثر لوگ اپنی یادگاری تصاویر وہیں بیٹھ کر بناتے ہیں۔ وہاں سے تاج محل تقریباً پانچ سو فٹ کے فاصلے پر ہے۔ یہ تاج محل کمپلیکس کا دوسرا حصہ ہے۔

تاج محل کمپلیکس کا تیسرا حصہ مقبرے اور اس کے دائیں اور بائیں موجود دو عمارتوں پر مشتمل ہے۔ مقبرہ کے دونوں اطراف میں عمارتیں بالکل ایک سی ہیں۔ ان کی لمبائی 160 فٹ اور چوڑائی 60 فٹ کے قریب ہے۔ ان عمارتوں کی اونچائی 65 فٹ ہے۔ دونوں میں تین، تین گنبد ہیں ۔ جن کا طرزِ تعمیر ایک ہی طرح کا ہے۔ اگر آپ

مقبرہ کی طرف منہ کرکے کھڑے ہوں تو آپ کے بائیں طرف کی عمارت کو مسجد کا نام دیا گیا ہے اور یہاں پر باقاعدہ نماز کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ میں نے ایک صاحب جو مقامی مسلمان تھے سے اس بارے بات کی تو انھوں نے بتایا کہ جمعہ کے روز مقامی مسلمانوں کا داخلہ مفت ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے حکومت سے مطالبہ کیا تھا کہ یہ ایک جامع مسجد ہے اور جمعہ کے روز عام مسلمان نمازِ جمعہ کے لیے آتے ہیں۔ ہم نے یہاں نماز پڑھنے کی اجازت حاصل کی۔ جو عمارت مقبرہ کے دائیں طرف ہے اسے مہمان خانے کا نام دیا گیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کا رخ کعبہ کی طرف نہیں ہے۔ یہ دو عمارتیں بنانے کا مقصد ایک طرح کی یکسانیت پیدا کرنا تھا۔

مقبرہ کے دائیں اور بائیں جانب پانی کے تالاب تاج محل کی خوبصورتی میں بے حد اضافہ کرتے ہیں۔ جیسے کہ میں نے پہلے کہا ہے کہ دونوں عمارتوں میں کوئی فرق نہیں ہے، دونوں کے سامنے تالاب ہیں جو وضو اور ہاتھ منہ دھونے کے لیے استعمال ہوتے ہیں البتہ عمارتوں سے ہٹ کر مقبرے کے دائیں طرف ایک ایسی چیز ہے جو بائیں طرف نہیں ہے یعنی ماربل اور سرخ پتھر سے بنا ہوا ایک وسیع پلیٹ فارم۔ اگر آپ پلیٹ فارم پر کھڑے ہوں تو آپ کو دریائے جمنا اتنا واضح نظر آتا ہے کہ آپ دریا کے دوسری طرف بھی باآسانی دیکھ سکتے۔ اب ہم اپنی آخری عمارت کی طرف آتے ہیں یعنی مقبرے کی جانب، جس کی وجہ سے اس عمارت کو سات عجوبوں میں ایک اہم مقام ملا ہے۔

کسی بھی مقام پر سیر کرتے وقت میری خواہش ہوتی ہے کہ میں تنہا اس جگہ پر سیر کروں، تاکہ اپنی مرضی سے چیزیں دیکھ سکوں۔ میرے دونوں ساتھی میرے ہمراہ تھے۔ ہم نے کچھ وقت اکٹھے گزارا اس دوران دلی سے ہمارے ساتھ آنے والے جوڑے؛ عرب میاں اور بھارتی بیوی سے بھی ہماری ملاقات ہوئی۔ انھوں نے ہمیں پہچان لیا۔ ہماری آپس میں سلام دعا بھی ہوئی۔ ان کی خواہش پر عمر بھائی نے میاں بیوی کی تصاویر

بھی بنائیں۔ کچھ وقت ساتھ گزارنے کے بعد میں نے اپنے دوستوں سے اجازت لی اور دوبارہ اکیلے ہی تاج محل دیکھنا شروع کر دیا۔

تاج محل ایک اونچے ٹیرس پر بنا ہوا ہے جو زمین سے 28 فٹ بلند ہے اور اس کی لمبائی 1000 فٹ اور چوڑائی 360 فٹ ہے۔ اس طرح سے یہ عمارت کم و بیش 80 کنال رقبے پر پھیلی ہوئی ہے۔ مقبرہ کے چاروں طرف ایک ایک مینار ہے۔ ہر مینار بنیاد سے 18 فٹ چوڑہ ہے اور 140 فٹ اونچا۔ جیسے جیسے مینار اونچا ہوتا جاتا ہے اس کی چوڑائی میں کمی واقع ہوتی جاتی ہے۔

مقبرہ چوکور شکل میں بنا ہوا ہے جو ہر طرف سے 185 فٹ لمبا ہے۔ پلیٹ فارم سے درمیانی گنبد کی اونچائی 221 فٹ ہے جبکہ سطح زمین سے یہ 240 فٹ اونچا ہے۔ گنبد کے چاروں طرف چار چھوٹے گنبد اور بھی ہیں۔ بڑے ہال میں موجود قبروں کی طرف جانے کے لیے آٹھ مختلف راستے ہیں۔ اصل قبریں نیچے تہہ خانے میں ہیں جبکہ اوپر صرف پتھر سے بنے ہوئے بہت ہی خوبصورت تعویز ہیں۔ عمارت کو خوبصورت بنانے کے لیے خطاطی کی گئی ہے مختلف پتھروں سے بیل بوٹے بنائے گئے ہیں۔ یہ سب کاریگری کا ایک بہترین نمونہ ہے۔ اس کی تفصیل بتانا میرے بس میں نہیں صرف اتنا ہی کہوں گا جب آپ اسے دیکھنا شروع کریں گے تو دیکھتے ہی رہ جائیں گے۔

بڑی حیرانی کی بات ہے کہ ساڑھے تین سو سال پہلے جب یہ عمارت بنائی گئی تو اس وقت سائنس نے اتنی زیادہ ترقی نہیں کی تھی۔ اس عمارت کو بے شمار لوگوں نے مختلف اطراف سے ناپا تو وہ حیران رہ گئے کہ کس طرح جیومیٹری کے استعمال سے ہر چیز لمبائی چوڑائی میں بالکل ٹھیک رکھی گئی ہے جس میں کسی بھی طرح کا کوئی فرق نہیں ہے۔

اس عمارت کو دیکھنے کے بعد میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ انتہائی گہرا سائنسی علم ہونے کے بغیر اس عمارت کی بنیاد سے لے کر چھت تک کی تعمیر ممکن نہ تھی۔ اسے بنانے والے کاریگروں میں ایرانی بھی تھے، مشرق وسطی کے لوگ بھی تھے اور ہندوستانی بھی تھے۔ سب سے کام لینے والے بے شمار انجینئر بھی تھے جنھوں نے سیلاب کا حساب بھی لگایا، زمین کی گہرائی کو بھی دیکھا، زمین کی سختی کو بھی ناپا، گرمی سردی کا حساب بھی لگایا، زلزلہ سے بچاؤ کا بھی بندوبست کیا اور اس طرح اس عمارت کو بنایا کہ چار صدیاں گزر جانے کے باوجود یہ عمارت اپنی اصلی حالت میں صحیح سلامت کھڑی ہے۔

آخر میں آپ کو میں ایک ایسے منظر کا بتانا چاہتا ہوں جو میں دیکھ نہ سکا لیکن زندگی رہی تو ضرور دیکھوں گا۔ ہمارے گائیڈ نے بتایا کہ تاج محل بننے سے قبل بابر نے دریا کے دوسری طرف باغات بنوائے تھے جن کو مہتاب باغ کا نام دیا گیا تھا۔ وہاں جانے کے لیے کشتی کے ذریعے دریا پار کیا جاتا ہے۔ عام طور پر رات کو اس طرف جانے کی اجازت نہیں ہوتی۔ کہتے ہیں کہ کبھی مل بھی جاتی ہے۔ لوگ کشتی میں بیٹھ کر دریا کی دوسری طرف جاتے ہیں جہاں وہ مہتاب باغ میں بیٹھ کر سورج غروب ہونے اور چودھویں کے چاند کا نظارہ دیکھتے ہیں۔

یہ اپنے اپنے نصیب کی بات ہے!

میرے لیے دریا کے دوسری طرف جانا تو ممکن نہ تھا لیکن میں مقبرے کے شمال کی طرف چلا گیا اور دریا کے کنارے بنی ہوئی دیوار کے ساتھ کھڑا ہو کر کوشش کرنے لگا کہ کسی طرح پانی میں مجھے تاج محل نظر آ جائے۔ میری کوشش کامیاب ہوئی اور میں تاج محل کا کچھ حصہ دیکھ سکا۔ پانی کم ہو تو ایسا ممکن نہیں ہوتا۔ اس دن دریا میں پانی بہت زیادہ تھا جو میری خوش بختی تھی، یوں میں نے دریا کے پانی میں بھی تاج محل

دیکھا۔ وہ حقیقی معنوں میں انوکھا نظارہ تھا کیونکہ پانی کی وجہ سے اس کے پتھر الگ نظر نہیں آرہے تھے بلکہ وہ پتھر کا ایک ہی بڑا سا ٹکڑا الگ رہا تھا۔

ایک اور انوکھی بات جو ہمارے گائیڈ نے مجھے بتائی کہ تاج محل کا رنگ سورج کے طلوع اور غروب ہونے کے وقت بدل جاتا ہے۔ ہم نے بھی دیکھا ہے کہ بعض اوقات موسم ایسا ہوتا ہے کہ غروب آفتاب کے وقت آسمان کا رنگ سرخی مائل ہو جاتا ہے۔ایسی صورت میں تاج محل کا رنگ بھی گلابی ہو جاتا ہو گا۔

میں نے جو منظر پانی میں تاج محل کو ہلتے جلتے دیکھا۔ یہ منظر میرے لیے بھلانا ناممکن ہے لیکن مجھے اس بات کا افسوس رہے گا کہ میں دریا سے پار اتر کر رات کے وقت تاج محل نہ دیکھ سکا۔ میں ان کالے پتھروں کے پاس بھی جانا چاہ رہا تھا جو ایک اور تاج محل بنانے میں استعمال ہونے تھے۔اُن پتھروں کی قسمت میں یہ نہیں تھا ورنہ وہ بھی آج تاج محل کی طرح سے دیکھے جاتے۔

وہ جو کہتے ہیں !

ہر پھول کی قسمت میں کہاں نازِ عروساں

کچھ پھول تو کھلتے ہیں مزاروں کے لیے بھی

ایک پتھر تاج محل کے ماتھے کا جھومر بنا جبکہ دوسرا ابھی زمین پر ہی پڑا ہے۔اگر عالمگیر کو خزانے کا خیال نہ آتا تو یقیناً آج ہم ایک کالے رنگ کا تاج محل بھی دیکھ رہے ہوتے۔ میں اسی حسرت کو دل میں چھپا کر اپنے دوستوں کے پاس آگیا۔ بس والے کے دیئے گئے وقت کے مطابق ہمیں واپس جانا تھا۔ ہم نے اپنا واپسی کا سفر شروع کیا۔ میں نے دونوں دوستوں سے پوچھا کہ آپ کے تاثرات کیا ہیں؟ جواب میں انھوں نے اتنا کہا

کہ یہ صرف محبت کی نشانی ہی نہیں ،بلکہ محنت ومشقت اور ٹیکنالوجی کا بھی ایک شاہکار ہے۔

میں نے صرف اتنا کہا کہ اب میرا شمار دنیا کے ان لوگوں میں ہے جنھوں نے تاج محل دیکھا ہے۔ ہم نے ان ہی خیالات کے ساتھ واپسی شروع کی۔ دہلی کے راستے میں ہمیں دو جگہ رُکنا تھا۔آئندہ صفحات میں ان مقامات کی تفصیل بھی آپ کے سامنے پیش کروں گا۔

At Taj Mahal

At Taj Mahal

Taj Mahal

Taj Mahal with colorful people andcamels Photo Credit: https://onlyinyourstate.in

Taj Mahal Complex a full picture Photo Credit: https://madainproject.com

Begum Taj Mahal and Shah Jahan Photo Credit:

https://in.pinterest.com/pin

Bill Clintin and his daughter Chelsea Photo Credit:
https://tucson.com

Ustad Ahmed Lahori no body knows his grave, Photo Credit: https://silverpax.com

آگرہ کا قلعہ: جس کی بنیاد اکبر بادشاہ نے رکھی

تاج محل کے سحر سے نکلنا کافی مشکل کام تھا لیکن زندگانی میں اور بھی بے شمار کام تھے، اس لیے تاج محل کو اس امید کے ساتھ خدا حافظ کہا کہ زندگی رہی تو پھر ملیں گے !

تاج محل کے شمال مغرب میں دریا کے ساتھ آگرہ کا قلعہ موجود ہے۔آپ کے سامنے آگرہ قلعہ سے متعلق کچھ باتیں بیان کروں گا جو یقیناً آپ کی دلچسپی کا باعث ہوں گی۔ آگرہ قلعے کے بارے میں کئی لوگوں نے تفصیل سے لکھا۔ میں نے ایک پی ایچ ڈی کا مقالہ بھی اس موضوع پر دیکھا ہے۔ مینا کاشی کرشنن نے آگرہ قلعے کے بارے میں ایک مضمون Images of Kingship: Statebuilding, Patronage, and Architecture in the capitals of the Mughal and Ottoman

Empiresکے نام سے لکھا ہے جس میں اس قلعے کے بارے میں کافی کچھ لکھا گیا ہے۔ میں نے بھی اس مضمون سے فائدا اٹھایا ہے[5]۔

تاریخ سے پتہ لگتا ہے کہ سولہویں صدی کے آغاز میں سکندر لودھی نے اپنا پایہ تخت دلی سے آگرہ منتقل کیا تھا۔ جب بابر نے پانی پت میں لودھی کو شکست دی تو اس نے دلی میں رہنے کی بجائے آگرہ میں رہنے کو ترجیح دیں۔اس وقت یہاں پر بہت زیادہ عمارتیں موجود نہیں تھیں۔ بابر نے اپنی ضرورت کے مطابق کچھ عمارات تعمیر کیں لیکن انھیں قلعے کی بنیاد نہیں کہا جا سکتا۔ موجودہ قلعے کی شکل و صورت اکبر کے دور میں بنی۔ بابر کے بعد ہمایوں کو جم کر حکومت کرنے کا موقع نہیں ملا۔ اس کی وفات کے بعد جب اکبر کو بادشاہت ملی تو اس نے آگرہ میں اس قلعے کی بنیاد رکھی۔ کہا جاتا ہے کہ اس قلعے کی تعمیر کے لیے چار ہزار لوگوں نے آٹھ سال تک کام کیا۔ اس قلعے کا رقبہ ایک سو ایکڑ کے قریب ہے۔لاہور کے شاہی قلعے کا رقبہ تقریباً پچاس ایکڑ ہے۔اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ یہ قلعہ کتنا بڑا ہے۔

ہم تینوں دوست قلعے کی طرف روانہ ہوئے۔ یہ قلعہ تاج محل سے تقریباً دو کلو میٹر کے فاصلے پر موجود ہے۔ میں نے اپنے دوستوں سے پوچھا کہ آپ اس قلعے میں کونسی چیز سب سے پہلے دیکھنا چاہیں گے۔ دونوں حضرات کا جواب تھا کہ ہم وہ کمرہ دیکھنا چاہیں گے جس میں شاہجہاں نے اپنی زندگی کے آخری سال گزارے۔ میری دلچسپی بھی

Images of Kingship: Statebuilding, Patronage, and Architecture in the capitals of the Mughal and Ottoman Empires
Meenakshi Krishnan
Wake Forest University
Follow this and additional works at:
https://idun.augsburg.edu/honors_review Part of the Islamic World and Near East History Commons[5]

اسی کمرے سے تھی۔ یہ کوئی اچھی بات تو نہ تھی لیکن اس قلعے میں اس کمرے سے بڑھ کر وہاں اور کوئی جگہ بھی نہیں ہے، جس کے ساتھ داستانِ غم جڑی ہوئی ہو۔

اس وقت آگرہ کے قلعے میں داخل ہونے کا ایک ہی بڑا گیٹ ہے جس کا نام امر سنگھ گیٹ ہے۔اس گیٹ کو شاہجہاں نے یہ نام دیا تھا۔ میرے خیال میں اکبر نے جو عمارتیں بنائیں ان میں سب سے بڑی عمارت یہ قلعہ ہے یا پھر فتح پور سیکری کا پایہ تخت ہے۔ علامہ ابوالفضل نے لکھا ہے کہ اس قلعے میں پانچ سو چھوٹی بڑی عمارتیں بنائی گئ تھیں، جن میں سے اس وقت صرف تیس موجود ہیں۔ قلعے کا کچھ حصہ ابھی بھی بھارتی فوج کے پاس ہے۔ وہاں پر عام لوگوں کا جانا ممنوع ہے۔

شاہجہاں نے اس میں سے بہت سی عمارتیں ختم کیں اور اس کے بعد بھارت پور کے جاٹوں نے بھی اسے شدید نقصان پہنچایا وہ تیرہ سال تک یہاں قابض رہے۔ بعدازاں انھوں نے بھی یہاں پر حکمرانی بھی کی۔ جب انگریزوں نے مراٹھوں کو شکست دے کر اس قلعے پر قبضہ کیا تو انھوں نے بھی یہاں پر موجود بہت ساری عمارات گرا کر اپنی فوج کے لیے بیرکس بنائیں۔ اس طرح ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ قلعہ اصل حالت میں اب ہمارے سامنے موجود نہیں ہے۔

یہاں پر ایک وضاحت بہت ضروری ہے۔ پاکستان میں لکھی گئ کتابوں میں مراٹھوں کے لیے مرہٹوں لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ جبکہ ہندی، گجراتی اور مقامی زبانوں کے علاوہ انگریزی میں بھی اسے مراٹھا لکھا جاتا ہے۔ میں نے اس کتاب میں مراٹھا کا لفظ ہی استعمال کیا ہے جو کہ اردو کے علاوہ ہر زبان میں لکھا جاتا ہے۔

اس سے پہلے کہ میں آپ کو قلعے کے بارے میں کچھ بتاؤں میں چاہوں گا کہ یہاں موجود چند مشہور مقامات سے متعلق کچھ تفصیلات آپ کے سامنے رکھوں جن میں سب سے اہم تین بڑے گیٹ ہیں۔ ہر گیٹ کی اپنی ہی شان ہیں۔ امر سنگھ گیٹ سب سے

بڑا دروازہ مانا جاتا ہے۔ اسی سے قلعے کے اندر داخل ہوا جاتا ہے۔ اس گیٹ تک جانے کے لیے دو دیواروں کے درمیان سے ایک راستہ ہے۔ فوجی نقطۂ نظر سے یہ ایک اہم مقام ہے۔

جب میں نے اس قلعے کو غور سے دیکھا تو مجھے محسوس ہوا کہ شاہی قلعہ لاہور اور لال قلعہ دہلی میں بنیادی طور پر ایک فرق ہے۔ لاہور اور دہلی کے قلعے فوجی نوعیت کے کم اور رہائشی نوعیت کے زیادہ محسوس ہوتے ہیں جب کہ آگرہ کا قلعہ دریا کے کنارے پر ایک سیمی سرکل شکل میں بنایا گیا ہے۔ ایک طرف سے اسے دریا کی وجہ سے محفوظ بنا یا گیا اور باقی اطراف اونچی دیوار بنائی گئیں اور راستہ بھی کافی ڈھلوانی بنایا گیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بادشاہوں کی رہائش بھی اسی قلعے میں تھی لیکن یہ قلعہ فوجی نقطۂ نظر سے زیادہ اہمیت کا حامل تھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اٹک کا قلعہ، شاہی قلعہ لاہور، لال قلعہ اور آگرہ کا یہ قلعہ چاروں ہی دریا کے کنارے پر بنائے گئے ہیں۔

اس وقت اس قلعے میں موجود چند مشہور مقامات کے نام یہ ہیں۔ جہانگیر کا نہانے کا ٹب، جہانگیر پیلس، انگوری باغ، خاص محل، دیوان عام، شاہ برج، روشن آراء پالکی، سردیوں کا محل، گرمیوں کا محل، نگینہ مسجد اور مچھلی پیلس۔ ان سب مقامات کی تفصیل بیان کرنا ممکن نہیں ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ تقریباً اسی طرح کی چیزیں ہمیں لال قلعہ دہلی اور شاہی قلعہ لاہور میں بھی ملتی ہیں۔ خوبصورتی، بناوٹ اور وسعت میں فرق ضرور موجود ہے لیکن دیکھنے میں بہت زیادہ فرق محسوس نہیں ہوتا۔

یہاں ایک بہت بڑا پیالہ ملا جو کہیں اندر پڑا ہوا تھا اور اب اٹھا کر باہر ایک لان میں رکھ دیا گیا ہے۔ یہ پیالہ پانچ فٹ اونچا ہے جس کا قطر آٹھ فٹ ہے۔ اسے جہانگیر کا باتھ ٹب کہتے ہیں۔ گائیڈ نے بتایا کہ جہانگیر کے بچپن میں اس کے نہانے کے لیے ٹب بنایا

گیا تھا۔ مختلف عمارتوں کو دیکھتے ہوئے ہم آگے کی طرف چل پڑے۔ ہماری منزل وہ کمرہ تھا جہاں پر شاہجہاں نے اپنے آخری دن گزارے۔

قلعے کے شمال مشرقی حصہ کے پاس ایک محل ہے جسے شاہجہاں کی برجی یا شاہ جہاں کا محل بھی کہا جاتا ہے۔ اگر آپ اس محل کی انتہائی خوبصورت بالکونی پر کھڑے ہوں تو آپ کو تاج محل کا مکمل نظارہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ اس بالکونی سے ملحقہ کمروں میں ہی شاہجہاں نے اپنی زندگی کے آخری سال بسر کیے۔

قسمت کی ستم ظریفی دیکھیے کہ جس عورت کی یاد میں تاج محل بنایا گیا اسی عورت کے بڑے بیٹے داراشکوہ نے شاہجہاں کو بیماری کے دنوں میں یہ کہہ کر خود بادشاہ بن گیا کہ اب آپ حکومت کرنے کے قابل نہیں ہیں۔ یہ شاہجہاں کی پہلی قید تھی جب اسے ایک کمرے تک محدود کر دیا۔ اس دوران اورنگزیب عالمگیر کو پتہ چلا تو اس نے آگرہ پر حملہ کر دیا اور داراشکوہ کو شکست دے کر خود حکمران بن گیا۔ اس وقت تک شاہجہاں بیماری سے نجات پا چکا تھا لیکن اورنگزیب عالمگیر نے اس کی قید کو برقرار ہی رکھا۔

اگر آپ کو یاد ہو تو میں نے دلی کے بارے میں لکھتے ہوئے بتایا تھا کہ چاندنی چوک کا ڈیزائن بنانے والی خاتون شاہجہاں کی بیٹی تھی جس کا نام جہاں آراء تھا۔ اسی بیٹی نے اپنی زندگی اپنے والد کے نام کر دی اور زندگی کے آخری آٹھ سال اپنے والد کے ساتھ رہیں۔ اس کے علاوہ کسی کو بھی شاہ جہاں سے ملاقات کی اجازت نہیں تھی۔

بیٹوں کی خواہش کرنے والے یہ بھول جاتے ہیں کہ ضرورت کے وقت بیٹیاں ہی ماں باپ کی زیادہ خدمت کرتی ہیں۔ کہتے ہیں کہ جب شاہجہاں کی سانسیں اکھڑنے لگیں تو اس نے کہا کہ اسے اٹھایا جائے اور اس کا چہرہ تاج محل کی طرف کیا جائے اور ایسا ہی کیا گیا اس کی آنکھ نے جو آخری نظارہ دیکھا وہ تاج محل کا تھا۔ ایک بوڑھے آدمی سے اورنگزیب عالمگیر کو کیا خطرہ ہو سکتا تھا؟

یہ تو وہ خود ہی جانتا ہو گا!

جب کبھی بھی تاریخ لکھی جائے گی یہ ضرور لکھا جائے گا کہ والد کی بیماری کو بہانہ بنا کر پہلے دارا شکوہ نے اپنے باپ کو قیدی بنایا اور پھر اورنگزیب عالمگیر نے بھی ایسا ہی کیا۔ شاہجہاں کی وفات کے بعد بھی اورنگزیب اتنا ڈرتا تھا کہ اس نے جنازے پر بھی عام لوگوں کو شریک نہیں ہونے دیا۔

اسے آپ دنیا کی بے ثباتی، بے وفائی اور تاریخ کا ایک سبق بھی کہہ سکتے ہیں۔

میں بہت دیر تک اپنے آپ کو اس منظر سے باہر نہ لا سکا۔ میں دوسری بالکونی میں چلا گیا، جہاں سے مجھے تاج محل اور شاہ جہاں، دونوں کی بالکنی نظر آ رہے تھے۔ وہ ایک عجیب و غریب منظر تھا۔ ایک طرف دیکھتا تو تاج محل اور دوسری طرف دیکھتا تو تصور میں شاہ جہاں نظر آتا۔

یہ حقیقت ہے تاج محل دنیا کا ایک عجوبہ ہے اور اس کے بنانے والے نے ہمیشہ کے لیے آنکھیں بند کرنے سے پہلے اس دنیا کی آخری چیز جو دیکھی وہ یہی تاج محل تھا۔۔۔ یہ اعزاز اس کے علاوہ کسی اور کو حاصل نہیں ہوا۔۔۔

تاج محل اور آگرہ کا قلعہ دیکھ کر میرے ذہن میں ایک سوال نے جنم لیا۔۔۔ سوال یہ ہے کہ یہ تاج محل سے محبت تھی جس کی وجہ سے یہ بنا؟ یا تاج محل بنانے کے لیے شاہ جہاں کو ایک محبوبہ کی ضرورت تھی؟

آپ کا کیا خیال ہے۔۔۔ آپ کچھ بھی کہہ سکتے ہیں!
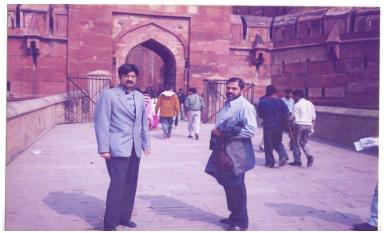
Agra Fort Main Gate
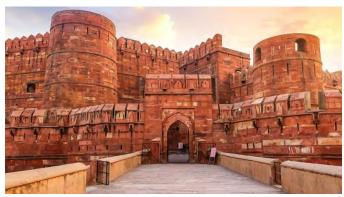
Agra Fort Main Gate Photo Credit:
https://www.wendywutours.com.au
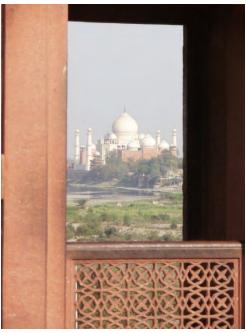
The window of Shah Jahan room from where he used to see the Taj Mahal when he was inprisoned by Aurang Zeb

Photo Credit: https://in.pinterest.com

Prison Cell for Shah Jahan Photo Credit:
http://www.etajmahaltour.com

Taj Mahal, Jamia Masjad and Agra fort Photo Credit:
http://www.etajmahaltour.com

ماتھورا: ہندوؤں کا ساتواں مقدس ترین شہر

ہم تینوں دوست آگرہ کے قلعے سے باہر نکلنے کے بعد کافی دیر خاموش رہے، جس کی وجہ صرف شاہجہاں کا واقعہ تھا۔ بالآخر میں نے خاموشی توڑی اور کہا کہ وہ جو تخت کی خواہش مند نہیں تھی، اسی نے محبت اور خدمت میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی اور آج دنیا اسے خدمت کی نشانی کے طور پر یاد کر رہی ہے۔ سب نے اس بات سے اتفاق کیا۔ شام ہو چکی تھی اور بس بھی تیار تھی۔ ہم سب لوگ بس میں بیٹھ گئے۔ میری سیٹ ڈرائیور کے پاس تھی۔ جس میں میری خواہش کا بھی عمل دخل تھا۔ اکثر ڈرائیور نا صرف بہت باتونی ہوتے ہیں بلکہ ان کے پاس بے شمار معلومات بھی ہوتی ہیں۔ ہمارے ڈرائیور کا نام دھیان چند تھا لیکن اس کے بقول لوگ اسے پہلوان کہتے تھے۔ بس چلنے میں تھوڑا وقت تھا تو اس لیے میں نے پہلوان صاحب سے باتیں کرنا شروع کر دیں۔

ہمارے گائیڈ نے ہمیں بتایا کہ اب ہماری اگلی منزل ماتھورا ہے۔ ماتھورا ہندوؤں کے نزدیک ایک بہت مقدس جگہ ہے۔ بس میں پانچ لوگوں کے علاوہ باقی سب ہندو تھے۔ ٹور آپریٹر نے یہ بندوبست کیا تھا کہ وہ تاج محل کے ساتھ ساتھ ان لوگوں کو ماتھورا کے مندر بھی دکھائے گا۔ میں نے گائیڈ سے کہا کہ ہمارے پاس ماتھورا جانے کا ویزا نہیں ہے تو گائیڈ نے جواب دیا کہ یہ شہر واپسی پر راستے میں ہی آئے گا لہٰذا کوئی دقت نہیں ہوگی۔ آج سے بیس سال پہلے حالات بھی اتنے زیادہ کشیدہ نہیں تھے۔ اس لیے ایسے معاملات میں مقامی پولیس بھی زیادہ سختی نہیں کرتی تھی۔ موجودہ حالات میں ایسا نہیں کرنا چاہیے، بلکہ صرف اسی شہر میں جانا چاہیے جہاں کا ویزا آپ کے پاس ہو۔

ماتھورا (Mathura) جسے اردو میں ماتھورا لکھا جاتا ہے اس کا صحیح نام ماتھورا ہے۔ بول چال میں بھی اسے ماتھورا یا ماتھوراو ہی استعمال ہوتا ہے۔ ہندی اور انگریزی میں بھی اسے ماتھورا ہی لکھا جاتا ہے۔ اس لیے میں بھی اسے ماتھورا ہی لکھوں گا۔

ماتھورا، آگرہ سے 50 کلومیٹر شمال میں جبکہ دلی سے 150 کلومیٹر جنوب میں واقع ہے۔ جب ہم وہاں پہنچے تو شام ہو چکی تھی۔ بس سے اترنے اور ایک چڑھائی چڑھنے کے بعد ہم ماتھورا کے مندروں تک پہنچے۔ اس سے پہلے کہ میں ماتھورا میں گزرے ہوئے اپنے وقت سے متعلق کوئی بات کروں میں چاہوں گا کہ ماتھورا کی تاریخ کے بارے میں کچھ معلومات آپ کی خدمت میں پیش کی جائیں۔ یاد رہے کہ ماتھورا ان سات بڑے شہروں میں سے ایک ہے جو ہندو مذہب کے نزدیک سب سے مقدس مانے جاتے ہیں۔ اس بات سے آپ اس شہر کی اہمیت کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ میں نے اس تحریر کے لیے دیو پرساد کی کتاب Krishna: A Journey through the Lands & Legends of Krishna جسے جیکب اپریشن نے شائع کیا ہے سے مدد لی ہے[6]۔

ماتھورا کی سب سے اہم بات یہاں پر ہندوؤں کے آٹھویں اوتار لارڈ کرشنا کی جائے پیدائش ہے۔ لارڈ کرشنا کی پیدائش ماتھورا شہر میں موجود ایک جیل میں ہوئی تھی۔ لارڈ کرشنا کے والدین کو ان کے کسی حکمران رشتے دار نے قید کر رکھا تھا۔ یہ چھٹی صدی قبل مسیح کی بات ہے۔

جب ہم ایک بڑے مندر کے درمیان میں پہنچے تو وہاں پر پتھر کی ایک سلیٹ پڑی ہوئی تھی۔ اس سلیٹ کے بارے میں گائیڈ نے بتایا کہ اس پر لارڈ کرشنا کی پیدائش ہوئی تھی۔ اسی لیے یہ سلیٹ ہندوؤں کے نزدیک بے حد مقدس ہے۔ لارڈ کرشنا ہندوؤں کے نزدیک محبت پیار اور برداشت کی ایک نشانی ہیں۔ اس لیے ان کی بہت زیادہ پوجا کی جاتی ہے۔ عام طور پر ان کی تصویر ایک بچے یا ایک خوبصورت نوجوان آدمی کی ہوتی ہے جو بانسری بجا رہا ہوتا ہے۔

---

[6]https://books.google.com.pk/books?id=o0_5caqiUH0C&pg=PT22&redir_esc=y#v=onepage&q&f=false

لارڈ کرشنا کی پیدائش کی وجہ سے یہاں پر موجود مندر کو لارڈ کرشنا جنمستان کمپلیکس کہا جاتا ہے۔لارڈ کرشنا کے نام پر دیگر شہروں میں بھی مندر بنائے گئے ہیں لیکن سب سے بڑا مندر اسی علاقے میں بنایا گیا ہے جہاں پر ان کی پیدائش ہوئی تھی۔ ہندوؤں کی مقدس کتابیں مہا بھارت اور رامائن میں بھی ان کا خصوصی ذکر ملتا ہے۔ اگر آپ نقشے میں ماتھورا کو دیکھیں تو معلوم ہو گا کہ یہ شہر دریائے جمنا کے مغربی کنارے پر واقع ہے۔ مزید غور کرنے پر محسوس ہوتا ہے کہ یہ ایک ایسی جگہ پر واقع ہے، جہاں سے بہت زیادہ سڑکیں گزرتی تھیں۔ دلی سے لکھنؤ اور دیگر علاقوں کی طرف جانے کے لیے بھی لوگ یہی راستہ اختیار کرتے تھے۔ شمال کے پہاڑوں سے آنے والے بھی یہاں سے گزر کر ہی آگے جاتے تھے۔اس کی جغرافیائی اہمیت کے پیش نظر یہ علاقہ کئی پرانی ریاستوں کا بھی تخت رہا ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ جس جگہ پر اکثر پرانے شہر واقع ہیں اور جہاں تجارت کے لیے بھی لوگوں کا آنا جانا ہوتا ہے۔ ایسے ہی شہروں میں مختلف مذاہب نے اپنی عبادت گاہیں بھی بنائیں۔ یہ میری ایک رائے ہے جس سے اتفاق یا اختلاف بھی کیا جا سکتا ہے۔

یہ بات بھی شاید آپ کے لیے بہت عجیب ہو۔ کہ ہندوستان پر حملہ کرنے والے پہلے لوگ مسلمان نہیں تھے۔ تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ جس نے سب پہلے ہندوستان پر پہلا حملہ کیا وہ وسطی ایشیاء سے آنے والے آرین تھے۔ بعد ازاں سکندرِ اعظم نے تیسری صدی قبل مسیح میں اس ملک پر حملہ کیا اور موجودہ پنجاب تک محدود رہا اور یہیں سے براستہ سندھ ، بلوچستان اور ایران چلا گیا، ایران میں ہی اس کی وفات ہوئی۔اس کے بعد ماتھورا پر مختلف ہندو حکمرانوں نے حکومت کی لیکن ایک وقت آیا جب یہاں پر ایران سے آنے والے لوگوں نے حملہ کیا۔ وہ لوگ مسلمان نہیں تھے۔ یہ اسلام سے پہلے کی بات ہے۔آپ نے چیستان کا نام تو سنا ہو گا۔ یہ چرواہوں کا ایک گروہ تھا جو وسط ایشیاء سے اٹھا اور اس نے یورپ اور ایشیاء کے ایک بڑے علاقے پر قبضہ کیا۔ انھوں نے پہلی

صدی عیسوی میں ماتھورا پر بھی سو سال سے زائد حکومت کی۔ اس واقعے کے تقریباً نو سو سال بعد غزنوی نے ہندوستان پر حملے کیے۔ اس طرح سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان قدیم دور سے ہی بیرونی حملہ آوروں کا پسندیدہ ملک رہا ہے۔ اس کی خوبصورتی، یہاں کی آب و ہوا، وافر مقدار میں غلہ، دریا، ندی نالے خوبصورت منظر دور دور سے لوگوں کو کھینچ کر لے آتے تھے۔

وہ جو کہتے ہیں کہ اس کا حسن ہی اس کا قاتل ٹھہرا۔۔۔ یہی ہندوستان کے ساتھ بھی ہوا اور ہوتا چلا آ رہا ہے۔۔۔ کب تک ۔۔۔ جب تک اہلِ پاک و ہند اپنی حفاظت کے قابل نہیں ہو جاتے۔۔۔ جس کا امکان اسی وقت پیدا ہو سکتا ہے جب اس خطہ کے لوگ اپنے مسائل اور اختلافات کو باہمی گفتگو سے حل نہیں کر لیتے۔۔۔

ایسا کب ہو گا، معلوم نہیں لیکن امید ضرور ہے۔ موجودہ نسل سے نہیں، آنے والی نسل سے قوی امید ہے۔

اس طرح یہ کہنا درست ہو گا کہ جو تاریخ ہم جانتے ہیں اس کے مطابق مغرب سے وقتاً فوقتاً ہندوستان پر حملہ آور آتے رہے ہیں۔ ان علاقوں میں سے ایک یہ ماتھورا بھی ہے جہاں پر ایرانیوں اور محمود غزنوی نے سب سے زیادہ حملے کیے۔ ان میں سے ایک مشہور حملہ سومنات کے مندر پر ہوا، جو اس علاقے سے دور گجرات میں سمندر کے قریب واقع ہے۔ گائیڈ نے ہمیں بتایا کہ یہاں بہت سارے مندر ایسے ہیں جنھیں محمود غزنوی نے تباہ کیا اور رہی سہی کسر سکندر لودھی نے پوری کر دی لیکن اس بات کا کوئی تاریخی ثبوت گائیڈ کے پاس نہیں تھا۔

ماتھورا شہر ایک وادی میں واقع ہے اور مندر ایک پہاڑی کے اوپر ہے۔ اس علاقے میں مسلمان کبھی بھی اکثریت میں نہیں رہے۔ اورنگزیب نے اس مندر کی دیوار کے بالکل ساتھ ہی ایک شاہی عید گاہ بنائی جو اب بھی موجود ہے۔ ہندو یہ کہتے ہیں کہ یہ

بھی ایک مندر کی جگہ پر بنائی گئی لیکن عام طور پر اس بات کو سچ نہیں مانا جاتا البتہ یہ ضرور کہا جاتا ہے کہ اس مندر کی اہمیت کو کم کرنے کے لیے اس دیوار سے دیوار ملا کر شاہی عید گاہ بنائی گئی۔

اورنگ زیب نے اس شہر کا نام بھی بدل کر اسلام آباد رکھ دیا تھا۔ میرے لیے بھی بڑی حیرانی کی بات تھی کہ ہمارے اسلام آباد شہر سے پہلے بھی اسلام آباد نام کا ایک شہر موجود تھا۔ میرے علم کے مطابق موجودہ اسلام آباد شہر سے پہلے ہمارے شہر ٹوبہ ٹیک سنگھ میں ایک محلّہ آباد ہوا تھا جس کا نام اسلام پورہ تھا۔ اس طرح ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے اسلام آباد سے پانچ سو سال پہلے بھی ایک شہر موجود تھا جس کا نام اسلام آباد تھا۔اس شہر کے ایک گورنر عبدالنبی نے یہاں جامع مسجد بھی بنوائی تھی۔اس شہر کی تاریخ بہت پرانی اور دلچسپ ہے۔ یہ شہر تین ہزار سال پرانا ہے جس پر ہندوؤں، جین، بدھ مت ، چیستان سے آئے چرواہوں اور مسلمانوں نے حکومت کی۔

میں نے پہلے بھی کہیں لکھا ہے کہ بعض اوقات کسی چیز کی خوبصورتی ہی اس کی تباہی کا سبب بن جاتی ہے۔ایسا ہی ماتھورا کے ساتھ بھی ہوا۔

ہم مندر کے اندر چلے گئے اور میں حسبِ معمول اپنے دوستوں سے الگ ہو کر مختلف چیزیں دیکھتا رہا۔ ایک چیز جو میں نے بڑی شدت سے محسوس کی یہاں پر آنے والوں کی اپنے مذہب سے عقیدت تھی۔ میں نے دیکھا کہ جو لوگ بھی یہاں آتے وہ اپنے بتوں کی پوجا اور مختلف گانے گاتے وقت اتنا مگن ہو جاتے کہ انھیں کوئی اور ہوش نہ رہتا۔ یوں لگتا تھا کہ اس کام سے انھیں بہت زیادہ لطف آتا ہے۔ میں ایک چھوٹی سی دکان پر کھڑا دیکھ رہا تھا کہ ایک آدمی نے ایک ٹرے میں بہت سارے بت بنا کر رکھے ہوئے تھے۔ مجھے بہت عجیب لگا جب میں نے دیکھا کہ اس نے انسانی اعضائے رئیسہ کے بت بھی

بنا کر رکھے تھے۔ میں نے کئی مندروں میں دیکھا ہے کہ ہندوؤں کی بنائی ہوئی تصاویروں میں ایسا ہی نظر آتا ہے۔

ہم کچھ وقت گزارنے کے بعد واپس آئے تو دیکھا کہ ایک جگہ پر بہت ساری بوڑھی عورتیں بیٹھی کچھ گا رہی تھیں اور یہ آنے جانے والے سے بھیک مانگ رہی تھیں۔ گائیڈ نے بتایا کہ یہ وہ عورتیں ہیں جن کا کوئی والی وارث نہیں ہے اور یہ اپنی بقیہ زندگی اسی مندر میں آکر گزارتی ہیں۔ یہ ان کا اولڈ ہوم تھا۔ گائیڈ نے مجھے ایک اور علاقہ بھی دکھایا جسے گئوشالہ کہتے ہیں۔ جب گائے بوڑھی ہو جاتی ہے اور دودھ دینے کے قابل نہیں رہتی تو اسے ذبح کرنے کی بجائے باقی زندگی گزارنے کے لیے یہاں پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ یہاں پر وہ اپنی طبعی موت مر جاتی ہے۔ وہاں سے باہر نکل کر وادی میں ہمیں ایک بہت بڑا شہر نظر آیا جس کی آبادی تقریباً پانچ لاکھ سے زائد تھی۔ اس مندر میں ہر سال ایک میلہ لگتا ہے جس میں چالیس لاکھ کے قریب لوگ شریک ہوتے ہیں۔ جس سے آپ اس مندر کی اہمیت کا اندازہ کر سکتے ہیں۔

یہ میرا مشورہ ہے کہ اگر آپ کسی بھی مذہب کے ماننے والوں کو جاننا چاہیں تو آپ کو ان کی عبادت گاہوں میں ضرور جانا چاہیے۔

ورنداوان جسے بندراوبان بھی کہتے ہیں

ہمارے گائیڈ نے ہمیں بتایا کے اب ہم تقریباً دس کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ایک اہم شہر ورنداوان جائیں گے۔ ہمارے علاوہ سب لوگ بے حد خوش ہوئے۔ ان کے نزدیک تو تاج محل بھی ایک اہم جگہ تھی لیکن ہندو ہونے کے ناطے یہ دو مقامات ان کے لیے بے حد مقدس تھے۔ اس لیے ان کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ ان جگھوں پر جائیں۔ آج ان کی وہ خواہش پوری ہو رہی تھی۔ میرے ساتھ ایک صاحب تشریف فرما تھے جو اپنی اہلیہ کے ساتھ پہلی مرتبہ ان جگھوں کو دیکھنے کے لیے آئے تھے۔ ان کی خوشی دیدنی تھی۔

میں نے ان سے ورنداوان کے بارے میں جاننے کی کوشش کی۔ انھوں نے بتایا کہ ہندوؤں میں ایک طبقہ ایسا ہے جنھیں لارڈ ویشنو کے ماننے والے کہا جاتا ہے۔ ان کے نزدیک یہ مقام سب سے اہم ہے۔ ان کی باتوں سے مجھے اندازہ ہوا کہ ہندومت میں بھی بے شمار فرقے یا طبقے پائے جاتے ہیں جو ایک دوسرے سے مختلف ہیں لیکن ان کی بہت سی باتیں ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہیں۔ جب ہماری بس اس شہر میں پہنچی تو میں نے دیکھا کہ یہ شہر دریا کے دونوں طرف آباد ہے۔ وہاں پر بہت ہی خوبصورت ہوٹل موجود تھے اور کوئی گلی یا محلّہ ایسا نہیں تھا جہاں پر کوئی مندر نہ ہو۔اس سے پہلے کہ میں اس مندر کے بارے میں آپ سے بات کروں۔ میں شہر کی مختصر تاریخ آپ کے سامنے رکھنا چاہوں گا۔

مجھے بے حد حیرانی ہوئی جب میں نے پڑھا کہ لارڈ کرشنا کی پیدائش یکم جولائی کو ماتھورا شہر میں ہوئی۔ کیسے ممکن ہے؟کہ آج سے پانچ ہزار پہلے کوئی اتنے یقین سے کہے کہ کس تاریخ کو فلاں شخص کی پیدائش ہوئی؟ جب میں نے جاننا چاہا تو پتہ چلا کہ ایک صاحب جن کا نام بنسال ہے نے دو سوفٹ ویئر بنائے ہیں، ایک کا نام لیو گولڈ اور دوسرے کا نام پالم ہے۔ انھوں نے اپنے ان سوفٹ ویئر کی مدد سے یہ تاریخ معلوم کی۔ تاریخ پیدائش تو کسی نا کسی انداز سے موجود تھی لیکن موجودہ حساب سے وہ کون سا دن تھا یہ اس سوفٹ ویئر کی مدد سے معلوم کیا گیا۔ یہ بات کہاں تک درست ہے، کچھ کہا نہیں جاسکتا لیکن ہندو لٹریچر کے مطابق لارڈ کرشنا کا جنم دن وہی ہے جو میں نے مندرجہ بالا سطور میں تحریر کیا۔

ہندو مذہب جاننے کے لیے آپ کو ان کی کسی کتاب کا مطالعہ کرنا پڑے گا۔ میں نے جب کچھ جاننا چاہا تو مجھے بہت سے الفاظ اور اصطلاحات سے واسطہ پڑا جیسے، کرشنا ویشنو، اوتار، رامائن، نارائن، مہابھارت اور رام وغیرہ۔ یہ تمام الفاظ ہندو مذہب کے

بڑے اہم الفاظ ہیں جن کے خاص معنی بھی ہیں۔ مجھے ان کے بارے میں زیادہ علم نہیں ہے لہٰذا میں تفصیلات میں جانے سے اجتناب کروں گا۔

میں صرف اتنی سی بات کہنا چاہوں گا کہ ہندومت اس وقت دنیا کے قدیم ترین مذاہب میں سے ایک ہے۔ یہ تقریباً سات ہزار سال پرانا مذہب ہے اور اس کی مذہبی کتاب گیتا بھی اتنی ہی پرانی ہے۔ درجہ بندی کے لحاظ سے یہ عیسائیت اور اسلام کے بعد تیسرے نمبر پر آتا ہے۔ دنیا میں اس وقت ہندو مذہب کو ماننے والوں کی تعداد ایک ارب سے زائد ہے۔ان کی اکثریت بھارت، نیپال اور افریقہ کے کچھ ممالک میں رہتی ہے۔ سندھ، پاکستان میں بھی ہندو بڑی تعداد میں رہائش پذیر ہیں۔

میں مذہب کے بارے میں بات کرنے پر بہت محتاط رہتا ہوں۔ میری لاعلمی کسی کی دل آزاری کا سبب بنے، یہ میرے لیے بہت ہی تکلیف دہ بات ہوتی ہے البتہ میں ورنداوان شہر کے بارے میں آپ سے چند باتیں ضرور کرنا چاہوں گا۔

جب ہم ورنداوان شہر میں داخل ہوئے تو میں نے اپنے گائیڈ سے پوچھا کہ اس شہر کی کیا اہمیت ہے؟ اس نے بتایا کہ اس شہر کو ہم مندروں کا شہر کہتے ہیں۔ اس کی تاریخ پانچ ہزار سال سے بھی زیادہ پرانی ہیں لیکن طویل عرصے تک اس شہر کی بہت ساری چیزیں چھپی رہیں۔ تقریباً تین سو سال پہلے دوبارہ سے ان چیزوں کو تلاش کیا گیا اور اس شہر کی چیزوں کو اصل حالت میں لانے کے لیے ہندو اور مسلمان راجاؤں میں ایک معاہدہ ہوا جس سے شہر کی مذہبی حیثیت کو بحال کرنے میں بے حد مدد ملی۔

یہ وہ واحد شہر ہے جہاں ہر طبقے کا ہندو آتا ہے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ یہاں کا سب سے بڑا مندر کون سا ہے؟ اس نے بتایا کہ تقریباً ڈھائی سو سال پہلے رنگاناتھا نام کے ایک صاحب نے لارڈ ویشنو اور لکشمی کے نام پر ایک مندر بنوایا جو سب سے بڑا تھا۔ ہمیں بھی اس مندر میں لے جایا گیا۔

میں نے کہیں پڑھا تھا کہ سولہویں صدی میں ایک شخص والا بچاریا تھا جسے والابھا بھی کہتے ہیں، ہندومت کا ایک بہت بڑا فلاسفر تھا۔ اس نے ننگے پاؤں بہت طویل سفر کیے اور 84 مختلف مقامات پر ہندومذہب پر لیکچرز بھی دیے۔ میں نے اس کے بارے میں اپنے گائیڈ سے پوچھا تو اس نے مجھے بتایا کہ وہ تمام مقامات جہاں پر اس نے لیکچرز دیے ،وہ مقدس مقامات کا درجہ رکھتے ہیں۔ ان میں سب سے اہم جگہ ورنداوان ہے۔ اس نے مجھے بتایا کہ یہاں بے شمار سالانہ میلے لگتے ہیں جہاں لوگ پوری دنیا سے آتے ہیں۔

والا بچاریا کے ماننے والوں کی ایک بڑی تعداد ہے۔ ان کی تعلیمات کے بارے میں ایک کتاب جیتھالال نے Shri Vallabhacharya: his philosophy and religion کے نام سے لکھی ہے۔ جس میں اس شہر کے بارے میں کئی مفید معلومات درج ہیں۔

میں اپنے دوستوں سے اجازت لے کر بازار میں گھومنے نکل گیا۔ بازاروں میں موجود دکانوں سے مجھے اندازہ ہوا کہ تمام تر دکانیں صرف ہندوؤں کی ہیں۔ کوئی دوکان ایسی نہ تھی جہاں کرشنا کی مورتیاں نہ تھیں۔ ہر فرد اپنے پاس ہندومذہب کی کوئی نا کوئی نشانی ضرور لیے ہوئے تھا۔ میں نے گائیڈ سے دریافت کیا کہ اس شہر میں ہندوؤں کے علاوہ کوئی اور لوگ نہیں ہیں کیا؟ اس نے بتایا کہ یہ بات سچ ہے کہ اس شہر میں نوے فیصد سے زائد ہندو جبکہ باقی شیڈولڈ کاسٹ یعنی شودر وغیرہ رہتے ہیں۔ ہندو انھیں اپنے آپ میں شامل نہیں سمجھتے۔

میں نے سندھ میں بھی یہ دیکھا ہے کہ جب بھی کسی سے پوچھیں کہ شہر میں کتنے ہندو ہیں؟ تو جواب کچھ اس طرح سے ہوتا تھا کہ دس ہزار ہندو ہیں اور دو ہزار شیڈولڈ کاسٹ ہیں۔ اس طرح یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ ہندوؤں کا ایک شہر ہے۔ یہاں ہندوؤں کے علاوہ شاید ہی کوئی اور رہتا ہو۔

مجھے ایک اور دلچسپ بات کا پتہ چلا کہ اس شہر میں مختلف فلاحی تنظیموں نے بہت سے ایسے گھر بنائے ہیں جہاں پر ان بیوہ خواتین کو رکھا جاتا ہے جن کا کوئی آسرا نہیں ہوتا۔ اس شہر میں بیس ہزار کے قریب ایسی بیوہ خواتین رہتی ہیں جو بھارت کے مختلف علاقوں سے آکر یہاں پناہ لیتی ہیں۔ان کا کام بھجن گانا ہی ہوتا ہے۔ ہمیں بھی ایک گروپ کے پاس سے گزرنے کا موقع ملا۔ میں نے دیکھا کہ وہ خاصی بوڑھی خواتین تھیں جن کے ہاتھ میں چھوٹا سا برتن تھا جسے وہ بجا کر مختلف بھجن گا رہی تھیں اور لوگ اپنی استطاعت کے مطابق ان کی خدمت کر رہے تھے۔ یہ معذور غریب اور بیوہ عورتوں کی سرپرستی کا ایک بے حد قابلِ تعریف منصوبہ ہے۔ پرانے وقتوں میں تو بیوہ کو اپنے مرحوم خاوند کے ساتھ ہی جلا دیا جاتا تھا، جسے ستی کی رسم کہتے تھے۔اب اس پر تو سخت پابندی ہے لیکن ان عورتوں کی حفاظت اور دیکھ بھال کا بہترین بندوبست کیا گیا ہے جو قابلِ ستائش ہے۔اسی وجہ سے ورنداوان کو بیواؤں کا شہر بھی کہتے ہیں۔ بی بی سی اس موضوع پر ایک رپورٹ بھی نشر کی ہے۔ جس کا عنوان ہے[7]۔ The Indian town with 6,000 widows اس کام کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔

ہر شہر کی کوئی نہ کوئی خاص بات ہوتی ہے اور اس شہر کی خصوصیت دریا کے دونوں طرف آبادی اور بڑے بڑے بہت خوبصورت مندر تھے جو فنِ تعمیر کے نادر نمونے ہیں۔ وہاں پوجا پاٹ کی بہت ساری چیزیں بھی موجود تھیں۔اس سب نے اس شہر کو دوسرے شہروں سے بے حد مختلف بنایا ہے۔ میں نے اپنے گائیڈ سے پوچھا کہ کیا سب لوگ یہاں مذہبی نقطۂ نظر سے ہی آتے ہیں؟ اس نے کہا کہ ایسا نہیں ہے بلکہ یہ شہر تفریح کے لیے بھی بہت کشش رکھتا ہے۔ یہاں بے شمار بہترین ہوٹل اور تفریح کی جگہیں ہیں، یہاں لوگ اپنی چھٹیاں گزارنے بھی آتے ہیں۔

---

[7] https://www.bbc.com/news/magazine-21859622

اب رات کافی ہو چکی تھی اور تھکاوٹ کے آثار بھی نمایاں ہو رہے تھے۔۔۔ اب واپسی تو بنتی تھی۔ ہمارے سامنے بیٹھا عربی، بھارتی جوڑا بھی خراٹے لے رہا تھا۔ وہ بس میں ہی بیٹھے رہے تھے اس لیے اب وہ سو رہے تھے۔ ہم نے اس جوڑے کا نام " مس میچ " رکھا ہوا تھا۔ اگلے صفحات میں میں آپ کو بذریعہ ریل دہلی سے مدراس، جسے اب چنائی کہتے ہیں کے سفر کے بارے میں بتاؤں گا۔ یہ فاصلہ بائیس سو کلومیٹر طویل ہے.

A Mandar at Mathora Photo Credit:
https://www.holidaysat.us
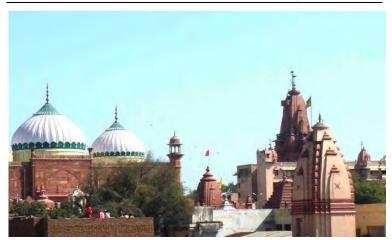
Shahi Eid Gah mosque made adjacent to Lord Krishna temple in Mathura Photo Credit: https://freepresskashmir.news

شمالی ہندوستان سے جنوبی ہندوستان تک
ایک ان دیکھی اور ان سنی آبادیوں کا سفر

دہلی سے چنائی: ایک طویل سفر

اگر آپ بھارت کے نقشے کو بغور دیکھیں تو آپ کو معلوم ہو گا کہ دہلی بھارت کے شمال میں واقع ہے جبکہ چنائی، جس کا پرانا نام مدراس تھا، بالکل جنوب مشرق میں نظر آتا ہے۔ چنائی شہر میں ایک ٹیکسٹائل کانفرنس منعقد ہو رہی تھی جس میں ہمیں شریک ہونا تھا۔ ہم نے دہلی سے چنائی تک کا سفر بذریعہ ریل طے کرنے کا فیصلہ کیا۔ دراصل ہم بھارت کے زیادہ سے زیادہ شہروں کو دیکھنا چاہتے تھے۔ اس مقصد کے لیے ریل سب سے زیادہ موزوں ذریعہ سفر تھا۔ میرے بہت ہی عزیز دوست رنبیر سنگھ مانگٹ امریکہ سے واپس آ گئے تھے اس لیے ہماری ان سے ملاقات بھی ہو گئی۔ مشورے کے بعد ہم نے تامل ناڈو ایکسپریس کی ایئر کنڈیشن کلاس میں اپنی سیٹیں بک کروالیں۔ دہلی سے چنائی تک کا فاصلہ بائیس سو کلومیٹر یعنی لاہور سے کراچی تک کا دوگنا سفر اس کے لیے تینتیس گھنٹے کا وقت درکار ہوتا ہے۔ ہماری ٹرین رات دس بجے کے بعد روانہ ہوئی اور ہم تینتیس گھنٹے بعد صبح کے وقت چنائی پہنچے۔

یہ ایک بہت ہی دلچسپ سفر تھا۔ جس میں ہمیں بہت کچھ دیکھنے اور سیکھنے کو ملا۔ اس سفر میں ہمیں بے شمار ایسے شہر دیکھنے کو ملے جن کا تاریخ میں بارہا ذکر سنتے آرہے ہیں۔ میری کوشش رہے گی کہ ان شہروں کا تاریخی پس منظر بھی آپ کے سامنے پیش کروں۔ اس سے پہلے کہ میں سفر کی رُوداد بیان کروں۔ میں دہلی کے ریلوے سٹیشن اور بھارت کے ریل کے نظام سے متعلق چند معلومات آپ کے سامنے رکھوں گا۔

ریل کہانی

ریل کی کہانی بڑی دلچسپ ہے۔ یہ موقع تو نہیں لیکن میں چاہوں گا کہ بھارت کی ریل کی بات کرنے سے پہلے آپ کو ریل کی تاریخ بتاؤں۔

کئی صدیاں قبل یونان میں کشتیاں ایک جگہ سے دوسری جگہ لے کر جانے کے لیے ایک ٹریک بچھایا گیا تھا۔ اس کی شکل موجودہ ریل لائن کی طرح ہی تھی۔ اس لائن کے اوپر کشتیوں کو لادا جاتا تھا اور اس طرح کشتیاں ایک جگہ سے دوسری جگہ تک لیجائی جاتی تھیں۔ انھیں کھینچنے کے لیے انسانوں کے ساتھ ساتھ جانوروں سے بھی کام لیا جاتا تھا۔ یہ ٹریک چھ صدیوں تک کام کرتا رہا۔ آپ اسے دنیا کا پہلا ٹریک کہہ سکتے ہیں جو لکڑی کا بنا ہوا تھا۔ اس کے بعد دنیا میں کئی مقامات پر اس طرح کے کئی ٹریک بنائے گئے، جن میں مصر اور روم بھی شامل ہیں۔

آج سے تقریباً پانچ سو سال پہلے آسٹریا میں لکڑی کی ٹرانسپورٹ کے لیے ایک ٹریک بچھایا گیا اس پر لکڑی کی بنائی گئی ٹرالی، جس کے پہیے بھی لکڑی کے ہوتے تھے، چلائی جاتی تھی۔ انھیں کھینچنے کے لیے گھوڑوں کا استعمال کیا جاتا تھا۔ اس طرح آج سے چھ صدیاں پہلے بھی ریل کی ایک شکل بنائی گئی جسے ہم موجودہ دور کی جدید ریل کی اولین صورت کہہ سکتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس ٹریک کی کوئی نہ کوئی باقیات اب بھی موجود ہیں گو کہ ان کی شکل بدل چکی ہے۔

سولہویں صدی سے اٹھارویں صدی کے نصف تک لکڑی کے بنے ہوئے ٹریک تھے جن پر لکڑی کے پہیوں والی ایک ٹرالی، جسے ویگن وے کہتے تھے کو کھینچنے کے لیے یورپی ممالک میں عام طور پر گھوڑے استعمال ہوتے تھے۔ ایک جگہ جب کوئی ٹیکنالوجی کامیاب ہو جاتی ہے تو دوسرے لوگ بھی اسے دیکھ کر ایسی ہی چیز بنا لیتے ہیں۔ جس کا آغاز آسٹریا سے ہوا، سولہویں صدی میں ایک جرمن کمپنی نے انگلینڈ کے اندر لیور پول کے پاس ہی کوئلہ ڈھونے کے لیے اسی طرح کا ایک ٹریک بچھایا۔ یہ ٹیکنالوجی امریکہ میں بھی متعارف ہوئی اور وہاں بھی اسی طرح ٹریک بچھائے گئے۔ اٹھارہویں صدی کے نصف تک لکڑی کے ٹریک پر لکڑی کی ہی ویگن جانوروں کی مدد سے کھینچی جاتی تھی۔ جس میں

سامان لادا جاتا تھا، اس ویگن اور ٹریک کو ویگن وے کہتے تھے اور یہ سلسلہ اس وقت تک چلتا رہا جب تک سٹیم انجن ایجاد نہیں ہوا۔

اس مختصر تحریر سے آپ یہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ انسان نے یہ سوچا کہ اگر ایک ٹریک بنایا جائے جس پر کسی پہیے کو چلایا جائے تو اس سے کم طاقت سے زیادہ کام لیا جا سکتا ہے۔ یہ تصور بہت جاندار تھا اس لیے لوگوں نے اسے بہت جلدی اپنا لیا۔ آج کی ٹرین بھی بنیادی طور پر اسی اصول کے تحت کام کرتی ہے۔
جب لوگوں نے یہ دیکھا کہ لکڑی کا ٹریک جلدی ٹوٹ جاتا ہے تو انھوں نے اس پر لوہے کی ایک پلیٹ لگانی شروع کر دی۔ یہ بڑی دلچسپ تاریخ ہے کہ لکڑی کی پٹڑی سے لوہے کی پٹڑی تک کا سفر کیسے طے ہوا۔ بہت سے لوگوں اور کمپنیوں نے اس پر کام شروع کر دیا۔ ایک طرف تو یہ کام ہو رہا تھا اور دوسری طرف سٹیم انجن میں بھی دن بدن تبدیلی آ رہی تھی۔ ابھی تک سٹیم انجن کو ایک جگہ رکھ کر اس سے پانی کھینچنے یا کانوں سے کوئلہ نکالنے کا کام لیا جاتا تھا۔ میں ہمیشہ اس بات کو جاننے کی خواہش رکھتا تھا کہ انجن کس طرح ایجاد ہوا اور کس نے کیا؟ اس تحریر کو لکھنے کے لیے جب میں نے پڑھنا شروع کیا تو بہت ہی دلچسپ باتیں سامنے آئیں۔

تھامس نیوکومین، ایک انگریز انجینئر نے 1712ء میں تیل سے چلنے والا ایک انجن بنایا۔ یاد رہے یہ سٹیم انجن نہیں تھا بلکہ تیل ہی بطور ایندھن جلایا جاتا تھا۔ جس سے ایک پریشر بنتا تھا اور اس پریشر سے انجن کو گھمایا جاتا تھا۔ یہ انجن بھی ایک جگہ پر رکھ کر ہی استعمال ہوتا تھا۔ جیمز واٹ ایک سکاٹش انجینئر تھا جس نے اس انجن میں پہلی مرتبہ پسٹن کا استعمال کیا اور بعد ازاں ایک سے زائد پسٹن استعمال کیے گئے جس سے اس کی کارکردگی میں بے حد اضافہ ہو گیا۔ ابھی بھی یہ انجن ایک ہی جگہ پہ ساکت حالت میں کام کرتا تھا۔ جب سٹیم بوائلر بنائے گئے تو جیمز واٹ نے ہائی پریشر سٹیم کو براہِ راست استعمال کرتے ہوئے پسٹن کو گھمانا شروع کیا۔ اس طرح پہلا سٹیم انجن بنایا گیا۔ اسے ایک چھوٹی

جگہ پر بھی رکھا جا سکتا تھا۔ سٹیم بنانے کے لیے لکڑی اور کوئلے کا استعمال کیا گیا جسے پسٹن گھمانے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ اس انجن کی دوسری خوبی یہ تھی کہ اس سے کسی پہیے کو بھی گھمایا جا سکتا تھا۔ جیمز واٹ نے 1784ء میں اپنا پہلا لوکو موٹو انجن پیٹینٹ کروایا۔ اس طرح اسے ایک دن ویگن کے ساتھ لگایا گیا۔ یہ ویگن بنیادی طور پر کوئلہ اور کپاس ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے کے لیے استعمال ہوتی تھی اور بعد میں لوگ بھی اس پر سفر کرنے لگے۔

21فروری 1804ء وہ دن تھا جب پہلی مرتبہ سٹیم انجن کی مدد سے ٹرین چلائی گئی اور 1837ء میں بجلی کی مدد سے ٹرین چلنا شروع ہوئی۔ یہ تھی ریل کی ایک مختصر کہانی لیکن اگر آپ زیادہ جاننا چاہیں تو آپ کو بہت سا مواد مل سکتا ہے جس سے آپ ریل کو مزید اچھے طریقہ سے جان سکیں گے۔ چارلس ایڈورڈ لی کی کتاب The evolution of railwaysاور ڈاکٹر ایم جے ٹی لیویس کی کتاب RAILWAYS IN THE GREEK AND ROMAN WORLDریل کی کہانی جاننے کے لیے مفید کتابیں ہیں۔

آج سے ایک سو پندرہ سال قبل فیصل آباد سے ساٹھ کلومیٹر کے فاصلے پر جڑانوالا کے قریب گنگا پور گاؤں سر گنگا رام نے اپنے گاؤں سے بچینانہ سٹیشن تک تین کلو میٹر طویل ایک ریل کی پٹڑی بچھائی جسے گھوڑے کی مدد سے چلایا جاتا تھا۔ چند سال پہلے تک تو یہ چلتی تھی لیکن تازہ صورت حال کا معلوم نہیں، اس طرح لوہے کی پٹڑی، لکڑی کی ٹرالی اور انجن کی جگہ گھوڑے کی ایک مثال ہمارے ہاں اپنی ہے۔

اب میں آپ کو دہلی ریلوے سٹیشن کے بارے میں کچھ معلومات فراہم کروں گا جو نہایت ہی دلچسپ ہیں۔

ہندوستان میں ریل کی ایک مختصر تاریخ

دنیا میں اکثر مقامات پر جب ریل کا آغاز کیا گیا تو اس کا بنیادی مقصد مال برداری تھا۔ بعد ازاں اسی ٹرین کی مدد سے اسے مسافروں کی آمدورفت کے لیے بھی

استعمال کیا گیا۔ ہندوستان میں ریل کی تاریخ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ پہلی ٹرین 1832ء میں مدراس میں ایک سڑک بنانے کے لیے پتھر لے جانے کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے چلائی گئی تھی۔ جب یہ تجربہ کامیاب رہا اور کم خرچ سے زیادہ کام ہو گیا تو اس طرح کے مزید روٹ بھی بنائے گئے جن سب کا مقصد سامان کی ترسیل تھا۔

ممبئی میں سب سے پہلے 16 اپریل 1853ء کو چودہ بوگیوں پر مشتمل ایک ٹرین چلائی گئی جس نے صرف 34 کلومیٹر کا سفر طے کیا۔ اس میں چار سو لوگ سوار تھے اور اسے تین سٹیم انجن کھینچ رہے تھے۔ میں نے کہیں پڑھا ان انجنوں کے نام صاحب ،سندھ اور سلطان تھے۔ اب یہ نام ہیں یا کچھ اور اس بات میں حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ آج سے تقریباً 167 سال پہلے ہندوستان میں پہلی مسافر ٹرین نے کام شروع کیا۔

آپ کی دلچسپی کے لیے بتاتا چلوں کہ پاکستان کے علاقے میں کراچی سے کوٹری تک اور لاہور سے ملتان تک ٹرین سروس 1861ء میں شروع ہو گئی تھی۔ ہندوستان کے مشرقی علاقوں میں مسافر ٹرین کا آغاز 1854ء میں ہو گیا تھا جبکہ جنوبی علاقہ جات میں ٹرین کا آغاز دو سال بعد یعنی 1856ء میں ہو گیا تھا۔ اس سے یوں لگتا ہے کہ جہاں انگریزوں کی حکمرانی قائم ہوئی، وہاں وہاں ٹرین کا بھی آغاز ہوا۔

ان سب کو دیکھتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ 1832ء سے 1853ء تک یعنی اکیس سال تک ٹرین صرف سامان لے جانے کے لیے استعمال ہوتی تھی۔ ریل کا فائدہ اٹھانے والے صرف انگریز ہی تھے۔ جن کا اصل مقصد تعمیراتی کام کے لیے سامان اور معدنیات ایک جگہ سے دوسری جگہ لے کر جانا تھا۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ اس دور میں مختصر فاصلے پر جہاں بھی سامان لے جانے اور لانے کا مسئلہ ہوتا تھا تو وہاں ٹرین کی پٹڑی بچھا کر اس پر گھوڑوں کی مدد سے ٹرین کو چلایا

جاتا تھا۔اسی طرح کی ایک ٹرین 1873ء میں کلکتہ اور 1874ء میں ممبئ میں بھی چل رہی تھی۔ ان لوگوں نے اس بات کو جان لیا تھا ٹرین کی پٹڑی پر کم طاقت استعمال کر کے زیادہ کام کیا جا سکتا ہے۔ جہاں ان کو انجن میسر نہیں تھے اس کے لیے انھوں نے گھوڑوں کا استعمال شروع کر دیا۔

پہلے پہل ٹرین میں کسی طرح کی لائٹ کا بندوبست نہیں تھا اور لوگ روایتی لالٹینوں سے کام چلاتے تھے۔ ٹرین میں بجلی سے چلنے والی روشنی کا انتظام 1897ء میں کیا گیا۔ایک اور اہم سنگ میل ہندوستان کی ریل کی تاریخ میں اس وقت آیا جب 1925ء میں پہلی مرتبہ بجلی سے چلنے والی ٹرین چلائی گئ۔ یاد رہے ٹرین چلانے کے لیے تین طرح کے انجن استعمال ہوتے رہے ہیں۔ایک وہ جنھیں سٹیم کی مدد سے چلایا جاتا تھا، دوسرے وہ جو ڈیزل کی مدد سے چلتے تھے اور تیسرے بجلی سے چلنے والے تھے۔

ہمیں بچپن میں کبھی کبھار سٹیم انجن سے چلنے والی ٹرین بھی نظر آتی تھی جو کہ بعد میں ختم ہو گئ۔ سٹیم بنانے کے لیے اکثر لکڑی استعمال ہوتی تھی۔ لاہور کے قریب چھانگا مانگا کا جنگل بھی اسی مقصد کے لیے لگا گیا تھا۔ یہ دنیا بھر میں لگائے گئے بڑے مصنوعی جنگلوں میں سے ایک ہے۔

ابھی بھی سٹیم انجن کا ایک ماڈل لاہور ریلوے سٹیشن پر موجود ہے۔ پشاور سے لنڈی کوتل بھی ایک ٹرین چلتی تھی جسے سٹیم انجن کی مدد سے چلایا جاتا تھا۔اس کا مقصد صرف تفریح مہیا کرنا تھا۔ یاد رہے کہ اب زیادہ تر انجن بجلی کی مدد سے چلتے ہیں لیکن دور دراز علاقوں میں ابھی بھی ڈیزل انجن چل رہے ہیں۔

تقسیم ہند کے بعد انڈین ریل نے جس قدر ترقی کی اس کا اندازہ آپ اس بات سے کر سکتے ہیں کہ اس وقت مختلف شہروں کے درمیان دو کروڑ تیس لاکھ لوگ روزانہ ریل سے سفر کرتے ہیں ۔ یہ تعداد سالانہ آٹھ ارب سے بھی زائد ہے۔ اس کے علاوہ

شہروں کے اندر چلنے والی ٹرین میں سفر کرنے والوں کی تعداد بھی کم نہیں ہے۔ صرف ممبئ کی ٹرین روزانہ اسی لاکھ سے زائد لوگوں کو یہ سہولت مہیا کرتی ہے اس طرح کی میٹرو ٹرین ہندوستان کے ہر بڑے شہر میں چلتی ہیں۔ اس وقت انڈین ریل کی نوے فیصد سے زائد ٹرینیں بجلی سے چلتی ہیں[8]۔

انڈین ریل کا 2021ء سالانہ بجٹ دس کھرب بھارتی روپیہ بنتا ہے۔ پاکستانی روپیہ میں یہ رقم پندرہ کھرب بنتی ہے۔ اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں انڈین ریل نے کس قدر ترقی کی۔ اس کی تفصیل بڑی ہی دلچسپ ہے اور اس میں ہمارے لیے بے حد سیکھنے کی باتیں ہیں کہ کس طرح سے انھوں نے ریل کے نظام کو سنبھالا، بڑھایا اور اتنا مضبوط کیا کہ روزانہ ڈھائی کروڑ لوگ سفر کرنا پسند کرتے ہیں۔ یہ صرف ایک شہر سے دوسرے شہر کی تعداد ہے۔ میٹرو ٹرین سے سفر کرنے والوں کی تعداد کا اندازہ لگانا میرے لیے بہت مشکل ہے۔

آج سے چالیس سال قبل جب مجھے کراچی جانا ہوتا تھا تو میں میں کراچی لوکل ٹرین پر سفر کرتا تھا۔ لوگوں کی ایک بہت بڑی تعداد اس پر سفر کرتی تھی۔ ہم اسے بڑھا تو نہ سکے لیکن ہم نے کئی دہائیوں تک اسے بند ضرور رکھا۔ اب بھی کبھی کبھی پتہ چلتا ہے کہ ہم بہت جلد اسے بحال کریں گے۔ اللہ کرے وہ دن بھی آئے کہ یہ ٹرین بحال ہو اور لوگ اس سے مستفید ہوں۔

ہم آگے بڑھنے کی بجائے پیچھے کیوں آئے؟ جب کہ ہمارے ہمسائے ہم سے کئی گنا ترقی کر گئے۔ یہ ہمارے لیے ایک لمحہ فکریہ ہے۔ آج بھی اگر ہم سوچیں اور پورے

---

[8] https://www.livemint.com/budget/news/railway-budget-2021-11612159442067.html

خلوص سے منصوبہ بندی کریں تو میں یہ بات یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ ہم بھی ان سے پیچھے نہیں رہیں گے۔ شرط صرف خلوص اور دیانت داری سے محنت کرنے کی ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ ہم نے ٹرین کی بجائے موٹروے کو ترجیح دی، جس سے سفر میں آسانیاں تو پیدا ہوئی لیکن یہ ٹرین کا نعم البدل نہیں ہے۔ دنیا بھر میں ٹرین کی اپنی منفرد اہمیت ہے۔ بھارتی حکومت نے پوری منصوبہ بندی کے تحت ٹرین سسٹم سے ایک اور فائدہ بھی حاصل کیا۔ میری ایک صاحب سے بات ہوئی انھوں نے مجھے بتایا کہ ٹرین میں بہت طویل فاصلے کے لوگ سفر کرتے ہیں۔ اس دوران انھیں ایک دوسرے کو جاننے اور ایک دوسرے کے قریب آنے کا موقع ملتا ہے، اس طرح سے ہندوستان میں یکجہتی کا تصور بھی پروان چڑھتا ہے۔ ہم نے خود بھی اس کا مشاہدہ کیا کہ جو لوگ ہمارے سامنے بیٹھے ہوئے تھے وہ لمبے سفر کی وجہ سے ہم سے باتیں بھی کرتے تھے اور ہماری باتیں بھی سنتے تھے۔ اس سے ہمیں بہت کچھ جاننے کا موقع ملا، میں اس کا ذکر آنے والے صفحات میں آپ کے سامنے پیش کروں گا۔

بھارت کی موجودہ ریلوے کی صورتحال

بھارت آبادی کے لحاظ دنیا کا دوسرا جبکہ ریلوے نظام کے اعتبار سے دنیا کا چوتھا بڑا ملک ہے۔ اس سے پہلے تین ممالک میں امریکہ، روس اور چین شامل ہیں۔ یاد رہے بھارت میں ریل کا نظام دو طرح کا ہے۔ ایک کا نام انڈین ریل ہے جو شہروں کے درمیان چلنے والی ریل گاڑیوں کا نظام دیکھتی ہے۔ دوسرا مختلف شہروں میں چلنے والا اربن ٹرین سسٹم ہے۔ جیسا کہ ممبئی کا اپنا ایک الگ نیٹ ورک ہے اور اس کے علاوہ بھی بے شمار شہروں میں اس طرح کے نیٹ ورک موجود ہیں۔

بھارت میں سات ہزار سے زائد ریلوے سٹیشن ہیں اور ریل لائن کی لمبائی ستر ہزار کلومیٹر کے قریب ہے۔ انڈین ریل کے پاس پونے تین لاکھ کے قریب سامان لے

جانے والی ویگنز جبکہ ستر ہزار سے زائد مسافر کوچز ہیں۔ بھارت اس وقت بارہ ہزار ریل انجنوں پر مشتمل سسٹم چلا رہا ہے۔ ابھی تک انڈین ریل نے ایک سو ساٹھ کلو میٹر فی گھنٹہ کی رفتار پر تیز ترین ٹرین چلائی ہے۔ اور وہ ایک منصوبے پر کام کر رہے ہیں جس کے بعد یہ سپیڈ تین سو کلو میٹر تک پہنچنے کا امکان ہے۔اس وقت انڈین ریل زمینی راستوں سے تین ممالک پاکستان، بنگلادیش اور نیپال سے منسلک ہے۔ ابھی ایک منصوبہ پر کام ہو رہا ہے جس کے بعد کشتیوں کے ذریعے سری لنکا کے ساتھ بھی ریل کا نظام منسلک کیا جائے گا۔ یہ سارا نظام چلانے کے لیے انڈین ریل کے پاس تیرہ لاکھ ملازمین ہیں۔

یہ نظام کتنا بڑا ہے، اس کا موازنہ آپ پاکستان ریل کے نظام سے کر سکتے ہیں۔ تقسیم ہند کے وقت مغربی پاکستان میں ریل کی پٹڑی 8120 کلو میٹر تھی جو اب کم ہو کر 7792 کلو میٹر ہے۔ بھارت کے مقابلے میں یہ دس گنا کم ہے۔ قریباً پاکستان ریلوے کے پاس 75 ہزار ملازمین ہیں اور تقریباً پونے دو لاکھ لوگ روزانہ ریل کا سفر کرتے ہیں۔ اس طرح پانچ کروڑ لوگ سالانہ پاکستان ریلوے سے مستفید ہوتے ہیں۔

ان تمام معلومات کا مقصد آپ کو بھارت کے ریل نظام سے آگاہ کرنا تھا۔ آئندہ صفحات میں جب ہم آپ کو اپنے ریل کے سفر کی داستان سنائیں گے تو اس سے آپ یہ اندازہ کر سکیں گے کہ یہ نظام کتنا بڑا ہے اور کس انداز سے چل رہا ہے۔ یاد رہے تقسیم ہند کے وقت مہاجرین کو ایک ملک سے دوسرے ملک لیجانے میں بھی ریل نے ایک اہم کردار ادا کیا تھا۔

اولڈ دہلی سٹیشن جسے دہلی جنکشن بھی کہتے ہیں

جب ہم نے بچپن میں ریل پر سفر شروع کیا تو دیکھا کہ کچھ سٹیشنوں پر ان کے نام کے ساتھ جنکشن کا لفظ بھی لکھا ہوتا تھا۔ پتہ کرنے پر معلوم ہوا کہ جہاں ریل گاڑیاں دو سے زائد اطراف میں جاتیں ہوں ایسے سٹیشن کو جنکشن کہتے ہیں۔ جب میں نے دہلی

میں قائم ریلوے سٹیشنز سے متعلق جاننا چاہا تو مجھے پتہ چلا کہ سب سے پہلے جو ریلوے سٹیشن دہلی میں بنا اس کا نام دہلی جنکشن تھا، جسے اب اولڈ دہلی سٹیشن بھی کہتے ہیں۔ شروع میں اس کا نام یقیناً دلی ہو گا کیونکہ دہلی کا لفظ انگریزوں نے آ کر رائج کیا۔

اس سے پہلے کہ میں آپ کو اپنے سفر کے بارے میں بتاؤں میں آپ کو دہلی ریلوے سٹیشن سے متعلق کچھ معلومات دینا چاہوں گا۔ دہلی شہر اور گردونواح میں 46 ریلوے سٹیشن ہیں۔ ان میں دو سب سے بڑے ہیں جن کا تفصیلی تعارف میں آپ کے سامنے پیش کروں گا۔

ہماری ٹرین نیو دہلی ریلوے سٹیشن سے روانہ ہوئی تھی اس لیے ہم اولڈ دہلی ریلوے سٹیشن کو اندر سے نہ دیکھ پائے لیکن اسکے پاس سے ہمارا گزر کئی مرتبہ ہوا۔ یہ سٹیشن چاندنی چوک اور کشمیری گیٹ کے درمیان واقع ہے جو کہ اندرون دلی کا علاقہ ہے۔ یہاں بہت رش ہوتا ہے۔ اس کی تعمیر دیکھ کر ہمیں یہ گمان گزرا کہ ہم لاہور کا ریلوے سٹیشن دیکھ رہے ہیں۔ ایسا صرف لاہور اور دہلی میں ہی نہیں بلکہ پاکستان اور بھات کے اکثر و بیشتر سٹیشنز کی تعمیر تقریباً ایک جیسی ہی ہے۔ اگر آپ کو انگلینڈ جانے کا اتفاق ہو تو آپ یہ جان کر حیران ہوں گے کہ انگلینڈ کے ریلوے سٹیشن پاکستان اور بھارت سے بہت زیادہ مشابہت رکھتے ہیں۔ ان سب کو بنانے والا ایک ہی ادارہ ہو تو ایسا ممکن ہے۔

دہلی میں سب سے پہلا ریلوے سٹیشن 1864ء میں بنایا گیا۔ اس کا نام دلی جنکشن ہے۔ یہ چاندنی چوک اور کشمیری گیٹ کے درمیان میں واقع ہے۔ یاد رہے کہ اس وقت تک ابھی نئی دہلی کا وجود عمل میں نہیں آیا تھا۔ آپ کی دلچسپی کے لیے بتاتا چلوں کہ لاہور کا مین سٹیشن 1860ء میں تیار ہو گیا تھا، یعنی دہلی سے پہلے۔ سٹیشن کی عمارت بنانے کے لیے ایک دلچسپ فیصلہ کیا گیا۔ لال قلعہ جو یہاں سے زیادہ فاصلے پر موجود نہیں ہے کی عمارت کو دلی جنکشن کا اسٹرکچر بناتے ہوئے ذہن میں رکھا گیا اور اس سٹیشن کا

رنگ بھی سرخ ہی رکھا گیا۔ پہلی عمارت تو عام سی تھی لیکن جو بڑی عمارت بنی اس کا آغاز 1903ء میں ہوا۔ ابتداء میں یہاں پر صرف ایک پلیٹ فارم تھا جس کی گنجائش تقریباً ایک ہزار مسافروں کی تھی۔ 1934ء میں اسے مزید وسعت دی گئی۔اس وقت اس ریلوے سٹیشن پر 18 پلیٹ فارم ہیں۔ کئی پلیٹ فارم ایسے بھی ہیں جہاں پر 24 بوگیوں والی ٹرین رُکتی ہے۔

اس وقت دو سو سے زائد ٹرینیں یہاں سے گزرتی یا شروع ہوتی ہیں۔ روزانہ دو لاکھ کے قریب مسافر اس سٹیشن سے مستفید ہوتے ہیں۔ ہم اس کے ایک پل سے گزرے۔ میرے ساتھ وقاص جعفری صاحب تھے۔ ہم نے پل سے دیکھا کہ حد نگاہ تک گاڑیاں ہی گاڑیاں کھڑی نظر آرہی تھیں۔ جہاں پر اتنی بڑی تعداد میں لوگ آئیں اور جائیں وہاں پر صفائی ستھرائی ایک اہم مسئلہ بن جاتا ہے۔ وہ ہمیں یہاں بھی دیکھنے کو ملا۔

وقاص بھائی کے نانا ابو ریلوے میں ملازم تھے اس لیے ان کی ریل سے محبت بھی پرانی تھی۔انھوں نے بتایا کہ وہ ماڑی انڈس کالا باغ سے اپنے ننہال لاہور، ٹرین پر آتے تھے۔ ریل کی ایک اپنی کشش ہے جو بہت سے لوگوں کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ابھی حال ہی میں اس ریلوے سٹیشن پر پرائیویٹ پبلک پارٹنر شپ کے تحت دو میگاواٹ سے زائد کا سولر سسٹم لگایا گیا ہے۔اس ریلوے سٹیشن کی ایک خاص بات یہ بھی تھی کہ اس کے پاس ہی میٹرو کا سٹیشن بھی ہے۔ لوگ دور دراز سے میٹرو پر سفر کرکے آتے ہیں اور پھر یہاں سے ٹرین پکڑتے ہیں۔

ہم نے ایک پلیٹ فارم سے گزرتے ہوئے دیکھا کہ پورے کے پورے خاندان پلیٹ فارم پر انتظار کر رہے ہیں۔ جس سے ہم نے یہ محسوس کیا کہ بھارت میں لوگوں کی ایک بہت بڑی تعداد بذریعہ ٹرین سفر کرتی ہے۔آمد و رفت کے دیگر ذرائع سے سستا اور آرام دہ ہونے کے ساتھ ساتھ محفوظ بھی ہے۔

ہندوستان میں ریل کی تاریخ جاننے کے لیے بھارتی ریلوے نے بھی کافی کچھ شائع کیا ہے۔ اس سلسلہ کی ایک کتاب جو John Hurd II and Ian J. Kerr نے India's Railway History کے نام سے لکھی میں تفصیل سے ہندوستان کی ریل کی کہانی لکھی ہے[9]۔ اس کے علاوہ شیوتا نے History of Indian Railways— 1853 to 2018 کے نام سے بھی ایک مضمون لکھا ہے جس میں کئی دلچسپ معلومات دی گئیں ہیں[10]۔

نیو دہلی ریلوے سٹیشن

نیو دہلی ریلوے سٹیشن بھارت کا اس وقت سب سے مصروف اور آمدنی کے اعتبار سے اول نمبر کا ریلوے سٹیشن ہے۔ اس کی وسعت کا اندازہ آپ اس بات سے لگا سکتے ہیں کہ یہاں سے روزانہ چار سو سے زائد گاڑیاں اپنا سفر شروع اور ختم کرتی ہیں۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق اس سٹیشن سے پانچ لاکھ لوگ روزانہ سفر کرتے ہیں۔ یاد رہے پورے پاکستان میں صرف پونے دو لاکھ لوگ ہیں جو ہر روز پاکستان ریلوے سے مستفید ہوتے ہیں۔

نیو دہلی ریلوے سٹیشن کی تاریخ زیادہ پرانی نہیں ہے۔ پچھلے صفحات میں آپ نے پڑھا ہو گا کہ 1911ء میں جب نیو دہلی کو آباد کرنے کا فیصلہ کیا گیا تو اس وقت دلی جنکشن موجود تھا۔ کچھ سالوں بعد صرف ایک نئی ریلوے لائن نئی دہلی تک پہنچائی گئی۔ ضرورت محسوس ہونے پر 1927ء میں آٹھ کلومیٹر طویل یہ ریلوے سٹیشن بنایا گیا۔ 1931ء میں جب نئی دہلی کا افتتاح ہوا تو اس وقت اس ریلوے سٹیشن نے کام شروع

[9] https://brill.com/view/title/21608
[10] https://www.orientrailjourneys.com/blog/history-of-indian-railways/

کر دیا تھا۔ اس ریلوے سٹیشن پر سولہ پلیٹ فارم ہیں۔ حال ہی میں ایک میگا واٹ کا سولر سسٹم بھی نصب کیا گیا ہے۔ اس ریلوے سٹیشن کے لیے 225 ایکڑ جگہ لی گئ تھی جواب کم پڑ رہی ہے۔ اس ریلوے سٹیشن کی سب سے اہم بات یہ تھی کہ ہر جگہ پر بہت ہی اچھے انداز میں معلومات دی گئ تھیں۔ جس سے آپ کو اپنے پلیٹ فارم پر جانے کے لیے کوئی دقت پیش نہیں آتی۔

ایک انتہائی دلچسپ بات یہ تھی کہ پلیٹ فارم کے فرش پر کوچ نمبر لکھا ہوا تھا۔ مثلاً اگر آپ کی سیٹ دس نمبر کوچ میں ہے توآپ کو ڈھونڈنا نہیں پڑے گا، بلکہ پلیٹ فارم کے فرش پر جس جگہ دس لکھا ہوگا کوچ بھی وہیں آ کر رکے گی۔ ایسا انتظام میں نے یورپ میں بھی نہیں دیکھا۔ اس سے مسافروں کو بے حد سہولت ہوتی ہے۔ لوگ اپنی کوچ والی جگہ پر کھڑے ہوتے ہیں اور آپ کی کوچ بھی وہیں پر آ کر رکتی ہے۔

یقیناً آپ سوچتے ہوں گے مختلف گاڑیوں کی لمبائی میں بھی فرق ہو سکتا ہے تو اس کا بھی حل انھوں نے نکالا ہوا ہے۔ فرش پر لکھا ہوا ہے کہ یہ نمبر فلاں گاڑی کے لیے ہیں۔ مثلاً ہماری گاڑی کا نام تامل ناڈو ایکسپریس تھا۔ تامل ناڈو کے نام کے ساتھ وہاں پر نشان لگا ہوا تھا۔ اگر کوئی اور گاڑی ہو گی تو اس کے نام پر بھی نشان ہوں گے۔ وہاں بہت زیادہ نشان نہیں تھے۔ ان بڑی باتوں میں سے ایک یہ تھی جنھوں نے ہمیں انڈین ریلوے سے متاثر کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔

اس سے پہلے کہ میں آپ کو سفر کے بارے میں بتاؤں میں یہ بھی بتانا چاہوں گا کہ جب کمپیوٹر اتنا عام نہیں تھا تو سیٹ بک کروانے کا نظام کیسا تھا۔

آج سے 20 سال قبل 1999ء میں ابھی کمپیوٹر کا استعمال عام نہیں ہوا تھا لیکن اس وقت بھی انڈین ریل کا سیٹ بک کرنے کا نظام موجود تھا۔ اس نظام کے تحت کسی بھی لینڈ لائن سے ریلوے کے دیے گئے نمبر پر فون کرتے تھے تو وہ آپ سے ضروری

معلومات جیسے کس دن سفر کرنا ہے؟ کس مہینے میں سفر کرنا ہے؟ کس ٹرین پر سفر کرنا ہے؟اور کس طرح کی کوچ پر سفر کرنا ہے وغیرہ وغیرہ لیتے تھے۔ معلومات لینے کا طریقہ کار بڑا دلچسپ تھا۔ آپ فون پر نمبروں سے ہی ان کو جواب دیتے رہتے تھے۔ مثلاً اس نے پوچھا کہ کونسی تاریخ، آپ نے نمبر ڈائل کرکے تاریخ بتا دی۔ اس نے پوچھا گاڑی کا نمبر ڈائل کریں تو آپ نے نمبر ڈائل کر دیا۔ اس طرح سے وہ سوال پوچھتے جاتے اور آپ جواب دیتے جاتے تھے۔ جواب میں وہ یہ بتاتے تھے کہ جس دن اور جس کلاس میں جانا چاہتے ہیں اس میں ابھی تک کتنی سیٹیں موجود ہیں۔

وقاص بھائی اور میں نے ہوٹل سے فون ملایا۔ جس کا طریقہ کار ہوٹل کے مینجر نے ہمیں بتایا تھا۔ اس طرح سے ہمیں یہ اندازہ ہو گیا کہ ٹرین میں کتنی سیٹیں خالی ہیں۔ ہم ٹکٹ لینے کے لیے اپنے علاقے میں قائم ریل ٹکٹ بوتھ پر گئے اور اپنی ٹکٹس لے لیں۔ اس سے ہمیں کافی سہولت ہوئی۔ مجھے یہ نظام اب تک یاد ہے۔ اب تو خیر سارا نظام ہی الیکٹرونک ہے، کمپیوٹرائز بکنگ ہے۔

رات دس بجے کے قریب ہماری روانگی تھی۔ رنبیر مانگٹ صاحب ہمارے ہوٹل میں تشریف لے آئے۔ شام کا کھانا ہم نے ان کے ساتھ کریم ہوٹل میں کھایا۔ جس کے بعد انھوں نے ہمیں اپنی گاڑی میں ریلوے سٹیشن پہنچایا۔ ہم نے ان سے عرض کیا کہ اب ہم خود ہی اپنی ٹرین تک پہنچ جائیں گے۔ لیکن ان کا اصرار تھا کہ وہ ہمیں بٹھا کر ہی جائیں گے۔ یہ ان کی ہم سے محبت کا ایک انداز تھا ان کے ساتھ ہماری وہ شام ایک یادگار شام تھی۔ ایک روائتی مہمان نوازی کا انداز ہمیں ہر جگہ دیکھنے کو ملا۔

جڑانوالہ: گنگا پور کے مکین بوچیانا ریلوے اسٹیشن کے نزدیک چلائی جانے والی ''گھوڑا ٹرین'' کی سواری سے لطف اندوز ہو رہے ہیں

Photo Credit: https://twitter.com/shirazhassan
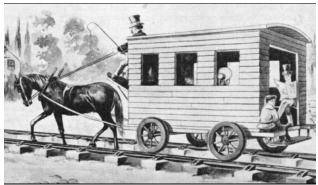
Rail Pulled by Horses: Photo Credit: https://collegeofcuriosity.com
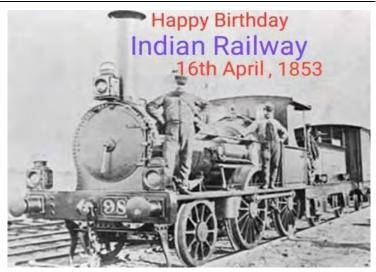
First Passanger train in Inida Photo Credit:
https://www.ibtimes.co.in

Today Indian train Photo Credit:
https://www.ibtimes.co.in

Dehli Metro Blue Line Photo Credit:
https://zeenews.india.com

Train over loaded in Inida Photo Credit:
https://www.businessinsider.com

ایک طویل سفر پر روانگی:
جو اب تک کیے گئے سفروں میں طویل ترین ہے

ٹرین کی روانگی کا وقت قریب پہنچا تو رنبیر جی نے ہمیں سٹیشن پر پہنچایا اور ہمارے ساتھ مختلف جگہوں سے معلومات لیتے ہوئے اس پلیٹ فارم پر چلے گئے جہاں سے ہماری گاڑی نے روانہ ہونا تھا۔ مجھے اس بات کا تجربہ نہیں تھا کہ ہماری کوچ کہاں کھڑی ہوگی۔ جیسا کہ میں نے پچھلے صفحات میں ذکر کیا۔ مجھے بہت ہی اچھا لگا جب رنبیر صاحب نے بتایا کہ فرش پر لکھا ہوا ہے کہ آپ کی کوچ کہاں پر رکے گی۔

اب تو انھوں نے یہ سارا کام ڈیجیٹلائزڈ کر لیا ہوگا اس وقت کا یہ کام زمین پر رنگ سے کیا جاتا تھا۔ ہمیں اس بات کا علم نہیں تھا لیکن رنبیر صاحب کی وجہ سے ہمیں بے حد سہولت ہوئی اور ہم ایک مخصوص جگہ پر ٹرین کا انتظار کرنے لگے۔

ٹرین اپنے مقررہ وقت پر آ گئی۔ ہم نے رنبیر صاحب کو خدا حافظ کہا اور اپنی کوچ میں چلے گئے۔ ہماری کوچ ایئر کنڈیشنڈ تھی اور اس میں کئی کیبن تھے۔ جس کوچ میں ایک برتھ ہوتی ہے اسے دو ٹائر کہتے ہیں، جس کوچ میں تین برتھ یعنی رات میں تین افراد کے سونے کی جگہ وہ تین ٹائیر کہلاتی ہے۔ ہمارا کیبن تین ٹائر تھا۔ رات کو سونے کے لیے ایک صاحب اوپر والی برتھ پر سوتے ہیں اور ایک صاحب نیچے سیٹوں پر اور ایک صاحب درمیان میں سوتے ہیں۔ یہ ایک دلچسپ بات ہے کہ دن میں ان سیٹوں پر آٹھ اور رات کے وقت چھ لوگ ہوتے ہیں۔ ایک صاحب نے ہمارا استقبال کیا اور ہم ان کی رہنمائی میں اپنے مطلوبہ کیبن میں چلے گئے، جہاں تین اور لوگ بھی تشریف فرما تھے۔ اس طرح اس کیبن میں ہم کل چھ لوگ تھے۔

ہمارے کیبن میں ہمارے علاوہ ان تین لوگوں کا تعارف بھی آپ کی دلچسپی کا باعث ہوگا۔ ایک صاحب کا نام سردار دل جیت سنگھ پوٹھوہاری دوسرے صاحب پردیپ سکسینہ تھے جبکہ تیسرے صاحب کا نام پرتھوی بھٹہ چاریا تھا۔ سردار صاحب بھوپال تک ہمارے ساتھ رہے جبکہ باقی دونوں افراد نے ہمارے ساتھ مدراس تک سفر کیا۔

Indian States Photo Credit: https://www.prokerala.com

ٹرین وقت پر روانہ ہوئی۔ تقریباً دس منٹ کے بعد ایک صاحب گرم پانی میں بھیگے تولیے لے کر آ گئے۔ یہ چھوٹے سائز کے تولیے تھے جن سے آپ اپنے منہ کو صاف کر سکتے ہیں۔ کچھ دیر بعد یہی صاحب ایک ٹرے میں مختلف جوس لے آئے اور ساتھ ہی انھوں نے ہم سے پوچھا کہ ہم کھانے میں کیا کھائیں گے؟ بھارت میں بہت سے لوگ گوشت نہیں کھاتے اور کچھ لوگ تو ایسے ہیں جو کسی انڈے وغیرہ کو بھی ہاتھ نہیں لگاتے، پانی کو بھی چھان کر پیتے ہیں تاکہ کوئی جراثیم بھی ان کے اندر نہ چلا جائے۔ زیادہ تر جین مت کے لوگ ایسا کرتے ہیں۔

ہم سب نے اپنی اپنی مرضی کے مطابق ان سے کھانے کا کہا۔ ہمارے ساتھ ایک صاحب جین مت سے تعلق رکھتے تھے۔ انھوں نے صرف اور صرف سبزی کے لیے کہا۔ یہ بات بھی دلچسپ ہے کہ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ وہ ویجیٹیرین ہیں اور کچھ لوگ خود کو نان ویجیٹیرین کہتے ہیں۔ کچھ ایسے بھی ہیں جو دونوں کے بیچ میں ہیں، وہ کچھ چیزیں کھا لیتے ہیں اور کچھ چیزوں سے انکار کر دیتے ہیں۔

کچھ دیر بعد کھانا آیا اور اس کے بعد چائے اور پھر ہاتھ صاف کرنے کے لیے تولیے۔ جب ہم کھانے سے فارغ ہوئے تو اس شخص نے ہم سب کو ایک ایک تکیہ اور کمبل لا کر دیا۔ اس سارے عمل میں تقریباً رات کے گیارہ بج چکے تھے اور ہم سب سونے کی تیاری میں مشغول تھے۔ ان پچھلے دو گھنٹوں میں ہمارا آپسی تعارف بھی ہو گیا تھا۔ جو مختصراً میں آپ کے سامنے رکھنا چاہوں گا۔

سردار صاحب کے آباؤاجداد کا تعلق کیمبل پور، موجودہ اٹک کے پاس کسی گاؤں سے تھا۔ سردار صاحب کی عمر لگ بھگ چالیس سال تھی۔ ان کے والدین تقسیم ہند کے وقت کیمبل پور سے نکل کر ہندوستان آ گئے تھے۔ اس وقت ان کی رہائش دہلی سے کچھ فاصلہ پر ایک چھوٹے سے قصبے میں تھی۔ سردار صاحب نے اپنے والدین اور خاندان

کے دیگر لوگوں سے اپنے آبائی علاقے کے بارے میں خاصی معلومات حاصل کر رکھی تھیں۔ وہ ایک بڑی کمپنی میں ملازمت کر رہے تھے اور کمپنی کے کام کے سلسلہ میں ہی بھوپال جا رہے تھے۔ میرے دونوں ساتھی سونے کی تیاری میں تھے۔ شیخ عمر فاروق صاحب سانس لینے میں کافی دقت محسوس کرتے ہیں۔انھیں گلے کی کوئی بیماری ہے۔ عام طور پر جب وہ سانس لیں یا سو رہے ہو تو کافی آواز آتی ہے لیکن سفر میں ہمراہوں کی کئی باتوں کو در گزر کرنا پڑتا ہے وہ ہماری باتوں سے در گزر کرتے ہیں اور ہم ان کی باتوں سے در گزر کرتے ہیں۔ اور اسی طرح سفر کٹ جاتا ہے۔

سردار صاحب نے بھوپال میں اتر جانا تھا لہٰذا میں یہ چاہتا تھا کہ ان کے اترنے سے پہلے جان سکوں کہ ان کے خاندان نے کیمبل پور سے نقل مکانی کیوں اور کیسے کی؟ میں ان کے پاس بیٹھ گیا۔ ہم دھیمی آواز میں باتیں کرنے لگے تاکہ ہماری باتوں سے دوسرے ساتھیوں کی نیند میں خلل نہ پڑے۔ مجھے جو انھوں نے بتایا اس کا مختصر خلاصہ میں آپ کے سامنے رکھ رہا ہوں۔ یاد رہے میں بھی ایک مہاجر کی اولاد ہوں جو بے یارومددگار اپنا سب کچھ حتیٰ کہ اپنی منکوحہ (جسے سکھ اغواء کرکے لے گئے تھے) کو بھی چھوڑ کر پاکستان آگیا تھا۔ اس لیے جب کوئی مجھے اپنی نقل مکانی کی داستان سناتا ہے تو مجھے اپنے خاندان کی نقل مکانی سامنے نظر آ جاتی ہے۔

سردار دل جیت سنگھ پوٹھوہاری: تقسیم ہند کے کیمبل سے دہلی تک

سردار صاحب نے بتایا کہ ان کے والد کا نام شیر سنگھ ہے اور وہ ایک زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ علاقے میں زیادہ تر مسلمان رہتے تھے۔ ہندوؤں اور سکھوں کی آبادی بہت کم تھی۔ بچپن میں وہ جیسے باقی بچے کھیلتے ہیں ان کا بچپن بھی دوسرے بچوں جیسا ہی گزرا۔ وہ مقامی طور پر منعقد ہونے والے مختلف میلوں میں شریک ہوتے تھے۔ ملاپ اردو کا ایک اخبار تھا جو اس علاقے میں کبھی کبھار ملتا تھا۔ انھوں

نے ایک انتہائی دلچسپ بات بتائی کہ اس علاقے میں کاغذ بہت کم ملتا تھالہٰذا وہ زمین پر ریت کی بڑی سی سلیٹ بنا لیتے اور اس پر مختلف چیزیں لکھ کر یاد کر لیتے تھے۔اس سے پہلے کہ سردار صاحب مجھے نقل مکانی کی بابت کچھ بتاتے وہ خاموش ہو گئے۔

انھوں نے نم زدہ آنکھیں چھپانے کی ایک ناکام کوشش کی اور ایک لمبی سانس کھینچ کر بتایا کہ تقسیم کے وقت ان کے والد صاحب کی عمر سولہ سال تھی اور وہ کیمبل پور میں ایک ہندو ہائی سکول میں زیر تعلیم تھے۔جب حالات خراب ہونا شروع ہوئے تو ہر کسی کو فکر لاحق ہوئی۔ان کے گاؤں میں بھی ہندوؤں اور سکھوں کے گھر تھے۔جب ان کے گھروں پر حملے ہونے لگے تو ایک مسلمان خاندان نے انھیں پناہ دی۔اس دوران کچھ لوگوں اس گھر پر آئے اور بوڑھی خاتون سے پوچھا کہ یہاں پر کوئی ہندو یا سکھ تو نہیں چھپے ہوئے۔اس خاتون نے بڑی دلیری سے جواب دیا کہ یہاں پر ایسا کوئی شخص نہیں ہے۔ اس دوران جو لوگ گھروں سے باہر تھے انھیں مار دیا گیا۔ان میں سردار صاحب کے دادا جی بھی شامل تھے ان کے خاندان کے بے شمار لوگوں کو مارا گیا۔یہ سب کچھ سناتے ہوئے کبھی وہ خاموش ہو جاتے اور کبھی ان کی آواز بھی بھرا جاتی تھی۔

میں صورتحال کو دیکھتے ہوئے مزید سوالات کرنے سے رُک گیا اور صرف اتنا پوچھا کہ ہندوستان میں ان کا خاندان کیسے پہنچا؟

اس پر انھوں نے بتایا کہ پہلے کسی نے انھیں کیمبل پور کے ہندو ہائی سکول میں پہنچا دیا۔وہاں وہ دو ماہ تک رہے۔بعد ازاں وہ کوئلہ لے جانے والی وین میں بیٹھ کر واہ کینٹ آ گئے۔جہاں پر وہ کئی ماہ تک رہے پھر ایک دن ایک ٹرین آئی جو انھیں اٹاری اور امرتسر کے راستے ہندوستان لے آئی۔لاہور سٹیشن پر اس ٹرین کو لوٹا گیا اور قتل و غارت بھی کی گئی۔جو خوش نصیب تھے وہ سرحد عبور کر کے ہندوستان آ گئے۔جن میں

ان کا خاندان بھی شامل تھا۔ کئی لوگ راستے میں زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

ایک اچھا خاصا زمیندار گھرانہ دہلی میں قائم کیمپوں میں آگیا۔ میں نے ان سے آخری سوال یہ پوچھا کہ سردار صاحب آپ کے والد 16 سال کی عمر کے تھے جب یہ واقعہ ہوا تو انھوں نے یہاں پر آکر کیا کیا؟ ہم ابھی یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ ایک سٹیشن آگیا جس پر چھوٹے چھوٹے بچے کھانے پینے کی چیزیں جیسے ٹافی اور بسکٹ وغیرہ بیچ رہے تھے۔ سردار صاحب نے ایک بچے کی طرف اشارہ کیا اور کہا کہ میرے والد کئی سال تک دہلی کے مختلف ریلوے سٹیشن پر اسی طرح کی چیزیں بیچا کرتے تھے۔ انھیں پڑھنے کا شوق تھا لہٰذا وہ دن میں پڑھتے اور شام میں یہ کام کرتے۔ وہ محنتی تھے اسی لیے بہت جلد اپنے آپ کو سنبھال لیا اور ہماری تعلیم کا بھی بندوبست کیا۔ میں الیکٹریکل انجینئر ہوں۔ والد صاحب چند سال پہلے فوت ہوئے ہیں، ماتا حیات ہیں۔ جب کبھی انھیں کیمبل پور کی یاد آتی ہے تو وہ باتیں کرنا شروع کر دیتی ہیں، بیچ میں روتی ہیں اور ہمیں بھی رولا دیتی ہیں۔۔۔ آخری بات پر میں بھی اپنے خاندان کی ہجرت یاد کرتے ہوئے کھڑکی سے باہر دیکھ کر اپنے غم چھپانے کی کوشش کرنے لگا۔

کافی دیر خاموشی کے بعد سردار صاحب نے ایک مرتبہ پھر گفتگو شروع کی اور کہنے لگے ہندوستان آنے کے بعد ہم لوگ کئی ماہ تک عارضی کیمپوں میں رہے۔ بعد ازاں دہلی سے خاصا دور پنجاب کے ایک بڑے قصبے میں ہمیں کچھ مکانات دیئے گئے اور ہم نے ان میں رہنا شروع کر دیا۔ یہ کہنے کے بعد سردار صاحب نے ایک لمبا وقفہ کیا اور بولے کہ مشتاق جی جن گھروں میں ہمیں رہنے کے لیے کہا گیا تھا وہ اس قصبے کے مشرق میں واقع تھے۔ لوگوں نے بتایا کہ وہ محلّہ مسلمانوں کا تھا اس علاقہ میں ان کی مسجد بھی موجود تھی لیکن بے آباد تھی، کیونکہ اب اس محلّہ میں کوئی مسلمان نہیں رہتا تھا۔

تقسیم ہند کے وقت ان پر بہت ظلم ہوا انھیں لوٹا گیا، مارا گیا اور گھروں سے نکلنے پر مجبور کیا گیا۔ جو مکانات خالی ہوئے وہ پاکستان سے آنے والے ہندوؤں اور سکھوں کو الاٹ کر دیے جاتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ ہم جس گھر میں رہے تھے اس کی کوئی بھی چیز باقی نہیں تھی، سوائے بچوں کی چند کتابوں کے۔ جب میں نے ان کتابوں کو پہلی مرتبہ دیکھا تم مجھے یوں لگا کہ یہ میری وہی کتابیں ہیں جو میں کیمبل پور کے گاؤں میں اپنے گھر میں چھوڑ آیا تھا۔

لوٹنے والوں کو سب چیزوں سے دلچسپی تھی سوائے ان کتابوں کے!

سردار صاحب کی کتابوں والی بات سے مجھے یاد آیا کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ میں ہمارا گھر سٹیشن کے سامنے والی گلی میں تھا۔ لکڑ منڈی کا شمال میں کھلنے والا راستہ بھی ہمارے گھر کے پاس ہی تھا جو کسی زمانے میں ایک گیٹ تھا۔ ہماری گلی کے سب لوگ مہاجر تھے، جس کا مطلب یہ تھا کہ اس گلی میں پہلے ہندو یا سکھ رہتے تھے۔ ہماری گلی میں جو سب سے بڑا گھر تھا وہ لکڑ منڈی کے گیٹ کے بالکل ساتھ تھا۔ جہاں شیعہ حضرات رہتے تھے۔ اس گھر کے ایک کمرے کا دروازہ لکڑ منڈی کے گیٹ کی طرف کھلتا تھا۔ یہ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جو میرے والدِ محترم نے جانوروں کا چارہ سٹاک کرنے کے لیے لیا ہوا تھا۔

ایک دن میں نے دیکھا کہ دیوار میں ایک الماری بنی ہوئی ہے جس میں بڑی تعداد میں کتابیں موجود تھی۔ میں نے کچھ کتابیں اٹھائیں۔ وہ بہت موٹی کتابیں تھیں۔ ان میں سے ایک کتاب میں نے اپنے سکول کے استاد محترم کو بھی دکھائی۔ انھوں نے اسے دیکھ کر کہا کہ یہ بہت قیمتی کتاب ہے۔وہ کتاب انگلستان کی تاریخ کے بارے میں تھی۔انھوں نے اسے سکول کی لائبریری میں رکھ لیا اور مجھے کہا کہ اگر اس طرح کی کتابیں مزید بھی وہاں پڑی ہوں تو لے آئیں۔ میں نے وہاں سے بہت ساری کتابیں لے جا کر اپنی سکول کی لائبریری میں رکھیں۔اس وقت میں چھٹی جماعت میں پڑھتا تھا اور ہم نے

انگریزی کی اے بی سی پڑھنا شروع کی تھی۔ الماری میں انگریزی کی کچھ ابتدائی کتابیں بھی تھیں۔ میں ان کتابوں سے انگریزی پڑھتا تھا۔ اس طرح میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ ایک ہندو کی چھوڑی ہوئی کتابوں سے میں بھی مستفید ہوا ہوں۔ جب شیعہ حضرات اس گھر میں آئے تھے تو انھوں نے بتایا کہ گھر کے اندر کوئی قابلِ استعمال گھریلو سامان نہیں تھا لیکن جیسے سردار صاحب نے بتایا کہ لوٹنے والوں کو بھی کتابوں سے کوئی سروکار نہیں تھا، ایسا ہی انھوں نے ٹوبہ ٹیک سنگھ میں بھی کیا۔

سب کچھ لوٹا گیا۔۔۔ کتابیں محفوظ رہیں۔۔۔ یہاں بھی اور وہاں بھی۔۔۔

سردار صاحب گویا ہوئے کہ اس مکان کی دیواروں پر خون کے چھینٹے تھے۔ ہمیں چیخوں کی آوازیں تو سنائی نہیں دے رہی تھی لیکن خون کے چھینٹے دیکھ کر ہمیں یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ یہاں پر ان پر کیا بیتی ہوگی۔ سردار صاحب نے یہ بھی بتایا کہ جب میری ماتا دیوار صاف کر رہی تھی تو ساتھ میں رو بھی رہی تھی۔ یوں لگتا ہے جیسے کہہ رہی ہوں کہ خون کا رنگ تو ایک جیسا ہی ہے اور قتل بھی ایک جیسا ہی ہوتا ہے۔ ظلم بھی ایک جیسا ہی ہوتا ہے، لوٹ مار اور نقل مکانی بھی ایک جیسی ہی ہوتی ہے، وہ ہندوستان سے پاکستان کی طرف مسلمانوں کی ہو یا پاکستان سے ہندوستان کی طرف ہندوؤں اور سکھوں کی ہو۔ یہاں بھی زمینداروں کے بچوں نے بازاروں میں ٹافیاں بیچی ہیں اور مجھے یقین ہے کہ اس گھر میں رہنے والے مسلمانوں نے بھی پاکستان میں جا کر کئی سال تک بازاروں میں ٹافیاں ہی بیچی ہونگی۔ یہاں بھی ہمیں کسی نے ہار نہیں پہنائے اور جو یہاں سے وہاں گئے انھیں بھی کسی نے ہار نہیں پہنائے ہوں گے۔ سب کو بوجھ سمجھا گیا اور غریب جان کر مدد بھی کی گئی۔

کچھ ہی دیر میں سرحد کے دونوں اطراف رہنے والے بادشاہ سے فقیر ہوگئے!

کچھ وقفے کے بعد جب ہم دونوں میں مزید بات کرنے کا حوصلہ پیدا ہوا تو سردار صاحب نے ایسی بات کہی جو میں نے کبھی نہیں سوچی تھی۔ انھوں نے کہا کہ ایک دن میں نے اپنے پتہ سے پوچھا یہ ٹھیک ہے کہ آپ اپنے گاؤں سے ڈر کے مارے نکل آئے اور ایک لمبے عرصے تک کیمپوں میں رہے اور آپ کے بقول چند ماہ بعد امن ہو گیا تو آپ نے واپس اپنے گاؤں جانا پسند کیوں نہ کیا اور ہندوستان کا ہی انتخاب کیوں کیا؟ جب کہ ابھی بھی ہمارے کافی رشتہ داران علاقوں میں رہ رہے ہیں۔

یہ وہ سوال تھا جو میں نے کبھی بھی اپنے بزرگوں سے نہیں کیا تھا لیکن سردار صاحب نے یہ سوال اپنے بزرگوں سے کیا۔ سردار صاحب نے بتایا کہ ان کے پتا نے کہا کہ اس وقت ماحول یہ بن چکا تھا کہ پاکستان مسلمانوں کے لیے جبکہ ہندوستان ہندوؤں اور سکھوں کے لیے ہے۔ اگر آپ امن سے رہنا چاہتے ہیں تو مسلمانوں کو پاکستان ہندو اور سکھوں کو ہندوستان چلے جانا چاہیے۔ یہ وہ تصور تھا جس کی بنیاد پر سب نے واپس اپنے گاؤں جانے کی بجائے ایک ان دیکھے ملک میں جہاں ان کا کوئی واقف بھی نہیں تھا، رشتہ دار تو دور کی بات تھی، جہاں ان کی کوئی جائیداد بھی نہیں تھی اور نئے سرے سے دوبارہ زندگی شروع کرنی تھی، ہندوستان کو ترجیح دی۔

میں نے ڈرتے ڈرتے ایک اور سوال پوچھا کہ کیا کبھی آپ کے پتا نے اپنے اس فیصلے پر بھی بات کی تھی؟ سردار صاحب نے بتایا کہ میں نے یہ سوال تو نہیں پوچھا لیکن ان کی باتوں سے یہ ضرور محسوس کیا کہ شروع میں تو وہ کہتے تھے کہ ہمیں نہیں آنا چاہیے تھا لیکن جب وہ سنبھل گئے اور ارد گرد کے لوگوں سے ان کے اچھے تعلقات بن گئے تو پھر وہ کہتے تھے کہ جو ہوا ٹھیک ہوا۔ وہ یہ بات ضرور کہتے تھے کہ تقسیم ہند میں نقل مکانی یا ہجرت کی بات نہیں ہوئی تھی، صرف اکثریت کی بات تھی۔ ہمارے لیڈروں کے درمیان طے یہ ہوا تھا کہ جس علاقے میں مسلمان اکثریت میں رہتے ہیں وہ پاکستان کہلائے گا لیکن اس کا یہ مطلب نہیں تھا پاکستان میں غیر مسلم نہیں رہ سکتے۔

یہ بحث کافی دیر سے چل رہی ہے اور شاید آئندہ بھی سو سال تک چلتی رہے گی۔ کچھ لوگ اس کے حق میں اور کچھ اس کی مخالفت میں ہیں۔ مجھے اپنے آباؤاجداد کے فیصلے پر تنقید کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں ۔ اس لیے کہ انھوں نے اس وقت کی صورتحال کے مطابق جو بہتر سمجھا وہی فیصلہ کیا۔ اگر میں اس وقت موجود ہوتا تو میں بھی اپنے حالات کے مطابق فیصلہ کرتا جو شاید آج کی نسل کو پسند نہ ہوتا۔ اس لیے میں یہ سمجھتا ہوں کہ جو بھی فیصلہ ہوتا ہے وہ اس وقت کے حالات کے مطابق ہی کیا جاتا ہے۔ بعد ازاں جب فیصلے کا تجزیہ کیا جاتا ہے تو کلی طور پر حالات ہمارے سامنے نہیں ہوتے۔ جس وجہ سے ہمیں فیصلے کو غلط یا صحیح قرار دینے کا کوئی حق حاصل نہیں ہوتا۔

پھر اس کے بعد نیند کی دیوی کو آتے آتے بہت دیر لگ گئی ۔۔۔ مجھے بھی اور سردار صاحب کو بھی۔

Migration at mass level in 1947 Photo Credit: https://www.pinterest.com

Attock Khurd railway station, est. 1885 © Muhammad Mudassir

Gurdwara Panja Sahib © Usman Khan

گوالیار ایک تاریخی شہر جہاں شیخ احمد سرہندی کو جہانگیر نے قید کیا

دہلی سے چلتے وقت رنبیر صاحب نے ہمیں ریلوے سٹیشن کے ایک سٹال سے انڈین ریل کا ایک ٹائم ٹیبل لے کر دیا۔ جب انھوں نے ہمارے لیے یہ ٹائم ٹیبل خریدا تو مجھے یاد آیا کہ ہم اپنے بچپن میں کبھی کبھار ایسا ہی ٹائم ٹیبل خریدتے تھے جو پاکستان ریلوے شائع کرتا تھا۔ اب کیا صورتِ حال ہے؟ وہ معلوم نہیں۔ اس میں مختلف ٹرینوں کی آمد ورفت سے متعلق لکھا ہوتا تھا۔ جب میں نے انڈین ریل کے ٹائم ٹیبل کو دیکھا تو مجھے معلوم ہوا کہ ہماری ٹرین رات دو بج کر بتیس منٹ پر گوالیار میں تین منٹ کے لیے رکے گی۔ میں نے سوچا کہ دو ڈھائی گھنٹے کی نیند کے بعد میں سٹیشن پر کچھ دیر کے لیے اتروں گا۔

اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ شیخ احمد سرہندی جنھیں مجدّد الف ثانی بھی کہتے ہیں، کو جہانگیر نے گوالیار کے قلعے میں قید کر دیا تھا۔ اس لیے میں اس شہر کو دیکھنا چاہتا تھا۔ اس قید کی وجہ جہانگیر کو تعظیمی سجدہ نہ کرنا تھا۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ جہانگیر کے دربار میں اہلِ تشیع کا خاصہ اثر و رسوخ تھا۔ جہانگیر کی ایک بیوی کا تعلق بھی شیعہ مسلک سے تھا۔ شیخ احمد سرہندی اہلِ تشیع کے نظریات کے خلاف تھے۔ کہتے ہیں کہ جہانگیر کی بیوی اور کچھ دوسرے لوگوں کے کہنے پر شیخ احمد سرہندی کو دربار میں بلوایا گیا اور انھوں نے جہانگیر کو سجدہ نہیں کیا۔ اس جرم کی پاداش میں انھیں گوالیار کے قلعے میں قید کر دیا گیا۔ گوالیار اس لحاظ سے بھی ایک تاریخی شہر ہے۔

دوسری وجہ یہ تھی کہ جناب شیخ احمد، ریاست پٹیالہ کے شہر سرہند ,جو اس وقت موجودہ بھارت کے صوبہ پنجاب میں واقع ہے میں پیدا ہوئے، اسی لیے انھیں سرہندی کہتے ہیں۔ میرے آباؤ اجداد کا تعلق بھی اسی شہر سے تھا۔ میرے والد صاحب بھی سرہند میں ہی پیدا ہوئے تھے۔ شیخ احمد سرہندی صاحب کا ہم پر ایک بہت بڑا احسان

ہے۔ سرہند ریاست پٹیالہ کا ایک اہم شہر تھا۔ اس علاقے کے بہت سے لوگوں کو شیخ احمد سرہندی اور ان کے خاندان کی وجہ سے مسلمان ہونے کی توفیق ملی۔

بہت وثوق سے کہنا تو مشکل ہے لیکن گمان یہی ہے کہ ہم ہندو یا سکھ مذہب سے مسلمان ہوئے ہیں۔ اس کا میرے پاس کوئی تاریخی ثبوت تو نہیں ہے لیکن جس طرح ہمارے علاقہ کے لوگ شیخ احمد سرہندی سے عقیدت رکھتے ہیں اور ہر سال ان کے عرس پر سرہند جاتے ہیں اس سے مجھے یہی لگتا ہے کہ سرہند شہر کے بیشتر مسلمان ان ہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔

سرہند سے جن لوگوں نے پاکستان ہجرت کی ان کی اکثریت ٹوبہ ٹیک سنگھ میں آباد ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ تقسیم ہند کے وقت سرہند شہر اور ارد گرد سے مسلمان شہر میں واقع شیخ احمد سرہندی کے مزار کے پاس بنائے گئے ایک کیمپ میں رہے۔ اس دوران ٹوبہ ٹیک سنگھ میں ہندوؤں اور سکھوں کے لیے غلہ منڈی میں عارضی کیمپ بنائے گئے۔ جب امن و امان ہو گیا تو لوگوں کے تبادلے کا وقت آیا۔

جیسے سامان ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جایا جاتا ہے اسی طرح ہنستے بستے لوگوں کو ان کے گھروں سے نکال کر ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جایا گیا۔

نقل مکانی یا ہجرت تقسیم ہند کے ایجنڈے میں شامل نہیں تھی۔۔۔ ایسا کیوں ہوا۔۔۔ کس نے اسے ایجنڈے کا حصہ بنایا۔۔۔ یہ بات کبھی تو ظاہر ہو گی۔

ٹوبہ ٹیک سنگھ سے جو ٹرین ہندوؤں اور سکھوں کو لے کر ہندوستان گئی ان میں سے اکثر لوگ دہلی میں آباد ہوئے۔ میرے بھارت کے آخری دورے پر میری ایک صاحب سے ملاقات ہوئی جو ٹوبہ ٹیک سنگھ میں اس گھر کے ساتھ والے گھر میں رہتے تھے جہاں میری پیدائش ہوئی تھی۔ اسی طرح سرہند شہر سے ایک ٹرین چلی جس میں ہمارا خاندان اور شہر کے باقی لوگ بھی سوار تھے۔ یہ ٹرین ٹوبہ ٹیک سنگھ آ کر رکی۔ اس سے یہ

ہوا کہ ایک ہی شہر کے لوگ ہجرت کر کے بھی ایک ہی شہر میں رہنے لگے جس سے انھیں کوئی اجنبیت محسوس نہیں ہوئی۔ اکثر لوگ ایک دوسرے کو جانتے تھے اور ان کی آپس میں رشتہ داریاں بھی تھیں۔

سرہند سے محبت کے اظہار کے لیے ٹوبہ ٹیک سنگھ میں انھوں نے ایک کالونی بنائی جس کا نام سرہند کالونی رکھا گیا۔ ابھی بھی ہمارے خاندان کو لوگ سرہندی ہی کہتے ہیں۔ ہمارے اکثر گھروں پر نام کے ساتھ سرہندی بھی لکھا ہوتا ہے۔ وہ شخص جس کی وجہ سے ہمارا خاندان مسلمان ہوا وہ ہمارے لیے انتہائی قابل احترام ہے اور گوالیار وہ جگہ تھی جہاں اس نے اپنے دین کی سربلندی کے لیے قید کاٹی۔

ایک لمبے عرصے کی قید کے بعد جہانگیر نے انھیں رہا کر دیا اور بڑی عزت دے کر اپنے ساتھ دربار میں بٹھایا۔ جہانگیر کے بعد بھی آنے والے مغل بادشاہ شیخ احمد سرہندی کی بہت عزت کرتے تھے۔

اس اچانک رہائی پر تاریخ میں دو مختلف باتیں ملتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ بہت ساری کرامات شیخ احمد سرہندی سے منسوب تھیں جس کی وجہ سے جہانگیر کے ذہن میں خوف پیدا ہو گیا اور اس نے آپ کو رہا کر دیا۔ دوسری بات یہ کہی جاتی ہے کہ گوالیار کے قلعے میں بہت سارے ہندو قیدی آپ کے ہاتھوں مسلمان ہو گئے۔ اس کے بارے شیخ احمد سرہندی نے کہا کہ اگر مجھے قید نہ کیا جاتا تو یہ لوگ اسلام کی برکت سے محروم رہتے۔ اتنی بڑی تعداد میں لوگوں کے مسلمان ہو جانے کی وجہ سے ہندوؤں میں یہ خوف پیدا ہو گیا کہ کہیں آپ کی تعلیمات کی وجہ سے مزید ہندو بھی مسلمان نہ ہو جائیں۔ اس لیے انھوں نے جہانگیر سے کہہ کر گوالیار کے قلعے سے آپ کو رہائی دلوائی اور واپس سرہند بھیج دیا۔ کون سی بات سچ ہے اور کونسی نہیں یہ تو معلوم نہیں لیکن تاریخ میں یہ دونوں باتیں ملتی ہیں۔ شیخ احمد سرہندی کے بارے میں بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں۔ ایک کتاب

Yohanan Friedmann نے Shaykh Ahmad Sirhindi: An Outline of His Thought and a Study of His Image in the Eyes of Posterity کے نام سے لکھی ہے جسے 1971ء میں میگیل یونیورسٹی پریس نے چھاپا ہے۔ یہ کتاب بہت سی ان کہی باتیں بھی بتاتی ہے[11]۔

یہ وہ وجہ تھی جس کے لیے میں گوالیار میں اترنا چاہتا تھا۔ رات کا وقت تھا لہٰذا زیادہ چیزیں بھی نہیں دیکھی جا سکتی تھیں۔ دوسرا یہ کہ ٹرین کا اسٹاپ بھی صرف تین منٹ کا تھا لیکن میں پھر بھی اتر گیا۔ صرف اس سرزمین سے ایک رشتہ جوڑنے کے لیے جس سرزمین نے ہمارے محسن شیخ احمد سرہندی کو پناہ دی تھی۔ میں نے ایک سٹال والے سے پوچھا کہ یہاں پر گوالیار کا قلعہ کس طرف ہے۔ اس نے مجھے بتایا کہ یہاں سے پانچ میل کے فاصلے پر پہاڑی کے اوپر یہ قلعہ موجود ہے۔ میں نے اس قلعے کی سمت پوچھی تو اس نے شمال کے طرف اشارہ کیا۔ میں نے شمال کی طرف منہ کر کے قلعہ دیکھنے کی کوشش کی جو رات کی وجہ سے ممکن نہ تھا۔۔۔ لیکن اس طرف منہ کر کے ہمارے محسن کے لیے دعا تو مانگی جا سکتی تھی۔۔۔ جو میں نے مانگی اور پھر تیزی سے ٹرین میں سوار ہو گیا۔

اس سے پہلے کہ میں آپ کے سامنے ایک انتہائی تاریخی شہر جھانسی کا تعارف پیش کروں میں چاہوں گا کہ گوالیار کی کچھ معلومات آپ سے شیئر کروں۔

علامہ اقبال نے شیخ احمد سرہندی صاحب کو ان الفاظ میں نذرانہ عقیدت پیش کیا ہے۔

حاضِر ہُوا میں شیخِ مجدّدؒ کی لحَد پر
وہ خاک کہِ ہے زیرِ فلک مطلعِ انوار

[11] https://www.jstor.org/stable/j.ctt1w6t8rm

اس خاک کے ذرّوں سے ہیں شرمندہ ستارے
اس خاک میں پوشیدہ ہے وہ صاحبِ اسرار
گردن نہ جھکی جس کی جہانگیر کے آگے
جس کے نفَسِ گرم سے ہے گرمیِ احرار
وہ ہِند میں سرمایۂ ملّت کا نِگہباں
اللہ نے بروقت کیا جس کو خبردار
کی عرض یہ میں نے کہ عطا فقر ہو مجھ کو
آنکھیں مری بِینا ہیں، و لیکن نہیں بیدار!
آئی یہ صدا سلسلۂ فقر ہُوا بند
ہیں اہلِ نظر کِشورِ پنجاب سے بیزار
عارف کا ٹھکانا نہیں وہ خِطّہ کہ جس میں
پیدا کُلَہِ فقر سے ہو طُرّۂ دستار
باقی کُلَہِ فقر سے تھا ولولۂ حق
طُرّوں نے چڑھایا نشۂ 'خدمتِ سرکار!'

گوالیار جس کا نام ایک جوگی کے نام پر رکھا گیا

کہا جاتا ہے کہ آج سے دو ہزار سال پہلے یہاں حکومت کرنے والے شہزادے کو کوڑھ کا مرض لاحق ہو گیا۔ وہ جنگلوں میں چلا گیا جہاں اسے ایک جوگی ملا۔ اس جوگی نے اسے ایک دریا میں نہانے کو کہا۔ جس سے اس کا مرض ٹھیک ہو گیا۔ اس جوگی کا نام گوالی پا تھا۔ شہزادے نے خوش ہو کر اس سے پوچھا کہ وہ اس کی کیا خدمت کرے۔ جوگی نے کہا

کہ یہاں پر بہت سے لوگ عبادت کرتے ہیں۔ جنھیں جنگلی جانوروں سے خطرہ رہتا ہے۔ آپ ہمارے لیے یہاں پر ایک دیوار بنا دیں۔ شہزادے نے ان کے لیے ایک بڑا مکان بنوا دیا۔ مکان اتنا بڑا ہوا کہ پھر اسی جگہ پر گوالیار کا قلعہ بنایا گیا۔

اس قلعے سے متعلق بابر نے یہ کہا کہ ہندوستان کے تمام قلعوں کی مالا میں اس قلعے کا مقام اس مالا میں پروئے گئے سب سے بڑے موتی جیسا ہے۔ میں ان علاقوں کو دیکھ سکا اور نہ ہی اس کا کوئی امکان تھا۔ یاد رہے کہ ہم جب بھی ہندوستان کا ویزا لیتے ہیں تو ہمیں زیادہ سے زیادہ پانچ شہروں کا ویزا دیا جاتا ہے۔ یہ پابندی بھارت میں صرف پاکستانی لوگوں کے لیے ہی ہے، بالکل اسی طرح کی پابندی پاکستان جانے والے بھارتی لوگوں کے لیے بھی ہے۔

مختلف اوقات میں اس علاقے پر مختلف لوگ حکمرانی کرتے رہے لیکن تاریخی کتب میں ایک بہت ہی اہم بات درج ہے کہ یہاں پر پہلی صدی عیسوی میں تورامانہ خاندان کی حکومت رہی ہے۔ ان کے دور حکومت میں اس علاقہ میں بے شمار ترقی ہوئی۔ کہا جاتا ہے کہ وہ ایک سنہری دور تھا۔ حکمران انتہائی دیانت دار تھے جنھوں نے علاقے کے کلچر کو پروان چڑھانے میں بہت کام کیا۔ آج بھی اس علاقے میں تورا لفظ دیانت و امانت کے لیے بولا جاتا ہے۔

دسویں صدی کے آخر میں محمود غزنوی نے ہندوستان پر حملے شروع کیے اور اب تک جتنی معلومات میں نے ان حملوں کے بارے میں حاصل کی ہیں اس کے مطابق زیادہ تر حملے ان مندروں پر ہوتے تھے جو ہندوؤں کے نزدیک بہت ہی مقدس اور بڑے ہوتے تھے۔ انھی میں ایک تیلی کا مندر بھی گوالیار میں موجود تھا۔ غزنوی نے حملہ کیا لیکن پہاڑی علاقہ ہونے کی وجہ سے اسے فتح نہ کر سکا۔ جب سلاطین دہلی کی حکومت تھی تو اس وقت التمش نے اس علاقے پر قبضہ کر لیا۔ یہ تیرویں صدی کے آغاز کا واقعہ ہے۔ پھر

اس علاقے پر مسلمانوں نے کافی دیر تک اپنی حکومت کی۔ راجہ ویر سنگھ کو اس علاقے کا گورنر بنایا گیا۔ (میں ہمیشہ سے یہ سمجھتا تھا کہ سنگھ کا لفظ صرف سکھوں کے لیے بولا جاتا ہے لیکن جب میں نے تاریخ پڑھی تو پتہ چلا کہ سنگھ کا لفظ تو ہندو بھی تواتر سے استعمال کرتے تھے اور کرتے ہیں)۔ سکھ دھرم کے دسویں گرو، گرو گوبند سنگھ نے سکھ مردوں کے نام کے ساتھ سنگھ اور سکھ عورت کے نام کے ساتھ کور کا لاحقہ لازمی قرار دیا۔

راجہ مان سنگھ بھی اس علاقے پر کافی دیر تک حکمرانی کرتے رہے۔ اگرچہ اس کا تعلق جین مت سے نہیں بھی تھا تب بھی اس کے دور میں جین مت نے بہت ترقی کی۔ راجہ مان سنگھ نے یہاں پر ایک خوبصورت مندر بنایا جس کا نام مان مندر پیلس ہے۔ پیلس کا لفظ اس وقت تو نہیں بولا جاتا ہوگا کیونکہ یہ انگریزی کا لفظ ہے۔ اس وقت تو مندر کا نام صرف مان سنگھ مندر ہوگا بعد میں اس کے ساتھ پیلس کا لفظ لگایا گیا ہوگا۔ یہ انگریزی زبان سے محبت کا اظہار بھی لگتا ہے۔

محبت ہے یا مرغوبیت، کچھ تو ہے!

انگریزوں کی آمد سے کچھ عرصہ قبل یہاں پر ایک سندیاس نام کی ریاست قائم ہوئی جو ان سینکڑوں ریاستوں میں سے ایک تھیں جنھیں پرنسلی اسٹیٹ کہا گیا ان ریاستوں کا انگریزوں سے الحاق تھا۔ جب انگریز چلے گئے تو ریاستیں بھی ختم کر دی گئیں۔ اب یہ مدھیہ پردیش کا ایک بہت ہی اہم شہر ہے۔ مدھیہ سے مراد درمیانہ یا مرکزی ہوتا ہے۔ مدھیہ پردیش بھارت کے مرکز میں واقع ہے۔ یہ وہ علاقے ہیں جہاں پر ہندو تہذیب و تمدن کے سب سے زیادہ نشانات پائے جاتے ہیں۔

اس شہر میں بہت زیادہ تاریخی مقامات ہیں۔ یہ مناسب سرد علاقہ ہے یہاں ہر طرف پہاڑیاں ہیں، کہا جا سکتا ہے کہ یہ شہر ہندوستان کے ان سو شہروں میں سے ہے جنھیں بھارتی حکومت سمارٹ سٹی بنانا چاہتی ہے۔ اس شہر کے بارے میں ایک مضمون

گوالیار ڈویزن کی ویب سائٹ پر موجود ہے[12]۔ میں نے پوری کوشش کی کہ کوئی ایسی کتاب مل جائے جس میں گوالیار کی تاریخ درج ہو جو مجھے نہ مل سکی۔ البتہ کئی لوگوں کے مضامین ضرور ملے۔ جن میں سب سے اہم درج بالا مضمون ہے۔

یہاں کی ایک بات جو مجھے اچھی نہیں لگی کہ یہ دنیا کے انتہائی آلودہ شہروں میں سے ایک شہر ہے۔ جس کی وجہ یہاں پر بہت زیادہ کارخانوں کا ہونا ہے۔ جہاں پر دولت آتی ہو اور اگر دولت کمانے والے ذرائع کا خیال نہ کیا جائے تو پھر آلودگی تو لازمی ہے۔ گوالیار سے بے شمار مسلمانوں نے ہجرت کی۔ جن کی اکثریت کراچی میں رہتی ہے۔ان لوگوں نے اپنے آبائی شہر گوالیار سے محبت کے اظہار کے لیے ملیر کینٹ کے شمال میں گوالیار کوآپریٹو ہاؤسنگ سوسائٹی بھی بنائی ہوئی ہے۔ اگر آپ کراچی جائیں تو آپ کو گوالیار کے نام کی دکانیں نظر آتی ہیں۔جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ گوالیار میں مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد رہتی تھی ۔ اس وقت گوالیار میں قریباً دس فیصد کے قریب مسلمان رہتے ہیں۔ جبکہ ہندوؤں کی تعداد نوے فیصد کے قریب ہے۔ جین مت کے لوگ بھی اس علاقے میں رہتے ہیں جو کہ آبادی کا دو فیصد حصہ ہیں۔ شہر کی آبادی دس لاکھ سے زائد ہے۔اس کا مطلب ہے کہ ایک لاکھ سے زائد مسلمان اس شہر میں رہتے ہیں۔ایک صاحب نے بتایا کہ گوالیار وہ شہر ہے جہاں پر ایک آدھ بار کے علاوہ کبھی بھی ہندو مسلم فسادات نہیں ہوئے ۔ عمومی طور پر سب لوگ امن سے رہ رہے ہیں۔ یہ ایک ہندو صاحب کی رائے تھی۔ حقیقت کچھ اور بھی ہو سکتی ہے۔ تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ تان سین بھی اس شہر میں بارہا آیا۔ جس کی وجہ اس شہر کے لوگوں کا موسیقی سے لگاؤ بھی تھا۔اب بھی اس شہر میں کئی موسیقی کے ادارے اور تنظیمیں موجود ہیں جو تان سین کے نام سے منسوب ہیں۔

[12] https://gwaliordivisionmp.nic.in/en/history/

Gawaliar Fort Photo Credit: https://www.offset.com
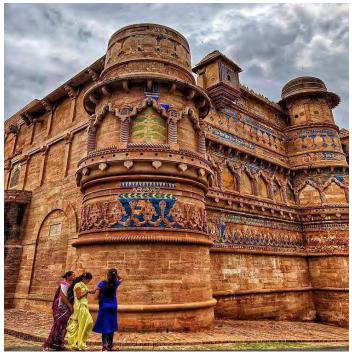
Gawalar Fort, Photo Credit: https://www.westend61.de

جھانسی: جنگِ آزادی کی ایک ہیروئن، رانی جھانسی کا شہر

ریلوے کے ٹائم ٹیبل سے مجھے پتہ چلا کہ ہماری گاڑی صبح چار بجے کے قریب جھانسی پہنچے گی۔ اگر آپ کو یاد ہو تو جنگِ آزادی میں انگریزوں کے خلاف جن لوگوں نے حصہ لیا ان میں ایک نام رانی جھانسی کا بھی تھا۔ اس وقت رانی جھانسی کا نام بہادری کی نشانی بن گیا اور اب تک ہے۔ بھارت میں ان کے نام پر متعدد ناول لکھے گئے اور کئی فلمیں بھی بنائی گئیں۔ جھانسی شہر میں ان کے نام پر ایک زرعی یونیورسٹی بھی بنائی گئی ہے۔ اس کے علاوہ اس علاقے میں بے شمار اہم عمارتوں کا نام رانی جھانسی کے نام پر رکھا گیا ہے۔ اس

سے پہلے کہ میں آپ کو رانی جھانسی کی زندگی کے بارے میں کچھ بتاؤں، میں مختصر طور پر یہ بتانا چاہوں گا کہ جھانسی کیسا علاقہ ہے۔

جب ہماری ٹرین نئی دہلی سے چلی تھی تو ہم اس علاقے میں تھے جسے مرکزی حکومت کنٹرول کرتی ہے۔ اس کے بعد ہماری ٹرین ہریانہ میں داخل ہوئی، ہریانہ کے بعد ہم اتر پردیش (جسے یو پی بھی کہتے ہیں) میں سے گزرے اور پھر گوالیار جو کہ مدھیہ پردیش میں ہے اور ایم پی کہلاتا ہے، سے ہمارا گزر ہوا اور ایک دفعہ پھر ہم یو پی میں آ گئے، جس میں جھانسی شہر واقع ہے۔ جھانسی شہر یو پی کے انتہائی جنوب میں واقع ہے جو یو پی اور ایم پی کی سرحد بنتا ہے۔

یہ شہر سطح سمندر سے ایک ہزار فٹ بلند ہے۔ دہلی سے اس کا فاصلہ تقریباً چار سو کلو میٹر ہے۔ اس کا پرانا نام بلونت نگر تھا۔ جھانسی کے بعد ایک بہت بڑا علاقہ شروع ہوتا ہے جس کا نام بندیل کھنڈ ہے۔ اس لیے جھانسی کو بندیل کھنڈ کا دروازہ بھی کہتے ہیں۔ اس علاقے میں کئی پہاڑی سلسلے بھی ہیں۔ یہاں کے میدانی علاقوں میں موسم نسبتاً گرم جب کہ پہاڑی علاقوں میں موسم کافی معتدل ہوتا ہے۔

میں نے جب جھانسی کے بارے میں پڑھا تو مجھے معلوم ہوا کہ یہ کوئی تاریخی شہر تو نہیں لیکن اس شہر سے متعلق دو باتیں بڑی ہی دلچسپ ہیں۔ ایک تو یہ کہ صفائی کے لحاظ سے یو پی کا دوسرا بڑا شہر ہے اور ان سو شہروں میں شامل ہے جنھیں اسمارٹ سٹی کا درجہ دیا جائے گا۔ اس علاقے میں سِٹریس یعنی ترشاوہ پھل یعنی کینو، مالٹا وغیرہ بہت بڑی تعداد میں ہوتا ہے۔ ہم فروری کے مہینے میں اس جگہ سے گزر رہے تھے جو کہ ترشاوہ پھل کا سیزن تھا۔ میری یہ خواہش تھی کہ میں سٹیشن سے کوئی نہ کوئی ترشاوہ پھل ضرور حاصل کروں اور دیکھوں کہ ہمارے سرگودھا کے مقابلے میں وہ کیسا ہے؟ اتفاق سے اس جگہ پر ٹرین کا سٹاپ بھی دس منٹ کا تھا۔ دوسری اہم بات یہ تھی کہ اس کا پلیٹ فارم لمبائی

کے لحاظ سے دنیا میں ساتویں نمبر پر ہے۔ یاد رہے دنیا کا طویل ترین ریلوے سٹیشن ہندوستان کا گورکھپور سٹیشن ہے جس کی لمبائی تیرہ سو میٹر ہے۔ان دو باتوں کی وجہ سے میں اس ریلوے سٹیشن پر اترنا چاہتا تھا۔

ابھی میری نیند کو دو گھنٹے بھی نہیں ہوئے تھے کہ ہم جھانسی پہنچ گئے۔ بڑی مشکل سے میں کمبل سے نکلا اور پلیٹ فارم پر آگیا۔ ایک جگہ پر مجھے مالٹے مل گئے جو میں نے فوراً خرید لیے۔ میرا دوسرا مقصد پلیٹ فارم دیکھنا تھا۔ میں اس کی لمبائی کو دیکھتا رہا اور ایک سٹال سے چائے بھی پی کیونکہ میں ابھی جاگنا چاہتا تھا تاکہ اگلے دو گھنٹے کے بعد سردار صاحب کو بھوپال سٹیشن پر خدا حافظ کہہ سکوں۔

چائے پیتے ہوئے میں نے سٹال پر موجود لڑکے سے باتیں کرنا شروع کر دیں۔ میں نے اس سے پوچھا آپ رانی جھانسی کو جانتے ہیں؟ میں بہت حیران ہوا جب اس نے کہا کہ آپ کس کی بات کر رہے ہیں؟ میں نے کہا کہ اس کی جس نے جنگ آزادی میں بہت بہادری سے انگریزوں کا مقابلہ کیا۔اس پر اس نے جواب دیا کہ ہم انھیں رانی جھانسی نہیں بلکہ لکشمی بائی رانی آف جھانسی کہتے ہیں۔ مجھے تھوڑی سی شرمندگی بھی ہوئی۔ ہم نے تو کتابوں میں صرف یہی لکھا ہوا تھا "رانی جھانسی"۔ غور کیا تو معلوم ہوا رانی جھانسی تو کوئی نام نہیں ہے بلکہ یہ تو ایک ٹائٹل ہے۔اِن کا اصل نام تو لکشمی بائی رانی آف جھانسی ہے۔

جنگ آزادی میں مردوں کے ساتھ ساتھ جن دو خواتین کا ذکر ملتا ہے ان میں ایک کا نام بیگم حضرت محل تھا جو نواب واجد علی شاہ والیِ اودھ کی دوسری بیگم تھیں، دوسری بہادر خاتون لکشمی بائی رانی آف جھانسی ہیں۔ جھانسی کی آبادی چھ لاکھ سے زائد ہے۔ جس میں مسلمان سترہ فیصد، بیاسی فیصد ہندو اور باقی لوگ سکھ اور عیسائی مذہب

سے ہیں۔اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس علاقہ میں بسنے والے مسلمانوں کی تعداد ایک لاکھ کے قریب ہو گی۔

یہ علاقہ بھارت کے بالکل وسط میں اور پاکستان کی سرحد سے آٹھ سو کلومیٹر کی دوری پر واقع ہے۔اس لیے اس علاقہ سے بہت کم لوگوں نے پاکستان ہجرت کی ہے(یہ بات میں اپنے ذاتی مشاہدے کی بنیاد پر کہہ رہا ہوں)۔ مجھے ڈھونڈنے سے بھی ایسی کوئی بات اس کے حق یا مخالفت میں نہیں ملی اس لیے یہ مشاہدہ درست بھی ہو سکتا ہے اور غلط بھی۔

لکشمی بائی رانی آف جھانسی

میں مختصراً لکشمی بائی رانی آف جھانسی کا ذکر کرنا چاہوں گا۔جس سے آپ یہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اہلِ ہند نے کس طرح مل جل کر انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنے کے لیے جدوجہد کی اور اس کے لیے بے تحاشہ قربانیاں دیں۔

لکشمی بائی رانی آف جھانسی 1828ء میں بنارس میں پیدا ہوئیں اور 1858ء میں، صرف تیس سال کی عمر میں میدانِ جنگ میں ایک سوار کی وردی پہن کر دست بدست جنگ کرتے ہوئے اس دنیا سے چلی گئیں۔آپ کے والد مہاراشٹرا سے آئے تھے اور پیشوا باجی راؤ کے ساتھ کام کرتے تھے۔ لکشمی بائی کی عمر چار سال تھی جب ان کی والدہ وفات پا گئیں۔ ان کی تعلیم و تربیت کا بندوبست گھر میں ہی کیا گیا۔ وہ بچپن ہی سے گھڑ سواری، ویٹ لفٹنگ اور پہاڑوں پر چڑھنے جیسے مشکل کاموں میں دلچسپی رکھتی تھیں۔ان کی شادی جھانسی کے مہاراجہ کے ساتھ کر دی گئی۔ان کے ہاں ایک بیٹا پیدا ہوا جس کا نام دامودر راؤ رکھا گیا۔ وہ صرف چار ماہ کی عمر میں فوت ہو گیا۔ مہاراجہ نے اپنے ایک عزیز کے بچے انند راؤ کو اپنا منہ بولا بیٹا بنالیا اور اس کا نام دامودر راؤ رکھا۔اس وقت اس ریاست کا انگریزوں سے الحاق تھا۔ انگریز آفیسر کی موجودگی میں راجہ نے اس سے کہا کہ میرے

مرنے کے بعد یہ لڑکا میرا وارث ہوگا۔۔جب راجہ کی وفات ہوئی تو انگریزوں نے ریاست پر قبضہ کرنے کی غرض سے راجہ کے منہ بولے بیٹے کو والیِ ریاست ماننے سے انکار کر دیا۔ اس پر لکشمی بائی نے احتجاج کیا۔ انگریزوں نے ان کا ساٹھ ہزار روپیہ ماہانہ وظیفہ مقرر کر دیا۔

جب جنگ آزادی شروع ہوئی تو ہر جگہ بغاوت ہوئی۔ جھانسی شہر میں ساٹھ کے قریب انگریزوں کو قتل کر دیا گیا۔ بنگال رجمنٹ کے سپاہیوں نے چھاؤنی پر قبضہ کر لیا اور بہت ساماال و دولت لوٹنے کے ساتھ ساتھ بے شمار اسلحہ بھی قبضے میں لے لیا۔ اس دوران انگریز دوسری جگہ سے مدد کی اپیل کرتے رہے۔جب لکشمی بائی کو یہ یقین ہو گیا کہ اب لڑے بغیر کوئی چارہ تو انھوں نے اپنی فوج تیار کی۔ ان کے پاس توپ وغیرہ تو نہیں تھی لہٰذا انھوں نے شہر میں توپ تیار کرنے کا بندوبست بھی کیا اور شہر کی حفاظت کے لیے توپیں بھی تیار کر لیں۔

انگریزوں نے اپنی بہت ساری فوج اکٹھی کر کے جھانسی کا محاصرہ کر لیا۔ جب انگریزوں نے حملہ کیا تو انھیں بہت مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا جس کا انھیں اندازہ نہیں تھا۔ ایک طویل محاصرے کے بعد لکشمی بائی کو اندازہ ہو گیا کہ اب شکست لازم ہے کیونکہ انگریزوں نے قلعے کی ایک بہت بڑی دیوار کو گرا دیا تھا۔ باہمی مشورے سے یہ طے ہوا کہ لکشمی بائی اپنے چند وفادار ساتھیوں سمیت گوالیار کی طرف چلی جائے۔ ان کے ساتھیوں کی فہرست میں خدا بخش اور غلام غوث کے علاوہ بھی بے شمار مسلمان تھے۔ مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ہندو بھی بڑی تعداد میں گوالیار کی طرف چلے گئے۔

لکشمی بائی کے پاس تین گھوڑے تھے جن میں ایک کا نام بادل تھا جو سب سے زیادہ طاقتور تھا لکشمی بائی اسی گھوڑے پر سوار ہو کر گوالیار کی طرف چلی گئی۔ آج بھی اس علاقے میں لوگ اپنے گھوڑوں کا نام بادل رکھنا پسند کرتے ہیں۔

انگریزوں کا ظلم جاننے کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ انگریزوں نے جھانسی پر قبضے کے بعد اپنے ساٹھ لوگوں کے بدلے پانچ ہزار لوگوں کو قتل کیا تھا۔ جھانسی میں موجود ہر وہ شخص جس کی عمر سولہ سال سے زائد تھی، کو قتل کر دیا گیا۔

جنگِ آزادی کی ناکامی کے بعد جنگ آزادی میں حصہ لینے والے لوگوں کے قتل کو ہی جائز قرار دے دیا گیا۔ یہ تھا انگریزوں کا انصاف!

اس کے بعد سب سے زیادہ ظلم دلی میں ہوا۔ پاکستان کے موجودہ علاقوں میں بھی اس طرح کے بے شمار واقعات ملتے ہیں۔ میں ایک دفعہ قلعہ بالا حصار پشاور گیا تو ہمارے گائیڈ نے بتایا کہ سامنے والے علاقے میں انگریزوں نے مقامی قبائل کے لوگوں جن میں آفریدی پیش پیش تھے، کو موت کی سزا دی تھی۔ یہ واقع جنگِ آزادی کے بعد کا ہے۔ میں دراصل یہ کہنا چاہتا تھا کہ جس علاقہ میں بھی انگریزوں کو فتح ہوئی انھوں نے مخالفین کو بے دردی سے قتل کر دیا۔ کئی مقامات پر انھوں نے لوگوں کو توپ کے منہ پر باندھ کر قتل کیا۔ اسکی چند مثالیں درج ذیل ہیں۔

اس طرح کا ایک واقعہ فیروزپور پنجاب میں پیش آیا جس کی تفصیلات درج ذیل لنک سے مل سکتی ہیں۔

1857: Twelveblown fromcannonsinBritishPunjab

-com/2011/06/13/1857-blown.executedtoday.http://www

from

rebellion/-sepoy-cannons

/wiki/Blowing_from_a_gun#cite_noteorg.wikipedia.enhttps://

-53

ان رپورٹوں کے مطابق پشاور میں بھی ایسے واقعات پیش آئے جہاں لوگوں کو ظالمانہ طریقے سے قتل کیا گیا۔ ایک طریقہ توپ کے ساتھ باندھ کر قتل کرنا بھی تھا۔

کیا یہ واقعہ قلعہ بالا حصار کے جنوب مشرق میں پیش آیا یا کہیں اور؟ میرے ایک پختون دوست جناب فدا محمد خان صاحب نے سوال اٹھایا۔ ہمارے گائیڈ نے بتایا کہ وہ قلعہ بالا حصار کے پاس پیش آیا تھا۔ مجھے جو معلومات ملیں ان کے مطابق توپ سے باندھ کر قتل کرنے کے واقعات ہندوستان کے بے شمار شہروں میں رونما ہوئے، جن میں پشاور بھی شامل ہے جس کی تصدیق انگریزوں کی اپنی کتابوں سے ہوتی ہے۔ یہ انگریزوں کا طرزِ حکومت تھا جو سات سمندر پار کرکے ایک آزاد ملک پر قبضہ کیے بیٹھے تھے اور کروڑہا لوگوں کو غلام بنا رکھا تھا۔ جبکہ اپنے ہاں وہ جمہوریت کو پروان چڑھا رہے تھے۔

گوالیار کے قریب جب شدت سے جنگ ہو رہی تھی اور لکشمی بائی کو شکست بھی نظر آ رہی تھی۔ اس نے ایک شاہ سوار کی وردی پہنی اور ایک مردانہ لباس میں میدان جنگ میں آ کر براہ راست انگریزوں کی فوج کے ساتھ جنگ شروع کر دی۔ یہ کسی بھی عورت کا میدان جنگ میں شریک ہونے اور میدان جنگ میں جان دینے کا ایک اہم واقعہ ہے۔انگریزوں نے اپنی کتابوں میں ان کی بطورِ سپاہی جنگی صلاحیتوں کا اعتراف کیا ہے۔ اس وقت لکشمی بائی کی عمر تئیس سال تھی۔ اس نے جنگ میں وہ جوہر دکھائے کہ لوگ آج تک اس کی مثالیں دیتے ہیں۔ یاد رہے کہ جنگ سے پہلے انگریز انھیں صلح اور معافی کی آفر کر چکے تھے لیکن لکشمی بائی نے جنگ کو صلح پر ترجیح دی۔ بلکہ در حقیقت ان کی فوج بھی کمزور تھی، دشمن طاقتور تھا، شکست بھی یقینی تھی۔۔۔

ایسی صورتحال میں حوصلہ اور دلیری ہی کا امتحان ہوتا ہے!

اس جنگ میں لکشمی بائی زخمی ہو گئی اور اس کے پاس ان کے صرف چند ہی ساتھی تھے۔ لکشمی بائی نے ان سے کہا میرے بچنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ جیسے ہی میری

موت واقع ہو اس سے پہلے کہ کوئی انگریز مجھے دیکھے یا ہاتھ لگائے آپ فوراً مجھے جلا ڈالیں۔ ان کے ساتھیوں نے ایسا ہی کیا۔

لکشمی بائی کی موت کی یاد میں پھول باغ کے نام سے ایک عمارت بھی گوالیار کے علاقہ میں بنائی گئی ہے۔ لوگ اس جگہ کو ان کا مقبرہ کہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ان کی باقیات کو اس جگہ دفن کیا گیا تھا۔ لکشمی بائی کی موت کے بعد ان کا منہ بولا بیٹا جو ہمیشہ ان کے ساتھ رہتا تھا، گرفتاری سے بچنے کے لیے اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ جنگلوں کی طرف چلا گیا۔ جنگلوں میں ہی ان سب کی موت واقع ہوئی۔ اس طرح اس خاندان کا کوئی فرد بھی انگریزوں کے ہاتھ نہ آیا۔

ایک دلچسپ بات لکشمی بائی رانی آف جھانسی کے متعلق بڑی مشہور ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ جب ان کو انگریزوں نے ہتھیار ڈالنے کے لیے کہا تو لکشمی بائی نے ایک نعرہ لگایا جو آج تک اس علاقے میں معروف ہے اور کئی مقامات پر لکھا ہوا ہے۔ وہ کچھ یوں ہے۔ ہم لارڈ کرشنا کے دلیش کی آزادی کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ جیت گئے تو آزادی کا مزہ چکھیں گے، ہار گئے تو ہماری روح مطمئن ہو گی۔

ایک انگریز نے اس واقعہ پر ایک کتاب لکھی ہے۔ جس میں اس نے لکشمی بائی کو انگریزوں کا سب سے بہادر اور خطرناک دشمن لکھا ہے۔

یہ تھی ایک مختصر کہانی لکشمی بائی رانی آف جھانسی کی۔ جس کے شہر سے گزرنے کا مجھے بھی موقع ملا۔ میں نے پلیٹ فارم پر کھڑے ہو کر شہر کو جی بھر کے دیکھا اور ان سب کو سلام پیش کیا جنھوں نے ہندوستان کی آزادی کے لیے قربانیاں دیں۔۔۔ جن میں خدا بخش، بشارت علی، غلام غوث اور لکشمی بائی سمیت بے شمار گمنام ہندو اور مسلمان بھی تھے۔۔۔ ان سب کا مقصد صرف آزادی تھا۔۔۔ جس کا مزہ آج ہم چکھ رہے ہیں۔ رانی آف جھانسی کے متعلق بہت کچھ لکھا گیا ہے۔

Joyce Lebra کی کتاب جو 2008ء میں شائع ہوئی جس کا عنوان ہے

Women Against the Raj: The Rani of Jhansi Regiment

جسے Institute of Southeast Asian Studies, نے شائع کیا ہے۔ یہ کتاب بھی نیٹ پر موجود ہے۔ اس کے علاوہ دیپا اگروال کی کتاب رانی لکشمی بھائی بھی ایک مفید کتاب ہے جس میں رانی کے بارے میں تفصیل سے لکھا گیا ہے۔

کتاب بھی اسی کے بارے میں لکھی جاتی ہے جو انسانیت کی خدمت کا جذبہ رکھتے ہیں اور اس پر عمل بھی کرتے ہیں!

جھانسی ریلوے سٹیشن دیکھنے کے بعد بہت دیر تک میں تصور ہی تصور میں ان لوگوں کو یاد کرتا رہا جنھوں نے ہندوستان کی آزادی کے لیے جدوجہد کی تھی۔ انھی سوچوں میں گم مجھے نیند آ گئی۔

Photo Credit: https://twitter.com/ddindialive

Jhansi Museum Photo Credit: https://www.adotrip.com

Rani Jhansi, Photo Credit: https://www.firstpost.com
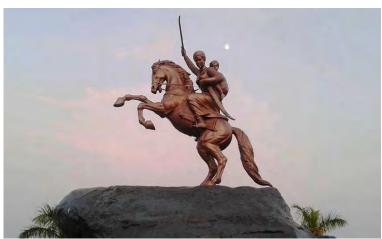
Statue of Rani Jhansi in Jhansi Photo Credit: https://www.thequint.com

پانی پت کا ہرجیت سدھو

کیبن میں آ کر میں ابھی لیٹا ہی تھا کہ میں نے ایک آواز سنی۔ کوئی بہت ہلکی آواز میں ہمارے کیبن کے دروازے کے باہر کھڑا ہو کر کہہ رہا تھا۔۔۔ بیڈ ٹی۔۔۔ بیڈ ٹی۔۔۔ جیسے ہی میں نے یہ آواز سنی میری چائے یا کافی پینے کی خواہش جاگ اٹھی۔ میں صبح ہر روز سب سے پہلا کام یہی کرتا ہوں۔آواز اتنی کم تھی کہ اگر کوئی جاگ رہا ہو تو اسے سنائی دے اور اگر کوئی سو رہا ہو تو اس کی نیند میں خلل نہ آئے۔ میں کیبن سے باہر آ گیا۔ باہر ایک کرسی تھی اور میں اس پر بیٹھ گیا۔ ویٹر نے مجھے ایک چھوٹی ٹرے میں چائے کے کپ کے ساتھ چند بسکٹ پکڑا دیے۔ یہ ویٹر وہی صاحب تھے جنھوں نے ہمیں رات کو کھانا کھلایا تھا۔ان کی عمر چالیس برس کے لگ بھگ ہو گی۔ میں نے حسب عادت ان سے باتیں شروع کر دیں۔

انھوں نے بتایا کہ میرا نام ہرجیت سدھو ہے۔ یاد رہے کہ سدھو، جاٹ قوم کی ایک سب کاسٹ ہے۔ جسے گوت بھی کہتے ہیں۔ میں نے ان سے پوچھا کہ کیا آپ کے پاس میرے ساتھ بات کرنے کے لیے کچھ وقت ہے؟ انھوں نے کہا کہ مجھے سات بجے ناشتہ دینا ہے اس لیے میرے پاس کچھ وقت ہے جو میں آپ کے ساتھ گزار سکتا ہوں۔

اس نے بتایا کہ وہ پندرہ سال سے ریلوے میں ملازم ہے۔اس کے دو بچے ہیں جو پانی پت کے قریب ایک گاؤں میں اس کے والدین کے ساتھ رہ رہے ہیں۔ ہم اس ٹرین کے ساتھ دلی سے چنائی تک جاتے ہیں، ایک دن چنائی میں آرام کرتے ہیں اور اس سے اگلے دن واپس دہلی جاتے ہیں۔ پھر ایک دن دہلی میں آرام کرتے ہیں اور پھر اسی ٹرین کے ساتھ واپس چنائی چلے جاتے ہیں۔

تنخواہ بھی ٹھیک ہے اور کچھ ٹپ مل جاتی ہے تو اچھا گزارا ہو جاتا ہے۔ بچے ایک سرکاری سکول میں پڑھ رہے ہیں، جہاں فیس وغیرہ نہیں ہے۔ ہم ایک سادہ زندگی

گزار رہے ہیں۔ تھوڑی بہت آبائی زمین بھی ہے اور گھر میں گائے بھی رکھی ہوئی ہے۔ محنت اور دیانت کی کمائی میں بہت برکت ہوتی ہے۔ اس لیے اوپر والا ہمیں مشکلات سے بچائے رکھتا ہے۔

اس نے کہا سر جی بات یہ ہے کہ کوئی انہونی نہ ہو جائے ورنہ ہر آدمی کی آمدن اس کے عمومی اخراجات کے مطابق ہوتی ہے۔ لیکن جب کوئی انہونی جیسے گھر میں کوئی بیمار ہو جائے، کوئی حادثہ پیش آ جائے، لڑائی جھگڑا ہو جائے، سیلاب یا زلزلہ آ جائے تو لوگ مشکلات کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ہرجیت کی ان باتوں نے مجھے اس میں مزید دلچسپی لینے پر مجبور کر دیا۔ میں اس سے یہ جاننا چاہ رہا تھا کہ ان کے گاؤں میں کس طرح کی تبدیلیاں آ رہی ہیں جو پہلے سے چلتے ہوئے رسم و رواج سے مختلف ہیں اور نئے رسم و رواج کا ان کی معاشرتی و معاشی زندگی پر کیا اثر پڑ رہا ہے؟

اس کے لیے میں نے ان سے مختلف سوالات کیے۔ جس سے مجھے محسوس ہوا کہ ہرجیت کم پڑھا ہوا تو ضرور ہے لیکن اس کا مشاہدہ کافی گہرا ہے۔ میں نے دیکھا کہ جب بھی سفر میں اسے کچھ وقت ملتا تو وہ اپنے کیبن میں رکھی ہوئی کتابوں، رسالوں اور اخبارات کا مطالعہ کرتا تھا۔

ہر انسان کو اللہ رب العزت نے مشاہدے کی صلاحیت بخشی ہوتی ہے۔ ایسے لوگ اپنی معلومات دوسروں تک پہنچا کر بہت خوش ہوتے ہیں۔ ہرجیت کا بھی میں وہی حال دیکھ رہا تھا۔ وہ مجھے اپنی باتیں بتا کر بہت خوشی محسوس کرتا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے اسے کسی اچھے سامع کی تلاش تھی، جو میری صورت میں اسے مل گیا۔ ابھی اگلے چوبیس گھنٹے بھی ہم نے اکٹھے رہنا تھا اور اس بات کی ہم دونوں کو خوشی تھی۔

مختلف نشستوں میں ہرجیت سدھو کی باتوں سے میں نے جو اخذ کیا اس کا خلاصہ کچھ اس طرح سے ہے۔

بھارت میں سب سے پہلی مردم شماری 1951ء میں ہوئی۔ اس مردم شماری کے مطابق بھارت کی آبادی 35 کروڑ تھی شرح خواندگی اٹھارہ فیصد تھی۔ اوسط عمر بتیس سال تھی۔ اب تعلیم کی شرح پچاس فیصد ہے۔ آبادی تقریباً ستر کروڑ سے بھی زائد ہے۔ بھارتی معاشرے پر اس تبدیلی کے اثرات معاشرتی اور معاشی، دونوں طریقے سے ہوئے ہیں۔ (یاد رہے کہ یہ بات 1999ء کی ہے)۔

ہرجیت نے بتایا کہ ہمارے گاؤں میں کوئی بھی گھر ایسا نہیں جس کے بچے سکول نہ جاتے ہوں۔ اکثر لڑکیاں بھی پڑھ گئی ہیں اور لڑکے بھی کسی سے پیچھے نہیں رہے۔ ہماری نگاہ میں سب سے ناپسندیدہ تبدیلی ہمارے بچوں کا بزرگوں سے میل جول کا طریقہ کار ہے۔ ہم اپنے والدین سے اختلاف نہیں کرتے تھے جب کہ موجودہ نسل کے بچے اپنے والدین سے اختلاف بھی کرتے ہیں اور ان سے بحث بھی کرتے ہیں۔ جو بظاہر تو بری بات نہیں ہے لیکن ہمیں اچھی نہیں لگتی۔

دوسری بات یہ کہ جب کوئی بچہ پڑھ لکھ جاتا ہے تو وہ گاؤں میں رہنا پسند نہیں کرتا۔ وہ یہ سمجھتا ہے کہ دیہاتی زندگی جمود کا شکار ہوتی ہے اور یہاں ترقی کے مواقع بہت کم ہوتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ یہاں زندہ رہنے کی ضروری سہولیات بھی میسر نہیں ہوتیں۔ اس لیے وہ جیسے ہی اس قابل ہوتے ہیں کہ شہر میں رہ کر روٹی روزی کما لیں، وہ گاؤں چھوڑ دیتے ہیں۔ جیسے میں نے میٹرک کرنے کے بعد اپنے گاؤں کو چھوڑا۔

ہرجیت نے کہا کہ اس سوچ کے دو اثرات مرتب ہوئے۔ پہلا اثر تو یہ ہوا کہ گاؤں کی ترقی رک گئی۔ پرانے لوگ ہیں اور ان کا پرانا ہی کھیتی باڑی کا طریقہ ہے۔ جسے کچھ سمجھ بوجھ تھی وہ گاؤں میں نہیں رہا۔ اس طرح سے دیہات ترقی میں بہت پیچھے رہ گئے۔ ہمارے ذہین بچے جو گاؤں کی ترقی کا باعث بن سکتے تھے، شہروں میں آ گئے۔ اب شہر ترقی کر رہے ہیں اور گاؤں اسی جگہ پر کھڑے ہیں۔

اُس نے بتایا کہ دوسرا معاملہ اس سے بھی زیادہ اہم ہے۔ ہم گاؤں میں رہتے ہیں اور ایک دوسرے کے صدیوں سے واقف ہیں آپس میں لین دین بھی کر لیتے ہیں۔ غمی خوشی میں شریک ہو جاتے ہیں، شادی بیاہ بھی اپنی ذات برادری میں کرتے ہیں لیکن جب کچھ لوگ شہر میں آ گئے تو ان کے اخراجات بڑھ گئے، اب وہ ایک دوسرے سے تعاون نہیں کرتے اور اپنا بوجھ خود اٹھاتے ہیں جو بعض اوقات نہیں اٹھایا جاتا اور ذہنی پریشانیاں جنم لیتی ہیں۔اسی لیے ذہنی مسائل دیہات میں کم اور شہروں میں زیادہ ہیں۔ دیہات میں لوگوں کو معاشرتی اور معاشی مسائل اتنے نہیں جتنے شہروں میں ہوتے ہیں۔

اُس نے بتایا کہ اب میں یہ بھی دیکھتا ہوں کہ لوگ پڑھ لکھ کر شہر تو آ جاتے ہیں لیکن ان کے باقی رشتہ دار گاؤں میں ہی رہتے ہیں۔ بچوں اور بچیوں کی شادیوں کے معاملے میں وہ گاؤں کے رشتہ داروں کو ترجیح دینے کی بجائے شہر میں ہی شادیاں کرتے ہیں۔اور اکثر شادیاں برداری سے باہر کرتے ہیں۔ ایسی شادیاں جو ناواقف لوگوں سے برادری کے باہر کی جاتی ہیں ان کی کامیابی کے امکانات پچاس فیصد سے زائد نہیں ہوتے۔ جس سے طلاق کی شرح بھی بڑھ رہی ہے اور دیگر بے شمار مسائل بھی جنم لے رہے ہیں۔

اس کے علاوہ بھی اُس نے میرے ساتھ بے تحاشا باتیں کیں جن میں بعض ذاتی اور کچھ اس کے خاندان کی تھیں۔ میں بھی اس کے ساتھ باتیں کرتا رہا۔آخر میں اس نے بڑی ہی ایک عجیب و غریب بات کی۔ جب میں نے پوچھا کہ آپ تو ایک جاٹ قوم سے تعلق رکھتے ہیں اور میرا تعلق بھی جاٹ قوم سے ہے۔ ہمارے معاشرے میں لوگ ابھی تک ذات برادری کی وجہ سے ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔ آپ کے معاشرے میں کیسا ہے؟

اس نے جواب دیا صاحب جی جاٹ زمین سے ہوتا ہے اور اب زمین تقسیم در تقسیم کے عمل سے بہت تھوڑی حصہ میں آتی ہے۔اب تو ہم جاٹوں میں شادی بھی کرنا ضروری نہیں سمجھتے اور نہ دوستی کے وقت ایسا سوچتے ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے یہ باتیں ہمارے ماضی کا حصہ ہیں۔ کسی غیر جاٹ قوم میں شادی کی بات کی جاتی ہے تو بڑی دلچسپ صورتحال پیدا ہوتی ہے۔بڑے ناراض ہوتے ہیں اور چھوٹے خوش، کہ شکر ہے ہمیں اپنی ذات سے باہر بھی لوگوں سے ملنے کا موقع ملا۔

اس موقع پر وہ کہنے لگا کہ ہر قوم کا رہنے سہنے کا اپنا ایک طریقہ کار ہوتا ہے جو انھوں نے صدیوں سے اپنا رکھا ہوتا ہے۔ ہم اسے تہذیب و تمدن بھی کہہ سکتے ہیں۔ اسے خاندان کی روایت بھی کہہ سکتے ہیں۔ در حقیقت یہ باتیں کسی بھی خاندان کی پہچان ہوتیں ہیں اور بالعموم لوگ اس پر فخر بھی کرتے ہیں۔ یہ بات اچھے اور برے کی نہیں بلکہ صرف اپنے زندگی گزارنے کے طریقہ کار، رہن سہن، شادی بیاہ کے موقع پر ہونے والے رسم و رواج، خاندان میں ایک دوسرے سے ملنے کے انداز اور اس طرح کی بے شمار چیزوں کی ہوتی ہے جو کہ ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں۔ ان باتوں کی بنیاد پر ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ فلاں خاندان کے لوگ اچھے یا برے ہیں۔

ماسٹر صوفی دین محمد جو میرے پسندیدہ استاد ہیں ان کا مطالعہ بہت اچھا ہے۔ میں اب بھی جاتا ہوں تو ان کے پاس بیٹھتا ہوں۔ وہ بوڑھے ہو گئے ہیں لیکن ابھی بھی باتیں کر لیتے ہیں۔ مجھے مطالعہ کرنے کی عادت بھی ان ہی کی وجہ سے ہوئی۔ ماسٹر صوفی دین محمد کا خاندان تقسیم کے وقت پاکستان نہیں گیا تھا اور انھوں نے اپنے گاؤں میں رہنا پسند کیا تھا۔ میں نے جو کچھ ان سے سنا، اس کی بنیاد پر یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جب سے ہم لوگوں نے اپنی برادری سے باہر شادیاں کرنا شروع کی ہیں تو ہم کافی مسائل کا شکار ہو گئے ہیں۔ جب دو مختلف خاندان اور مختلف روایتیں رکھنے والے، آپس میں شادی کرتے ہیں تو

ان کے رسم و رواج میں فرق ہونے کی وجہ سے وہ آپس میں کبھی بھی قریب نہیں ہو پاتے۔ اس سے ایک نقصان یہ بھی ہو رہا ہے کہ صدیوں پرانی خاندانی روایات بھی ختم ہونا شروع ہو گئی ہیں۔

میں نے حیرت سے پوچھا کہ کیا وہ دوسری برادری میں شادی کرنے کو ناپسند کرتے ہیں؟ اس نے جواب دیا کہ نہیں، ایسا نہیں ہے لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ شادی اپنے جیسوں میں کرنی چاہیے۔ جس سے مسائل بھی کم پیش آتے ہیں اور خاندان کی پہچان بھی باقی رہتی ہے۔

اس نے بتایا کہ میرے ماسٹر صوفی دین محمد بھی اسی بات کے قائل ہیں کہ شادی اپنے جیسوں میں کرنی چاہیے لیکن اب معاشی و معاشرتی فرق اور بچوں کو تعلیم کی وجہ سے انھیں جو شعور ملا ہے اس کے ساتھ ساتھ یونیورسٹی اور کالج میں آپس میں ملنے کا موقع بھی ملتا ہے، اب برادری سے زیادہ اس بات کو ترجیح دی جاتی ہے کہ دونوں خاندانوں کی معاشی اور معاشرتی حیثیت کیسی ہے۔ بچے یہ سمجھتے ہیں کہ ذات سے زیادہ معاشی اور معاشرتی حیثیت اہم ہے۔ اس نے آخر میں کہا کہ معاشی اور معاشرتی حیثیت تو بدلتی رہتی ہے کیونکہ جو آج امیر ہیں وہ کل غریب ہو سکتے ہیں لیکن خاندانی روایت تو نہیں بدلتی۔

اس لیے میں یہ دیکھتا ہوں کہ ایسی شادیاں جو بچوں نے معاشی اور معاشرتی حیثیت کو سامنے رکھ کر کی ہوتی ہیں ان میں بہت جلد دراڑ پڑ جاتی ہے اور کوئی اس دراڑ کو ختم کرنے والا بھی نہیں ہوتا۔ خود ہی لڑتے ہیں اور خود ہی صلح کرتے ہیں۔ جب کہ خاندان میں ہونے والی شادی میں دونوں خاندانوں کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ یہ سلسلہ چلتا رہے اور کسی بھی ایسے موقع کی صورت میں سب مل جل کر اس دراڑ کو پورا کر دیتے ہیں۔ ہرجیت نے کہا کہ اس کا ایک نقصان یہ بھی ہو رہا ہے کہ بچے اپنی خاندانی

پہچان کھو رہے ہیں۔ ددھیال میں ہوتے ہیں تو کچھ اور سنتے ہیں، ننہال میں جاتے ہیں تو کچھ اور۔ اس طرح سے وہ بھی گومگو کی کیفیت میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

جب میں نے سیاست کے بارے میں پوچھا تو اُس نے کچھ اس طرح سے بتایا۔

سر جی ہمارا سیاسی نظام اب آہستہ آہستہ پیسے کے بوجھ تلے دب چکا ہے۔ اب قیادت ان لوگوں کے پاس ہے جو پیسہ رکھتے ہیں اور بے بہا رکھتے ہیں۔ پہلے یہ قیادت ان کے پاس تھی جو لوگوں کی خدمت کرنا چاہتے تھے۔ وہ لوگ کسی نظریے سے منسلک ہوتے تھے۔ ایک دوسرے سے نظریاتی اختلاف بھی کرتے تھے۔ اب عام آدمی کے بس میں نہیں ہے کہ وہ سیاست میں حصہ لے کیونکہ یہ انتہائی مہنگا کام ہے۔ اس میں وہی حصہ لے سکتا ہے جس کے پاس پیسہ ہو اور اسے کمانے کے دیگر ذرائع ہوں۔

اب یہ ایک کاروبار ہے جہاں کمانے کے لیے خرچ کیا جاتا ہے۔ ہماری موجودہ اسمبلی میں آج سے پچاس سال قبل والی اسمبلی کے مقابلے میں زیادہ امیر لوگ بیٹھے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ اب عام لوگ سیاسی باتوں سے کنارہ کشی کر گئے ہیں۔ لوگ گاؤں سے شہر آ کر معاشی جدوجہد میں مصروف ہو گئے ہیں۔ وہ صرف اپنی روزی روٹی کا بندوبست کر رہے ہیں لہٰذا اب سیاست کچھ مخصوص لوگوں کے ہاتھ میں ہی ہے۔ ووٹ تو ہمیں کسی نہ کسی کو دینا ہی ہوتا ہے۔ ہم اسی کو چنتے ہیں جو ہمارے مفادات کی نگرانی کرتا ہے۔ ہمارے لیے نظریات سے زیادہ مفادات اہم ہو گئے ہیں۔

اس نے مجھے بھارتی معاشرے میں ہونے والی تبدیلیوں سے متعلق اور بھی بہت کچھ بتایا جس سے مجھے بھارتی معاشرے کو جاننے کے لیے بے حد کامیابی ملی۔

تعلیم میں تبدیلی، آبادی میں اضافہ، معاشرے میں چند لوگوں کے پاس بے تحاشہ دولت، جب یہ سب کچھ ہو اور معاشرے پر ان کے اثرات نہ ہوں، یہ ممکن نہیں

ہے۔ یہ اثرات قابل قبول ہیں یا نھیں، وہ ایک الگ بحث ہے۔ یاد رہے کہ 1999ء میں ابھی میڈیا کا جن بوتل سے باہر نہیں نکلا تھا۔

ہمیں باتیں کرتے ہوئے خاصی دیر ہو گئی اور اس دوران سورج بھی طلوع ہو رہا تھا۔ سات بجنے والے تھے۔ باہر کھیت کھلیان بھی نظر آ رہے تھے طلوع آفتاب کا منظر ہمیشہ ہی خوبصورت ہوتا ہے۔

ایک دفعہ میں سید وقاص جعفری صاحب کے والدِ محترم جناب رفیق انجم جعفری صاحب کے ساتھ سفر کر رہا تھا تو ہمیں سرگودھا پہنچنے سے پہلے صبح ہوئی۔ ہم وہاں نماز کے لیے رک گئے۔ نماز سے فارغ ہوئے تو دیکھا کہ سورج طلوع ہو رہا تھا۔ یہ منظر دیکھ کر جعفری صاحب نے جوش ملیح آبادی کا ایک شعر سنایا جو مجھے آج بھی یاد ہے۔

شعر کچھ یوں ہے۔

ہم ایسے اہل نظر کو ثبوتِ حق کے لیے

اگر رسول نہ ہوتے تو صبح ہی کافی تھی

بھوپال: ایک پختون کی قائم کردہ ریاست

میں ہرجیت سے باتیں کرکے کیبن میں واپس آ گیا۔ سب لوگ آہستہ آہستہ بیدار ہو رہے تھے۔ کچھ دیر بعد ہرجیت بھی آ گیا اور سب سے ناشتے کے بارے میں پوچھنے لگا۔ سب نے اپنی پسند کے مطابق ناشتہ کیا جو کسی بھی لحاظ سے فائیو سٹار ناشتے سے کم نہ تھا۔ اب تقریباً آٹھ بج رہے تھے اور ہم بھوپال کے قریب پہنچنے والے تھے۔ سردار صاحب نے بھی اپنا سامان سمیٹنا شروع کر دیا۔ بھوپال میں ٹرین کا سٹاپ دس منٹ کا تھا۔ وقاص بھائی اور میرا ارادہ تھا کہ ہم پلیٹ فارم پر اتر کر سردار صاحب کو رخصت کریں گے۔

اس سے پہلے کہ میں بھوپال سے متعلق کچھ معلومات آپ کی خدمت میں پیش کروں، میں چاہوں گا کہ ہندوستان میں انگریز کی آمد سے روانگی تک کی ایک مختصر رُوداد بیان کروں جس میں اس دور کی ریاستوں اور انگریزوں کے تعلقات بھی شامل ہوں۔ ان معلومات سے آپ کو مختلف ریاستوں اور ان کے سیاسی اور سماجی کردار کو سمجھنے میں آسانی ہوگی۔

ہندوستان میں انگریزوں کی آمد سے لیکر رخصت ہونے تک کی تاریخ کو جاننے کے لیے میں نے درج ذیل کتابوں اور مضامین سے مدد لی ہے۔ آپ بھی اگر ہندوستان کے اس دور کی تاریخ کو جاننا چاہتے ہیں تو یہ کتابیں اس کام کے لیے کافی کارآمد ہیں۔

چندریکا کول کالکھا ہوا ایک طویل مضمون جو بی بی سی نے شائع کیا جس کا عنوان From Empire to Independence: The British Raj in India 1858-1947 ہے[13]۔ ششی کپور کی کتاب جو 2016 میں شائع ہوئی جس کا عنوان ہے[14]۔ An Era of Darkness: The British Empire in India پنڈت سندرلال کی کتاب British Rule in India First Edition بھی ایک مفید کتاب ہے[15]۔

ڈیوڈ گلمور کی کتاب The British in India: Three Centuries of Ambition and Experience جو 2019ء میں شائع ہوئی ایک ایسی کتاب ہے

[13] https://www.bbc.co.uk/history/british/modern/independence1947_01.shtml

[14] https://www.amazon.com/Era-Darkness-British-Empire-India/dp/938306465X

[15] https://www.amazon.com/British-Rule-India-Pandit-Sunderlal/dp/9352808029

جس میں انگریزوں کے ہندوستان میں کیے گئے اقدامات کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے[16]۔ ان کی ایک دوسری کتاب The British in India: A Social History of the Raj جو میں شائع ہوئی ہے میں بھی کافی معلومات مل سکتی ہیں۔

اس کے علاوہ سٹینلے ولپرٹ کی کتاب

Shameful Flight: The Last Years of the British Empire in India

بھی ایک مفید کتاب ہے۔ یہ کتاب آج کل میرے زیرِ مطالعہ ہے۔ یہ کتاب تاریخ کے کئی نئے رخ سامنے لاتی ہے۔

سولہویں صدی کے آخر اور سترہویں صدی کے شروع میں صنعتی دور کا آغاز ہوتا ہے۔ اس سے ذرائع آمد و رفت میں بھی آسانی پیدا ہوئی۔ طویل فاصلوں کے لیے بحری سفر کا بھی آغاز ہوا۔ اس سے پہلے بھی یہ سفر ہوتے تھے لیکن اب ان میں نا صرف آسانیاں پیدا ہو گئی تھیں بلکہ ان کی تعداد میں بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ اس دور میں یورپ کے کچھ ممالک جن میں پرتگال سرفہرست تھا، ہندوستان سے مصالحہ جات لے جاتے اور یورپ سے لوہے کی بنی ہوئی چیزیں اور سونا وغیرہ لے آتے تھے۔ ہندوستان کے ساتھ تجارت کے علاوہ اپنی کالونی بنانے میں پرتگال کے ساتھ ساتھ ، ہالینڈ، ڈنمارک اور فرانس بھی پیش پیش تھے۔ ان کی تجارت کو دیکھ کر لندن کے کچھ تاجروں نے سن سولہ سو میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی بنیاد رکھی۔ اس کمپنی کا مقصد بحر ہند کے ارد گرد موجود ممالک سے تجارت کرنا تھا۔ برطانیہ کی ملکہ الزبتھ نے انھیں بحر ہند کے ارد گرد موجود ممالک کے ساتھ تجارت کے کلی اختیارات دے دیے۔ بعدازاں اس میں چین کے کچھ علاقے بھی

[16] https://www.amazon.com/British-India-Centuries-Ambition-Experience/dp/0141979216

شامل ہو گئے۔اور یوں اس علاقے میں بالواسطہ برطانوی بادشاہ کا عمل دخل شروع ہو گیا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنا پہلا تجارتی قافلہ 1601ء میں انڈونیشیا کی طرف بھیجا۔ اس وقت نہر سویز نہیں بنی تھی اس لیے یہ جہاز افریقہ کا پورا چکر لگا کر پہلے بحیرہ عرب اور بعد میں بحر ہند میں آتے تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کا پہلا تجارتی جہاز 1608ء **میں** سورت جو گجرات کی ایک بندرگاہ ہے، میں آیا تھا۔ آپ اسے ایسٹ انڈیا کمپنی کا ہندوستان میں آغاز کہہ سکتے ہیں۔ اس وقت ہندستان پر جہانگیر کی حکومت تھی۔ انگریزوں نے مغل بادشاہوں سے بہت ساری تجارتی رعائتیں بھی حاصل کیں۔

انگریزوں کی پہلے سے موجود دیگر یورپی ممالک کے لوگوں سے کئی لڑائیاں بھی ہوئیں۔ انگریزوں نے ان جنگوں میں فتح حاصل کی۔ مختصر یہ کہ ان لڑائیوں کے بعد انگریزوں نے سوچا کہ اگر انھیں تجارت کرنی ہے تو انھیں فوج کی بھی ضرورت ہو گی۔ اس کے لیے انھوں نے باقاعدہ اپنی فوج بھی کھڑی کرلی، جس میں دو لاکھ سے زائد انگریز اور انڈین فوجی شامل تھے۔ان فوجیوں کی مدد سے انھوں نے مقامی ریاستوں کے ساتھ لڑائی جھگڑے بھی شروع کر دیے۔ ریاستیں کمزور تھیں جبکہ انگریزوں کے پاس جدید اسلحہ تھااور ان کا جنگ کا تجربہ بھی بہت بہتر تھا۔ کچھ ریاستیں انگریزوں کے ساتھ معاہدوں میں چلی گئیں اور جس نے ان کی بات نہ مانی تو اسے انھوں نے زبردستی اپنے قبضے میں کر لیا۔ جس کی ایک مثال ریاست میسور کی ہے۔ اس کے علاوہ بھی بہت سے ریاستیں ایسی تھیں جنھوں نے مخالفت کی لیکن کمزور اور متحد نہ ہونے کی وجہ سے انگریزوں کو ان کے علاقوں پر بھی قبضہ کرنے کا موقع مل گیا۔

تجارت کے علاوہ انگریزوں نے ایک اور کام بھی شروع کر دیا۔ جب کسی ریاست کا راجہ کمزور پڑ جاتا یا اسے کسی سے خطرہ ہوتا یا کوئی اس کی ریاست پر قبضہ کر لیتا

تو وہ انگریزوں سے مدد کا طلبگار ہوتا۔ انگریز اس کی فوجی مدد کرتے جس کے بدلے بہت سارا مال و دولت بھی لیا جاتا۔ اس طرح کا ایک کام انھوں نے افغانستان میں بھی کیا۔ ہندوستان میں تو ہمیں ایسے بے شمار واقعات کا ذکر ملتا ہے۔ ایسا بھی ہوا کہ انھوں نے ایک ریاست کو اپنے ساتھ ملا کر دوسری ریاست کے خلاف جنگ کی۔ جیسے مراٹھوں کو اپنے ساتھ ملا کر ٹیپو سلطان کے خلاف جنگ لڑی بعد میں مراٹھوں کو بھی زیر کر لیا۔ ایسا کرتے کرتے انھوں نے ہندوستان کے ایک بہت بڑے علاقہ پر قبضہ کر لیا۔

جن علاقوں پر انھوں نے لڑائی کے بعد قبضہ کیا انھوں نے اسے برٹش انڈیا کا نام دے دیا، جہاں پر ان کی اپنی حکومت تھی۔ جن ریاستوں کو فتح نہ کر سکے ان کے ساتھ معاہدے کرتے گئے۔ یہ معاہدے بہت دلچسپ ہیں اگر شوق ہو تو ضرور پڑھیے گا۔ ان معاہدوں کے مطابق ریاستیں اپنے اندرونی معاملات میں بہت تک آزاد تھیں۔ دیگر ریاستوں سے تعلقات کے لیے انھیں ہر لحاظ سے انگریزوں کی پالیسی کو اپنانا ہوتا تھا۔ ان معاہدوں کی رو سے انگریز ان ریاستوں کی سلامتی کے ذمہ دار تھے، یعنی ان پر کسی بھی طرح کے حملے کی صورت میں انگریز ان کی مدد کے پابند تھے۔ کچھ علاقوں میں انگریزوں نے اپنے وفاداروں کو جاگیریں بھی عطا کی جس کی بے شمار مثالیں ہمارے ارد گرد موجود ہیں۔ اس طرح سے انھوں نے ہندوستان پر اپنا مکمل قبضہ کر لیا۔ یاد رہے پنجاب ان علاقوں میں شامل ہے جہاں انگریزوں نے سب سے آخر میں قبضہ کیا۔ پنجاب میں انگریزوں اور سکھوں کی آخری جنگ کھاریاں کے قریب 1849ء میں چیلیانوالہ میں ہوئی۔

انگریزوں نے ہندوستان میں پہلا قدم 1608ء میں ایسٹ انڈیا کی شکل میں رکھا اور 1857ء تک اس کمپنی نے ہندوستان پر کہیں براہ راست اور کہیں بلواسطہ قبضہ کر لیا۔ یاد رہے یہ ایک تجارتی کمپنی تھی، کوئی ملک نہیں تھا۔ جس ملک پر انھوں نے قبضہ کیا اس کا رقبہ پنتالیس لاکھ مربع کلومیٹر تھا۔ اس کا اندازہ آپ یوں کر سکتے ہیں کہ پاکستان کا

رقبہ آٹھ لاکھ مربع کلومیٹر کے قریب ہے۔ یعنی پاکستان سے پانچ گنا رقبے پر انگریزوں کی حکومت تھی۔ یاد رہے اس وقت ہندوستان میں بنگال بھی شامل تھا۔ ہندوستان کی آبادی بیس کروڑ کے قریب تھی۔انگریزوں کے دور میں ہندوستان میں رہائش پذیر انگریزوں کی تعداد سوا دو لاکھ کے قریب رہی ہے، جس میں فوجی اور سویلین دونوں طرح کے لوگ شامل تھے۔ایسٹ انڈیا کمپنی کی فوج ایک وقت میں دو لاکھ سے بھی زائد فوجیوں پر مشتمل تھی، جس میں اکثریت ہندوستانیوں کی تھی۔ یہ تعداد اعتبار کے لحاظ سے حکومتِ برطانیہ کی فوج سے بھی بڑی تھی۔

1857ء کی جنگ جو چند فوجیوں نے شروع کی وہ کافی دور تک پھیل گئی۔ میرے علم کے مطابق سوائے جھانسی کی ریاست کے کسی نے بھی بطورِ ریاست اس جنگ کی حمایت نہیں کی۔ بلکہ انھوں نے جنگِ آزادی میں انگریزوں کی کامیابی کے لیے ہر ممکن مدد کی ۔ ایک اور بات بھی اہم ہے کہ مغلوں کے آخری حکمران بہادر شاہ ظفر نے بڑھاپے، کمزوری، انگریزوں کی بہت بڑی فوج، انگریزوں کے وظیفے اور لال قلعے کے اندر انگریزوں کے کنٹرول کے باوجود بھی آزادی حاصل کرنے والے سپاہیوں کی سپہ سالاری قبول کی۔ انھوں نے اپنے بچوں کو بھی اس کام پر لگایا جس کی سزا بھی انگریزوں نے انھیں دی۔ جو بچوں کے قتل اور ان کی ملک بدری کی شکل میں ہمارے سامنے آتی ہے۔

یہ جنگِ آزادی تھی یا چند فوجیوں کی بغاوت، اس پر کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ بغاوت تھی۔ سیر سید احمد خان نے اس پر اسبابِ بغاوتِ ہند کے نام سے ایک کتاب بھی لکھی ہے۔اس موضوع پر کافی کچھ جان کر میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ آغاز میں یہ یہ چند ہندوستانی فوجیوں کی طرف سے بغاوت تھی، لیکن بعد میں یہ جنگ آزادی میں تبدیل ہوئی۔ جس میں رانی جھانسی بھی شریک ہوئیں، ریاست نابھہ کے راجا نے بھی اس کی حمایت کی، بہادر شاہ ظفر نے اس کی قیادت سنبھالی، دلی سے انگریزوں کو باہر بھی نکالا

گیا، ریواڑی کے راجا بھی ان کے ساتھ تھے، ان کے علاوہ بھی کئی لوگ اس میں شریک ہوئے اور ان سب نے اپنے اس عظیم جرم کی سزا بھی پائی۔ میں انھیں آزادی کے ہیرو ہی کہوں گا۔ وہ کامیاب تو نہ ہو سکے، لیکن ایک طویل جنگ آزادی کی بنیاد ضرور رکھ گئے۔ اس واقعہ کے صرف نوے سال بعد مکمل آزادی انھی کی شروع کی ہوئی جدوجہد کا نتیجہ ہے۔ اس سے پہلے ہندوستان بھر میں کہیں بھی انگریزوں کے خلاف ایک بڑے پیمانے پر جنگ نہیں ہوئی تھی۔ مقامی ریاستیں اپنی آزادی کی جنگ ضرور لڑتی رہیں تھیں، جیسے میسور، مراٹھا۔

یہ جنگ ان ہندوستانی فوجیوں نے شروع کی جو انگریز فوج میں ملازم تھے۔ ان میں پہلا شخص منگل سنگھ پانڈے تھا جس نے اپنی جان ہندوستان کی آزادی کے لیے قربان کی۔ جب فوجی مار دیے گئے تو جنگ آزادی بھی ختم ہو گئی اور پھر اگلے نوے سال کے لیے پورا ملک انگریزوں کے قبضے میں چلا گیا۔ بعدازاں سیاست دانوں نے سیاسی اندازاور بھگت سنگھ اور چندر بوش جیسے جوشیلے نوجوانوں نے طاقت کے ذریعے آزادی حاصل کرنے کی کوشش کی اور بالآخر اہل ہند آزادی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

جنگِ آزادی کے بعد 1858ء میں برطانیہ کی پارلیمنٹ نے ایک بل کے ذریعے کمپنی کے تمام تر اثاثہ جات پر قبضہ کر لیا اور ہندوستان کا کنٹرول اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ایک فرد کو سیکرٹری آف انڈیا مقرر کیا گیا جو ہندوستان کے تمام تر معاملات کا ذمہ دار تھا۔ نئے قوانین کے مطابق اس وقت کی ملکہ برطانیہ وکٹوریہ کو ہندوستان کی ملکہ بھی قرار دے دیا گیا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے دور میں کمپنی کی طرف سے تمام تر معاملات کو کنٹرول کرنے کے لیے گورنر جنرل مقرر کیا جاتا تھا۔ برطانوی حکومت کے براہ راست کنٹرول کے بعد ایسے شخص کو وائسرائے کہا جاتا تھا۔ جو پہلا وائسرائے 1858ء میں ہندوستان آیا اس کا نام لارڈ کیننگ تھا اور آخری وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن تھا۔ اس

طرح 1858ء سے 1947ء تک برطانوی حکومت کی ہندوستان پر براہ راست حکومت رہی۔ یہ عرصہ تقریباً نوے سال پر محیط ہے۔ اس سے پہلے 1608ء سے 1858ء تک کے اڑھائی سو سال بھی اس ملک پر ایسٹ انڈیا کمپنی ہی کا جزوی یا مکمل کنٹرول رہا۔ تاریخ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان میں انگریز تقریباً تین سو چالیس سال تک کسی نہ کسی انداز میں موجود رہے۔

یہاں وہ آئے جو ایک تاجر کے طور پر تھے لیکن گئے وہ وائسرائے کے طور پر!

انگریزوں نے اپنے دور حکومت میں ہندوستان کو دو بڑے حصوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ ان میں ایک حصے کا نام برٹش انڈیا تھا جبکہ دوسرا حصہ مقامی ریاستوں پر مشتمل تھا۔ برٹش انڈیا پر پہلے کمپنی اور بعد میں براہ راست حکومتِ برطانیہ حکومت کرتی تھی۔ اس کی ایک مثال پنجاب کا بہت بڑا علاقہ ہے جو انھوں نے سکھوں سے اپنے قبضے میں لیا۔ اسی طرح انھوں نے دہلی بھی مغلوں سے چھینا۔ یہ ہندوستان کے تقریباً نصف سے زائد علاقے پر مشتمل تھا اور اس میں بسنے والے لوگوں کی تعداد بھی ستر فیصد سے زائد تھی۔

ہندوستان میں صدیوں سے مقامی ریاستیں قائم تھیں۔ جن میں بڑی بڑی ریاستیں جیسے حیدرآباد، جموں وکشمیر، سکم اور کئی چھوٹی چھوٹی ریاستیں بھی شامل تھیں جو چند سو مربع میل پر پھیلی ہوئی تھیں۔ جب انگریزوں کی حکومت قائم ہوئی تو انھوں نے ان ریاستوں کے ساتھ معاہدے کیے اور اپنے تعلقات استوار کیے۔ ایسی ریاستوں کی تعداد 565 تھی۔ اس کے علاوہ بہت سارے علاقوں میں جاگیردار تھے جنھیں مغلوں نے جاگیریں عطا کیں بعد ازاں انگریزوں نے بھی کچھ لوگوں کو نوازا تو وہ اپنے علاقے کے جاگیردار بن گئے۔ انھیں کچھ آزادی حاصل تو تھی لیکن وہاں بھی انگریزوں کی بالواسطہ حکمرانی تھی۔ کچھ علاقوں میں بڑے بڑے زمین دار تھے۔ جو جاگیر کے اعتبار سے تو کم لیکن

پھر بھی ایک خاصے بڑے علاقے کے مالک ہوتے تھے۔ ریاستوں کے پاس ہندوستان کا چالیس فیصد حصہ تھا جبکہ ہندوستان کی تیس فیصد آبادی ان ریاستوں میں رہتی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ کچھ علاقے آزاد بھی تھے جیسے اِفغانستان اور ہندوستان کے درمیان سرحدی علاقے۔ یہ بھی یاد رکھنے کی ہے کہ ایک مدت تک انگریزوں کے زیرِ قبضہ علاقوں میں اضافہ یا کمی بھی واقع ہوتی رہی ہے جیسا کی مالاکنڈ کی جنگوں سے واضح ہے۔

تقسیم ہند کے وقت ان ریاستوں کو یہ اختیار دیا گیا کہ وہ پاکستان یا ہندوستان میں سے کسی کے ساتھ بھی مل سکتی ہیں۔ اگر وہ آزاد رہنا چاہیں تو انھیں اس کا بھی حق ہوگا۔ حیدرآباد کی ریاست میں اکثریت ہندوؤں کی تھی لیکن حکمران مسلمان تھے۔ مسلمان حکمرانوں نے کچھ دیر مزاحمت تو کی لیکن بھارتی حکومت نے طاقت کے زور پر اس ریاست کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ کشمیر میں اکثریت مسلمانوں کی تھی لیکن حکمران ہندو تھے۔ حکمرانوں نے مسلمانوں کی مخالفت کے باوجود ریاست کا الحاق بھارت کے ساتھ کر دیا۔ جس کی وجہ سے حالات بہت خراب ہوگئے اور اب تک کشمیر کے مسلمان اپنے حق خود ارادیت کے لیے لڑ رہے ہیں۔ ریاست جوناگڑھ میں اکثریت ہندوؤں کی تھی لیکن حکمران مسلمان تھے۔ حکمرانوں نے پاکستان کے ساتھ ملنے کی کوشش لیکن بھارت نے اس پر بھی زبردستی قبضہ کر لیا۔ ریاست قلات کے حکمرانوں نے پہلے آزادی کا اعلان کیا اور بعد میں پاکستان میں شامل ہوگئے۔ ریاست بھوپال بھی ایسی ہی صورتحال سے دوچار تھی، یہاں پر رہنے والوں کی اکثریت ہندو تھی حکمران مسلمان تھے۔ چاروں طرف بھارتی علاقے کی وجہ سے اس ریاست کے پاس بھی بھارت کے ساتھ شریک ہونے کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا۔ میں اس بارے میں مزید معلومات آپ کی خدمت میں آئندہ صفحات میں پیش کروں گا۔

ہمای گاڑی آٹھ بجے بھوپال ریلوے سٹیشن پر پہنچ گئی۔ سردار صاحب سے بہت اچھا تعلق بن گیا تھا اسی لیے ان کے جانے سے اداسی بھی ہو رہی تھی۔

سب کو ہی جانا ہوتا ہے۔ کوئی بھوپال چلا جائے گا اور کوئی چنائی، کوئی دنیا سے ہی۔۔۔

بھوپال جہاں خواتین ایک عرصہ تک حکمران رہیں

ہم نے سردار صاحب کو خدا حافظ کہا اور کچھ دیر کے لیے پلیٹ فارم پر کھڑے لوگوں کو آتے جاتے دیکھتے رہے۔

ہم دونوں نے ایک بات نوٹ کی کہ مسافروں میں ایک بڑی تعداد مسلمانوں کی تھی۔ جنھوں نے اپنی شناخت بھی قائم رکھی ہوئی تھی اس لیے انھیں پہچاننے میں ہمیں دقت بھی نہیں ہوئی۔ بعد ازاں جب میں نے بھوپال سے متعلق مختلف معلومات حاصل کیں، تو پتہ چلا کہ اس شہر میں 26 فیصد کے قریب مسلمان رہتے ہیں۔ شہر کی آبادی تقریباً پندرہ لاکھ ہے اور یہ ہندوستان کا سولہواں بڑا شہر ہے۔ اس طرح اس شہر میں چار لاکھ سے زائد مسلمان رہتے ہیں۔ اس شہر کی جھیلوں، باغات اور جنگلات کی وجہ سے اسے ہندوستان کے سب سے زیادہ گرین سٹی ہونے کا خطاب دیا گیا ہے۔ ہم نے محسوس کیا کہ ہم جس طرف بھی دیکھتے تھے ہمیں سبزہ ہی سبزہ نظر آتا وہ بہت ہی خوبصورت منظر تھا۔ بھوپال پہنچنے سے پہلے مجھے یہ اشتیاق تھا کہ میں ایسے علاقے دیکھوں جنھیں چلانے والی بیگمات اپنی طرزِ حکمرانی کی وجہ سے بہت مشہور ہوئیں۔

تاریخ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ریاست بھوپال کی کچھ خاص تاریخی حیثیت نہیں ہے۔ کہا جاتا ہے کہ گیارہویں صدی میں اس علاقے پر بھوجا نام کا ایک ہندو راجا حکومت کرتا تھا۔ اس وقت یہاں پر ایک گاؤں تھا۔ جسے بھوج پال کہا جاتا تھا۔ بعد ازاں

اس کا نام بھوپال پڑ گیا۔ پختونوں کے کسی قبیلے سے تعلق رکھنے والے دوست محمود خان اورنگزیب کی فوج میں ایک کمانڈر تھے۔ ان کے ساتھ اور بھی بہت سارے پختون فوجی تھے۔ اورنگ زیب کی وفات کے بعد جب مغلوں کا کنٹرول کمزور ہو گیا تو مقامی طور پر بہت سے لوگوں نے خود ساختہ آزادی کا اعلان کر دیا۔ دور دراز کے علاقے اس میں خاص طور پر پیش پیش تھے۔

اسی طرز پر چلتے ہوئے دوست محمد خان نے اپنا ایک بڑا گروہ بنا لیا۔ انھوں نے مقامی لوگوں کو اپنی فوجی خدمات پیش کرنا شروع کر دیں۔ مقامی راجہ مہاراجہ انھیں اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرتے تھے جس کے بدلے وہ ان کی ضروریات پوری کرتے تھے۔ اس طرح وہ کافی عرصے تک اس علاقے میں آتے جاتے رہے۔ ایک چھوٹی ریاست کی رانی نے اپنی ریاست کی حفاظت کے لیے دوست محمد خان سے ایک معاہدہ کیا۔ معاہدے کے مطابق رانی رقم کی ادائیگی نہ کر سکی۔ جس پر دوست محمد خان نے اس کی ریاست پر اپنا قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد دوست محمد خان نے علاقے پر علاقے فتح کرنا شروع کر دیے۔ آخر کار وہ اپنی ایک ریاست قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس طرح اس نے 1707ء میں ریاست بھوپال کی بنیاد رکھی۔

اس علاقے میں ہندو اکثریت میں تھے جبکہ حکمران مسلمان تھے۔ میں نے ایک بات نوٹ کی کہ جن ریاستوں کے حکمران مسلمان تھے وہ اپنے آپ کو نواب، نظام، یا والی کہلواتے تھے، جیسے نظام حیدر آباد، نواب آف بہاولپور وغیرہ لیکن جن ریاستوں کے حکمران ہندو تھے وہ اپنے آپ کو راجہ یا مہاراجہ کہلوانا پسند کرتے تھے۔ بھوپال کے حکمرانوں نے بھی خود کے لیے نواب کا لقب پسند کیا۔ دیگر ریاستوں کی طرح بھوپال کا بھی انگریزوں کے ساتھ الحاق ہو گیا۔ اس طرح یہ ریاست ان 565 ریاستوں کا حصہ بن گئی

جن کے انگریزوں کے ساتھ معاہدے تھے۔ اس ریاست سے متعلق ایک ایسی بات جس کی مثال کہیں اور نہیں ملتی وہ نواب خاندان کی بیگمات کی سو سال سے زیادہ حکمرانی ہے۔

کسی وجہ سے خاندان کا کوئی مرد حکمران بننے کے قابل نہیں تھا۔ تو 1819ء میں ایک بیگم کو حکمران بنایا گیا۔ پھر اس کے بعد بیگمات نے کسی مرد کو حکمران نہیں بننے دیا۔ 1819ء سے لے کر 1926ء تک یکے بعد دیگرے چار بیگمات نے اس ریاست پر حکمرانی کی۔ یاد رہے حیدرآباد کے بعد یہ مسلمانوں کی دوسری بڑی ریاست تھی۔ پھر ایک بیگم کو ترس آگیا یا وہ کسی دوسری بیگم کو اپنے بعد حکمران دیکھنا نہیں چاہتی تھیں لہٰذا اس نے اپنی زندگی میں ہی اپنے بیٹے کو حکمران بنا دیا۔ اس سو سالہ حکمرانی میں ان بیگمات نے بھوپال کی ترقی میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ اُس دور میں اس شہر میں ایک تاج محل پیلس بھی بنایا گیا۔

جیسا کہ میں نے پچھلے صفحات میں ذکر کیا کہ تقسیم ہند کے وقت ہر ریاست کو کسی کے ساتھ ملنے یا آزاد رہنے کا اختیار دیا گیا تھا۔ ریاست بھوپال کے مسلمان حکمران حمیداللہ خان نے بھارت سے ملنے کی بجائے آزاد رہنے کو ترجیح دی۔ اس فیصلے کے خلاف ہندوؤں نے بہت بڑی تحریک چلائی۔ تقریباً ڈیڑھ سال تک نواب صاحب نے اس کی مزاحمت کی۔ آخرِ کار اپریل 1949ء کو ریاست ختم کر دی گئی اور اسے بھارت کا حصہ بنا دیا گیا۔

بھوپال کی تاریخ جاننے کے لیے نواب شاہجہان کی کتاب جو 1876ء میں لکھی گئی جس کا حال ہی میں انگریزی میں ترجمہ بارسٹو نے کیا ہے بے حد مفید ہے۔

The Taj-Ul Ikbal Tarikh Bhopal: Or The History Of Bhopal (1876) اس کے علاوہ شہریار محمد خان کی کتاب The Begums of Bhopal میں بھی ریاست بھوپال کے بارے کافی مواد موجود ہے[17]۔

بیگمات کی حکمرانی کی وجہ سے مجھے اس علاقے کو دیکھنے کا شوق تھا جو آج پورا ہو گیا۔

بدقسمتی سے 1984ء میں اس شہر کے ایک کیمیکل کارخانے میں دھماکہ ہوا جس کے نتیجے میں ہزاروں لوگ اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے اور اس سے بھی کہیں زیادہ لوگ متاثر ہوئے۔ اب تک اس کے اثرات محسوس کیے جاتے ہیں۔ یہ ایک بہت ہی اندوہناک حادثہ تھا۔

Begum Sultana Jahan Photo Credit: http://aligarhmovement.com

[17] https://www.bloomsbury.com/uk/begums-of-bhopal-9781350180277

From right to left, Sikandar Begum, Qudisa Begum,Sultana Begum and Shahjehan Begum

Photo Credit: https://feminisminindia.com

یادِ رفتگاں: بیادِ والیٔ بھوپال بیگم سلطان جہاں
احمد علی برقیؔ اعظمی
والیٔ بھوپال تھیں سلطاں جہاں
ہر طرف ہیں جن کی عظمت کے نشاں
اہلِ علم و فضل کی تھیں سرپرست
تھیں وہ اربابِ نظر کی میزباں
تھا علی گڈھ سے اُنھیں فطری لگاؤ
تھیں دلوں پر اہلِ دل کے حکمراں
تھیں وہ یکساں صاحبِ سیف و قلم
ہیں کتابیں اُن کی زیبِ داستاں
" ہر کہ خدمت کرد او مخدوم شد"
کارنامے اُن کے ہیں سب پر عیاں
آج بھی بھوپال میں موجود ہیں
ہر طرف اُن کے نقوشِ جاوداں
پیکرِ حُسنِ عمل تھی اُن کی ذات
تھیں وہ برقیؔ مرجعِ دانشوراں

Begum Sultan Jahan

First Indian women, Founder Chancellor of Aligarh Muslim University, Aligarh Photo Credit: http://aligarhmovement.com

Taj ul Masjad Located on the shores of pristine 'Motia Talaab', the 'Taj-ul-Masjid' is one of the biggest tourist attractions in the Bhopal Plus 175000 people can say their prayer Photo Credit: https://www.tourmyindia.com

دیپ سکسینہ: سوشیالوجی کے پروفیسر، بھارتی معاشرے کی گہرائیوں سے واقف

میں اور وقاص انجم جعفری، سردار صاحب کو رخصت کرکے واپس اپنے کیبن میں آ گئے۔ سب لوگ ناشتے سے فارغ ہو چکے تھے اور ہشاش بشاش لگ رہے تھے۔ ابھی ہم نے تقریباً بائیس گھنٹے اور ساتھ رہنا تھا۔ اس لیے ہم کبھی گفتگو شروع کر دیتے اور کبھی کوئی اپنی کتاب یا رسالہ نکال کر پڑھنا شروع کر دیتے۔ اس وقت موبائل فون بھی بہت عام نہیں تھا۔ انٹرنیٹ بھی کہیں کہیں دستیاب تھا اور لیپ ٹاپ تو شاید ہی کسی کے پاس ہو۔ اس لیے علم حاصل کرنے اور وقت گزارنے کے لیے کتابیں ہی اصل سہارا تھیں۔ اکثر لوگ طویل سفر میں کچھ نہ کچھ پڑھنے کے لیے ساتھ رکھ لیتے ہیں۔ ایسا ہی معاملہ ادھر بھی تھا لیکن میری ایک اور دلچسپی بھی تھی۔

ہم نے جب دہلی سے سفر شروع کیا تو میں نے اسی وقت اپنے ایک ہم سفر سردار دیپ سکسینہ سے مختصر تعارف حاصل کر لیا تھا۔ انھوں نے بتایا کہ وہ دہلی میں ایک یونیورسٹی کے شعبہ سوشیالوجی سے وابستہ ہیں اور گزشتہ پندرہ سال سے سوشیالوجی سے متعلقہ مختلف مضامین پڑھا رہے ہیں اور انھوں نے کچھ کتابیں بھی لکھی ہیں۔ اب وہ چنائی میں ایک تعلیمی کانفرنس میں شرکت کے لیے جا رہے تھے۔ میں بہت خوش تھا کہ مجھے ایک صاحبِ علم سے ہندوستانی معاشرے کے بارے میں بہت کچھ ایسا جاننے کا موقع میسر آ گیا ہے جس تک عام آدمی کی رسائی نہیں ہے۔ یہ میری خوشبختی تھی کہ مجھے ایسا ایک موقع میسر آ رہا تھا۔

سوشیالوجی ایک ایسا مضمون ہے جو معاشرے میں آنیوالی تبدیلیوں، رہن سہن اور ایک دوسرے سے میل جول کے طریقوں کے بارے میں بحث کرتا ہے۔ یہ ان مضامین میں سے ایک ہے جو مجھے بے حد پسند ہیں۔ دیپ صاحب جیسے جہاندیدہ پروفیسر کی موجودگی میرے لیے باعثِ مسرت تھی اور ایک طویل سفر کی وجہ سے ہونے والی انتہائی دلچسپ گفتگو بھی میرے لیے خوشی کا باعث تھی۔ چھوٹے چھوٹے وقفوں میں ہماری کئی نشستیں ہوئیں۔ میں نے ان سے بیشمار سوالات کیے اور انھوں نے بڑے تحمل کیساتھ جوابات مرحمت فرمائے۔ ان جوابات کی تفصیل بیان کرنے کے لیے الگ سے ایک کتاب درکار ہو گی۔ میں نے ان سے جو کچھ سنا اس کی مختصر رُوداد بیان کرنا چاہوں گا۔

کیبن کے باہر دو کرسیاں موجود تھیں۔ ہم نے جب بھی باتیں کرنی ہوتی تو ہم کیبن سے باہر آ کر بیٹھ جاتے تاکہ باقی ساتھی ہماری وجہ سے کسی مشکل کا شکار نہ ہوں۔ دوسرا مجھے باتیں غور سے سننے اور انھیں یاد رکھنے اور نوٹس لینے میں بھی سہولت ہوتی تھی۔

میں نے دیپ صاحب سے کہا کہ ہمارے ہاں دیپ کا مطلب چراغ ہوتا ہے۔ آپ کے نام کا مطلب بھی یہی ہے؟ انھوں نے بتایا ہاں میرے نام کا مطلب بھی دیا یا چراغ ہی ہے اور سکسینہ ہماری برادری کا نام ہے۔ دیپ صاحب سے میرا پہلا سوال یہ تھا کہ بھارت کی فلم انڈسٹری دنیا بھر میں مشہور ہے اور دن بدن اس میں وسعت بھی آرہی ہے اور یقینی طور پر اس کے معاشرے پر اثرات بھی ہوں گے۔ میں یہ جاننا چاہوں گا کہ فلم کے معاشرے پر اثرات کو عام آدمی کس نظر سے دیکھتا ہے؟ میرے سوال کے جواب میں انھوں نے کہا کہ مشتاق جی آپ کا سوال بہت وسیع ہے۔ پہلے آپ سوال محدود کریں پھر میں آپ کو اس کا جواب دوں گا۔

میرے لیے ان کا یہ جواب بہت غیر متوقع تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ روٹین کا کوئی جواب دیں گے لیکن میرے سوال کے جواب میں ان کا سوال میرے لیے مشکل ثابت ہو رہا تھا۔ میں بھی تھوڑا سا ٹھٹھک گیا۔ میں نے کہا چلیئے آپ یہ بتایئے کہ بھارت کی فلم انڈسٹری کا بھارتی معاشرے کے مختلف گروہوں کو آپس میں قریب یا دور کرنے میں کیا کردار ہے؟ اس کے جواب میں دیپ صاحب نے کہا سوال تو اب بھی بہت وسیع ہے لیکن کیونکہ یہ معاشرے کی کسی خاص جہت سے متعلق ہے اس لیے اس کا جواب دینا آسان ہوگا۔ انھوں نے جو بتایا اس کا خلاصہ پیش خدمت ہے۔

دیپ صاحب نے کچھ دیر سوچنے کے بعد بتایا کہ میں آپ کو ایک ایسی بات بتاتا ہوں جو عام طور پر بیان نہیں کی جاتی۔ میری دلچسپی بڑھ گئی اور میں مزید چوکنا ہو کر بیٹھ گیا۔ انھوں نے بتایا کہ ہم نے حال ہی میں ایک ریسرچ کی ہے۔ جس کے مطابق ہماری فلم انڈسٹری نے بھارتی معاشرے کو قریب لانے اور ایک دوسرے کو جاننے میں بیحد اہم کردار ادا کیا ہے۔ وہ اس طرح کہ اگر آپ فلم انڈسٹری میں کام کرنے والے لوگوں کو دیکھیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ وہاں پورے بھارت سے لوگ آتے ہیں اور مل جل کر فلم

بناتے ہیں۔انھوں نے ایک مشہور فلم شعلے کا تذکرہ کیا اور بتایا کہ اس فلم کو بنانے والوں میں بھارت کے سبھی علاقوں کے لوگ شامل تھے۔

انھوں نے مزید بتایا کہ ہماری سیاست میں بھی زیادہ تر لوگ علاقائی سیاست کرتے ہیں۔ وہ مرکزی اسمبلی میں بھی اپنے علاقوں کی ہی بات کرتے ہیں جس سے لوگ تقسیم ہوتے ہیں اور اس کی بنیادی وجہ مفادات ہی ہیں۔اس کے برعکس فلم انڈسٹری میں ہم نے یہ دیکھا کہ ایک پلیٹ فارم پر بہت سے لوگ مل کر کام کر رہے ہوتے ہیں جو عقائد، خیالات اور سماجی طور پر ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ یہ سب دیکھ کر ہم سمجھتے ہیں کہ فلم انڈسٹری ملک کے مختلف لوگوں کو قریب لانے میں اہم کردار ادا کر رہی ہے۔

دیپ صاحب نے دوسری بات یہ بتائی کہ اس فلم کے ذریعے لوگ ایک دوسرے کو جاننا شروع ہو گئے ہیں لوگ اپنے علاقے کے علاوہ بھی دیگر علاقوں کے لوگوں کو دیکھتے ہیں۔اس سے انھیں دیگر اقوام کے رہن سہن کا بھی پتہ چلتا ہے۔ نتیجتاً آپس میں قربتیں پیدا ہوتی اور دوریاں بھی کم ہوتی ہیں۔

بالی وڈ نے آسان ہندی زبان میں جو فلمیں بنائیں اس سے لوگوں کی ایک بڑی تعداد نے ہندی زبان کو سمجھنا شروع کیا۔ ہندی، جو کبھی ایک خاص علاقے کی زبان ہوا کرتی تھی اب اسے سمجھنے والوں کی تعداد میں بے حد اضافہ ہو رہا ہے۔ دیپ صاحب نے یہ بھی بتایا کہ ہندی اردو اور پنجابی زبانیں ایک دوسرے سے کافی ملتی جلتی ہیں۔اس وجہ سے فلم انڈسٹری نے ہندی اور پنجابی زبان میں فلمیں بنا کر بھارت کے لوگوں کو "ایک قوم" بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

پھر میں نے ایک قدرے مختلف سوال کیا کہ آپ ابھی جو زبان بول رہے ہیں اسے آپ کیا کہتے ہیں؟ انھوں نے کہا میں اسے ہندی کہتا ہوں۔ میں نے کہا میں جس

زبان میں آپ کے ساتھ بات کر رہا ہوں،اسے آپ کیا کہتے ہیں؟ انھوں نے کہا میں اسے اردو کہتا ہوں۔ یہ جواب سننے کے بعد میں نے ان سے پوچھا کہ میری اور آپ کی زبان میں وہ کون سے مختلف الفاظ ہیں جن کی بنیاد پر آپ نے ہندی اور اردو زبان کی تقسیم کی ہے؟

میرے سوال پر وہ ہنس پڑے اور مسکرا کر جواب دیا کہ جو اصل ہندی زبان ہے اس میں بہت سے الفاظ ایسے ہیں جو اردو میں نہیں ہیں اور اگر کوئی صحیح ہندی بول رہا ہو تو اردو بولنے والوں کو سمجھنے میں دقت ہو گی۔ مطلب تو شاید وہ سمجھ لیں لیکن پوری بات نہیں سمجھ سکتے۔اب ہندی کے مشکل الفاظ بھی آہستہ آہستہ ختم ہو رہے ہیں۔آپ نے یہ محسوس کیا ہوگا میری اور آپ کی گفتگو کے دوران شاید کچھ الفاظ ایسے ہوں جو بھارتی استعمال کرتے ہیں اور آپ نہیں، جیسے چنتا، شانتی، وغیرہ۔ یہ بات تو درست ہے کہ اب عام آدمی آسان ہندی بولتا ہے جو اردو سے بے حد مشابہت رکھتی ہے بلکہ ان میں فرق کرنا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔

انھوں نے مزید کہا کہ بھارت میں بننے والی فلمیں پاکستان میں بے حد پسند کی جاتی ہیں اور انھیں سمجھنے میں پنجابی یا اردو سمجھنے والے شخص کو کوئی دقت محسوس نہیں ہوتی لیکن اگر آپ ہمارے ٹی وی پر ہندی خبریں سنیں تو میں پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ شاید آپ کو آدھی باتیں بھی سمجھ نہ آئیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہندی جو صدیوں پرانی زبان ہے، وہ اب آسان ہندی میں تبدیل ہو گئی ہے اردو اور اس کے درمیان شاید دو فیصد کا فرق بھی باقی نہیں رہا۔آخر میں انھوں نے کہا کہ یہ بات ہمارے لیے باعثِ تشویش ہے کہ ہماری موجودہ نسل، صدیوں سے بولی جانے والی ہندی زبان سے دور ہو گئی ہے۔ کئی بچے صرف انگلش میں بات کرنا ہی پسند کرتے ہیں۔ اگر کبھی وہ ہندی میں بھی بات کریں تو ان کی ہندی آسان ہندی ہے، جو اردو سے دور نہیں ہے۔

یہ کہہ کر انھوں نے ایک آہ بھری اور کہا کہ معاشرتی رویوں میں تبدیلی لانے والے عوامل پر کوئی آسانی سے قابو نہیں پا سکتا۔ کیا اب ہم اصلی ہندی زبان میں فلم بنا کر دنیا کو دکھا سکتے ہیں؟ ایسا ممکن نہیں ہے۔ اس لیے ایسی زبان استعمال کرتے ہیں جسے زیادہ سے زیادہ لوگ سمجھ سکیں خاص طور پر ہندی، اردو اور پنجابی بولنے والے جن کی تعداد ایک ارب سے بھی زائد ہے۔ اپنی فلم کی کامیابی کے لیے بالی وڈ کا ایسا کرنا بے حد ضروری ہے۔ یہ صرف ایک وجہ ہے اور اس طرح کی بے شمار دیگر وجوہات بھی موجود ہیں جو ہمارے کنٹرول میں نہیں ہیں۔ اس لیے میری ہندی اور آپ کی اردو میں کوئی خاص فرق نہیں البتہ لکھنے اور رسم الخط میں نمایاں فرق ہے۔

ہم کئی گھنٹوں سے بات کر رہے تھے اور ہمیں آپس میں بات کرنے کے لیے کسی دوسری زبان کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ یہ کمال ہے آسان ہندی کا، مشکل ہندی مجھے تو کچھ آتی ہے لیکن میرے بچوں کو نہیں آتی۔ جیسے انسان مرتے ہیں ویسے ہی زبانیں مر جاتی ہیں۔ ہر روز کسی نا کسی زبان کی موت واقع ہوتی ہے۔ ہم ایک یونیورسل زبان کی طرف جا رہے ہیں جس کا نام انگریزی ہے۔ جس کا مشاہدہ آپ اپنی طرف بھی کر سکتے ہیں اور یہاں بھی۔ ہماری عدالتی کارروائیاں، ہماری دکانوں کے نام، علاقوں کے نام، ہمارے اداروں کا ایک دوسرے سے رابطے کا ذریعہ، انگلش میڈیم سکولوں کی بھرمار اور اس کے علاوہ بے شمار مثالیں ہیں جو اس بات کو سمجھنے کے لیے کافی ہیں کہ اب انگریزی کا ہی چلن ہے۔ دیپ صاحب کے ساتھ ایک طویل نشست اختتام کو پہنچی۔ ہم نے باقی باتیں اگلی نششت میں کرنے کا منصوبہ بنایا۔

اٹراسی: جو بھارت کے وسط میں واقع ہے

اُس وقت صبح کے دس بجنے والے تھے اور ہماری ٹرین اٹراسی ریلوے سٹیشن پر پہنچنے والی تھی۔ جیسے ہی ٹرین رکی میں اور وقاص بھائی حسبِ اشتیاق پلیٹ فارم پر اتر

گئے۔ یہاں پر ٹرین کا سٹاپ پانچ منٹ کا تھا۔ ہم نے پلیٹ فارم پر دیکھا کہ ایک اسٹال پر کھانے پینے کا کچھ سامان پڑا تھا۔۔ یہ ایک عام سی بات تھی لیکن جب ہم نے اس سٹال کو قریب سے دیکھا تو ہمیں ایک دلچسپ چیز نظر آئی۔ صاحب سٹال نے اپنے سامنے والے شیشے کے فریم میں دنیا بھر کے کرنسی نوٹ سجا رکھے تھے۔ معلوم ہوا کہ یہ ان صاحب کا شوق ہے۔اس نے بے شمار ممالک کے چھوٹے بڑے کرنسی نوٹ سجائے ہوئے تھے۔ ہم نے پاکستان کا نوٹ تلاش کرنے کی کوشش کی جو ہمیں نہیں ملا۔ ہم نے اس سے گزارش کی کہ کیا وہ پاکستان کا نوٹ رکھ لے گا؟ اس نے ہمیں خوش ہو کر کہا کہ کیوں نہیں؟ ہم نے ایک سو روپے کا نوٹ اسے دیا جو اس نے ہمارے سامنے شیشے کے فریم میں ایک خالی جگہ پر رکھ دیا۔ امید ہے اب تک وہاں موجود ہوگا۔

اس کے بعد میں اور وقاص صاحب اٹراسی کے پلیٹ فارم کو دیکھتے رہے۔ جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ مدھیہ پردیش کا سب سے بڑا ریلوے جنکشن ہے۔ اٹراسی زیادہ پرانا شہر نہیں ہے۔اس کے نام کا پہلا لفظ اینٹ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہاں پر بڑی تعداد میں اینٹ بنانے والے بھٹے تھے، جس کی وجہ سے اس کا نام اٹراسی پڑ گیا۔ راسی ہندی کا کوئی لفظ ہے جس کے معنی مجھے معلوم نہیں ہیں۔ میں نے ڈھونڈنے کی کوشش کی لیکن مجھے کہیں سے اس کا مطلب نہ مل سکا۔

اگر آپ نقشے پر دیکھیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ یہ شہر بھارت کے مرکز میں واقع ہے۔ اسی لیے بھارت کے لوگ اسے بھارت کا دل بھی کہتے ہیں۔اس علاقہ کی اہم بات یہ ہے کہ یہاں پر اسلحہ بنانے کا ایک بہت بڑا کارخانہ ہے۔ چاروں طرف سے سرحد دور ہونے کی وجہ سے یہ جگہ ایسے کام کے لیے بہت محفوظ ہے۔ یہاں پر ایک تاوا ڈیم بھی ہے جو ہمارے منگلا ڈیم سے چھوٹا ہے۔ اس علاقے میں بہت زیادہ سیاح آتے ہیں اور وہ ڈیم میں چلنے والی کشتیوں پر بھی سیر کرتے ہیں۔ اس ڈیم کو بنانے میں یہاں کے ایک

مقامی رہنما کمار دیوان نے اہم کردار ادا کیا تھا۔ اسی وجہ سے کمار دیوان کو اس علاقے کا مہاتما گاندھی کہا جاتا ہے۔ اٹراسی میں مسلمانوں کی تعداد پانچ فیصد کے قریب ہے۔ میرا یہ خیال ہے کہ دہلی سے آٹھ سو کلومیٹر دور ہونے کی وجہ سے بھی اس علاقے میں مسلمان تھوڑے ہیں۔

میں اور وقاص بھائی اپنے کیبن میں واپس آ گئے۔ اتنی دیر میں ہرجیت بھی آ گیا اور اس نے ہم سے چائے کا پوچھا۔ سب نے ہاں میں سر ہلایا۔ ہرجیت نے بہت ہی اچھے طریقے سے لوگوں کو چائے پیش کی۔ چائے سے فارغ ہونے کے بعد میں نے دیپ صاحب سے کہا اگر وہ مناسب سمجھیں تو ہم باہر بیٹھ کر باتیں کریں۔ باہر جانے کو ان کا دل نہیں تھا لیکن وہ میری خاطر راضی ہو گئے۔ پھر ہم باہر آ کر کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

معاشرے میں دوریاں پیدا کرنے میں بھارتی فلموں کا کردار

میں نے دیپ صاحب سے پوچھا، کیا بھارتی فلموں نے معاشرے کے مختلف طبقات میں دوری بھی پیدا کی ہے؟ اس کے جواب میں انھوں نے بتایا کہ ہاں ایسا بھی ہوا ہے۔ دیپ صاحب نے مزید کہا کہ میں فلم کے موضوعات کو چھ مختلف کیٹیگریز میں تقسیم کرتا ہوں۔ جن کی تفصیل کچھ یوں ہے۔ پہلی وہ ہیں جن میں جدوجہد اور کوشش کو نمایاں کیا گیا ہے۔ دوسری جن میں معاشرے کے مختلف طبقات، خاص طور پر امیر اور غریب کے درمیان موجود کشمکش کو اجاگر کیا گیا ہے۔ تیسری قسم کی فلمیں وہ ہیں جن کا موضوع حب الوطنی ہے۔ چوتھی قسم ان فلموں کی ہے جن میں سیاستدانوں کو بہت برے انداز میں پیش کیا گیا ہے اور ان کے خلاف مختلف لوگوں خاص طور پر پولیس کے رویہ کو اجاگر کیا گیا ہے۔ پانچویں قسم میں مختلف شخصیات کو لوگوں کے سامنے بھگوان بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ آخری قسم وہ ہے جس میں معاشرتی اور خاندانی مسائل کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ایک قسم مزاحیہ فلموں کی بھی ہے لیکن میں انھیں زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔ دیپ

صاحب نے بتایا کہ ہندوستان کی پہلی فلم 1913ء میں بنی تھی۔ پہلی بولنے والی فلم 1931ء میں جبکہ پہلی رنگین فلم 1937ء میں بنائی گئی۔اس طرح سے بھارتی فلم انڈسٹری اپنی سو سالہ تاریخ رکھتی ہے۔ جس سے آپ معاشرے سے ایک تعلق کا اندازہ کر سکتے ہیں۔

دیپ صاحب نے کہا کہ جہاں تک آپ کے سوال کا تعلق ہے اس کے جواب میں، میں صرف یہ کہنا چاہوں گا کہ بہت ساری فلموں نے معاشرے کے ساتھ ساتھ ہمسایوں، خاص طور پر پاکستان کے ساتھ فاصلوں کو بڑھانے میں بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔ ایسی تمام فلمیں جو حب الوطنی کے موضوع پر بنائی گئیں ،ان میں بھارت کا دشمن صرف پاکستان کو دکھایا گیا۔ یہ بات بھی درست ہے کہ تقسیم ہند کے بعد سے اب تک بھارت کی بڑی لڑائیاں صرف پاکستان سے ہی ہوئی ہیں۔ چین کے ساتھ کچھ سرحدی تنازعات ضرور موجود ہیں جس کی وجہ سے معمولی جھڑپیں تو کئی بار ہوئی ہیں، لیکن کبھی بھی کوئی بڑی جنگ نہیں ہوئی۔ اسی لیے میں یہ سمجھتا ہوں کہ بھارتی فلموں نے پاکستان اور ہندوستان کے درمیان دوستی کے عمل کو نقصان پہنچایا ہے۔انھوں نے کہا کہ میں نے پاکستانی فلموں میں بھی یہی دیکھا ہے کہ وہ بھی جب دشمن کی بات کرتے ہیں تو انھیں بھی بھارت ہی نظر آتا ہے۔

دوسرا موضوع سیاست دانوں اور ان کے منفی کردار ہیں۔ ایسی فلمز میں سیاستدانوں کو ظالم کے طور پر دکھایا گیا ہے اور تمام تر برائیوں کی جڑ سیاستدان کو ہی دکھایا گیا ہے۔ سیاست دانوں کے خلاف عام آدمی اور پولیس کے رویہ کو بھی اجاگر کیا گیا ہے۔ ان فلموں سے بھی ہمارے معاشرے میں عام لوگوں اور سیاست دانوں کے درمیان ایک خلا پیدا ہو گیا ہے۔ اس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ عام آدمی سیاست اور سیاست دانوں سے نفرت کرنے لگا ہے۔

ایک اور بڑا نقصان یہ ہوا کہ سیاست دانوں کا لوگوں کے دلوں میں احترام بھی ختم ہو گیا ہے۔ اس کی مثال دیتے ہوئے انھوں نے بتایا کہ ماضی قریب میں کوئی بھی ایسا سیاست دان نہیں گزرا جسے ہمارے عوام اپنا ہیرو تصور کرتے ہوں یا خدمت کی بنیاد پر وہ بھگوان ماننے کو تیار ہوں۔ اکا دکا علاقائی سیاست دان ضرور ایسے گزرے ہیں جبکہ پچاس سال پہلے ایسے بے شمار سیاستدان موجود تھے جن کو اب بھی لوگ ان کی خدمت اور دیانت کی وجہ سے بھگوان مانتے ہیں اور ان کے مجسمے بھی بنا کر رکھے ہیں۔ان کے نام پر ادارے بناتے ہیں۔ اب ہر سیاستدان کے ساتھ کوئی نہ کوئی اخلاقی یا مالی کہانی جڑی ہوتی ہے جس نے سیاستدانوں کو عام لوگوں کی نظروں سے گرا دیا ہے۔اس فہرست میں بہت بڑے بڑے لوگوں کے نام بھی ہیں۔

اس ساری گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر فلم انڈسٹری نے بھارتی معاشرے میں یکجہتی پیدا کی ہے اس کے ساتھ ساتھ مختلف گروہوں اور طبقات کے درمیان دوری بھی پیدا کی ہے۔ دیپ صاحب کے ساتھ یہ نشست بھی ختم ہوئی۔ دوپہر کے کھانے کا وقت بھی ہو رہا تھا۔ باتیں بھی ایک خاص وقت تک ہی ہوتی ہیں اور اس کے بعد ہمت بھی جواب دے جاتی ہے ،اس لیے ہم نے یہ طے کیا کہ کھانا کھانے اور قیلولہ کرنے کے بعد اگلی بیٹھک کریں گے۔

ہماری گاڑی کا اگلا سٹاپ ناگپور تھا جو رہن سہن کے حوالے سے بھارت کا سب سے بہترین شہر قرار دیا گیا ہے۔

ناگپور: ہندو قوم پرستوں کا ہیڈ کوارٹر۔ جہاں آر ایس ایس نے جنم لیا

کھانے کے بعد سب لوگوں نے کچھ دیر آرام کیا اور پھر وہی کتاب، اخبار، رسالہ اور باتیں۔ ہماری ٹرین دو بجے کے قریب ناگپور پہنچ گئی۔ میں نے ناگپور سٹیشن سے متعلق پڑھا تھا کہ یہ ہندوستان کا وہ ریلوے سٹیشن ہے جہاں پر لوگ سیر و تفریح کے لیے آتے

ہیں کیونکہ عام طور پر ایسا نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ مہاراشٹر اکا سب سے پرانا اور مصروف سٹیشن ہے۔ اس کی مصروفیت کا اندازہ آپ اس بات سے لگا سکتے ہیں کہ یہاں سے روزانہ ایک سو بیس ٹرینیں گزرتی ہیں۔ یہ یہاں کا ایک بہت بڑا جنکشن ہے۔ پرانا ریلوے سٹیشن 1881ء میں بنایا گیا تھا۔ موجودہ ریلوے سٹیشن کا افتتاح 1925ء میں اُس وقت کے انگریز گورنر نے کیا تھا۔

حسب ذوق میں اور وقاص صاحب کچھ دیر کے لیے پلیٹ فارم پر اترے۔ ناگ پور ریلوے سٹیشن دیکھ کر ہمیں یہ احساس ہوا کہ یہ واقعی ایک مصروف ریلوے سٹیشن ہیں۔ اس کی بناوٹ صفائی ستھرائی اور یہاں پر رکھی گئی بہت ساری چیزیں اپنے اندر اتنی کشش رکھتی ہیں کہ ہر سال لاکھوں لوگ ناگپور ریلوے سٹیشن کو دیکھنے آتے ہیں۔ اس سے پہلے کہ میں دیپ صاحب کے ساتھ اپنی اگلی نشست میں ہونے والی باتوں کا تذکرہ کروں میں چاہوں گا کہ ناگپور کے بارے کچھ باتیں بتائی جائیں۔ اس شہر میں تین ہزار سال پرانی عمارتیں بھی پائی گئی ہیں جو اس بات کی گواہی دیتی ہیں کہ یہ شہر تین ہزار سال سے بھی زیادہ پرانا ہے۔

بھارت میں ہر سال صحت و صفائی، شہری سہولیات، قدرتی حسن اور دیگر کئی عوامل کی بنیاد پر شہروں کی درجہ بندی کی جاتی۔ اس درجہ بندی کے مطابق ناگپور شہر پورے بھارت میں اول نمبر پر ہے۔ یہ صوبہ مہاراشٹر اکا سرمائی کیپیٹل بھی ہے۔ ناگپور آبادی کے لحاظ سے بھارت کا تیرھواں بڑا شہر ہے۔ اسی شہر سے ایک نئی تحریک نے بھی جنم لیا۔ اس تحریک کا مقصد بھارت میں رہنے والے نچلی ذات خاص طور پر دلت اور بدھ مت کے لوگوں کو معاشرے میں صحیح مقام دلوانا تھا۔ ناگپور میں ترشاوہ پھل بڑی مقدار میں پیدا ہوتے ہیں اس لیے اسے اورنج سٹی بھی کہا جاتا ہے یعنی یہ بھارت کا سرگودھا ہے۔

بدھ مت کے لوگ اپنی عبادت گاہ کو سٹوپہ کہتے ہیں۔ دنیا کا سب سے بڑا سٹوپہ اسی شہر میں واقع ہے۔ ہندو قوم پرستوں کی تنظیم آر ایس ایس کا ہیڈ کوارٹر بھی یہاں ہی ہے۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ بھارت کے مرکزی حصے میں سب سے زیادہ ہندو رہتے ہیں جبکہ سرحدی علاقوں میں ہندوؤں کے ساتھ ساتھ دیگر مذاہب کے لوگوں کی بھی ایک خاصی تعداد آباد ہے۔

اس شہر کے نام سے متعلق دو مختلف روایات ہیں۔ ایک روایت کے مطابق اس علاقے میں ایک خاص قسم کا سانپ پایا جاتا ہے جسے ناگ کہتے ہیں وہ ہندوؤں کے نزدیک خاصہ متبرک ہوتا ہے۔ اس وجہ سے اس شہر کا نام ناگپور رکھا گیا۔ یہاں سے ایک دریا بھی گزرتا ہے اور اس کا نام بھی ناگ ہے۔ اس لیے کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ دریا اور شہر کا نام اسی ایک خاص قسم کے سانپ کی وجہ سے رکھا گیا ہے۔ دوسری روایت کے مطابق یہاں پر ناگ نام کی ایک قوم آباد تھی جس کی وجہ سے اس کا نام ناگپور مشہور ہو گیا۔ پاکستان میں بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو اپنے نام کے ساتھ ناگی لکھتے ہیں۔ میں نے کچھ کتابوں کے مصنفین کے نام کے ساتھ بھی ناگ لکھا ہوا دیکھا ہے۔ اس بنیاد پر میرے خیال میں دوسری روایت زیادہ قرین قیاس ہے۔ اس علاقے میں ناگ قوم کی موجودگی کی وجہ سے شہر کا نام ناگپور پڑ گیا۔

ناگپور میں مختلف مقامات پر کئی ایسے آثارِ قدیمہ دریافت ہوئے ہیں جو یہ ثابت کرتے ہیں کہ اس علاقہ میں تین ہزار سال قبل بھی لوگ رہتے تھے۔ اس علاقہ پر مختلف ہندو راجاؤں نے تیرہویں صدی کے آخر تک حکومت کی۔ علاؤالدین خلجی نے تیرہویں صدی میں اس علاقے پر حملہ کیا اور مقامی ہندو راجاؤں کو شکست دے کر اپنی حکومت قائم کر لی۔ اس کے بعد چودھویں صدی کے آخر میں تغلق خاندان نے اس علاقے میں اپنی باقاعدہ ریاست کا اعلان کر دیا۔ یہ علاقہ دہلی کے مختلف سلاطین کے ماتحت

رہا۔ سترہویں صدی میں مغل حکمرانوں نے سلاطینِ دہلی کو شکست دے کر ان کے تمام علاقوں پر قبضہ کرلیا۔ اس طرح اورنگ زیب کے زمانے میں یہ علاقہ بھی مغلیہ سلطنت کا حصہ بن گیا۔

اورنگ زیب نے اس علاقے کے انتظامی معاملات کے لیے مقامی لوگوں کو اپنے ساتھ ملا کر انھیں تمام تر انتظامات کا ذمہ دار بنادیا۔ مغلوں نے جس مقامی قبیلے کے لوگوں کو اس علاقے کا انتظام دیا تھا انھوں نے اسلام قبول کرلیا جن میں سب سے مشہور نام بخت بلند شاہ کا ہے۔ بخت بلند شاہ نے ناگپور شہر کی ترقی میں بے حد اہم کردار ادا کیا اور اس علاقے میں اسلام کی سربلندی کے لیے کئی کام کیے۔اس علاقے میں انھوں نے کئی مساجد بھی تعمیر کروائیں۔ مغلوں کی حکومت ختم ہوتے ہی مراٹھوں نے اس ریاست پر حملہ کیا اور یہاں پر اپنی حکمرانی قائم کرلی۔ یہ اس بات کا تسلسل تھا کہ جیسے ہی مرکز میں مغل کمزور ہوئے تو دور دراز علاقوں میں رہنے والے لوگوں نے ایک طرح سے آزادی کا اعلان کردیا۔

اس دوران انگریز مختلف ریاستوں سے لڑائی کرکے ان پر قبضہ کرتے رہے۔ انگریزوں کے نزدیک ناگپور کا علاقہ بے حد اہم تھا۔ ناگپور کے علاقے پر قبضہ کرنے کے لیے انگریزوں نے مراٹھوں کے ساتھ تین مشہور لڑائیاں لڑیں۔ تیسری لڑائی 1817ء میں لڑی گئی جس میں مراٹھوں کو شکست ہوئی اور انگریزوں نے اس علاقے پر قبضہ کر کے اسے برٹش انڈیا کا حصہ بنالیا۔

ناگپور اس لحاظ سے ایک منفرد شہر ہے کہ یہاں سے دو مختلف تحریکوں کا آغاز ہوتا ہے۔پہلی تحریک کا نام ”راشٹریا سوامی سیوک سنگھ “ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ 1923ء میں اس شہر میں بڑے پیمانے پر ہندو مسلم فسادات ہوئے۔ جن میں اقلیت ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کا بہت نقصان ہوا۔ ہندوؤں نے اس چیز کا فائدہ اٹھایا اور ہندو قوم پرستی

کا نعرہ لگایا۔ اس کام کے لیے انھوں نے ایک تنظیم بنائی جسے ہم عمومی طور پر آر ایس ایس کا نام دیتے ہیں۔ اب یہ پورے ہندوستان میں پھیل چکی ہے اور ہندوستان میں ایک طرح سے ہندو قوم پرستی کی نمائندہ تنظیم ہے۔ بہت سارے سیاسی رہنما بھی اس سے وابستہ ہے۔

دوسری تحریک امبید کر نامی ایک شخص نے شروع کی ۔ وہ ہندو مذہب سے تعلق رکھتے تھے بعد میں انھوں نے بدھ مت اختیار کیا اور اپنی ایک پارٹی بنائی جس کا مقصد نچلی ذات کے لوگوں کو ان کے حقوق دلوانا تھا۔ یہ صاحب کافی پڑھے لکھے تھے اور نہ صرف انگریزوں کے دور میں بڑے اہم عہدوں پر فائز رہے ۔ بلکہ بھارت کی ابتدائی حکومتوں میں بھی وزارت کے عہدہ پر فائز رہے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ بھارت کا واحد شہر ہے جہاں پر بدھ مت سولہ فیصد کے قریب ہیں۔ اس شہر میں مسلمان بارہ فیصد اور ہندو تقریباً ستر فیصد ہیں۔ میرے علم کے مطابق شاید ہی بھارت کا کوئی دوسرا شہر ہو جہاں بدھ مت کے لوگ اتنی بڑی تعداد میں رہتے ہوں۔ اس کی صرف ایک ہی وجہ ہے کہ جب امبید کر نے بدھ مت اختیار کیا اور وہ بہت مشہور ہو گئے تو لوگ ان کی خدمات کا اعتراف بھی کرنے لگے۔ ایسی صورت میں ان کے بہت سارے چاہنے والوں نے ہندو مت چھوڑ کر بدھ مت اختیار کیا۔

ٹاٹا خاندان نے اس علاقہ میں پہلی ٹیکسٹائل مل لگائی۔ اس مل کے افتتاح کے لیے یکم جنوری 1877ء کا دن مقرر کیا گیا۔ یہ دن مقرر کرنے کی وجہ صرف یہ تھی کہ اس دن برطانیہ کی ملکہ وکٹوریہ کو ہندوستان کی پرنسز کا خطاب دیا جانا تھا۔ لہٰذا دونوں کام ایک ہی دن ہوئے۔ بعد ازاں لوگ اس مل کو پرنسز مل ہی کہتے تھے۔ آقاؤں کو خوش کرنے کے لیے اس سے اچھا اور کیا طریقہ ہو سکتا تھا؟

جب غلام، غلامی کو پسند کر لے تو پھر وہ اپنے آقا کی ہر بات کی نقل کرنا پسند کرتا ہے۔

بہر حال غلامی میں ایسا تو ہوتا ہے۔۔۔ جب غلام، غلامی میں خوش ہوں تو آقا کو انھیں آزاد کرنے کی کیا ضرورت ہے؟

ناگپور کی مختصر رُوداد میں نے آپ کے سامنے پیش کی جو اس بات کو سمجھنے کے لیے کافی ہے کہ بھارت کے مختلف علاقوں میں بے شمار اہم شہر موجود ہیں جن کے بارے میں ہم پاکستانیوں کا علم بہت محدود ہے۔ اس کی وجہ ایسے شہروں کا پاکستان سے دور ہونا ہے۔ ابھشیک چوہدری نے ناگپور کے بارے ایک طویل مضمون Nagpur as the heart of India کے نام سے لکھا ہے جس میں یہ کہا گیا ہے کہ ناگپور بھارت کا دل ہے۔ یہ مضمون ٹائمز آف انڈیا نے چھاپا ہے[18]۔ اسی اخبار میں انجایا انپار تھی کے Nagpur is now Orange City, officially کے نام سے ایک مضمون لکھا ہے یعنی ناگپور بھارت کا سر گودھا ہے۔

میں دیپ صاحب سے ابھی بہت سارے سوالات کا جواب لینا چاہ رہا تھا لیکن مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ وقت کم پڑتا جا رہا ہے اس لیے میں نے وقت ضائع کیے بغیر دیپ صاحب سے درخواست کی کہ جناب اب آپ نے بہت آرام کر لیا ہے لہٰذا ہماری اگلی نشست کا وقت ہو گیا ہے، ذرا باہر تشریف لائیں۔ انھوں نے خوشی سے میری بات مان لی اور ہم ایک طویل نشست کے لیے باہر بیٹھ گئے۔

---

[18] https://timesofindia.indiatimes.com/city/nagpur/Nagpur-as-the-heart-of-India/articleshow/18854653.cms

اس دفعہ میرا ان سے یہ سوال تھا کہ معاشرتی تبدیلیوں میں بھارت کی فلم انڈسٹری کا کیا کردار ہے؟ انھوں نے بجائے یہ کہنے کے کہ سوال کو محدود کیا جائے، کہا کہ وہ خود ہی جواب محدود کر لیں گے۔ جو کچھ انھوں نے کہا اس کا خلاصہ پیش خدمت ہے۔

RSS People Nagpur Photo Credit:
https://www.newsbharati.com
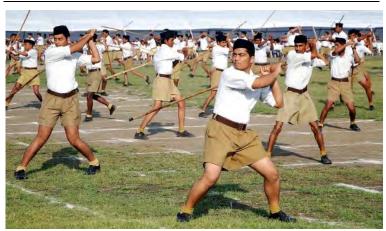
RSS Training Center Photo Credit:
https://worldbulletin.dunyabulteni.net

بھارتی معاشرہ اور بھارت کی فلم انڈسٹری

دیپ صاحب نے بتایا کہ بھارت میں فلم انڈسٹری کے دو بڑے مراکز ہیں ایک بالی وڈ جو بمبئ میں ہے اور دوسرا جنوبی ہندوستان کی فلم انڈسٹری جو بہت سارے معاملات میں بالی ووڈ سے کہیں آگے ہے۔ دونوں کے اپنے اپنے اثرات ہیں۔ میں مجموعی طور پر آپ کو کچھ باتیں بتاؤں گا جس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ بھارتی فلم انڈسٹری کا معاشرتی تبدیلیوں میں کیا کردار ہے؟

دیپ صاحب نے فلم انڈسٹری کی تاریخ بتاتے ہوئے کہا کہ آج سے بیس سال پہلے یعنی 1980 ء تک جب کمپیوٹر کا دور نہیں آیا تھا تو آپ کو فلموں میں رومانس زیادہ نظر آتا تھا اور فلموں میں گھریلو ماحول زیادہ پایا جاتا تھا۔ ہیرو بھی بڑا خوبصورت ہوتا تھا جسے ہم چاکلیٹ ہیرو کہتے تھے۔ خواتین کا لباس بھی ہماری عام خواتین جیسا ہوتا تھا جسے ایک مکمل لباس کہا جا سکتا ہے۔ فلم کے تمام تر مناظر بہت ہی آہستہ چلتے تھے۔ بہت زیادہ فیشن بھی نہیں ہوتا تھا۔ وہ گھریلو فلمیں ہوتی تھی جنھیں پورا خاندان مل کر دیکھتا تھا۔ جب

کبھی کسی گھر میں کوئی مہمان آتا تو اسے سینما لے کر جانا مہمان نوازی کا ایک حصہ ہوتا تھا۔ مجھے بھی اس کا کئی مرتبہ تجربہ ہوا۔ میزبان جہاں یہ پوچھتا کہ کیا کھانا ہے وہیں پر یہ بھی پوچھتا تھا کہ کونسی فلم دیکھنے جانا ہے۔ جس سے مجھے اندازہ ہوا کہ بھارتی معاشرے میں سینما گھر میں فلم دیکھنے کا عام رواج ہے۔

دیپ صاحب نے مجھے یہ بھی بتایا کہ مغرب خاص طور پر امریکہ کی 1960ء سے پہلے فلموں اور آج کی فلموں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ پرانی فلموں میں خواتین کا ایک روایتی لباس ہوتا تھا۔ عورتوں کا عمومی لباس ایک لانگ سکرٹ پر مشتمل ہوتا تھا۔ مرد حضرات بھی پینٹ کوٹ پہنتے تھے اور سر پر ہیٹ ان کے لباس کا ایک لازمی جزو تھا۔ مغرب نے ستر کی دہائی میں معاشرتی تبدیلیوں کی نمائندگی کرتے ہوئے اپنی فلموں میں بھی بے شمار تبدیلیاں کیں۔ ہم بھی ان کے پیچھے پیچھے چلتے رہے۔ میرے خیال میں ہم مغرب سے تقریباً بیس سال پیچھے چل رہے ہیں۔ ہم نے اپنی فلموں میں تبدیلیاں اکیسویں صدی کے آغاز میں کی ہیں۔ بھارت میں اکیسویں صدی کا آغاز بالکل نئی طرز کی فلموں کے ساتھ ہوتا ہے۔ اب ہماری فلمیں ایکشن، تِھرل، فیشن اور جدید ٹیکنالوجی کے استعمال پر مشتمل ہیں۔ فلم میں ایسے بھارتی معاشرے کی تصویر پیش کی جاتی ہے جسے ہم اپنی سوسائٹی میں تصور بھی نہیں کر سکتے۔ ہماری فلموں کو دیکھ کر اگر کوئی یہ سوچے کہ بھارتی معاشرہ بھی ایسا ہی ہوگا تو اسے سخت مایوسی ہوگی۔

اب ہم اس سوال کی طرف آتے ہیں کہ بھارتی فلم انڈسٹری کی اس بدلاؤ کی وجہ سے ہمارے معاشرتی رویوں میں کیا تبدیلی آئی ہے؟

دیپ صاحب گویا ہوئے کہ میں بھارتی فلم انڈسٹری کے اثرات کو چار حصوں میں تقسیم کرکے باری باری ان کا ایک مختصر جائزہ پیش کروں گا۔

بھارتی فلم انڈسٹری کا اثر فیشن، رہن سہن، لباس اور کھانے پینے کے انداز پر سب سے گہرا پڑا ہے۔ اب ہماری خواتین فلم انڈسٹری کی مشہور شخصیات کے لباس کو پسند کرتی ہیں اور ویسا ہی لباس پہننا بھی شروع ہو گئیں ہیں۔ ہمارے لڑکے بھی کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔ انھوں نے اپنے والدین کے لباس کو ترک کر دیا ہے اور اب وہ بھی ایسا لباس پہنتے ہیں جس کا تصور آج سے چند سال پہلے تک محال تھا۔ ہماری سوسائٹی میں گھر میں مل جل کر کھانا نہایت ضروری سمجھا جاتا تھا۔ بازار کا کھانا بہت مجبوری میں کھایا جاتا تھا لیکن اب اس میں بھی ایک زبردست تبدیلی آ چکی ہے۔ دیپ صاحب نے ایک اور بات کی طرف بھی اشارہ کیا۔ کہ آج سے چند دہائیاں پہلے بھارت کے مختلف علاقوں میں مختلف لباس پہنے جاتے تھے۔ پنجاب کے لباس ہمارے بنگالی لباس سے بہت مختلف تھے۔ اس طرح کی اور بھی بہت سی مثالیں ہیں۔ اب یہ حال ہے کہ آپ بھارت کے کسی بھی علاقے کے تعلیمی ادارے میں چلے جائیں خواہ وہ کلکتہ ہو، چنائی، چندی گڑھ یا دہلی ہو آپ بچوں کے لباس دیکھ کر یہ فرق نہیں کر سکتے کہ آپ بھارت کے مختلف علاقوں کو دیکھ رہے ہیں۔آج سے چالیس سال پہلے اگر آپ ہماری پارلیمنٹ کو ہی دیکھتے تو آپ یہ جان لیتے کہ مختلف علاقوں سے آنے والا ہر شخص ایک مخصوص لباس پہنے ہوتا تھااور اب یہ فرق ہماری پارلیمنٹ میں بھی کم ہو گیا ہے۔

جب یہ بچے تعلیمی اداروں سے فارغ ہو کر نکلیں گے تو جہاں یہ ایک ڈگری لیں گے وہیں پر ایک نئی طرح کا لباس، نئی طرز کا رہن سہن، نئے انداز سے کھانے پینے والا رویہ بھی لے کر نکلیں گے۔ آنے والے دنوں میں یہی بچے بھارتی معاشرے کے لیڈر ہوں گے۔ اس طرح یہ کہا جا سکتا ہے کہ پچھلے تیس سے چالیس برس کے درمیان لوگوں کے رہن سہن، لباس اور دیگر بہت سارے معاملات میں ایک قابلِ ذکر تبدیلی آئی ہے اور اب موجودہ نسل یہ بات سوچ بھی نہیں سکتی کہ وہ اپنے آباؤاجداد جیسا لباس دوبارہ کبھی پہنیں گے۔ اب پرانے لباس صرف کلچرل شو کے لیے ہی رہ گئے ہیں۔

دیپ صاحب نے بتایا کہ دوسرا اثر ہماری معاشرتی زندگی پر پڑا ہے۔ اس میں ہمارا خاندانی نظام، شادی بیاہ کے طریقے کار، لوگوں کی آپس میں دوستی شادی سے پہلے لڑکے اور لڑکی کی ملاقاتیں، عام گھروں کی بجائے بڑے بڑے گھروں کا دکھایا جانا، ماں باپ کا اپنے والدین سے سلوک اور اس کے علاوہ بے شمار ایسے ایریاز ہیں جنھیں ہماری فلم انڈسٹری نے بے حد متاثر کیا ہے۔ یونیورسٹیز پروفیسرز کے علاوہ اور بھی بہت سے اداروں نے اس موضوع پر باقاعدہ ریسرچ کی ہے۔ مختلف لوگوں کے نتائج ایک دوسرے سے کافی مختلف ہیں۔ اس پر میں تفصیل سے بات نہیں کر پاؤں گا کیونکہ کہیں تو بہت مفید اثرات پائے گئے اور کہیں ان کی وجہ سے خاندانی نظام میں بگاڑ بھی پیدا ہوا ہے۔ میں چند مثالوں سے اپنی بات واضح کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔

ہمارے بھارتی کلچر میں خاندانوں میں ہی شادی بیاہ کا رواج تھا۔ جس کی وجہ سے کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ جب دیر تک آپس میں شادیاں ہوتی رہتی ہیں تو ذہنی اور جسمانی صلاحیتوں میں کمی واقع ہونا شروع ہو جاتی ہے جبکہ ایک خاندان سے دوسرے خاندان میں شادی کرنے سے ذہنی اور جسمانی صلاحیتوں میں اضافہ دیکھا گیا ہے۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ مختلف خاندان آپس میں شادی کرتے ہیں اور وہ قدیم ذات برادری کا تصور ختم ہوتا جا رہا ہے۔ اب یہ دیکھا جاتا ہے کہ دونوں خاندانوں کی معاشی اور معاشرتی حیثیت میں کتنی مماثلت ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ لڑکے اور لڑکی کی پسند کا بھی پہلے سے زیادہ خیال رکھا جاتا ہے۔ اس بات کا ایک منفی پہلو یہ بھی ہے کہ طلاق کی شرح میں اضافہ جو کبھی ہمارے معاشرے میں نا ہونے کے برابر تھی اب بہت زیادہ ہو گئی ہے۔ یہ بات صرف بھارت پر ہی لاگو نہیں بلکہ ہماری ریسرچ کے مطابق ہمارے ارد گرد کے ممالک بھی اسی طرح کے مسائل کا شکار ہیں۔

بھارتی فلم انڈسٹری کا ایک مثبت اثر یہ ہوا کہ ہمارے بچوں اور بچیوں کی تعلیم میں دلچسپی بڑھ گئی ہے۔ اس بات کے دو پہلو ہیں؛ ایک والدین اور دوسرے بچے۔ دونوں ہی تعلیم کی اہمیت کو جان گئے ہیں۔ اس کی ایک خاص بات ہماری بچیوں کا دفاتر میں کام کرنا ہے۔ ہماری عورتوں نے جب فلموں میں خواتین کو دفاتر اور کارخانوں میں کام کرتے دیکھا تو ان میں بھی ایسا کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ جس میں دن بدن اضافہ ہو رہا ہے۔ دیپ صاحب نے ہنس کر کہا کہ یہ عورتوں کے لیے تو کافی دلچسپی کا باعث ہے لیکن وہ لوگ جو خواتین سے کھانا پکانا، گھر کی صفائی اور کپڑوں کی استری تک کا کام لیتے تھے، وہ بیچارے مشکل میں ہیں۔ میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ یہ سب کچھ فلم انڈسٹری کی وجہ سے ہوا البتہ میں اتنا ضرور کہوں گا کہ فلم انڈسٹری کا اس میں ایک اہم کردار ضرور ہے۔

بھارتی فلم انڈسٹری کا تیسرا اثر جو بہت ہی مفید ثابت ہوا وہ غیر ممالک میں رہنے والے بھارتی لوگوں کا بھارت کے بارے میں رویہ ہے۔ وہ لوگ فلموں کی وجہ سے بھارت میں ہونے والی مختلف تبدیلیوں سے واقف رہتے ہیں۔ اس سے وہ اپنی زبان کو بھی یاد رکھتے ہیں اور ملکی حالات سے بھی آگاہ رہتے ہیں۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ہماری فلم انڈسٹری نے انھیں نا صرف بھارتی معاشرے سے جوڑ رکھا ہے بلکہ یکجہتی کی فضا قائم رکھنے میں بھی مدد دی ہے۔ اس پر دیپ صاحب نے زیادہ تفصیل سے بات نہیں کی۔ ایک تو وہ تھک چکے تھے اور دوسرا شاید اس موضوع پر ان کے پاس زیادہ معلومات نہیں تھیں۔

آخر میں دیپ صاحب نے بتایا کہ فلم انڈسٹری کا بھارتی معیشت میں ایک قابلِ ذکر حصہ ہے۔ ایک ایک فلم پر اربوں روپیہ خرچ ہوتا ہے اور ہزاروں سینما گھر فلموں کو دکھانے کا بندوبست کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی بے شمار کمپنیاں اس انڈسٹری کے ساتھ جڑی ہوئی ہیں۔ لاکھوں لوگوں کا بلاواسطہ یا بلواسطہ اس انڈسٹری کے

ساتھ تعلق ضرور ہے۔ بھارتی فلم انڈسٹری کی وجہ سے بھارتی حکومت کو بہت زیادہ ٹیکس بھی ملتا ہے۔

Indian Film Industry Photo Credit:
https://indieseducation.com

بات ختم کرنے سے پہلے انھوں نے بڑے فخر سے کہا کہ یہ ہماری واحد پروڈکٹ ہے جس کی وجہ سے بھارت پوری دنیا میں جانا جاتا ہے۔

میں نے آخری سوال پوچھنے کی جسارت کی کہ اس بات میں کہاں تک سچائی ہے کہ فلم انڈسٹری کے لوگ یہ کہتے ہیں کہ معاشرے میں جو ہو رہا ہے ہم وہ دکھاتے ہیں جبکہ ایک طبقہ یہ کہتا ہے کہ معاشرے میں جو تبدیلی بھی ہو رہی ہے وہ فلم انڈسٹری کی وجہ سے ہے؟ آپ کا کیا خیال ہے؟ دیپ صاحب نے جواب دیا کہ یہ دونوں باتیں سچ ہیں۔ یہ ان کا مختصر ترین جواب تھا۔

جس سے میری تشفی نہیں ہوئی کیونکہ میرا خیال ہے کہ فلم معاشرتی تبدیلیوں کی ذمہ دار ہے۔

باتیں کرتے ہوئے وہ بھی تھک گئے اور سنتے سنتے میں بھی تھک گیا تھا۔ اس لیے طے ہوا کہ آج کی نشست کو آخری نشست ہی سمجھا جائے۔ اب شام ہو رہی تھی اور سفر کی تھکاوٹ بھی محسوس ہو رہی تھی۔ ابھی ہمارا تقریباً پندرہ گھنٹے کا سفر باقی تھا۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا انھوں نے بھی یہی کہا کہ آپ سے مل کر مجھے بہت خوشی ہوئی کہ کوئی تو ہے جو اتنی تفصیل سے اس معاملے میں دلچسپی لے رہا ہے۔

مہاراشٹرا: ایک قدیم تہذیب کا نمائندہ علاقہ

مدھیہ پردیش کے بعد ہم مہاراشٹرا اسٹیٹ میں تھے۔ پاکستان میں ہم عام طور پر صوبے کا لفظ استعمال کرتے ہیں لیکن بھارت میں صوبے کے لیے اسٹیٹ کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ ریاست کے لیے بھی اسٹیٹ کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ امریکہ میں بھی مختلف علاقوں کے لیے اسٹیٹ کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ ناگپور مہاراشٹرا کا پہلا شہر ہے۔ اس شہر کا ایک مختصر تعارف آپ پچھلے صفحات میں پڑھ چکے ہیں۔ اس سے پہلے کہ میں اِس علاقے میں موجود دیگر شہروں کا تعارف کرواؤں میں چاہوں گا کہ آپ کو مہاراشٹرا کا ایک مختصر تعارف آپ کی خدمت میں پیش کروں۔

یاد رہے کہ مہاراشٹرا کا علاقہ بھی سلاطین دہلی اور مغلوں کے قبضے میں رہا ہے۔ مہاراشٹرا آبادی کے لحاظ سے بھارت کی دوسری جبکہ رقبے کے اعتبار سے تیسری بڑی اسٹیٹ ہے۔ مہاراشٹرا کا رقبہ تین لاکھ 7 ہزار مربع کلومیٹر ہے اور آبادی بارہ کروڑ ہے۔ یہ کتنا بڑا صوبہ ہے۔ اس کا اندازہ آپ اس بات سے لگا سکتے ہیں کہ پنجاب اور کے پی کے کا کل رقبہ تقریباً تین لاکھ مربع کلومیٹر ہے۔ پنجاب کی آبادی گیارہ کروڑ جب کہ مہاراشٹرا کی آبادی بارہ کروڑ ہے۔ اگر آپ بھارت کے نقشے کو غور سے دیکھیں تو آپ جان سکیں گے کہ مہاراشٹرا کے مشرق میں تلنگانہ اسٹیٹ، مغرب میں بحیرۂ عرب، جنوب میں کرناٹک اور گوا جبکہ شمال میں مدھیہ پردیش واقع ہے۔ مہاراشٹرا اسٹیٹ کا کیپیٹل

ممبئی ہے جبکہ سردیوں میں اس کا کیپیٹل ناگپور میں شفٹ ہو جاتا ہے۔ بھارت کی کل پیداوار کا پندرہ فیصد صرف مہاراشٹر امیں پیدا ہوتا ہے۔ اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ یہ اسٹیٹ صنعتی طور پر کس قدر ترقی یافتہ ہے۔ بھارتی لوگ اسے اپنا کماؤ پوت کہتے ہیں۔ دنیا کے گنجان آباد علاقوں کی فہرست کے مطابق مہاراشٹر ادوسرے نمبر پر ہے۔۔

اس علاقے میں واقع مختلف مقامات سے ملنے والے آثار قدیمہ سے پتہ چلتا ہے کہ آج سے تین ہزار سال قبل بھی یہاں آبادیاں موجود تھیں۔ یہاں ایک مرتبہ پھر میں ایک بات کی وضاحت کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ ہماری اردو کی مختلف کتابوں میں مہاراشٹرا کے لوگوں کے لیے مرہٹہ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جبکہ ہندی اور انگریزی میں ان لوگوں کے لیے مراٹھا کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ یہ دونوں الفاظ ایک ہی ہیں۔ دونوں کا مطلب ایک ہی قوم ہے، لیکن اب ہندوستان میں بولنے میں مراٹھا کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے اس لیے میں بھی مراٹھا کا لفظ ہی استعمال ہی کر رہا ہوں۔ میں نے کچھ اہل علم سے بات کی انھوں نے یہ کہا کہ اگر کوئی بات غلط عام ہو جائے تو اسے کسی وقت بھی ٹھیک کیا جاسکتا ہے۔ کیونکہ یہ سفر نامہ ہندوستان سے متعلق ہے اس لیے بہتر ہے کہ وہ ہی لفظ لکھا جائے جو عام طور پر بھارت کے لوگ استعمال کرتے ہیں اس لیے میں مراٹھا کا لفظ ہی استعمال کروں گا۔

Maharshtra Culture Photo Credit:
https://www.istockphoto.com

مہاراشٹر اپر چودھویں صدی تک مقامی ہندو راجاؤں کی حکومت رہی۔ پہلی مرتبہ علاؤالدین خلجی نے اس علاقے پر حملہ کرکے مقامی راجاؤں کو شکست دی اور اپنی حکومت قائم کی۔ ابھی حال ہی میں علاؤالدین خلجی پر ایک فلم بھی بنائی گئی جس کی ہندوؤں نے بے حد مخالفت بھی کی تھی۔ اس کے بعد محمد بن تغلق نے پہلے سے موجود علاقے کو مزید وسیع کیا اور اورنگ آباد میں واقع دولت آباد کو اپنا دارالخلافہ بنایا۔ یہ شہر پہلے مقامی ہندو بادشاہوں کی راجدھانی تھا۔ اس علاقہ میں کئی مقامی مسلمان ریاستیں بھی

قائم ہوئیں۔ جن میں بیجاپور، قطب شاہی اور میسور قابلِ ذکر ہیں۔ شاہجہاں کے دور تک مغل بھی اس علاقے پر اپنا قبضہ جما چکے تھے۔

ان ریاستوں کے وجود سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ دہلی سے تقریباً پندرہ سو کلومیٹر دور تک مسلمان بادشاہوں نے دلی میں بیٹھ کر اپنی سلطنت کو وسعت دی۔ جن لوگوں کی ریاستوں پر سلاطین دہلی اور مغلوں نے قبضہ کیا تھا انھوں نے مغل سلطنت کے کمزور پڑتے ہی اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ ان میں مراٹھے سب سے پیش پیش تھے اور مغل سلطنت تباہ کرنے میں ان کا سب سے بڑا ہاتھ ہے۔ انھوں نے انگریزوں کے ساتھ مل کر پہلے مسلمان ریاستوں کو تباہ کیا اور پھر مغل سلطنت کو تباہی کے دہانے تک پہنچانے میں مکمل طور پر اپنا کردار ادا کیا۔

میرا خیال ہے کہ ہر بادشاہ کو یہی خیال رہتا ہے کہ وہ اپنی سلطنت کو مزید کیسے بڑا کر سکتا ہے؟ ایسا ہی خیال رومیوں کو بھی آیا، ایرانیوں نے بھی ایسا ہی کیا، ماضی قریب میں مغلوں نے بھی اسی رویے کو اپنایا، سلطنت عثمانیہ بھی اسی ڈگر پر چلی، انگریزوں نے بھی ایسا ہی کیا، روس نے بھی اسی طریقے کو اپنایا اور جب سلطنت اتنی بڑی ہو گئی کہ مرکز طویل فاصلوں اور مقامی لوگوں کے طاقتور ہونے کی وجہ سے دور دراز علاقوں پر اپنا کنٹرول برقرار نہ رکھ سکا تو سلطنت اپنے ہی بوجھ تلے دب کر ختم ہو گئی۔

بس رہے نام اللہ کا۔۔۔

سیواگرام: جہاں مہاتما گاندھی نے زندگی کے آخری بارہ سال گزارے

ناگپور سے اسی کلومیٹر کے فاصلے پر واردہ شہر کے ساتھ ایک گاؤں سیوا گرام واقع ہے۔ اس گاؤں کو دیکھنے کی میری شدید خواہش تھی۔ اس کی وجہ اس گاؤں کا مہاتما گاندھی سے ایک گہرا تعلق ہے۔ مہاتما گاندھی نے سیوا گرام میں اپنی زندگی کے آخری

دس سال گزارے۔ ریلوے ٹائم ٹیبل سے مجھے پتہ چلا کہ اِس جگہ ہماری گاڑی کا اسٹاپ نہیں ہے لیکن اگر آپ ٹرین کے مشرق میں دیکھیں تو آپ واردہ ریلوے سٹیشن سے کچھ پہلے سیوا گرام ریلوے سٹیشن کے پاس مہاتما گاندھی آشرم کو دیکھ سکتے ہیں۔ اب اس جگہ کو محفوظ کر لیا گیا ہے اور مہاتما گاندھی سے متعلقہ اشیاء کی بھی حفاظت کر لی گئی ہے۔ ہندوؤں کے نزدیک مہاتما گاندھی ایک باپ کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان کی معاشرے میں وہی قدر و قیمت ہے جو ہمارے ہاں قائدِ اعظم کی ہے۔ جیسے ہم قائداعظم کو فادر آف نیشن کہتے ہیں اسی طرح سے بھارت کے لوگ مہاتما گاندھی کو فادر آف انڈیا کہتے ہیں۔

جب ہماری گاڑی سیوا گرام کے پاس سے گزری تو اس وقت شام کے تین بج رہے تھے۔ میں کھڑکی کے پاس بیٹھ کر انتظار کرتا رہا کہ کب سیوا گرام آئے گا اور میں اسے دیکھوں ۔ میں اس تاریخی جگہ دیکھنا چاہ رہا تھا جہاں بیٹھ کر مہاتما گاندھی نے ہندوستان کی تحریک آزادی میں حصہ لیا۔ یہ چھوٹا سا قصبہ کتنا اہم بن گیا کہ انھوں نے یہاں پر ایک دفعہ اپنا سالانہ جلسہ بھی منعقد کیا تھا۔

اس سے پہلے کہ میں آپ کو سیوا گرام کی تاریخ کے بارے میں کچھ بتاؤں میں چاہوں گا کہ واردہ کا ایک مختصر تعارف آپ کے سامنے پیش کیا جائے۔

واردہ مہاراشٹرا کا ایک شہر ہے۔ اس علاقے پر چودھویں صدی تک مقامی راجاؤں کی حکومت رہی۔ جن کا تعلق ہندو مذہب سے تھا۔ اس علاقے پر ایک طویل عرصہ تک گپتا خاندان نے حکومت کی۔ چندر گپتا اس خاندان کا سربراہ تھا جس کا تاریخ میں بارہا ذکر آیا ہے۔ سلاطینِ دہلی نے جب حیدر آباد اور دکن کے علاقوں کو فتح کرنا شروع کیا اسی دوران میں انھوں نے واردہ کے علاقے میں اپنی حکومت قائم کر لی۔ ان کے دورِ حکومت میں یہاں پر کوئی شہر نہیں تھا البتہ اکادکا کچھ لوگ رہتے تھے۔ مغلوں نے بھی اس علاقے پر اپنی حکمرانی کی۔ مغل حکمرانوں کے نامزد کردہ گورنر اقبال بخت بلند شاہ نے اس علاقے پر بھی اپنا کنٹرول قائم کر لیا تھا۔ تاریخ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ 1850ء میں انگریزوں نے

مغل سلطنت کے خاتمے کے ساتھ ہی اس علاقے پر اپنا قبضہ کر لیا۔ اس وقت یہاں کوئی بڑا شہر نہیں تھا۔ واردہ بھارت کے ان شہروں میں سے ایک شہر ہے جن کو انگریزوں نے باقاعدہ ایک پلاننگ کے تحت بسایا۔ اس شہر کو بسانے کے لیے انگریزوں نے اس وقت کے ایک بہت ہی معروف ٹاؤن پلاننگ کے ماہر سر کریڈوک کو اس شہر کی پلاننگ کا ذمہ دار بنایا۔

اس شہر جیسی پلاننگ کی مثال کم ہی ملتی ہے۔ شہر کا نام اس کے پاس سے گزرنے والے ایک دریا، واردہ کے نام پر رکھا گیا۔ اس شہر میں انگریزوں نے تعلیم کے فروغ کے لیے ایک بڑا ہائی سکول بھی بنایا جس کا نام سر کریڈوک کے نام پر رکھا گیا۔ انگریزوں کے چلے جانے کے بعد سکول کا نام مہاتما گاندھی سکول رکھ دیا گیا ہے۔

نام بدلنے کی روایت ہر جگہ پائی جاتی ہے، نا جانے کیوں؟

انگریزوں نے یہاں پر ایک خوبصورت ہسپتال بھی بنایا جس کا نام کنگ جارج ہسپتال رکھا گیا۔ اس کا نام بھی تبدیل کر کے ڈسٹرکٹ ہاسپٹل رکھ دیا گیا۔ انگریزوں نے یہاں پر کئی عمارات بھی بنائیں جن میں چرچ، سینٹرل جیل اور عیسائیوں کا قبرستان قابلِ ذکر ہیں۔ بھارت کا ایک بہت ہی مشہور کاروباری خاندان بھی اسی شہر میں رہتا ہے۔

اس شہر کی آبادی ایک لاکھ سے زائد ہے۔ جن میں زیادہ تر لوگوں کا تعلق ہندو مذہب سے ہے۔ ان کے ساتھ ساتھ بدھ مت کے ماننے والوں کی بھی ایک کثیر تعداد یہاں رہتی ہے۔ مسلمان بہت کم تعداد میں اس علاقے میں موجود ہیں۔ یہ علاقہ دلی سے بہت دور تھا اور بہت تھوڑی مدت کے لیے سلاطین دہلی اور مغلوں کے قبضے میں رہا شاید اسی وجہ سے مسلمان یہاں تعداد میں کم ہیں۔ اس شہر میں اسی فیصد لوگ پڑھے لکھے ہیں جبکہ بھارت میں شرح خواندگی ستر فیصد کے قریب ہے۔

میرے علم کے مطابق انگریز جس بھی علاقے میں گئے وہاں انھوں نے سب سے پہلے جو چند کام کیے، ان میں مختلف تعلیمی اداروں کا قیام بھی شامل ہے۔ اس کے

ساتھ ساتھ انھوں نے شہری معاملات کو دیکھنے کے لیے میونسپل کمیٹی بھی تشکیل دی۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ انھیں اپنا دفتری نظام چلانے کے لیے پڑھے لکھے لوگوں کی ضرورت تھی۔ اسی لیے انھوں نے تعلیمی ادارے بنانے پر توجہ دی۔ کچھ لوگوں کا یہ بھی کہنا ہے کہ وہ یہ نہیں دیکھتے تھے کہ عام لوگوں کا مفاد کس چیز میں ہے بلکہ وہ ہر وہ کام کرتے تھے جس میں ان کا مالی فائدہ ہوتا تھا۔ ان کے ذہن میں کیا تھا؟ اس کا تو مجھے اندازہ نہیں لیکن کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ وہ ہندوستان میں تعلیم کا فروغ چاہتے تھے۔ اس لیے وہ تعلیمی اداروں کو فوقیت دیتے تھے۔

ایک بات کا مجھے بخوبی اندازہ ہے کہ جن علاقوں میں انھوں نے قابض ہو کر اپنی حکومت قائم کی اسے وہ برٹش انڈیا کے نام سے پکارتے تھے، وہاں پر دیگر علاقوں کی نسبت شرح خواندگی پہلے بھی زیادہ تھی اور اب بھی زیادہ ہے۔ یہ وہ اپنے مفاد کے لیے کرتے تھے یا عام لوگوں کے مفاد کے لیے یہ کہنا مشکل ہے۔

کوئی بھی حتمی بات کہنا میرے لیے خاصا مشکل ہے!

واردہ میں راجستھان سے تعلق رکھنے والا ایک امیر خاندان رہتا تھا۔ اس خاندان کا ایک فرد جمنا لال نا صرف کانگرس کا ایک متحرک فرد تھا بلکہ کانگرس میں کئی اہم عہدوں پر بھی فائز رہا تھا۔ اسی وجہ سے مہاتما گاندھی کے ساتھ اس کے گہرے تعلقات تھے۔ اس کی وفات کے بعد اس کی سیاسی خدمات کے اعتراف میں بھارتی حکومت نے اس کے نام پر ڈاک ٹکٹ بھی جاری کیے۔ ایک دفعہ مہاتما گاندھی کا اس علاقے سے گزر ہوا تو گاندھی چند دن کے لیے جمنا لال کے گھر ہی ٹھہرے۔ اس دوران گاندھی نے شہر کے ساتھ ایک کھلی جگہ پر لکڑی کا ہٹ بنا کر رہنے کا فیصلہ کیا۔ یہاں ایک طرح سے نیا گاؤں بسایا گیا۔ مہاتما گاندھی نے اس کا نام سیوا گرام یعنی خدمت کرنے والا گاؤں رکھا۔ مہاتما گاندھی نے یہ فیصلہ کیوں کیا؟ اس کا جواب کسی کے پاس نہیں ہے۔ اس وقت یہ ایک دور دراز علاقہ سمجھا تھا۔ آمد و رفت کے ذرائع بھی محدود تھے۔ باقی سب سیاسی پارٹیوں کے

دفاتر بڑے شہروں میں تھے۔ مہاتما گاندھی نے یہاں پر اپنا ایک آشرم بنایا جسے آپ ایک ڈیرہ یا حجرہ کہہ سکتے ہیں۔ وہ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ 1936ء سے 1948ء تک اس آشرم میں رہے۔ یاد رہے دہلی میں جب انھیں قتل کیا گیا تو اس وقت بھی ان کی مستقل رہائش اسی علاقہ میں تھی۔ ان بارہ سالوں میں ہندوستان کی تحریک آزادی بہت زوروں پر تھی۔ مہاتما گاندھی نے اپنی تمام تر سیاسی سرگرمیاں اسی گاؤں سے جاری رکھیں۔ اب اس گاؤں کو محفوظ کر لیا گیا ہے اور ایک عجائب گھر میں مہاتما گاندھی کی ذاتی استعمال کی تمام اشیاء رکھی گئیں ہیں۔

میں نے حال ہی میں مہاتما گاندھی کی آپ بیتی پڑھی جو پاکستان میں تلاش حق کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب سے مجھے مہاتما گاندھی کے بچپن سے سیاست میں حصہ لینے تک کے تمام واقعات جاننے کا موقع ملا۔ میرا خیال ہے سیاست میں دلچسپی رکھنے والے لوگوں کو وہ کتاب ضرور پڑھنی چاہئے۔ اس سے انھیں اس دور کے حالات کا بخوبی اندازہ ہوگا۔

Photo Credit: https://www.youtube.com

پرتھوی بھٹہ چاریا: ایک منجھے ہوئے سرکاری ملازم

اس سے قبل کہ میں آپ کو راستے میں آنے والے دیگر شہروں کے بارے میں معلومات فراہم کروں میں چاہوں گا کہ اپنے تیسرے بھارتی ہم سفر پرتھوی بھٹہ چاریا صاحب کا تعارف بھی پیش کروں۔

بھٹہ چاریہ صاحب ایک منجھے ہوئے سرکاری ملازم تھے۔ ان کی عمر 60 کے قریب تھی۔ مجھے ان کی عمر کا اندازہ ان کی اس بات سے ہوا جب انھوں نے بتایا کہ وہ جلد ہی ریٹائر ہونے والے ہیں۔ ان کا محکمہ بھارت میں معدنیات کی تلاش اور اس کی ترقی کے لیے کام کرتا تھا۔ بھٹہ چاریہ صاحب اس محکمہ میں پچھلے پینتیس سال سے کام کر رہے تھے۔ انھوں نے بہت جونیئر لیول پر اس محکمے میں شمولیت اختیار کی لیکن ترقی کرتے کرتے اب ڈپٹی ڈائریکٹر کے عہدے تک پہنچ گئے ہیں۔ میں نے ان سے دو طرح کے سوالات کیے۔

پہلا سوال تو بہت آسان تھا کہ بھارت میں معدنیات کی تلاش اور پھر ان کو زمین سے نکالنے کا عمل کس رفتار سے چل رہا ہے اور بھارتی معیشت میں معدنیات کا کتنا اہم کردار ہے؟ میرا دوسرا سوال یہ تھا کہ آپ اس محکمہ میں 1955ء میں بھرتی ہوئے، اس وقت انگریزوں کو گئے چند سال ہی ہوئے تھے اور اب آپ کو اس محکمہ میں کام کرتے ہوئے 35 سال ہو گئے ہیں۔ آپ نے اس عرصہ میں اپنے دفاتر کے ملازمین کے رویہ میں کیا تبدیلی محسوس کی؟ اس کے ساتھ ساتھ میں یہ بھی جاننا چاہوں گا کہ سرکاری دفاتر میں کرپشن اور رشوت کی کیا صورتِ حال ہے؟

بھٹہ چاریہ صاحب نے میرے پہلے سوال کا جواب دیتے ہوئے بتایا کہ بھارت میں ہر قسم کی معدنیات پائی جاتی ہیں لیکن مقدار کے لحاظ سے بھارت کے کوئلہ کے ذخائر ہ دنیا میں چوتھے نمبر پر ہیں۔ اس کے علاوہ دنیا میں لوہے کے ذخائر کی فہرست میں ہمارا

ساتواں نمبر ہے۔ تیل اور گیس کے بھی بہت بڑے ذخائر ہیں لیکن ملک کی ضرورت پوری کرنے سے قاصر ہیں۔ میں نے پوچھا کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ پہلی مرتبہ کوئلہ کب نکالا گیا؟ انھوں نے کہا کہ 1774ء میں انگریزوں نے بنگال کے علاقے سے کوئلہ نکالنا شروع کیا تھا لیکن اس کی مقدار بہت کم تھی۔ جب 1853ء میں لوکوموٹو اسٹیم انجن سے گاڑیاں چلنی شروع ہوئیں تو کوئلے کی پیداوار میں بہت زیادہ اضافہ ہوگیا۔ انگریزوں نے اس مقصد کے لیے بے شمار علاقوں میں ریل کا آغاز کیا اور مختلف معدنیات ، جن میں کوئلہ سرفہرست تھا، نکالنا شروع کیا۔ اسی لیے ہندوستان میں پہلی ریل کا آغاز مسافروں کے لیے نہیں بلکہ معدنیات نکالنے کے لیے ہوا تھا۔

ابتداء میں جب ہر جگہ انجن موجود نہیں ہوتا تو ایسی صورتِ حال میں گھوڑوں کی مدد سے ریل کو کھینچا جاتا تھا۔ ان کا یہ کہنا تھا کہ انگریزوں کو معدنیات کا اچھا خاصا تجربہ تھا جبکہ ہندوستان کے لوگ ان طریقوں سے ناواقف تھے۔ اس لیے انگریزوں نے ہندوستان بھر سے مختلف معدنیات کو نکالا اور اس سے بہت زیادہ مال و دولت کمایا۔ یاد رہے کہ یہ سب کچھ ایسٹ انڈیا کمپنی کے زیرِ انتظام ہوتا تھا۔ انگریز معدنیات کے حصول کے لیے جنگ بھی کرتے تھے اور جہاں کہیں انھیں موقع ملتا وہ مقامی راجاؤں کو کچھ دے دلا کر بھی اپنا کام چلاتے تھی۔

بھٹہ صاحب نے کہا کہ آغاز میں ایسٹ انڈیا کمپنی کو سب سے زیادہ فائدہ ہندوستان سے معدنیات نکال کر دنیا کے مختلف حصوں میں بیچنے میں تھا اور یہ ان کا سب سے پسندیدہ کام تھا۔ آزادی کے بعد بھارتی حکومت نے بھی اس کام کو بہت آگے بڑھایا۔ اگر بھارت معدنیات پر پوری توجہ دے تو یہ اس کی معیشت کے لیے بہت زیادہ مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ بھٹہ چاریہ صاحب نے کہا کہ اب میں آپ کے دوسرے سوال کی طرف آتا ہوں۔

انھوں نے بتایا کہ شروع میں ہم بہت قاعدے اور قوانین کا خیال کرتے تھے۔ انگریزوں نے بہت تفصیل سے دفتری طریقہ کار لکھ رکھا تھا اور وہ اسی کے مطابق کام کرتے تھے۔ ایسا کرنے میں ہمیں بھی خاصی سہولت تھی اور کسی بھی طرح کی بدعنوانی کرنا ایک کٹھن کام تھا۔ بھٹہ صاحب نے کہا کہ پچھلی چند دہائیوں میں ہمارے دفتری طریقہ کار میں اتنی شفافیت نہیں رہی۔ اس کی کئی وجوہات ہو سکتی ہیں لیکن سب سے بڑی وجہ ہمارے دفاتر میں سیاسی افراد کا اثر و رسوخ ہے۔

انھوں نے طنزاً کہا کہ یہ سب جمہوریت کا کیا دھرا ہے۔ سیاسی لوگوں کی دو اہم ضرورتیں ہوتی ہیں، ایک پیسہ اور دوسری عوام کی حمایت۔ ہمارا محکمہ ان کی یہ دونوں ضروریات بڑے احسن انداز میں پوری کرتا ہے۔ اس لیے اب ہمارے کام میں شفافیت نہیں رہی۔ جب کوئی ہمارے ہاتھ سے غلط کام کرواتا ہے اور اس کا مالی اور معاشرتی فائدہ اٹھاتا ہے تو پھر ہمیں بھی موقع ملتا ہے کہ ہم اپنی خواہشات کو پورا کریں۔ بھٹہ صاحب نے اس پر مزید بات کرنے میں ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کیا تو میں بھی سمجھ گیا۔ امید ہے آپ بھی اصل بات سمجھ گئے ہونگے۔

جہاں جمہوریت ہو گی وہاں کچھ نہ کچھ تو ایسا ضرور ہو گا لیکن میں پھر بھی یہ کہوں گا کہ لولی لنگڑی جمہوریت کسی بھی طرح کی آمریت سے بہتر ہے۔ اس میں عوام کو احتساب کا موقع تو مل ہی جاتا ہے۔

ہمارا اگلا سٹیشن بلہار شاہ تھا۔ شام کے پانچ بج رہے تھے اور ہر جیت نے چائے کی آوازیں بھی لگانی شروع کر دی تھیں۔ حسب ذوق مجھے پلیٹ فارم پر بھی اترنا تھا تا کہ میں کہہ سکوں کہ میں نے بھارت کا چپہ چپہ چھان مارا ہے۔ یاد رہے ابھی چوتھے ہم سفر کا تعارف باقی ہے۔ جو نہایت ہی دلچسپ آدمی تھے۔

بلہار پور اور بلہار شاہ

اب اس شہر کا نام بلہار پور ہے لیکن سٹیشن ابھی تک بلہار شاہ کے نام سے ہی جانا جاتا ہے۔ بلہار پور کی آبادی ایک لاکھ کے قریب ہے۔ جب سے ہم مہاراشٹر امیں داخل ہوئے، میں نے محسوس کیا کہ اب لوگ ہندی کی بجائے ایک دوسری زبان میں بات کرتے ہیں۔ میرے پوچھنے پر پتہ چلا کہ اسے مراٹھی زبان کہتے ہیں۔

مجھے بلہار پور کے بارے میں چند دلچسپ باتوں کا پتہ چلا جن کا ذکر میں آپ کے سامنے بھی کرنا چاہوں گا۔

کہتے ہیں کہ آج سے کئی سو سال قبل اس علاقے میں کوئی آبادی نہیں تھی اور ہر طرف جنگلات ہی جنگلات تھے۔ یہاں سے تقریباً چار سو کلومیٹر کے فاصلے پر ایک ریاست آباد تھی۔ جب ریاست کا راجہ وفات پا گیا تو اس کے بیٹے کو راجہ بنایا گیا۔ نئے راجہ کو اپنا آبائی علاقہ پسند نہ تھا اس لیے اس نے اس خوبصورت علاقہ کو اپنی راجدھانی چنا جہاں ایک طرف بانس بڑی مقدار میں پیدا ہوتا تھا اور دوسری طرف کوئلے کی کانیں بھی موجود تھیں۔ اس کے آبائی علاقے کی زمین زرخیز نہیں تھی۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ کوئی سیانا آدمی تھا جس نے سوچا کہ ایسے علاقے میں جایا جائے جہاں زراعت کے لیے زرخیز زمین بھی ہو اور اس کے ساتھ ساتھ زمین میں معدنیات بھی ہوں۔ اس لحاظ سے یہ علاقہ بہت مفید تھا۔ نئے راجہ نے یہاں پر اپنا ایک قلعہ بنوایا۔ جس کی باقیات آج تک موجود ہیں اور لوگ اس کی سیاحت کے لیے آتے ہیں۔

دوسری دلچسپ چیز یہاں پر گرونانک کالج آف سائنس کا قیام ہے۔ 1971ء میں اس کالج کا قیام عمل میں لایا گیا۔ بلہار پور میں اکثریت ہندوؤں کی ہے، جن کی تعداد ساٹھ فیصد کے قریب ہے۔ دوسرے نمبر پر بدھ مت کے پیروکار بستے ہیں جو بیس

فیصد ہیں۔ مسلمان پندرہ فیصد جبکہ سکھوں کی تعداد دو فیصد سے بھی کم ہے۔ ایسا شہر جہاں سکھ اتنی قلیل تعدا میں ہوں وہاں گرو نانک کے نام کا کالج بظاہر عجیب لگتا ہے۔

مجھے اس بات کا علم نہیں تھا کہ ہندو بابا گرو نانک کا بہت زیادہ احترام کرتے ہیں، اس وقت میں یہی سمجھتا تھا کہ ہندوؤں اور سکھوں میں مذہبی طور پر بہت فرق ہے۔ میں نے سندھ میں واقع بہت سے مندروں میں بابا گرو نانک کی تصاویر دیکھی ہیں۔اس لیے جہاں ہندو اپنے گرو کی تصویریں لگاتے ہیں وہیں وہ بابا گرو نانک کی تصویر بھی لگاتے ہیں۔ یاد رہے بابا گرو نانک کے والد ہندو تھے۔ بابا گرو نانک نے اپنی سوچ سے ہی سکھ مذہب کی بنیاد رکھی تھی۔اس لیے انھیں سکھ مذہب کا بانی کہا جاتا ہے۔ میں نے جب بلہار پور گرونانک کالج آف سائنس کا ذکر پڑھا تو مجھے کوئی حیرانی نہیں ہوئی۔ جس شہر میں سکھوں کی تعداد دو فیصد بھی نہ ہو اور وہ پنجاب سے پندرہ سو کلومیٹر دور بھی ہو تو ایسے شہر میں گرو نانک کے نام کے کالج کا ہونا یہ ثابت کرتا ہے کہ ہندو بھی بابا گرو نانک کا بے حد احترام کرتے ہیں۔

لالہ کرم چند تھاپر نے 1945ء میں اس علاقے میں ایک کاغذ بنانے کی مل لگائی جس کا نام بلہار پور انڈسٹریز ہے۔لالہ کرم چند تھاپر کا تعلق دہلی کے قریب ایک علاقے گڑگاؤں سے تھا۔ کاغذ کی مل کے لیے بانس خام مال کا کردار ادا کرتا ہے۔ اس علاقے میں مل لگانے کی وجہ بھی صرف یہی تھی کہ یہاں پر بہت بڑی مقدار میں بانس پیدا ہوتا تھا۔ اس وقت بھارت میں کاغذ بنانے والی یہ سب سے بڑی مل ہے۔ دنیا کی کاغذ بنانے والی سو بڑی ملوں میں بھی اس کا شمار ہوتا ہے۔اس کی سالانہ آمدن 70 ملین ڈالر تقریباً بارہ ارب روپے پاکستانی بنتی ہے۔ یہ مل کتنی بڑی ہے اس کا اندازہ آپ اس بات سے لگا سکتے ہیں کہ پاکستان میں کاغذ بنانے والی سب سے بڑی مل پیکجز لمیٹڈ ہے جو لاہور اور قصور میں واقع ہے۔ پیکیجز لمیٹڈ کی سالانہ آمدن دو ارب روپے سے بھی کم ہے۔

اس مل نے جہاں بانسوں کی کٹائی کرکے اس سے کاغذ بنانے کا کام لیا وہیں ایک بہت بڑی تعداد میں بانس کے جنگلات بھی لگائے۔ بھارت کی حکومت نے انھیں اس بات پر مجبور کیا کہ اگر وہ ایک بانس کا درخت کاٹیں گے تو اس کے بدلے ایک سے زائد درخت بھی لگائیں گے۔اس طرح اس مل نے علاقے کے ماحول کو خراب ہونے سے بچایا اور بہت سارے لوگوں کو یہاں پر ملازمت بھی ملی ہے۔اس مل کی وجہ سے بھارت کے دیگر علاقوں سے بھی بہت سے لوگوں نے آکر اس شہر میں رہائش اختیار کی جن میں بہار اور جنوبی ہند کے لوگ نمایاں ہیں۔

آپ کی معلومات کے لیے بیان کرتا چلوں کہ تھاپر نام کا ایک بہت بڑا کاروباری گروپ سیالکوٹ شہر میں بھی رہتا ہے اور وہ سب مسلمان ہیں۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ کوئی اپنا مذہب تو بدل سکتا ہے لیکن قبیلہ اور ذات برادری بدلنا ممکن نہیں ہوتا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ پاکستان اور بھارت میں تھاپر قبیلے کے لوگ کاروباری دنیا میں ایک نمایاں مقام رکھتے ہیں۔

بابا امتے خدمت کا ایک نشان اور اس کا آنند وان

مہاراشٹرا ایک ایسا علاقہ ہے جہاں ہندو اکثریت میں ہیں اور ان کے قدیم شہر بھی اسی علاقے میں واقع ہیں۔ مہاراشٹرا سے متعلق معلومات حاصل کرتے وقت مجھے پتہ چلا کہ بلہارپور کے قریب وارورہ (Warora) نام کا ایک شہر ہے جہاں بھارت کے ایک مشہور سوشل ورکر مرلی دھر دیوی داس المعروف بابا امتے نے 1952ء میں کوڑھ کے مریضوں اور معذور افراد کے لیے اسی مربع سے زائد زمین پر آنند وان کے نام سے ایک بہت بڑا ادارہ قائم کیا تھا جو اب تک انتہائی کامیابی سے چل رہا ہے۔ بابا امتے کو ان کی خدمات کے باعث کئی نیشنل اور انٹر نیشنل اعزازات سے نوازا گیا ہے۔ انھیں گاندھی پیس ایوارڈ بھی دیا گیا ہے۔

اس شہر کے بارے میں دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ یہ شہر انگریزوں کے بنائے ہوئے ایک صوبے سنٹرل پروونس کا بھی ایک اہم شہر ہے۔ انگریزوں نے مقامی حکمرانوں سے لڑائی کے بعد جو شہر حاصل کیے، یہ صوبہ ان علاقوں پر مشتمل ہے۔ ان مقامی حکمرانوں میں مراٹھوں اور مغلوں کے علاوہ بھی کئی حکمران شامل تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جس علاقے کو وہ فتح کرکے حاصل کرتے تھے اسے وہ برٹش انڈیا کا نام دیکر اس کا کُلی نظم و نسق خود سنبھال لیتے تھے۔

تیسری بات یہ کہ ٹاٹا خاندان کے بانی سر جمشید جی ٹاٹا نے 1882ء میں ایک اسٹیل مل قائم کرنے کے سلسلے میں اس علاقے کا دورہ کیا تھا۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ ٹاٹا سٹیل مل کا وجود اسی دورے کا نتیجہ ہے۔ اس علاقے میں لوہارا نام کا ایک قصبہ بھی آباد ہے جس کے نام سے ہی ظاہر ہوتا ہے یہاں پر لوہے کا کام کرنے والے آباد رہتے تھے۔

یہاں پر ہماری گاڑی کا سٹاپ نہیں تھا لیکن میں نے گزرتے ہوئے اس شہر کو بڑے غور سے دیکھا۔ اس کی وجہ بابا امتے اور اس کا آنند وان تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ جب کوئی عام سی چیز بھی کسی خاص چیز سے نسبت قائم کرلے تو وہ عام چیز بھی خاص ہو جاتی ہے۔ ایک عام سا شہر جس کی آبادی پچاس ہزار سے بھی کم ہے لیکن بابا امتے کے کام کی وجہ سے اب یہ شہر دنیا بھر میں جانا پہنچانا جاتا ہے۔ بابا امتے نے جس طرح خدمت خلق کی اور ایک بہت بڑا پروجیکٹ بنایا وہ ایک انتہائی باہمت اور رہنمائی فراہم کرنے والی داستان ہے۔ میں اس کا ذکر اس لیے کرنا چاہتا ہوں تاکہ خدمت خلق کرنے والوں کو اُن سے کچھ سیکھنے کا موقع ملے۔ اس سے پہلے کہ میں بابا امتے اور ان کے پروجیکٹ؛ آنند وان کے بارے میں آپ سے بات کروں، میں اس شہر کی مختصر تاریخ آپ کے سامنے رکھنا چاہوں گا۔

واروره شہر دہلی سے بارہ سو کلومیٹر کے فاصلے پر مہاراشٹرا میں واقع ہیں۔ اس شہر میں نوے فیصد سے زائد ہندو جبکہ چار فیصد مسلمان آباد ہیں۔ یہ شہر ہندوؤں اور مسلمانوں کے مختلف تہواروں کی وجہ سے بے حد مشہور ہے۔ محرم کے مہینے میں یہاں پر محرم کا ایک بہت بڑا جلوس نکالا جاتا ہے جس میں ایک کثیر تعداد میں مسلمان شریک ہوتے ہیں۔ تاریخی شہر نہ ہونے کی وجہ سے یہاں پر تاریخی عمارات بھی موجود نہیں ہیں۔ اس علاقے میں ہنگ گھاٹ کے نام سے ایک شہر آباد ہے۔ کئی لوگ ہنگ کے لفظ سے واقف ہوں گے۔ یہ ایک بوٹی کا نام ہے جو عام طور پر حکیم دیسی ادویات بنانے میں استعمال کرتے ہیں۔ ہنگ سے متعلق ایک کہاوت مشہور ہے جو کچھ اس طرح سے ہے۔

نہ ہِنگ لگے نہ پھٹکڑی

رنگ چوکھا ہی چوکھا

مجھے معلوم نہیں تھا کہ ہِنگ کے نام پر ایک شہر بھی موجود ہے جسے ہِنگ گھاٹ کہا جاتا ہے۔ جس کی وجہ اس علاقے میں ہِنگ کی کثیر پیداوار ہے۔

بابا امتے کی پیدائش 1914ء میں ہِنگ گھاٹ میں ہوئی۔ بابا امتے کے والد انگریز حکومت میں ایک سرکاری افسر تھے۔ بابا امتے کا بچپن امیر بچوں کی طرح گزرا۔ انھوں نے ایک دفعہ کہا کہ ہمارے خاندان نے عام آدمی اور ہمارے درمیان ایک بہت بڑی دیوار کھڑی کر رکھی ہے جس کی وجہ سے ہمیں عام لوگوں کے مسائل کا کوئی علم نہیں ہوتا۔ بابا امتے نے وکالت امتحان پاس کرکے اپنے علاقے میں ایک وکیل کی حیثیت سے بے حد شہرت کمائی۔ مہاتما گاندھی کے بھی بہت قریب تھے اور ان کا سیوا گرام بھی بہت آنا جانا تھا۔ وہ گاندھی اِزم کے بہت بڑے پیروکار تھے اور انھوں نے تحریک آزادی ہند میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اسی دوران میں انھوں نے دیکھا کہ کوڑھ کے مریضوں اور معذور لوگوں کی زندگی بہت ہی مشکل سے گزرتی ہے۔ خاص طور پر کوڑھ کے مریض

کو تو کوئی اپنے پاس پھٹکنے بھی نہیں دیتا۔ یہ سب دیکھتے ہوئے انھوں نے 1949ء میں اِس علاقے میں ایک ہسپتال بنایا جس میں کوڑھ کے مریضوں کاعلاج کیا جاتا تھا۔ اس کام میں ان کی بیوی بھی ان کے شانہ بشانہ تھی۔ اس طرح کا ہسپتال ایک عام سی بات ہے لیکن ان کا اصل کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اسی مربع سے زائد زمین لے کر ایک انوکھا پروجیکٹ شروع کیا جس کا نام آنند وان رکھا گیا۔

آنند وان پروجیکٹ کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں رہنے والے پانچ ہزار سے زائد کوڑھ کے مریضوں اور معذور افراد سے ان کی استطاعت کے مطابق کام لیا جاتا ہے اور یوں یہاں پر رہنے والے لوگ اپنی ضروریات زندگی کا سامان خود پیدا کرتے ہیں۔ کچھ لوگ کھیتی باڑی کا کام کرتے ہیں اور کچھ یہاں پر موجود چھوٹے پیمانے کی فیکٹریوں میں بھی کام کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی طے کیا گیا کہ یہاں رہنے والے زیادہ تر قدرتی طور پر پیدا ہونے والی چیزیں ہی استعمال کریں گے اور ماحول خراب نہیں کریں گے۔ اس سے ایک فائدہ تو یہ ہوا کہ پروجیکٹ خود کفیل ہو گیا اور دوسرا ماحول کی حفاظت بھی قابلِ تقلید مثال بن گئی۔ بابا امتے نے پورے علاقے سے مریضوں اور معذوروں کو ایک جگہ پر اکٹھا کیا اور فارغ بٹھانے کی بجائے ان سے وہ کام لیا جو وہ کر سکتے تھے۔

2008ء میں بابا امتے چورانوے سالہ خدمت کی طویل زندگی گزار کر فوت ہو گئے لیکن اُن کا لگایا ہوا پودہ اب بھی تر و تازہ ہے۔ اُن کی وفات کے بعد ان کا بیٹا اور پوتا آنند وان کی دیکھ بھال کر رہے ہیں۔ ان کی زندگی بے شمار لوگوں کے لیے ایک نمونہ ہے۔ ہمنشو ٹھاکر نے انھیں[19] Baba Amte: The Gandhi after that Gandhi کا

[19] https://www.rediff.com/news/2008/feb/09amte4.htm

لقب دیا ہے۔ ان پر کئی فلمیں بن چکی ہیں اور دنیا بھر میں انھیں بے شمار اعزازت سے نوازا گیا ہے۔

دی ٹائمز آف انڈیا Amte, the great social reformer کے نام سے میں شائع ہونے والے ایک مضمون میں ان کے بارے میں کافی معلومات ملتی ہیں[20]۔
ان کے کام پر ایک فلم بھی بنائی گئی ہے جس کا نام ہے - Dr. Prakash Baba Amte The Real Hero جس میں مرکزی کردار نانا پاٹیکر ایک معروف بھارتی اداکار نے ادا کیا ہے۔

بابا امتے کے خیالات ان کے اپنے الفاظ میں

I don't want to be a great leader.

I want to be a man who goes around with a little oil-can and,

whenever he sees a breakdown, offers his help.

To me the mechanic with the oil-can, that is my ideal in life...

بہت ہی خوبصورت بات ہے جو مجھے بھی بے حد پسند ہے۔

میں انھی خیالات میں گم اس علاقے سے گزرتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ ہم پاکستان میں رہ کر بھارت کے بیشتر علاقوں سے ناواقف ہیں۔ میرے ہمراہی اب تھکاوٹ کے ساتھ ساتھ اکتاہٹ بھی محسوس کر رہے تھے۔ میری کیفیت ذرا مختلف تھی۔ میں نئے علاقوں کی سیر سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اتنے میں ہمارا میزبان شام کی چائے سمیت تشریف لے آیا۔ میں حسبِ معمول اپنی چائے کی پیالی لے کر کھڑکی کے پاس بیٹھ کر

[20] https://timesofindia.indiatimes.com/india/Amte-the-great-social-reformer/articleshow/2768984.cms

چندراپور کا انتظار کرنے لگا جہاں پر موجود کوئلے کی کانوں کی وجہ سے اس شہر کو بھارت کا بلیک گولڈ سٹی کہا جاتا ہے۔ تین ہزار سال پرانا شہر ہونے کی وجہ سے اسے دیکھنا میرے لیے ایک اعزاز سے کم نہیں تھا۔ایسے نظارے کے لیے تگ و دو تو کرنا ہی پڑتی ہے۔ اس شہر میں بھارت کے مشہور ایٹمی سائنس دان اور سابق بھاتی صدر عبدالکلام کے نام پر بنایا گیا ایک بہت ہی خوبصورت پارک ہے جہاں ان کا مجسمہ بھی نصب ہے۔
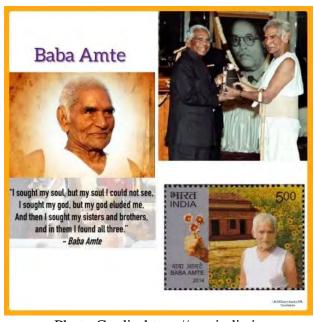
Photo Credit: https://cmeindia.in

چندراپور: بھارت کا بلیک گولڈ سٹی

چندراپور سے دریافت ہونے والے آثار قدیمہ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ شہر صدیوں پرانا ہے۔ یہ دہلی سے بارہ سو کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔یہی وجہ ہے کہ یہ علاقے کبھی بھی سلاطین دہلی یا مغل حکمرانوں کے زیرِ اثر نہیں رہے۔اس کے باوجود بھی یہاں پر مسلمانوں کی تعداد دس فیصد کے قریب ہے۔ شہر میں مساجد کی خاصی تعداد

موجود ہے۔ تبلیغی جماعت کا سالانہ اجتماع بھی اسی شہر میں ہوتا ہے جس میں شرکاء کی تعداد پندرہ لاکھ سے بھی زیادہ ہوتی ہے۔اس بات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس علاقے میں اسلام تبلیغ کے ذریعے پہنچا ہے۔ مسلمان بادشاہ زیادہ تر بھارت کے شمال اور مغربی علاقہ جات جن میں حیدرآباد دکن کے علاقے شامل ہیں، میں آئے اور یہیں پر ہی حکمران رہے۔ وسطی اور جنوبی ہندوستان کے ساتھ ساتھ جنوب مشرقی علاقوں پر بھی اکثر اِوقات مقامی حکمرانوں کی ہی حکومت رہی ہے۔

اس علاقے میں گوند خاندان کافی عرصہ تک حکمرانی کرتے رہے ہیں۔ بعدازاں مراٹھے بھی اس علاقے پر حکمرانی کرتے رہے۔ انیسویں صدی کے وسط میں انگریزوں نے مراٹھوں کو شکست دے کر اپنی حکومت قائم کرکے 1853ء میں چاندراپور کے علاقے کو بھی برٹش انڈیا کا حصہ بنالیا۔ اس شہر کی آبادی تقریباً تین لاکھ ہے۔اس علاقے کی اکثریتی زبان مراٹھی اور گوندی ہے البتہ ہندی سمجھنے والے لوگ بھی موجود ہیں۔

تاریخی عمارات کے حوالے سے اس علاقے میں گوند حکمرانوں کا بنایا ہوا پانچ سو سال پرانا قلعہ بھی موجود ہے۔ یہ قلعہ اس وقت ایک مشہور تفریحی مقام کی حیثیت اختیار کرچکاہے۔ کوئلے کی موجودگی کی وجہ سے یہاں پر ایک سپر تھرمل پاور سٹیشن بنایا گیا جس کی بنیاد 1977ء میں رکھی گئی اور 1984ء میں اندراگاندھی نے اس کا افتتاح کیا۔اس کی پیداوار 3240 میگاواٹ ہے یہ پلانٹ کتنا بڑا ہے اس کا اندازہ آپ اس بات سے لگا سکتے ہیں کہ پورے پاکستان میں 3700 میگاواٹ بجلی پیدا ہوتی ہے۔ چانداپور کے بارے میں اس ضلع کی ویب سائٹ پر تفصیلات موجود ہیں[21]۔ ایک رپورٹ کے مطابق پتھر کے زمانے سے یہاں آبادی کے آثار ملتے ہیں۔ ولیم میر نے ایک کتاب

[21] https://chanda.nic.in/en/history/

Chandragupta Maurya and his times کے نام سے لکھی ہے۔ اس میں اس علاقے کا تفصیل سے ذکر ہے۔ میرا گمان ہے کہ اس شہر کا نام اسی وجہ سے چندراپور ہے۔ عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ اس شہر کا نام چاند کے نام پر رکھا گیا ہے۔ یہ بھی تو ممکن ہے کہ چندراگپتا کا نام بھی چاند کے نام پر رکھا گیا ہو؟ یہ بھی میرا گمان ہے!

ڈاکٹر عبدالکلام ایک مایہ ناز ایٹمی سائنسدان اور بھارت کے صدر بھی رہے ہیں، بظاہر تو اُن کا اِس علاقے سے کوئی تعلق نہیں تھا لیکن پھر بھی چاندراپور میں اُن کے نام کا ایک پارک موجود ہے جہاں پر اُن کا مجسمہ بھی نصب ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس علاقے سے عبدل شفیع صاحب کانگریس کے ٹکٹ پر ایم پی بھی منتخب ہوتے رہے ہیں ۔اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ علاقائی سیاست میں مسلمانوں کا ایک اہم کردار ہے۔ چندراپور میں شیروں کی نسل بچانے کے لیے ایک سفاری پارک بھی بنایا گیا ہے۔

سطح مرتفع دکن : ایک وسیع و عریض علاقہ

میں نے نقشے میں دیکھا کہ ایک ریلوے ٹریک براستہ وارانگال، چنائی کی طرف جاتا ہے اور دوسرا ٹریک کریم آباد اور حیدرآباد سے گزر کر چنائی جاتا ہے۔ میں نے دل ہی دل میں دعا کی کہ ہماری ٹرین حیدرآباد سے ہو کر گزرے لیکن ضروری نہیں کہ آپ کی ہر خواہش پوری ہو جائے۔

تامل ناڈو ایکسپریس ایک تیز رفتار ٹرین ہے جس کے دہلی سے چنائی تک صرف نو سٹاپ ہیں حالانکہ یہ فاصلہ اکیس سو کلومیٹر سے بھی زائد ہے۔اس طویل سفر کو کم سے کم کرنے کے لیے اس ٹرین کے لیے کئی شارٹ کٹ راستے بھی استعمال کیے گئے۔ میں بہت افسردہ ہوا جب مجھے پتہ چلا کہ ہماری ٹرین ریاست حیدرآباد سے گزر کر تو جائے گی لیکن کریم آباد اور حیدرآباد شہر کی طرف نہیں بلکہ ایک شارٹ کٹ استعمال کرتے ہوئے براستہ وارانگال، چنائی جائے گی۔اس طرح ہم کریم نگر سے چند کلومیٹر کے فاصلے

سے گزریں گے۔البتہ یہ جان کر مجھے بے حد خوشی ہوئی کہ ہم کچھ سفر پرانی ریاست حیدرآباد میں بھی کریں گے۔ حیدرآباد ریاست کی تفصیل ذکر آئندہ صفحات میں ہوگا۔

جب کبھی بھی میں نے دکن کا نام سنا تو اس کے ساتھ حیدرآباد کا لفظ بھی لگا ہوتا تھا۔ مغل حکمرانوں کی تاریخ پڑھتے ہوئے بھی یہ جاننے کا موقع ملا کہ عالمگیر نے دکن کے علاقے سے اپنی فتوحات کا آغاز کیا تھا۔اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ مغل حکمرانوں نے جب شمالی ہندوستان میں اپنے قدم مضبوطی سے جما لیے تو انھوں نے وسطی اور جنوبی ہندوستان کے علاقوں پر بھی حملے شروع کر دیے اورحیدرآباد کے ساتھ ساتھ دیگرعلاقے بھی اپنی سلطنت میں شامل کر لیے۔دکن کا بیشتر حصہ بھی مغل حکمرانوں کے قبضہ میں تھا۔ دکن سے متعلق معلومات سے پہلے میرا خیال تھا کہ دکن کسی شہر کا نام ہے۔ حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ یہ ایک وسیع علاقے کا نام ہے جس کی سطح ہموار نہ ہونے کی وجہ سے اسے سطح مرتفع بھی کہتے ہیں۔اسے سمجھنے کے لیے آپ چکوال کے علاقے میں واقع سطح مرتفع پوٹھوہار کی مثال لے سکتے ہیں۔اس سے پہلے کہ میں آپ کو ریاست حیدرآباد کے بارے میں کچھ بتاؤں میں چاہوں گا کہ دکن کا ایک مختصر تعارف آپ کی خدمت میں پیش کروں۔

دکن کی مسلمان ریاستیں

بھارت کے جنوب میں ایک بہت بڑا علاقہ ہے جسے دکن کہا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اصل لفظ دکھن، جس کا مطلب جنوب ہوتا ہے اور اتر کا مطلب شمال ہے، جیسے اتر پردیش۔اسی طرح سے پورب مشرق کے لیے بولا جاتا ہے جبکہ مغرب کے لیے پچھم کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے لیکن سب لوگ اسے دکن ہی کہتے ہیں ۔ یہ علاقہ دو بڑے پہاڑی سلسلوں کے درمیان واقع ہے۔ شمال میں اس کی اونچائی تین سو فٹ جبکہ جنوب تک جاتے جاتے اس کی اونچائی تین ہزار فٹ تک ہو جاتی ہے۔ یہ سارا علاقہ اونچے نیچے ٹیلوں

اور چھوٹی بڑی پہاڑیوں پر مشتمل ہے۔اس کا رقبہ ڈیڑھ لاکھ مربع کلومیٹر ہے جو ہمارے کے پی کے رقبہ سے بھی پچاس فیصد زیادہ بنتا ہے۔

جب میں نے اس علاقے سے متعلق پڑھنا شروع کیا تو اس وقت میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب مجھے معلوم ہوا کہ چودہویں صدی میں اس علاقے میں کئی مسلمان ریاستیں قائم ہوئیں اور تین سو سال سے بھی زیادہ عرصہ تک قائم رہیں۔ ہمیں جو تاریخ پڑھائی جاتی ہے وہ تو زیادہ تر شمالی ہندوستان تک ہی محدود ہے۔

جنوبی ہندوستان میں مسلمانوں کی پہلی ریاست علاؤالدین رحمان شاہ نے 1358ء میں قائم کی اور اسے بہمانی سلطنت کا نام دیا جاتا ہے۔ اس سے پہلے علاؤالدین رحمان شاہ سلاطینِ دہلی کے ساتھ منسلک تھے۔ کسی وجہ سے انھوں نے تغلق خاندان سے اپنا رشتہ ختم کیا اور اِس علاقے میں آ کر اپنی ریاست قائم کی۔ بعد ازاں یہ ریاست پانچ حصوں میں تقسیم ہو گئی لیکن ان سب نے اپنی وحدت کو قائم رکھا۔ انھیں سلاطینِ دکن

کہا جاتا تھا۔اس علاقے میں مسلمانوں کی پانچ ریاستوں کے نام کچھ اس طرح سے ہیں، احمد نگر، بیجاپور، بیدار، بیرار اور گولکنڈا۔ اس ریاست کے حکمران اپنا رشتہ ایران سے جوڑتے تھے۔ اسی وجہ سے انھوں نے اس علاقے میں فارسی زبان اور ایرانی کلچر کو فروغ دیا۔ یاد رہے کہ یہ سلطنت مغلوں کی سلطنت سے بھی دو سو سال پہلے قائم ہو چکی تھی۔
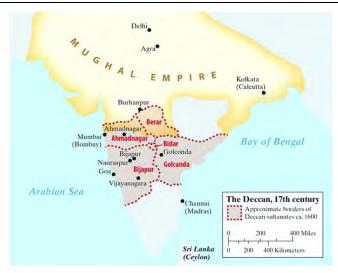
Muslim States in Deccan: Photo Credit:
https://www.thefridaytimes.com

اب تک جو میں نے پڑھا ہے اس کے مطابق وسطی اور جنوبی ہندوستان میں قائم مسلمان ریاستوں کے متعلق ہندوؤں کی رائے شمالی ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کی نسبت بہت بہتر ہے۔ سلاطین گجرات، دکن اور اس علاقے میں جو مسلمان ریاستیں تھیں وہ عدل اور انصاف کے لیے بھی جانی جاتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے لوگوں کی بھلائی کے لیے کافی کام کیے ہیں۔ ان کے ریاستی مظالم کی داستانیں بہت کم سننے کو ملتی ہیں۔ جب میں نے اس علاقے میں قائم مسلمان ریاستوں کے متعلق پڑھا تو مجھے اس بات کا افسوس ہوا کہ پاکستان میں تاریخ کی کتابیں صرف شمالی ہندوستان کی تاریخ ہی کے متعلق ہی کیوں ہیں؟ ان ریاستوں کی تاریخ مسلمانوں کے عوام دوست، عدل و انصاف، تعلیم میں دلچسپی، لوگوں کی فلاح و بہبود اور مذہبی رواداری کی ان گنت داستانوں سے بھری پڑی ہے جو مسلمانوں لیے ایک سرمایہ افتخار ہے۔ میری آپ سے

گزارش ہے کہ آپ دکن میں مسلمان ریاستوں کے بارے میں ضرور مطالعہ کریں۔اس کام کے لیے درج ذیل تین کتابیں بے حد مفید ہیں۔

حمید اختر صدیقی کی کتاب[22]

HISTORY OF BAHMANIS OF DECCAN

a Gulbarga Saltanate of India

اور

Mediaeval Deccan History: Commemoration Volume

in Honour of Purshottam Mahadeo Joshi

اور

فاروق سلمان احمد کی کتاب[23]

A Comprehensive History of Medieval India: Twelfth

to the Mid-eighteenth Century

میں یہ بات پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ دکن اور گجرات کے مسلمان حکمرانوں کے طرزِ حکمرانی سلاطین دلی اور مغل حکمرانوں نے بہت ہی بہتر تھا۔ وہ جنگجو تھے جب کہ یہ صلح پسند اور خیر خواہ تھے۔ میری بات سے آپ کو اختلاف ہو سکتا ہے۔اس کے لیے آپ کو کوئی دلیل لانا پڑے گی جس کا ملنا مشکل ہے۔ میں یہ بھی کہوں گا کہ جب

---

[22]https://web.archive.org/web/20071116091500/http://www.indiancoins.8m.com/bahmani/BahmaniHist.html

[23]https://books.google.com.pk/books?id=sxhAtCflwOMC&vq=shia+bahmani&source=gbs_navlinks_s

مغل ریاست کو اس علاقے میں آنے کا موقع ملا تو انھوں نے یہاں بھی وہی طرزِ حکمرانی اختیار کیا جو اب تک مسلمانوں کی شرمندگی کا باعث ہے۔۔۔ جس میں مندروں کی بے حرمتی سرِ فہرست ہے جس کا سہرا اورنگزیب کے سر ہے۔ کاش وہ ایسا نہ کرتے۔ میں اس بات پر مکمل یقین رکھتا ہوں کہ ان کے اس جنگی اور جور و جبر کے اندازِ حکمرانی سے یہاں کے لوگوں اور اسلام کے درمیان ایک تعصب کی آہنی دیوار کھڑی کر دی تھی جس کی وجہ سے کسی بھی مسلمان بادشاہ کی وجہ سے کوئی اپنا دھرم چھوڑ کر مسلمان نہیں ہوا۔ جو بھی لوگ مسلمان ہوئے وہ مسلمان صوفیاؤں کے پیار اور محبت سے بھرے اخلاق کی وجہ سے ہوئے۔ میں تو یہاں تک کہوں گا کہ شمالی ہندوستان کے اکثر مسلمان بادشاہ اسلام کی بدنامی کا باعث بنے ہیں جبکہ جنوبی، وسطی اور جنوب مغربی ہندوستان میں ایسا بہت کم ہوا ہے۔

یہ میری رائے ہے، اختلاف آپ کا حق ہے۔۔۔

نفرت نہیں۔۔۔

نفرت صحیح بات کو بھی تسلیم کرنے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہوتی ہے میرے دوستو!

جنوبی ہندوستان میں مسلمانوں کی سب سے بڑی ریاست حیدرآباد تھی۔ مسلمان صرف شمالی ہندوستان تک ہی محدود نہیں رہے بلکہ انھوں نے جنوبی ہندوستان کے علاقے بھی فتح کیے اور وہاں بھی عرصہ دراز حکومت کی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ان علاقوں میں قائم آخری دو ریاستوں، بیجاپور اور گول کنڈا کو اورنگ زیب نے اپنی دکن کی مہم کے دوران 1687ء میں فتح کیا یوں اس علاقے میں پہلی مسلمان ریاست جو 1358ء میں ایرانی نژاد لوگوں نے قائم کی جو سوا تین سو سال تک قائم رہی۔ اس

سلطنت کو مقامی ہندو تو ختم نہ کر سکے لیکن وہ ایک مسلمان جسے ہم سب نیک دل اور ٹوپیاں سی کر گزارا کرنے والا حکمران کہتے ہیں، کے ہاتھوں ہی انجام کو پہنچی۔

وارنگل دہلی سے پندرہ سو کلومیٹر دور: جہاں کبھی مارکوپولو بھی آیا تھا

شام آٹھ بجے کے قریب ہمارے انتہائی پیارے میزبان نے ہمیں کھانا کھلایا۔ حسب معمول بہترین چائے اور سونے کے لیے تکیے اور کمبل کا بندوبست کیا۔ ہمیں سفر کرتے ہوئے تقریباً بائیس گھنٹے ہو چکے تھے اور ہم پندرہ سو کلومیٹر کا سفر طے کر چکے تھے۔ ابھی بھی ہمارا چھ سو کلومیٹر سے زائد کا سفر باقی تھا جو ہمیں رات بھر میں کرنا تھا۔

اجنبی لوگوں کے ساتھ باتیں بھی ایک خاص وقت تک ہی ساتھ دیتی ہیں بعد میں لوگ اپنی ذاتی مصروفیات تلاش کر لیتے ہیں۔ میری مصروفیت اُن علاقوں کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنا تھی جہاں سے ہمیں گزر کر جانا تھا۔ ٹائم ٹیبل سے معلوم ہوا کہ ہم تقریباً نو بجے کے قریب وارنگل سٹی کے ریلوے سٹیشن پر دو منٹ کے لیے رکیں گے۔ یہ جان کر مجھے بہت خوشی ہوئی۔ اس کی کئی وجوہات ہیں جو میں آئندہ صفحات میں آپ کو بتاؤں گا لیکن سب سے بڑی وجہ یہ ہے اس علاقے کا ذکر مارکوپولو نے اپنے سفر ناموں میں بڑے ہی خوبصورت انداز میں کیا ہے۔ میں مارکوپولو کی طرح کا سفر تو نہیں کر سکا لیکن جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ یہاں سے مارکوپولو بھی ہو کر گیا ہے تو میں بھی خود کو خوش نصیب سمجھنے لگا۔

میں موقع غنیمت جانتے ہوئے ایک منٹ کے لیے پلیٹ فارم پر اتر گیا۔ پہلی ہی نظر میں مجھے محسوس ہوا کہ میں کسی بڑے ہوٹل کے لاؤنج میں ہوں۔ اب تک میں نے بھارت کے جتنے بھی ریلوے سٹیشن دیکھے تھے، اُن میں یہ ریلوے سٹیشن سب سے زیادہ صاف ستھرا محسوس ہو رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں شہر کی خوبیاں بیان کروں میں چاہوں گا کہ اس علاقے کی مختصر تاریخ سے آپ کو روشناس کروایا جائے، جس سے آپ

یہ اندازہ کر سکیں گے کہ کس طرح سلاطینِ دلی اور مغلوں نے ہزاروں میل دور واقع ان علاقوں میں آ کر اپنی حکومتیں قائم کیں۔

وارنگل سلاطین دلی اور اورنگزیب

دکن کے مشرق اور خلیج بنگال میں تقریباً دو سو کلومیٹر کے فاصلے پر واقع اس علاقے میں ہندوؤں کی اکثریت تھی اور اب بھی ہے۔ اس علاقے پر صدیوں سے مقامی ہندو راجہ ہی حکمران رہے۔ پہلی مرتبہ 1323ء میں تغلق حکمرانوں نے اس علاقے پر حملہ کیا اور یہاں اپنی سلطنت قائم کی لیکن یہ سلطنت صرف پچاس سال تک ہی قائم رہ سکی۔ یہ کسی بھی غیر ملکی کا اس علاقے پر پہلا قبضہ تھا۔ دلی میں تغلق خاندان کی حکومت کے خاتمے اور دوری کی وجہ سے مقامی لوگوں نے انھیں اپنے علاقے سے نکال کر اپنی ریاست واپس لے لی۔ اورنگزیب نے جب دکن کے مختلف علاقوں کو فتح کیا تو اُس نے سترہویں صدی کے آخر میں اس علاقے پر بھی حملہ کیا اور اِسے بھی مغل سلطنت کا حصہ بنایا لیکن جیسے ہی اورنگزیب کی وفات ہوئی تو دور دراز کے علاقوں والے مقامی حکمرانوں نے خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ اس طرح یہ علاقہ بھی مغل سلطنت سے الگ ہو گیا اور مقامی لوگوں نے اپنا اقتدار قائم کر لیا۔ البتہ 1724ء میں کچھ علاقوں پر مشتمل مغل حکمرانوں کے ایک گورنر نے حیدر آباد ریاست قائم کی، جو 1948ء تک قائم رہی۔

ورانگل سٹی کی آبادی دس لاکھ کے قریب ہے۔ یہاں پر اسی فیصد سے زائد ہندو جبکہ مسلمانوں کی آبادی پندرہ فیصد ہے۔ میں نے پوری کوشش کی کہ کسی طریقے سے مجھے پتہ چل سکے کہ اس علاقے میں انگریز بھی آئے تھے؟ لیکن میں یہ جاننے میں ناکام رہا کہ وہ اس علاقے میں آئے تھے یا نہیں کیونکہ اس شہر میں کسی بھی طرح کی کوئی ایسی نشانی نہیں ملی جس سے میں کوئی اندازہ لگا سکوں۔ تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ 1899ء میں اس شہر میں میونسپل کمیٹی بنائی گئی جو اب تک بھارت کی سب سے پرانی میونسپل کمیٹی ہے۔ اب یہ کارپوریشن کا درجہ رکھتی ہے۔

سیکھنے والی بات یہ ہے کہ اس علاقے میں ایک منصوبہ جو کئی دہائیاں پہلے شروع کیا گیا تھا، انتہائی قابل تعریف و تقلید ہے۔ اس منصوبے کے مطابق ہر گھر پر لازم تھا کہ وہ اپنے گھر کے باہر کوڑے کے لیے دو عدد کنٹینر رکھے۔ ایک میں خشک ویسٹ ڈالی جائے جیسے کاغذ، لوہا، لکڑی وغیرہ اور دوسرے میں گیلی چیزیں جیسے سبزیاں، پھل وغیرہ ڈالے جائیں۔ ایسا کرنے کرنے سے ویسٹ کو دوبارہ قابلِ استعمال بنانے میں مدد ملتی ہے ریاست تلنگانہ نے ریاست کی تمام میونسپل کارپوریشنز کا مقابلہ کروایا۔ وہ یہ جاننا چاہتے تھے کہ کس شہر میں صفائی کا نظام سب سے بہتر ہے۔ وارنگل سٹی نے اس مقابلے میں پہلی پوزیشن حاصل کی۔

وارنگل شہر میں ویسٹ اکٹھا کرنے کے لیے مختلف مقامات پر چار سو سے زائد سیمنٹ کی ڈسٹ بِن بنائی گئیں تھیں، جو اب ختم کر دی گئیں ہیں۔ اب ہر گھر سے کوڑا کرکٹ اٹھا کر بہت دور لے جایا جاتا ہے۔ جہاں ایک ایسا نظام وضع کیا گیا ہے جس کی مدد سے بہت بڑی مقدار میں قدرتی کھاد حاصل کی جاتی ہے اور پھر یہ کھاد مقامی کاشتکاروں کو مہیا کی جاتی ہے۔ اس عمل کو Composti Vermi کہتے ہیں۔ ایسا کرنے سے زمین میں دفن کرنے والے ویسٹ کی مقدار میں چالیس فیصد سے زائد کمی واقع ہو چکی ہے۔

ہمارے لیے بھی یہ سوچنے کا مقام ہے کہ اگر دس لاکھ کی آبادی والا شہر اپنا سو فیصد کوڑا ہر گھر سے دو الگ الگ صورتوں میں اکٹھا کر کے دوبارہ استعمال کر کے قدرتی کھاد بنا سکتا تو ہم یہ کام کیوں نہیں کر سکتے۔ آج کی تاریخ یعنی 2020ء تک، میرے علم کے مطابق پاکستان میں کہیں بھی کوڑا کرکٹ سے دوبارہ کھاد بنانے کا کوئی بھی انتظام موجود نہیں ہے۔ ہم ایسا کیسے کر سکتے ہیں؟ خواہ بہت ہی چھوٹے پیمانے پر ہی سہی۔ یہی سوچتے سوچتے میرے سفر کے چند سو میل اور کم ہو گئے۔ میرے باقی ساتھی سو چکے تھے اور عمر بھائی کے خراٹے بھی بلند ہو رہے تھے۔

اس علاقے کے بارے میں مزید جاننے کے لیے ھیگ ٹی ڈبلیو کی کتاب Historic Landmarks Of The Deccan بہت مفید ہے۔ یہ کتاب نیٹ پر بھی موجود ہے[24]۔

Interior of Khush Mahal, Warangal Fort. Photo by Surendra Kumar

محبوب آباد: ریاست حیدر آباد کا آخری شہر

رات کافی بیت چکی تھی اور سب لوگ گہری نیند سو رہے تھے لیکن میں شہر محبوب آباد کو دیکھنے کی خاطر جاگنے کی کوشش کر رہا تھا۔ شہر کے نام سے ہی محسوس ہوتا تھا کہ یہ مسلمانوں کا بسایا ہوا ہے۔ یہاں ہماری گاڑی کا سٹاپ نہیں تھا اس لیے میں ریلوے سٹیشن اور شہر کی چند بتیوں کو ہی دیکھ سکا۔ اگر شہروں کی عمارتوں کو دیکھیں تو کوئی خاص فرق محسوس نہیں ہوتا۔ بہت ساری چیزیں ملتی جلتی ہی ہوتی ہیں جن میں زیادہ سے زیادہ چند تاریخی قلعے، مساجد، مندر اور گردوارے وغیرہ ہوتے ہیں ۔ میرے نزدیک اصل بات یہ ہوتی ہے کہ اس شہر سے تاریخ کا کون سا واقعہ جڑا ہوا ہے؟ اس لحاظ سے محبوب آباد میرے لیے محبوب ثابت ہو رہا تھا جسے میں ضرور دیکھنا چاہتا تھا۔

24

میں نے پہلے بھی اس بات کا ذکر کیا کہ بھارت سے متعلق میری زیادہ تر معلومات اس کے شمال یا کچھ وسطی علاقوں تک ہی محدود ہیں۔ بھارت کا جنوبی علاقہ خاص طور پر مشرقی جنوب کی تاریخ اور جغرافیے کا مجھے بہت ہی کم علم ہے۔ان علاقوں کی زبان اور رہن سہن بھی شمالی ہندوستان سے بہت مختلف ہے۔ میرے علم کے مطابق پاکستانی کاروباری لوگ بھی اس علاقے میں نہیں آتے اور نہ ہی پاکستان میں رہنے والے لوگوں کی یہاں پر زیادہ رشتہ داریاں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ علاقے میری نظروں سے اوجھل رہے اور ان کے بارے میں میرا علم نہ ہونے کے برابر ہے۔اس لیے جب مجھے زندگی میں پہلی مرتبہ اس علاقے میں آنے کا موقع ملا تو میری خواہش تھی کہ اس علاقے سے متعلق زیاہ سے زیادہ جان سکوں۔اسی لیے اتنے دور دراز علاقے میں ایک مسلمان کے نام پر شہر اور شہر میں دس فیصد سے زیادہ اردو بولنے والوں کا وجود، فاطمہ ہائی سکول اور قدیمی شکار گاہ نے اس شہر میں میری دلچسپی کو بے حد بڑھا دیا۔

تاریخ سے پتہ چلتاہے کے اس شہر کا نام مانو کوٹہ تھا جس کا مطلب درختوں سے بنا ہوا ایک قلعہ ہے۔ یہ ریاست حیدر آباد کی سرحد پر واقع ایک قصبہ تھا۔ دور دراز علاقہ ہونے کی وجہ سے یہاں تعلیم و ترقی تو برائے نام تھی لیکن ایک وسیع و عریض جنگل ہونے کی وجہ سے نظام حیدر آباد نے یہاں ایک شکار گاہ بنا رکھی تھی۔ بادشاہ سلامت شکار کی غرض سے اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ یہاں تشریف لاتے تھے۔ ایک مرتبہ ریاست حیدر آباد کے ایک صاحب محبوب خان یہاں تشریف لائے اور انھوں نے ایک لمبے عرصے تک قیام کیا۔

محبوب صاحب نے اور کوئی کام کیا یا نہیں لیکن انھوں نے مانو کوٹہ کا نام تبدیل کر کے محبوب آباد رکھ دیا جو اب تک محبوب آباد ہی کہلاتا ہے ۔ محبوب خان صاحب ایک طاقتور ریاست کے نمائندے تھے لہٰذا ان کی بات کو کون ٹال سکتا تھا۔ آج

تک اس علاقے کے لوگوں نے اس شہر کے اصلی نام کو دوبارہ لانے کا کوئی مطالبہ نہیں کیا جبکہ اس علاقے میں ہندو اسی فیصد سے زائد جبکہ مسلمانوں کی آبادی دس فیصد سے بھی کم ہے۔

ریاست حیدرآباد کی وجہ سے اس شہر میں بھی اردو بولی جاتی ہے دس فیصد کے قریب لوگ ایسے ہیں جن کی مادری زبان اردو ہے اور یہ سب مسلمان ہیں۔ میں جب اس کی تاریخ پڑھ رہا تھا تو مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ اس شہر میں ایک فاطمہ سکول بھی قائم ہے جو اردو کے فروغ میں بے حد اہم کردار ادا کر رہا ہے۔ یاد رہے کہ یہ شہر دلی سے سولہ سو کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے اور تلنگانہ ریاست میں واقع ہے۔

محبوب آباد ریاست حیدرآباد کا آخری شہر تھا۔اس سے پہلے کہ میں آگے کے سفر کی رُوداد بیان کروں۔ میں چاہوں گا کہ آپ کو ریاست حیدرآباد کے بارے میں چند باتیں بتاؤں جس سے آپ کو اندازہ ہو کہ مسلمانوں کی ایک بہت بڑی ریاست کب قائم ہوئی اور اس نے کیا کارہائے نمایاں سرانجام دیے۔ یہ وہی علاقہ ہے جہاں سید ابوالاعلی مودودی علیہ رحمہ کی پیدائش ہوئی تھی۔

ریاست حیدرآباد: مسلمانوں کی ایک شاندار ریاست

دکن کو مغلیہ سلطنت کا حصہ بنانے کے لیے شاہ جہاں نے اپنے بیٹے اورنگزیب کو دکن فتح کرنے کا حکم دیا تھا۔ شاہجہاں کے حکم پر اورنگزیب نے یہاں کئی علاقے فتح کیے اور ان کو مغل سلطنت کا حصہ بھی بنایا۔ تاریخ میں اورنگزیب کی دکن والی فتوحات بڑی تفصیل سے ملتی ہیں۔اورنگزیب کا انتقال 1707ء میں ہوا اور اس وقت تک دکن کا ایک وسیع علاقہ مغلیہ سلطنت کا حصہ بن چکا تھا۔ تاریخ میں یہ بھی لکھا ہے کہ شاہجہاں بھی اپنے والد جہانگیر کے زمانے میں اس علاقے پر حملہ آور ہوا تھا۔ یہی وجہ ہوگی کہ اس نے بادشاہ بننے کے بعد عالمگیر کو اس علاقے کو فتح کرنے کا حکم دیا جسے وہ خود نہیں کر سکا تھا۔

عالمگیر کو یہ علاقہ اتنا پسند آیا کہ اس نے اپنی زندگی کے آخری سال بھی یہیں گزارے اور یہیں پر اس کی وفات ہوئی، اس کے نام کا ایک شہر بسایا گیا، اس کا مقبرہ بھی بنایا گیا۔

مغل حکمرانوں کو دکن سے اس قدر محبت کس وجہ سے تھی، معلوم نہیں لیکن کچھ تو تھا جس کی پردہ داری تھی۔ میرے خیال میں دکن کی خوبصورتی اور یہاں کے لوگوں کی رواداری اور خوش اخلاقی ایک اہم وجہ ہو سکتی ہے!

اورنگ زیب کی وفات کے بعد مغلیہ سلطنت کمزور تو ہونا شروع ہو گئی لیکن اس کے باوجود بہت سے علاقوں پر ان کی بڑی مضبوط گرفت تھی، جن میں دکن کا علاقہ بھی شامل تھا۔اورنگ زیب کی وفات 1707ء سے لیکر 1857ء تک ڈیڑھ سو سال تک ہندوستان پر مغلیہ سلطنت کی حکومت کسی نہ کسی انداز میں قائم رہی۔ اس دوران بہت سی ریاستوں نے مغلیہ سلطنت سے علیحدگی کا اعلان بھی کیا اور وہ اس میں کامیاب بھی ہوئے۔ مغل بادشاہ محمد شاہ نے 1713ء میں میر قمرالدین خان، جو ایک ترکی النسل شخص تھا، کو دکن کا گورنر مقرر کیا جس کا ایک اہم شہر حیدرآباد تھا۔ اس دوران میں میر قمرالدین نے اس علاقے میں اپنے قدم مضبوط کر لیے اور 1724ء میں جب کہ ابھی دلی میں مغل حکومت قائم تھی اس نے ریاست حیدرآباد کا اعلان کر دیا۔ مغلوں کی کمزوری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے جہاں غیر مسلم ریاستوں نے علیحدگی کا اعلان کیا وہیں طاقتور مسلمان گورنروں نے بھی اپنے اپنے علاقوں میں اپنی ریاست قائم کرنے کا اعلان کر دیا جن میں ایک ریاست حیدرآباد بھی ہے۔ میر قمرالدین نے اپنے لیے آصف جاہ اور نظام الملک کا لقب اختیار کیا۔ یہ ریاست 1724ء سے 1948ء تک، تقریباً دو سو تئیس سال تک قائم رہی۔ تقسیم ہند کے بعد اس ریاست نے بھارت سے الگ رہنے کی کوشش کی لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ تقسیم ہند کے نتیجہ میں یہ ریاست بھارت کا حصہ بن گئی اور یوں

ایک شاندار ریاست کا اختتام ہو گیا۔ سابقہ والیانِ ریاست اب بھی خود کو ریاست کے بغیر بھی میر ہی کہلواتے ہیں۔

ریاست حیدرآباد ہندوستان کے مشرقی وسطی علاقے میں واقع تھی، 1941ء میں اس کا رقبہ دولاکھ پندرہ ہزار مربع کلومیٹر سے زائد تھا۔ موجودہ کے پی کے کا رقبہ ایک لاکھ ایک ہزار مربع کلومیٹر ہے۔ اس کی آبادی ایک کروڑ ساٹھ لاکھ تھی۔ اس کی اپنی کرنسی تھی جس کا نام حیدرآبادی روپیہ تھا۔

انگریزوں نے جب دکن کے علاقے میں اپنا اثر ورسوخ بڑھانے کی کوشش کی تو انھیں بہت سی مقامی ریاستوں کی طرف سے مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ جن میں ریاست میسور پیش پیش تھی۔ اس ریاست کے علاوہ مراٹھے بھی انگریزوں کے خلاف تھے۔ انگریزوں کو ان لوگوں کے خلاف جنگ کے لیے مقامی مالی اور افرادی مدد کی ضرورت تھی اس کام کے لیے انھوں نے 1798ء میں ریاست حیدرآباد کے ساتھ ایک معاہدہ کیا۔ اس معاہدے کی رو سے یہ ریاست جنگ کی صورت میں انگریزوں کی مالی اور افرادی مدد کی پابند تھی۔ اس کام کو بہتر انداز سے کرنے کے لیے 1803ء میں انگریزوں نے حیدرآباد میں اپنی چھاؤنی بھی بنائی۔ اسے بالواسطہ حکمرانی کا ایک طریقہ بھی کہا جا سکتا ہے ۔

تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ جب انگریزوں نے ریاست میسور کو فتح کیا تو اُس کے بعد انھوں نے مراٹھوں کے خلاف کارروائی کر کے اُن کے علاقوں پر بھی قبضہ کیا، اس دوران ریاست حیدرآباد نے بالکل خاموشی اختیار کی۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ریاست حیدرآباد، انگریزوں کی ایک وفادار ریاست تھی اور والیانِ ریاست نے اپنی ریاست کو بچانے کے لیے انگریزوں سے دوستی کو ترجیح دی اور انھیں اپنے علاقے میں

فوجی چھاؤنیاں بنانے کی بھی اجازت دی۔ انگریزوں نے بھی ریاست سے وفاداروں جیسا سلوک کیا۔

میرے خیال میں اگر ریاست حیدرآباد اُس وقت انگریزوں کے خلاف کھڑی ہو جاتی اور مقامی ریاستیں بھی ان کا ساتھ دیتیں تو انگریز کبھی بھی دکن میں اپنے قدم نہ جما پاتے۔ جب انگریزوں نے ٹیپو سلطان کو شکست دی اور مقامی مراٹھوں کا بھی خاتمہ کر دیا تو پھر ان کے لیے دلی کو فتح کرنا مشکل نہ رہا۔ اس طرح ریاست حیدرآباد سے متعلق میں کہہ سکتا ہوں کہ یہ اُن ریاستوں میں سے ایک ہے جنھوں نے انگریزوں کو دلی فتح کرنے میں مدد دی۔

یاد رہے اُس وقت انگریز طاقت میں ریاست حیدرآباد کے مقابلے میں کہیں کم تھے۔ پھر کیا وجہ ہوئی کہ ریاست نے مزاحمت کی بجائے مفاہمت کا راستہ اختیار کیا؟ شاید اس کی وجہ صرف مقامی ریاستوں سے اپنی ریاست کو بچانے کی حکمت عملی ہو۔ ان کی اپنی ریاست تو بچ گئی لیکن ہندوستان ایک غیر قوم کا غلام ہو گیا۔

حیدرآباد ریاست کے متعلق مزید جاننے کے لیے درج ذیل کتابیں بے حد مفید ہیں۔ میں نے بھی انھی سے استفادہ کیا ہے۔

کیرن اساکسین لیونارڈ کی کتاب [25]

Social History of an Indian Caste: The Kayasths of Hyderabad

[25] https://books.google.com.pk/books?id=32aMey7k-IYC&dq=hyderabad+state+history&source=gbs_navlinks_s

اریک لیوس بیویرلی کی کتاب[26]

Hyderabad, British India, and the World

اور عبدالغفور عبدالمجید نورانی کی کتاب[27]

The Destruction of Hyderabad

یہ تمام کتابیں نیٹ پر موجود ہیں۔ تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے لوگوں کے ریاست حیدرآباد کی تاریخ کا ضرور مطالعہ کرنا چاہیے۔

جیسا کہ پچھلے صفحات میں ذکر ہو چکا ہے کہ دکن کے علاقے میں چودہویں صدی سے ہی مسلمان ریاستیں قائم تھیں جن میں ایک ریاست گولکنڈہ بھی تھی۔ گولکنڈہ کے والی محمد علی قطب نے 1591ء میں حیدرآباد شہر کی بنیاد رکھی۔ریاست حیدرآباد کے حکمرانوں نے اس علاقے میں شاندار کارنامے سرانجام دیے۔ ایک وقت تھا کہ یہ ریاست ہندوستان کی سب سے امیر ریاست تھی۔ اس کی سرکاری زبان اردو تھی۔ یہاں پر ایک بہت بڑا آصفیہ کتب خانہ بھی بنایا گیا۔ ابھی بھی کسی کو اردو سے متعلق کچھ جاننا ہو تو فرہنگِ آصفیہ ہی سے مدد لی جاتی ہے۔ اس ریاست نے ہندوستان کی پہلی ایئر لائن؛ دکن ایئر لائن کی بنیاد رکھی جو ہندوستان کی سب سے پرانی ایئر لائن ہے۔ایک وقت تھا کہ ریاست کے آخری حکمران میر عثمان علی دنیا کے امیر ترین شخص تھے۔اس ریاست نے 1880ء میں نے اپنی ریلوے سروس شروع کر دی تھی۔ ہندوستان میں پہلی

---

26 https://books.google.com.pk/books?id=qw3UBwAAQBAJ&dq=hyderabad+state+history&source=gbs_navlinks_s

27 https://books.google.com.pk/books?id=FzyKngEACAAJ&dq=hyderabad+state+history&hl=en&sa=X&ved=2ahUKEwiF9bXZiefyAhWfQUEAHeEuCV8Q6AEwAXoECAIQAg

مرتبہ انھوں نے اسٹیٹ بینک آف حیدرآباد کا تصور بھی دیا۔ اس کے علاوہ بے شمار، سکول اور ہسپتال بھی بنائے۔

یہ سب دیکھتے ہوئے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ ریاست حیدرآباد وہ ریاست تھی جہاں سب سے زیادہ ترقی ہوئی اور لوگوں کے لیے بے حد سہولتیں بھی پیدا کی گئیں۔ سیلاب کی روک تھام کے لیے دو بڑی جھیلیں بھی بنائیں گئیں۔ اس علاقے میں مسلمان اقلیت میں تھے اس کے باوجود انھوں نے سوا دو سو سال تک اس علاقے پر بلا شرکتِ غیرِ حکومت کی۔ نظام حیدرآباد کی بہترین کارکردگی کی بنیاد پر حکمرانوں کو کسی طرح کی عوامی مخالفت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے وقت کے حکمران، یعنی انگریزوں کے ساتھ بھی اپنے تعلقات بنا کر رکھے اور وہ انگریزوں کے وفادار بھی تھے اور ان کی ہندوستان میں حکومت قائم رکھنے میں مددگار بھی تھے۔اس طرح انھیں دو طرفہ مدد حاصل تھی جس کی وجہ سے انھوں نے علاقے میں قابل ذکر ترقیاتی کام کیے۔

عثمانیہ میڈیکل کالج اور عثمانیہ یونیورسٹی کے ذکر کے بغیر ریاست حیدرآباد کی بات مکمل نہیں ہوتی۔ ریاست حیدرآباد کے پانچویں حکمران افضل الدولہ نے 1846ء میں حیدرآباد میڈیکل کالج کی بنیاد رکھی۔ یہ اس علاقے کا سب سے پہلا میڈیکل کالج تھا۔ آخری حکمران میر عثمان علی خان کے دور میں عثمانیہ یونیورسٹی کا قیام عمل میں لایا گیا جس میں ذریعہ تعلیم اردو تھا۔ یہ ہندوستان کی پہلی یونیورسٹی تھی جس کا ذریعہ تعلیم اردو تھا۔ایم ایس سی، ایم بی بی ایس وغیرہ تمام مضامین اردو میں پڑھائے جاتے تھے۔ ان دو کاموں نے ریاست حیدرآباد کو ایک نمایاں مقام دلانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

اس سب کے باوجود تاریخ میں یہ بھی لکھا ہے کہ جب ٹیپو سلطان کو شہید کیا جارہا تھا اسوقت اس ریاست کے حکمران انگریزوں کے ایک وفادار غلام کا کردار ادا کر رہے تھے اور اسے ہر طرح کی مدد فراہم کر رہے تھے۔ ہندوستان کو ایک غلام ملک بنانے

میں ریاست حیدرآباد کا ایک اہم کردار ہے۔ لوگ اس بارے میں کیا سوچتے ہیں، اس کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ جب ریاست تلنگانہ کا سرکاری دن منایا گیا اس میں سلطان ٹیپو کا مجسمہ تو موجود تھا۔۔۔ کسی میر اور نظام کا نہیں تھا۔۔۔

اب بھی لوگ اسے ہی یاد رکھتے ہیں جس نے انھیں آزادی دلوانے کی کوشش میں اپنی جان بھی قربان کردی!

Char Minar Hyderabd Photo Credit: https://blog.pathik.co

Golconda fort Photo Credit: https://blog.pathik.co

The Chaumahalla Palace, located near the Charminar,
Photo Credit: https://blog.pathik.co

Royal Darbar Hall of Nizams in Khilwat Shareef in Hyderabad

Photo Credit: https://www.youtube.com

Usmani Medical college established in 1846 and named the Hyderabad Medical School, during the reign of the 5th Nizam of Hyderabad - Afzal ad-Dawlah, Asaf Jah V.
Photo Credit: https://www.jagranjosh.com

تلنگانہ: جہاں اردو دوسری سرکاری زبان ہے

رات بہت زیادہ گزر چکی تھی اور میں کچھ نیند بھی پوری کر چکا تھا۔ ایک تو سفر میں مجھے نیند بھی کم آتی ہے اور دوسرا سیاحت کا شوق بھی مجھے سونے نہیں دیتا۔ اس لیے ایک ہزار سال پرانے شہر کو دیکھنے کے لیے کھڑکی کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس شہر میں کئی صدیاں پرانا ایک قلعہ ہے یہاں پر ایک لارڈ نراسیما سوامی کا مندر بھی ہے جو اس شہر کی اصل پہچان ہے۔ مسلمانوں کی آبادی پانچ فیصد کے قریب ہے۔

دہلی سے نکلنے اور ہریانہ اسٹیٹ سے گزرنے کے بعد ہم اتر پردیش، مدھیہ پردیش، مہاراشٹرا اور اب ہم آندھرا پردیش سے گزر رہے تھے۔ اگر آپ نقشے میں دیکھیں تو آپ کو معلوم ہو گا کہ ہم شمالی بھارت سے شروع ہو کر اس کے مشرقی حصے کی طرف سے ہوتے ہوئے جنوب کی طرف جا رہے تھے۔ ہماری منزل چنائی تھی جو بھارت

کے جنوب مشرق میں واقع ہے۔ یہاں اکثریت کی زبان تلگو ہے۔ یاد رہے جب 1999ء میں ہم یہاں سے گزر رہے تھے تو تلنگانہ نام کی کوئی ریاست موجود نہیں تھی۔ تلنگانہ اسٹیٹ 2014ء میں معرضِ وجود میں آئی، اُس وقت یہ علاقہ آندھرا پردیش کا حصہ تھا۔

اب جب میں نے یہ سفر نامہ لکھنا شروع کیا تو مجھے معلوم ہوا کہ خمام، تلنگانہ اسٹیٹ کا ایک بڑا شہر ہے اور یہ ریاست مختلف ریاستوں کے حصوں کو ملا کر زبان کی بنیاد پر بنائی گئی ہے۔ مجھے اس کی تاریخ جاننے میں دلچسپی پیدا ہوئی اور میں نے جو کچھ جانا وہ پیش خدمت ہے۔

تقسیم ہند کے بعد ہندوستان میں واقع ریاستوں کو یہ حق دیا گیا کہ وہ پاکستان یا بھارت، کسی کے ساتھ بھی مل سکتے ہیں اور اگر وہ آزاد رہنا چاہیے تب بھی انھیں اس بات کی اجازت ہو گی۔ اس سب کی تفصیل میں پچھلے صفحات میں آپ کے سامنے پیش کر چکا ہوں۔

تقسیم ہند کے کچھ عرصہ بعد ایک اور واقعہ پیش آیا۔ بھارت اور پاکستان کے مختلف علاقوں میں لوگوں نے زبان کی بنیاد پر نئے صوبے یا اسٹیٹ بنانے کا مطالبہ شروع کر دیا۔ انگریزوں نے جو صوبے بنائے تھے وہ زبان کی بنیاد پر نہیں بلکہ ایک انتظامی ضرورت کے تحت بنائے تھے۔ مثال کے طور پر جب صوبہ سرحد بنایا گیا تو ہزارہ کو صوبہ سرحد کا حصہ بنایا گیا جبکہ پختون آبادی کا ایک بہت بڑا حصہ بلوچستان کے ساتھ جوڑا گیا۔ پھر ایک وقت آتا ہے جب پختون آبادی نے زبان کی بنیاد پر ایک صوبے کا مطالبہ کیا۔ اسی طرح سے بلوچستان میں بھی زبان کی بنیاد پر ایک صوبے کا مطالبہ کیا گیا۔ ایک مثال سرائیکی صوبے کی بھی ہے جس کا مطالبہ سرائیکی بولنے والوں نے کیا۔ اُس دوران بھارت کے مختلف علاقوں میں بھی اسی طرح کے مطالبات نے سر اٹھانا شروع کر دیا۔ جنوب میں تیلگو

بولنے والے لوگوں نے بھی مطالبہ شروع کیا کہ تیلگو زبان بولنے والے علاقوں پر مشتمل ایک اسٹیٹ بنائی جائے۔ اُس وقت کی سیاسی قیادت نے اِن مطالبات کو رد کر دیا اور اِس کی وجہ یہ بیان کی کہ اگر زبان کی بنیاد پر علاقوں کی تقسیم کی گئی تو لوگوں کی ملک سے زیادہ اپنے علاقے سے وفاداری ہوگی اور اس طرح مرکز کمزور ہو جائے گا۔ اس کے باوجود زبان کی بنیاد پر صوبہ بنانے کی کئی تحریکیں شروع ہوئیں۔ نتیجتاً کچھ تحریکیں کامیاب ہوئیں اور کچھ ناکام۔ اگر میں یہ کہوں کہ بنگلہ دیش بنانے کے مطالبے کے پیچھے جہاں اور بہت سارے عوامل تھے وہاں پر بنگالی زبان بھی ایک بڑا سبب تھا تو غلط نہ ہوگا۔

تلنگانہ اسٹیٹ بھی اسی طرح ایک تحریک کا نتیجہ ہے۔ یہ تحریک انتہائی دلچسپ ہے۔ اس کا مختصر ذکر نا صرف آپ کی معلومات میں اضافہ کرے گا بلکہ تلنگانہ اسٹیٹ کو سمجھنے میں مدد بھی دے گا۔

ریاست حیدرآباد کے بہت سے علاقوں اور آندھرا پردیش کے شمال مغربی حصے کو ملا کر تلنگانہ اسٹیٹ بنائی گئی۔ اس کا رقبہ ایک لاکھ بارہ ہزار کلومیٹر سے زائد ہے اور اس کی آبادی ساڑھے تین کروڑ ہے۔ اس کا صدر مقام حیدرآباد ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے حیدرآباد آندھرا پردیش کا بھی صدر مقام ہے۔ میرے علم کے مطابق چندی گڑھ جہاں پنجاب اور ہریانہ کے دفاتر ہیں، کے بعد حیدرآباد وہ دوسرا شہر ہے جہاں دو اسٹیٹس یعنی تلنگانہ اور آندھرا پردیش کے صوبائی دفاتر ہیں۔ یہ ایک عارضی بندوبست تھا جس کے تحت آندھرا پردیش نے اگلے دس سال کے عرصہ میں اپنا صدر مقام یہاں سے منتقل کرنا تھا۔ اس کے بڑے شہروں میں حیدرآباد، نظام آباد، کریم نگر اور وارنگل شامل ہیں۔ اس کے شمال میں مہاراشٹرا، شمال مشرق میں آندھرا پردیش، مشرق میں چھتیس گڑھ اور جنوب میں کرناٹک واقع ہیں۔ اس علاقے میں اٹھائیس ہزار مربع کلومیٹر پر پھیلے ہوئے ہزاروں سال پرانے گھنے جنگلات بھی ہیں۔

یہ بات بھی دلچسپ ہے کہ ہمارے ایک کرکٹر کی بیوی ثانیہ مرزا کا تعلق بھی اسی علاقے سے ہے۔ آپ نے اسدالدین اویسی صاحب کا نام تو سنا ہوگا جو آل انڈیا مجلس اتحاد المسلمین کے صدر اور چار مرتبہ لوک سبھا کے رکن منتخب ہوئے ہیں، اُن کا تعلق بھی اِسی اسٹیٹ سے ہے۔ مسلمانوں کی ایک واضح اکثریت کی زبان اردو ہے۔ حال ہی میں اردو کو تلنگانہ کی دوسری سرکاری زبان قرار دیا گیا ہے۔ جس سے مسلمان تو خوش ہیں لیکن دوسرے بے حد ناراض ہیں۔ تقسیم ہند سے پہلے ذریعہ تعلیم اردو تھا جواب بدل دیا گیا ہے۔

موجودہ تلنگانہ کے علاقے پر مقامی لوگوں کے علاوہ سلاطین دہلی اور مغل حکمرانوں نے بھی حکومت کی۔ 1948ء میں ریاست حیدرآباد کا بھارت سے الحاق ہو گیا لیکن یہ مکمل طور پر بھارت کا حصہ نہیں تھی۔ 1956ء میں ایک فوجی آپریشن کے ذریعے حیدرآباد کی ریاستی حیثیت ختم کر دی گئی اور اسے بھارت میں ضم کر دیا گیا اردو جو کہ اس ریاست کی سرکاری زبان تھی، کو ختم کر دیا گیا۔ پاکستان میں بھی ایسا ہی کیا گیا۔ شروع میں پاکستانی علاقے میں موجود ریاستوں بہاولپور، چترال، ہنزا، دیر وغیرہ نے پاکستان کے ساتھ الحاق کیا اور پھر بھٹو دور میں انھیں پاکستان کا حصہ بنا دیا گیا۔ ریاست حیدرآباد کے تیلگو بولنے والے علاقے کو آندھرا پردیش کا حصہ بنا دیا گیا لیکن اس پر تیلگو بولنے والے خوش نہ تھے۔ انھوں نے مطالبہ کیا کہ تیلگو بولنے والے علاقے پر مشتمل ایک الگ اسٹیٹ بنائی جائے۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے ایک تحریک شروع کی۔ یہ تحریک 1950ء میں شروع ہوئی اور 2014ء میں تقریباً ساٹھ سال کی مسلسل جدوجہد کے بعد یہ مطالبہ منظور کر لیا گیا اور تیلگو بولنے والے علاقے پر مشتمل تلنگانہ نامی ایک الگ اسٹیٹ بنا دی گئی۔ یہ بہت طویل جدوجہد تھی۔ جسے کسان تحریک کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔

ایک بھوک ہڑتال جس نے تلنگانہ اسٹیٹ کی بنیاد رکھی

تلنگانہ اسٹیٹ کے پہلے چیف منسٹر چندرا شیکھر راؤ نے ایک مرتبہ اپنے مطالبات کے حق میں طویل بھوک ہڑتال کی جس کے نتیجے میں تلنگانہ تحریک میں بہت زیادہ جوش پیدا ہو گیا اور بھارتی حکومت کو اُن کے مطالبات کے سامنے سر جھکانا پڑا۔ کہا جاتا ہے کہ اس بھوک ہڑتال نے بھارت کے نقشے کو تبدیل کر دیا اور ایک نئی اسٹیٹ معرض وجود میں آئی۔

مجھے اس تحریک میں جس بات نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ اس کا سات دہائیوں تک چلتے رہنا ہے۔ اس دوران بے شمار لوگوں نے اس کی قیادت کی۔ بے حد مشکل مراحل بھی آئے لیکن انھوں نے کبھی بھی جنگی طریقہ کار اختیار نہ کیا اور نہ ہی طاقت کے زور پر قانون اپنے ہاتھ میں لیا بلکہ سیاسی انداز میں تمام تر جدو جہد کی اور پھر وہ کامیاب بھی ہوئے۔ اس بھوک ہڑتال کے بارے میں ٹائمز آف انڈیا نے ایک مضمون شائع کیا ہے جس میں اس ہڑتال کے بارے میں کافی دلچسپ معلومات درج ہیں[28]۔

میرے مطابق سیاسی انداز سے چلائی جانے والی تحریک کبھی نہ کبھی ضرور کامیاب ہو جاتی ہے لیکن جو تحریک فوجداری طریقے پر چلائی جائے اس کی کامیابی کے امکانات بہت کم ہوتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ فوجی انداز سے چلائی جانے والی تحریک کبھی کامیاب نہیں ہوتیں، ایسی تحریک جو طاقت کے زور پر چلائی جائے وہ اسی وقت کامیاب ہوتی ہے جب اس کے ساتھ ایک سیاسی طاقت بھی ہو۔ اگر سیاسی تحریک عوام کی ایک واضح اکثریت کو ساتھ لے کر چلے تو اس کی کامیابی کے امکانات بہت زیادہ ہوتے ہیں۔

[28]https://timesofindia.indiatimes.com/city/hyderabad/talengana-remembers-day-kcr-went-on-hunger-strike-to-roll-t-juggernaut/articleshow/61858910.cms

میرے سب ساتھی سو رہے تھے۔ میری خواہش تھی کہ میں بارہ بجے تک تو ضرور جاگوں۔ ہماری ٹرین کا اگلا سٹاپ وجیاوادہ (Vijyawada) تھا جو بہت ساری باتوں کی وجہ سے ایک منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ میں چاہتا تھا کہ کم از کم اس کے ریلوے سٹیشن کو تو ضرور دیکھوں اور جان سکوں کہ صدیوں پرانا یہ شہر کس طریقے سے دنیا کی امیدوں کا مرکز بن رہا ہے۔

میرے لیے یہ بات باعث حیرت تھی کہ ایک شہر جو بھارت کی راجدھانی سے ساڑھے سترہ سو کلومیٹر دور ہے میں ایسی کونسی بات ہے کہ آنے والے وقتوں میں اسے ایک اہم شہر قرار دیا جارہا ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ ہم بھارت میں جیسے جیسے شمال سے جنوب کی طرف جاتے ہیں شرح خواندگی میں اضافہ ہوتا جاتا ہے اور بالکل جنوب میں جا کر شرح خواندگی سو فیصد ہو جاتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جہاں انگریزوں نے پہلے قدم جمائے وہاں انھوں نے تعلیمی نظام کی بنیاد رکھی۔ یہ انھوں نے اپنی ضرورت کی خاطر کیا یا بغیر ضرورت کے ،اس سے عام لوگوں کو بے حد فائدہ پہنچا۔ یہی وجہ ہے کہ بھارت کے جنوب میں شرح خواندگی شمال سے کہیں زیادہ ہے۔

ہماری ٹرین کا وجیاوادہ میں پانچ منٹ کا سٹاپ تھا اس لیے مجھے نیچے اتر کر پلیٹ فارم کو دیکھنے کا بھی موقع مل گیا۔ میں اکثر اوقات تنہا سیاحت پسند کرتا ہوں، ایسا نہ جانے کیوں ہے، مگر ہے۔ اس وقت جب سب سو رہے ہوں تو ایسی صورت میں تنہا سیاحت کا اس سے زیادہ اچھا موقع کہاں مل سکتا ہے؟ موقع غنیمت جانتے ہوئے میں پلیٹ فارم پر اترا اور پھر جو کچھ میں نے دیکھا وہ پیش خدمت ہے۔

میں بارہا اس بات کا تذکرہ کر چکا ہوں کہ میرا مقصد تاریخ بیان کرنا نہیں بلکہ میں چاہتا ہوں کہ مجھے جن مقامات کو دیکھنے کا موقع ملے ان کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات لوگوں تک پہنچائی جائیں۔ اس سے نا صرف لوگوں کی معلومات میں

اضافہ ہوگا بلکہ اُن علاقوں کو دیکھنے کا شوق بھی پیدا ہوگا۔ جو کچھ ہم سیاحت سے سیکھ سکتے ہیں وہ کسی اور ذریعے سے سیکھنا ممکن نہیں ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ میرا دوسرا مقصد لوگوں کے تجربات اور کام آپ کے سامنے رکھنا ہے تاکہ ہم ان سے بہت کچھ سیکھ سکیں۔ زندگی نام ہی سیکھنے اور سکھانے کا ہے ۔ سیکھنے اور سکھانے کا عمل ہی کسی فرد، معاشرے، ملک، غرضیکہ پوری انسانیت کی ترقی کا ضامن ہے۔ اس عمل کے بغیر ترقی ممکن نہیں ہے۔

Lambadi (Banjari) women in festive dress, near Hyderabad, Telangana, India. Photo Credit:John Isaac

Golconda Fort Mosque

Photo Credit: https://indianwanderers.wordpress.com

وجیاوادہ: گلوبل سٹی آف فیوچر

آندھرا پردیش بھارت کی ایک اہم ریاست ہے وجیاوادہ اس کا معاشرتی اور معاشی کیپیٹل مانا جاتا ہے۔آبادی کے لحاظ سے وجیاوادہ آندھرا پردیش کا دوسرا بڑا شہر ہے۔ ہندوؤں کا ایک بہت ہی قدیمی گرگاکانکا مندر بھی اس شہر میں واقع ہے۔اس مندر کو دیکھنے کے لیے دنیا بھر سے لاکھوں کی تعداد میں ہندو آتے ہیں۔ وجیاوادہ کا شمار بھارت کے سب سے گنجان آباد علاقوں میں ہوتا ہے۔آکسفورڈ اکنامکس کی رپورٹ کے مطابق یہ شہر بھارت کے ان شہروں میں شامل ہے جو معاشی طور پر تیز رفتاری سے ترقی کر رہے ہیں۔ بھارت میں ہر سال مختلف شہروں میں موجود مختلف سہولتوں کی بنیاد پر ایک فہرست

مرتب کی جاتی ہے جس کے مطابق یہ اعلان کیا جاتا ہے کہ رہائش کے لیے سب سے زیادہ موزوں شہر کونسا ہے؟ اس فہرست میں وجیاوادہ کا نواں نمبر ہے۔

وجیاوادہ کا ریلوے سٹیشن بھارت کا چوتھا بڑا اسٹیشن ہے۔ یہ ریلوے سٹیشن 1888ء میں بنایا گیا اور 1889ء میں اسے ریاست حیدر آباد کے ریلوے نظام سے جوڑا گیا۔ اس ریلوے سٹیشن سے روزانہ ڈیڑھ لاکھ مسافر مستفید ہوتے ہیں۔

آپ میں سے اکثر لوگ انٹر نیشنل سٹینڈرڈ ارگنائزیشن (ISO) کے نام سے تو واقف ہوں گے۔ یہ پوری دنیا میں پھیلا ہوا ایک نظام ہے جس کے تحت مختلف اداروں اور شہروں کو سرٹیفائیڈ کیا جاتا ہے۔ اور اس کام کے لیے مختلف پیرامیٹرز منتخب کیے جاتے ہیں۔ ایک بہت بڑی کمپنی Data City of Council Word اس کام کے لیے بہت معروف ہے۔ یہ کمپنی دنیا کے مختلف شہروں کو ان میں مہیا کی جانے والے عوامی خدمات کی بنیاد پر سرٹیفیکیٹ دیتی ہیں جو اس بات کو ظاہر کرتے ہیں کہ شہری انتطامیہ لوگوں کو کس طرح کی سہولیات مہیا کرتی ہیں۔ اب تک یہ کمپنی دنیا میں 145 شہروں کو ایسے سرٹیفیکیٹ جاری کر چکی ہے۔ ان میں سعودی عرب کے دو، اردن کا ایک شہر اور دبئ بھی شامل ہیں۔ ان کے علاوہ اس میں کسی مسلمان ملک کا کوئی بھی شہر شامل نہیں ہے جبکہ بھارت کے سات شہر اس فہرست میں شامل ہیں جن میں وجیاوادہ بھی شامل ہے۔ اس چھوٹے سے شہر کے لیے یہ ایک بہت بڑا اعزاز ہے اور اسی لیے کہا جا رہا ہے کہ آنے والے دنوں میں ٹیکنالوجی کے اعتبار سے وجیاوادہ ایک بہت ہی اہم شہر ہوگا۔

وجیاوادہ شہر کی بنیاد ساتویں صدی کے شروع میں رکھی گئ تھی۔ اس دور میں یہاں بہت سی درسگاہیں تھیں جہاں ہندو مذہب کی تعلیم دی جاتی تھی۔ تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ایک ہزار سال قبل لوگ یہاں پر چین سے علم حاصل کرنے آتے تھے۔ جن میں زیادہ تر بدھ مت کے پیروکار ہوتے تھے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ علاقہ زمانہ

قدیم سے علمی میدان میں ایک خاص مقام رکھتا ہے۔اس بات کا ذکر دی ھند واخبار میں شائع ہونے والے ایک مضمون میں کیا گیا ہے۔ جس کا عنوان ہے، Xuan Zang stayed in Vijayawada to study Buddhist scriptures

یہ مضمون بھی پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے[29]۔

یہاں پر ہندوآبادی اسی فیصد سے زائد ہے جو تیلگو زبان بولتے ہیں۔ مسلمانوں کی تعداد تقریباً دس فیصد ہے اور اُن کی اکثریت اردو بولتی ہے۔

میرے لیے یہ ایک انتہائی دلچسپ بات تھی جب مجھے پتہ چلا کہ بھارت میں سالانہ کی بنیاد پر بڑے شہروں کے جی ڈی پی کا اندازہ لگایا جاتا ہے۔اس اندازے کے مطابق 2010ء میں وجیاوادہ کا جی ڈی پی تین بلین ڈالر تھا اور 2025ء میں یہ 17 بلین ڈالر کا ہو گا۔ یاد رہے کہ پاکستان کا جی ڈی پی تین سو بلین ڈالر کے قریب ہے۔ اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ وجیاوادہ معاشی لحاظ سے بھارت کا کتنا اہم شہر ہے۔

[29] https://www.thehindu.com/news/national/Xuan-Zang-stayed-in-Vijayawada-to-study-Buddhist-scriptures/article16091816.ece

Vijayawada: Photo Credit:
https://vijayawada.tourismindia.co.in

India’s First Hyperloop Line To Connect Amaravati And Vijayawada

تینالی: کھدر اسماعیل اور ہاجرہ اسماعیل کا شہر

رات کافی بیت چکی تھی، سب لوگ سو رہے تھے اور میری جاگنے کی ہمت بھی ختم ہو چکی تھی۔ مجھے افسوس ہو رہا تھا کہ میں تینالی شہر نہیں دیکھ سکوں گا جہاں کھدر اسماعیل نامی شخص نے اپنی بیوی ہاجرہ کے ساتھ مل کر آزادیِ ہند میں اہم کردار ادا کیا۔

تینالی علاقہ میں دوسری صدی سے لوگ آباد چلے آرہے ہیں۔ بیسویں صدی کے آغاز پر اسے باقاعدہ ایک شہر کا درجہ دے دیا گیا۔ اس شہر کی خوبصورتی اور شہری سہولیات کی بناء پر اسے آندھرا پردیش کا پیرس بھی کہا جاتا ہے۔ جب بھی ہم پاکستان میں کسی شہر کی خوبصورتی کا ذکر کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم اسے پیرس بنا دیں گے۔ میرے

مطابق پیرس سے بھی زیادہ خوبصورت شہر دنیا میں موجود ہیں لیکن اب پیرس خوبصورتی کا ایک سمبل بن گیا۔ اس شہر میں پچاسی فیصد کے قریب ہندو اور چودہ فیصد کے قریب مسلمان آباد ہیں۔ میں نے اب تک جو دیکھا، اس کے مطابق جہاں بھی مسلمان ہوتے ہیں ان میں زیادہ تر کی زبان اردو ہوتی ہے۔ اس شہر میں مسلمانوں کا وجود اس علاقے میں قائم مختلف مسلمان ریاستوں کی وجہ سے ہے جن کا ذکر میں نے پچھلے صفحات میں کیا ہے جیسے بہمانی، قطب شاہی اور مغل سطنت کے ساتھ ساتھ حیدرآباد ریاست۔

تینالی کی مختلف تصاویر دیکھنے سے مجھے لگتا ہے کہ اسے واقعی پیرس کہنا چاہیے۔ خوبصورت محل وقوع اور آرٹ کی دنیا میں اس کا اپنا ہی ایک مقام ہے۔ شہر کی تاریخ پڑھنے سے مجھے اندازہ ہوا کہ یہاں مسلمانوں کا سیاسی معاملات میں عمل دخل بھی قابل ذکر ہے۔

تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں مسلم لیگ کا دفتر بھی قائم تھا اور مسلمان سیاسی میدان میں بھی بہت متحرک تھے۔

کبھی کبھی میرے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مسلم لیگ پورے ہندوستان میں مسلمانوں کی واحد نمائندہ سیاسی جماعت تھی۔ صرف مسلمان ہی اس کے ممبر تھے جبکہ اس کے مقابلہ میں کانگرس میں شریک ہونے کے لیے کوئی مذہبی پابندی نہیں تھی۔ جس کے دفاتر ہندوستان کے تمام چھوٹے بڑے شہروں میں قائم تھے اور ان کے کارکنان اپنے سیاسی قائدین کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے ہندوستان کی آزادی میں بھی اپنا کردار ادا کر رہے تھے۔ ایسے شہروں کے رہنے والے لوگوں کو، جو موجودہ پاکستان سے ہزاروں میل کے فاصلے پر واقع تھے مکمل طور پر اس بات کا اندازہ تھا کہ ان کے علاقے کبھی بھی پاکستان کا حصہ نہیں بنیں گے اور صرف مسلمان اکثریت والے علاقے علیحدہ ہو جائیں گے جبکہ وہ ایک ایسے ملک کا حصہ ہوں گے جہاں پر وہ اقلیت میں شمار کیے جائیں

گئے۔ اس کے باوجود انھوں نے مسلم لیگ کا ساتھ دیا۔ پاکستان کو معرض وجود میں لانے کے لیے ان کے کردار سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ انھوں نے ایسا کیوں کیا؟ میں مدت سے اس کا جواب ڈھونڈ رہا ہوں۔ آپ بھی میری مدد کریں۔

اس شہر میں محمد اسماعیل صاحب رہتے تھے۔ انھوں نے اپنی اہلیہ ہاجرہ اسماعیل کے ساتھ مل کر مسلم لیگ کی بجائے کانگریس میں شمولیت اختیار کی اور وہ دونوں مہاتما گاندھی کے بہت پکے اور سچے پیروکار بن گئے۔ اس بات کا ثبوت اس سے ملتا ہے کہ اس علاقے میں سب سے پہلے کھڈی پر بنائے گئے کھدر کی دکان اسماعیل صاحب نے شروع کی۔ یاد رہے کھڈی اور کھدر کی تحریک مہاتما گاندھی نے شروع کی تھی۔ کھدر کی دکان کی وجہ سے اسماعیل صاحب کا نام کھدر اسماعیل ہو گیا۔ تقسیم ہند کے فوراً بعد اسماعیل صاحب کا انتقال ہو گیا لیکن ان کی اہلیہ نے ان کے کاروبار کو جاری رکھا جو بعد میں ان کے بچوں نے سنبھالا۔ ہاجرہ بی بی کی ایک خوبصورت گفتگو نے میری نظروں میں ہاجرہ بی بی اور ان کے خاوند کے احترام میں بے حد اضافہ کر دیا، یقیناً یہ بات آپ کو بھی بہت بھلی لگے گی۔

تقسیم ہند کے بعد بھارتی حکومت نے اُن لوگوں کو زمینیں دینا شروع کیں جنھوں نے آزادی ہند کی تحریک میں بہت کام کیا اور اس تحریک کے دوران وہ بارہا جیلوں میں بھی گئے، جس سے اُن کا بہت زیادہ مالی نقصان بھی ہوا۔ جب بھارتی حکام ہاجرہ بی بی کے پاس آئے اور ان سے کہا کہ ہم آپ اور آپ کے خاوند کی خدمات کے بدلے آپ کو کچھ زمین دینا چاہتے ہیں۔ اس پر ہاجرہ بی بی نے کہا کہ میں نے اور میرے خاوند نے جو بھی خدمت کی اس کا معاوضہ زمین نہیں ہو سکتی۔ اس لیے میں یہ زمین نہیں لوں گی۔ میرے پاس جو کچھ ہے میں اسی میں اپنی زندگی گزاروں گی۔ انھوں نے مزید کہا کہ میں نے اور میرے خاوند نے جو کام کیا اس کا صحیح معاوضہ ہمیں ہندوستان کی آزادی کی شکل میں مل چکا ہے، اس سے بڑھ کر کوئی اور معاوضہ نہیں ہو سکتا ہے اور نہ میں لینے کو تیار ہوں۔

ہاجرہ بی بی کے اس مکالمے نے میری نظروں میں ان کی عزت و عظمت کو بہت بڑھا دیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جب انھوں نے کانگریس میں شمولیت اختیار کی تو بہت سارے مقامی مسلمانوں نے اس بات کا بُرا منایا اور ان کے لیے کئی مشکلات بھی کھڑی کیں ۔انھوں نے جسے مناسب سمجھا اسے زندگی بھر سینے سے لگا کر اس کے لیے اخلاص کے ساتھ کام کیا اور اس کے لیے اس دنیا میں کسی بھی طرح کا معاوضہ قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ آزادی کے ہیرو ایسے بھی ہوتے ہیں۔

میں نے یہ تمام معلومات سید نصیر احمد کی کتاب

THE ROLE OF MUSLIMS IN THE STRUGGLE FOR THE FREEDOM OF INDIA

سے لی ہیں۔ سید نصیر احمد صاحب سے میں نے رابطہ بھی کیا اور ان کی کتابوں کے بارے میں بات چیت ہوئی۔ ان کی اکثر کتابیں ہندوستان کی آزادی میں مسلمانوں کی قربانیوں کے بارے میں ہیں۔ انھوں نے زیادہ تر یہ کتابیں تیلگو زبان میں لکھی ہیں۔ انھوں نے یہ کتابیں مجھے سافٹ کاپی کی صورت میں بھی بجھوائیں۔ ایک ویبسائٹ جس کا لنک درج ذیل ہے۔ اس ویب پر بے شمار ایسی کتابیں موجود ہیں جن میں ان مسلمان رہنماؤں کا ذکر ہے جنہوں نے جنگِ آزادی میں ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔

https://heritagetimes.in/author/snahamed

Hajara Beebi Ismail : A Great women Freedom Fighter of India from Tenali of Guntur district in Andhra Pradesh.
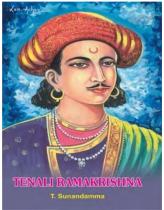
Tenali Rama) was an Indian poet, scholar, thinker and a special advisor in the court of Sri Krishnadevaraya who ruled from C.E. 1509 to 1529.[1

چیرالا؛ چھوٹا ممبئی اور دنیا کی بہترین ساڑھیوں کا مرکز

رات کا ایک بج رہا تھا, سب لوگ گہری نیند سو رہے تھے اور مجھے بھی نیند کی سخت ضرورت محسوس ہو رہی تھی لہٰذا میں نے بھی سونے کا ارادہ کر لیا لیکن سونے سے پہلے میں نے ریلوے ٹائم ٹیبل دیکھا تو مجھے معلوم ہوا کہ ہماری گاڑی تقریباً دو بجے کے

قریب چیرالا سے گزرے گی۔ اس شہر میں میری دلچسپی کی دو باتیں تھیں لیکن مجھ میں یہ ہمت نہ تھی کہ میں رات کو دو بجے اٹھ کر شہر کی بتیوں کا نظارہ کروں۔ دوسرا یہ کہ ہماری ٹرین کا یہاں سٹاپ بھی نہیں تھا۔ اِس لیے میں نے سونے میں ہی غنیمت جانی۔ یہاں دو چیزیں ایسی موجود ہیں جن کی وجہ سے یہ شہر مجھے اچھا لگا اور میں نے اس کا ایک مختصر تعارف آپ کی خدمت میں پیش کرنا ضروری سمجھا۔

اس شہر کو چھوٹا ممبئ کہا جاتا ہے اس شہر میں بہت بڑی تعداد میں ہاتھ سے چلنے والی کھڈیاں موجود ہیں جنھیں ہینڈ لومز بھی کہتے ہیں۔اس کے ساتھ ساتھ ٹیکسٹائل کی چھوٹی بڑی فیکٹریز بھی یہاں پر موجود ہیں۔ ان سب کی بنیاد پر اسے چھوٹا ممبئ کہنا بجا ہے۔ بالکل اسی طرح سے جیسے ہمارے ہاں فیصل آباد جو اپنی ٹیکسٹائل انڈسٹری کی وجہ سے پہچانا جاتا ہے کو ہم پاکستان کا مانچسٹر کہتے ہیں۔ مانچسٹر دنیا کے ان شہروں میں سے پہلا شہر ہے جہاں صنعتی دور شروع ہونے کے بعد ٹیکسٹائل انڈسٹری نے جنم لیا اور بڑی تیزی سے ترقی کی۔

ایک رپورٹ کے مطابق چیرالا میں اٹھارہ ہزار سے زائد ہینڈ لومز ہیں جو ایک بہت بڑی تعداد ہے۔ چیرالا کی بنی ہوئی ساڑھیاں پورے بھارت میں مشہور اور پسند کی جاتی ہیں۔ یہاں کا بنا ہوا دستی رومال بھی اپنی مثال آپ ہے۔اسے بنانے کے لیے ریشم کا استعمال کیا جاتا ہے اور اس پر ہاتھوں سے خوبصورت کڑھائی بھی کی جاتی ہے۔ اس کی نفاست دنیا بھر میں مشہور ہے۔ ٹیکسٹائل انڈسٹری کی وجہ سے چیرالا، علاقے کی صنعتی ترقی میں بہت اہم کردار ادا کر رہا ہے۔ میرا تعلق بھی ٹیکسٹائل انڈسٹری سے ہے جس وجہ سے مجھے یہ شہر اچھا لگا۔

محمد غوث بیگ: تحریکِ آزادی ہندوستان کا ایک ہیرو

تاریخ سے یہ پتہ چلا کہ اس شہر کے ایک امیر خاندان سے تعلق رکھنے والے محمد غوث بیگ صاحب نے بھی تحریک آزادی ہند میں بہت اہم کردار ادا کیا تھا۔ تحریک آزادی ہند میں شریک ہونے سے پہلے یہاں پر انگریزوں کے خلاف ایک تحریک چلائی گئی جس کا نام چیرالا پیرالا تحریک تھا۔ یہ دو قصبے تھے جنھیں انگریزوں نے اکٹھا کر دیا اور ایک بڑا شہر قرار دیتے ہوئے یہاں کے لوگوں پر ناقابلِ برداشت ٹیکسز لگا دیے گئے جو بہت ہی ظالمانہ تھے۔ اسی وجہ سے یہاں پر انگریزوں کے خلاف ایک تحریک چلائی گئی۔ محمد غوث بیگ اس تحریک کے ایک اہم رہنما تھے۔ بعد ازاں یہ تحریک، تحریک آزادی ہند کا حصہ بن گئی اور سب لوگ مہاتما گاندھی کے پیروکار بن گئے۔ محمد غوث نے بھی مہاتما گاندھی کے نظریہ کو اپنایا اور اس کے لیے بے حد جدوجہد کی۔ اس دوران انھیں اور ان کی اہلیہ کو بارہا جیل میں بھی ڈالا گیا۔ انگریزوں نے ان کی تمام تر جائیداد کو بھی قبضے میں لے لیا۔ ان سب کے باوجود بیگ صاحب نے اپنا کام جاری رکھا۔

آپ کو یاد ہوگا ایک مرتبہ 1930ء میں انگریزوں نے نمک پر بہت زیادہ ٹیکس لگا دیے جس کے خلاف مہاتما گاندھی نے چوبیس دن پر مشتمل ایک پیدل مارچ کیا تھا۔ مہاتما گاندھی نے اسی لوگوں کے ساتھ یہ مارچ شروع کیا وہ ہر روز دس میل سفر کرتے تھے اس طرح انھوں نے 240 میل کا سفر کرکے اس کا اختتام کیا۔ اسے ستیا گرا تحریک کہا جاتا ہے۔

محمد غوث بیگ اس تحریک کے ایک اہم رکن تھے۔ اُس وقت شہر میں مسلم لیگ کے دفاتر بھی موجود تھے لیکن بہت سارے مسلمان جن میں محمد غوث بیگ سب سے آگے تھے، کانگریس کی صفوں میں کھڑے تھے اور تقسیم ہند کے مخالف تھے۔ اس سے مجھے یہ محسوس ہوا کہ ان علاقوں میں مسلم لیگ کا وجود تو پایا جاتا تھا اور اس میں صرف

مسلمان ہی شامل ہوتے تھے لیکن اس کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد کانگریس میں بھی شامل تھی اور ان کے نظریات کا پرچار بھی کرتی تھی۔ محمد غوث بیگ نے ہندو مسلم بھائی چارے کا نعرہ بھی لگایا اور اس سلسلے میں بہت کام بھی کیا۔ تقسیم ہند کے بعد وہ کچھ عرصے تک اپنے شہر کی میونسپل کمیٹی کے چیئرمین بھی رہے لیکن انھوں نے بہت جلد وہ عہدہ چھوڑ دیا اور اپنی وفات یعنی 1976ء تک کا سارا وقت ہندو مسلم اتحاد کی کوششوں میں گزارا۔ ہندو مسلم اتحاد کی کوششوں اور تحریک آزادی ہندوستان کے ایک ہیرو ہونے کی وجہ سے علاقے میں رہنے والے ہندو اور مسلمان، دونوں اُن کی بہت قدر کرتے تھے۔ سید نصیر احمد نے ان کے بارے میں بھی لکھا ہے[30]۔

آزادی کے متوالوں کی تاریخ ضرور پڑھنا چاہیے۔ ان کا تعلق کسی بھی مذہب یا سیاسی جماعت سے ہو سکتا ہے لیکن ان کی جدوجہد تو آزادی کی خاطر تھی جس کا لطف آج میں اور آپ اٹھا رہے ہیں۔ ہمیں ان کا احسان مند ہونا چاہیے۔

چیرالا کی آبادی دو لاکھ کے قریب ہے اور یہاں مسلمانوں کی تعداد سات فیصد کے لگ بھگ ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ ریاست حیدرآباد اور دوسری دکنی ریاستوں کے مرکزی علاقوں سے دور مسلمانوں کی تعداد میں واضح کمی پائی جاتی ہے۔ اس کے باوجود شہر میں مساجد کی ایک معقول تعداد موجود ہے اور مسلمانوں کا علاقے کی سیاست میں بھی ایک اہم کردار ہے۔ اگر آپ نقشے میں دیکھیں تو یہ شہر بحر بنگال سے چند کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ جس کی وجہ سے اس علاقے میں کئی ساحلی مقامات ایسے ہیں جنھیں تفریح کے لیے بہت ترقی دی گئی ہے جو اس شہر کی وجہ شہرت بھی ہے۔

[30] https://heritagetimes.in/ghouse-baig/

Mohammad Ghouse Baig a Great Freedom Fighter who fought against the British: Photo Credit: https://heritagetimes.in

اونگول: جس کا نام بیل کی ایک نسل پر رکھا گیا

ایک دیہاتی ہونے کے ناطے مجھے ہمیشہ سے ہی جانوروں اور کھیتی باڑی میں دلچسپی رہی ہے۔ میں نے جب یہ پڑھا کہ اس علاقے میں ایک ایسا شہر آباد ہے جس کا نام بیلوں کی ایک بہت ہی خوبصورت نسل کے نام پر رکھا گیا ہے تو میری دلچسپی میں اضافہ ہو گیا۔ اس شہر کا نام اونگول ہے اور یہ آندھرا پردیش میں واقع ہے۔ یہاں ہماری ٹرین کا سٹاپ نہیں تھا اور ویسے بھی جب ہم اس شہر سے گزرے تو رات کے تین بج رہے تھے ابھی ہمارا سفر تین سو کلومیٹر سے بھی زائد باقی تھا اس لیے میں اس شہر کو تو نہ دیکھ سکا لیکن یہ جان کر مجھے بے حد خوشی ہوئی کہ اس علاقے کے مقامی لوگوں نے صدیوں قبل ایک ایسے بیل کی نسل کو پروان چڑھایا جو دنیا کے کئی ممالک کو برآمد بھی کیا گیا اور اپنی خوبصورتی کے لحاظ سے بھی دنیا بھر میں جانا گیا۔

ایک مرتبہ مجھے الخدمت فاؤنڈیشن کے کام کے سلسلے میں سبی میلے بلوچستان میں جانے کا اتفاق ہوا۔ میرے ساتھ الخدمت فاؤنڈیشن بلوچستان کے صدر عاصم سنجرانی

صاحب بھی تھے۔ سبی میلے میں مجھے باگ ناڑی نسل کے خوبصورت بیل دیکھنے کا موقع ملا۔ میں نے اس میلے میں خوبصورتی کے لحاظ سے اول پوزیشن حاصل کرنے والے بیل کے ساتھ کھڑے ہو کر تصویر بھی بنوائی۔اس بیل کا قد مجھ سے بھی ایک فٹ زیادہ تھا۔جب مجھے پتہ چلا کہ اونگول میں اسی طرح کے بیل پائے جاتے ہیں تو میں نے دونوں نسل کے بیلوں کا موازنہ کیا۔ دونوں نسل کے بیلوں کی تصویروں کو میں نے اکٹھے رکھ کر دیکھا تو مجھے دونوں میں کوئی خاص فرق نظر نہ آیا۔ ایک ہی طرح کا رنگ اور جسم۔اونگول کے لوگوں نے اپنے بیل کو دنیا بھر میں متعارف کروایا اور آج دنیا کے کئی ممالک میں اس کی نسل موجود ہے جب کہ ہم بلوچستان میں پائے جانے والی باگ ناڑی نسل کو دنیا میں متعارف نہ کرواسکے۔ یہ کہنا تو مشکل ہے کہ دونوں میں سے کون سازیادہ خوبصورت ہے لیکن یہ بات درست ہے کہ ہمارا بیل بھی اونگول بیل سے کم خوبصورت نہیں ہے۔ بیلوں کے شوقین حضرات کے لیے اونگول بیلوں کے بارے میں مزید معلومات

Breeds of Livestock, Department of Animal Science

ریاست حیدر آباد کے نقشے سے معلوم ہوتا ہے کہ ریاست کا اس علاقے کی ساحلی پٹی پر قبضہ نہیں تھا۔ جب انگریز نے اس علاقے پر قبضہ کیا تو اس نے سب سے پہلے خلیج بنگال کے ساحلی علاقوں پر جو اب آندھرا پردیش میں واقع ہے پر قبضہ کیا۔

اونگول دلی سے انیس سو کلومیٹر اور حیدر آباد سے سوا تین سو کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ میں نے یہ جاننے کی بہت کوشش کی کہ کیا اس علاقے پر کبھی مسلمان حکمرانوں نے حکومت بھی کی ہے؟ لیکن مجھے اس بارے میں کوئی مصدقہ معلومات نہ مل سکیں۔ عام طور پر یہ دیکھا گیا ہے کہ جس شہر پر مسلمانوں نے حکومت کی ہو وہاں وہ کوئی نہ کوئی ایسی عمارتیں ضرور بناتے تھے جو ان کی حکمرانی کی نشانی کے طور پر موجود ہوں

---

[31] http://afs.okstate.edu/breeds/

لیکن میں اونگول میں ایسی کوئی نشانی نہ ڈھونڈ سکا۔ آندھرا پردیش میں سمندر کے کنارے پر واقع مختلف شہروں میں مسلمانوں کی آبادی سات فیصد سے پندرہ فیصد تک ہے۔ آندھرا پردیش کے شہروں میں جو مسلمان رہتے ہیں انھیں آندھرا مسلمان کہتے ہیں ان کی اردو زبان کا لہجہ حیدر آبادی لہجے سے مختلف ہے جسے دکھنی لہجہ کہتے ہیں۔

یہ ایک ایسا علاقہ ہے جہاں بہت کم عرصے کے لیے مسلمان حکمران رہے اور وہاں بھی مسلمانوں کی تعداد اوسطاً دس فیصد کے قریب ہے۔ اس صورتحال کو دیکھ کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسلام کا پیغام ایسے علاقوں میں بھی پہنچا جہاں کبھی بھی مسلمانوں کی حکومت نہیں رہی۔ ان علاقوں میں بے شمار مساجد کا پایا جانا اس بات کی نشانی ہے کہ مسلمان یہاں بے حد متحرک ہیں۔ تحریک آزادی ہند میں مسلمانوں کا ایک اہم کردار رہا ہے اور مقامی سیاست میں بھی ان کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

Ongol Bull famous all over the world Photo Credit:
http://udumulasudhakarreddy.blogspot.com

Jallikattu - meaning - Embracing the bull in Tamil Photo Credit: https://divinediyaas.blogspot.com

نواب آف آرکوٹ

صبح کے پانچ بج رہے تھے اور ابھی بھی چنائی 170 کلومیٹر دور تھا۔ میرے ساتھی بھی کروٹیں لینا شروع ہو گئے تھے۔اس دوران ہمارے میزبان کی آواز میرے کانوں میں پڑی، جو بہت ہی بھلی محسوس ہوئی۔ وہ حسب معمول آہستہ آواز میں پکار رہے تھے، بیڈ ٹی، بیڈ ٹی۔ میں اُن کی آواز پر اٹھا۔ میرے ساتھی بھی مکمل طور پر نیند سے بیدار ہونے کی کوشش میں تھے۔ وہ ابھی انگڑائیوں سے فارغ ہو ہی رہے تھے کہ چائے آ گئی۔ ہم سب چائے کا مزہ لے رہے تھے تو ساتھ ہی عمر صاحب نے پوچھا کہ کتنا سفر باقی ہے ؟ ان کے خیال میں مجھے ایسی باتوں کا زیادہ پتہ ہوتا ہے۔ میں نے انھیں بتایا کہ تقریباً 170 کلومیٹر سفر ابھی باقی ہے اور اس وقت ہم آندھرا پردیش کے آخری بڑے شہر نیلور سے گزر رہے۔ یہ سن کر سب کو بے حد خوشی ہوئی۔

منزل تو منزل ہوتی ہے۔۔۔ اس تک بخیریت پہنچ کر خوش ہونا فطری سی بات ہے۔

اس علاقے کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہوئے مجھے معلوم ہوا کہ نوابز آف آرکوٹ نے ڈیڑھ سو سال سے زائد عرصے تک اس علاقے پر حکومت کی۔ آرکوٹ اب تامل ناڈو کا ایک اہم شہر ہے۔ اس قصبے کے نام کی وجہ سے وہ نواب آف آرکوٹ کہلاتے تھے۔ کچھ کتابوں میں نواب آف کرناٹک بھی کہا گیا۔

اب سورج بھی طلوع ہو رہا تھا اور روشنی بھی ہو رہی تھی۔ طلوعِ آفتاب کا منظر ہمیشہ ہی دل کو بھاتا ہے۔ میں چائے کی پیالی ہاتھ میں لیے کھڑکی کے پاس بیٹھ کر علاقے کا نظارہ کرتا رہا اور دل میں یہ سوچتا رہا کہ صرف چند ہزار سپاہیوں کے ہمراہ اس قدر دور دراز علاقے میں آ کر دو صدیوں تک حکومت کرنا کوئی آسان بات نہ تھی۔ اس میں جہاں مسلمان حکمرانوں کی فوجی طاقت کا کمال ہے وہیں مقامی لوگوں کے ساتھ ان کے حسنِ سلوک نے بھی ایک اہم کردار ادا کیا ہوگا۔ تبھی تو اتنے طویل عرصے تک ان کے خلاف کوئی بغاوت نہیں ہوئی۔

مجھے اس بات پر پہلے بھی یقین تھا اور اس سفر نے اس یقین کو مزید مستحکم کر دیا کہ جو کچھ آپ سیاحت میں سیکھ سکتے ہیں وہ کسی اور طریقے سے سیکھا نہیں جا سکتا۔ ہندوستان کی جو تاریخ میں نے پڑھی ہے اس میں مجھے نہیں یاد پڑتا کہ میں نے کبھی نواب آف آرکوٹ سے متعلق کچھ پڑھا ہو، جنھوں نے 1687ء میں ایک دور دراز علاقے میں اپنی ریاست قائم کی ہو اور پھر اس کا حیدرآباد کی ریاست سے الحاق کیا ہو۔ تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اس سلطنت کے ایک نواب نے ہندوستان پر قبضہ کرنے کی نیت سے آنے والے فرانسیسی لوگوں کے خلاف انگریزوں کی طرف سے لڑتے ہوئے میدانِ جنگ میں شہادت حاصل کی۔ یہ بات ہم میں سے بہت کم لوگوں کو معلوم ہے۔

اس سے پہلے کہ میں آپ کو آرکوٹ کی ریاست کے بارے کچھ بتاؤں، نیلور شہر کی تاریخ اور اس کی موجودہ صورت حال اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ اس شہر سے متعلق بھی کچھ باتیں آپ کی خدمت میں پیش کی جائیں۔

نیلور بھارت کا چوتھا گنجان آباد شہر

نیلور آندھرا پردیش کا ایک اہم شہر ہے جو تامل ناڈو کی سرحد پر واقع ہے۔ دہلی سے اس کا فاصلہ 2038 کلومیٹر ہے (خنجراب بارڈر سے کراچی کا فاصلہ 22 سو کلومیٹر ہے اس سے آپ دہلی اور نیلور کے درمیانی فاصلہ کا اندازہ کر سکتے ہیں) ۔ یہ شہر چنائی سے 175 کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے اور بنگلور یہاں سے 380 کلومیٹر دور ہے۔ اس سے آپ کو اس بات کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ مغل حکمرانوں نے جنوب میں بھی اپنی سلطنت کو دو ہزار کلومیٹر سے زیادہ وسیع کیا ہوا تھا۔

یہ بھارت کا چوتھا گنجان آباد شہر ہے۔ اس علاقے کی 65 فیصد آبادی شہر میں رہتی ہے۔ انگریزوں نے اٹھارہویں صدی کے آخر میں اس علاقے کی مختلف ریاستوں پر قبضہ کرکے ان سب کو مدراس ریذیڈنسی کا حصہ بنا دیا۔ ایسے علاقے جو انگریز لڑ کر حاصل کرتے تھے وہ انھیں برٹش انڈیا کا نام دیتے تھے۔ (پچھلے صفحات میں اس موضوع پر تفصیلی بات بیان کی جا چکی ہے) ۔ وہ ایسے علاقوں میں میونسپل کمیٹی بناتے تھے جو شہری معاملات کی دیکھ بھال کرتی تھی ۔ اس کے ساتھ ساتھ تعلیم کے لیے سکول اور کالجز کا نظام بھی قائم کرتے تھے۔ اسی طرح انھوں نے 1866ء میں نیلور میں بھی میونسپل کمیٹی کا آغاز کیا۔ یہ علاقہ اس لحاظ سے بھی بہت اہم ہے کہ یہاں پانچ لاکھ کی آبادی والے شہر میں ایک لاکھ مسلمان رہتے ہیں جن میں سے اکثر کی زبان اردو ہے۔

یہاں پر ایک درگاہ ہے جسے بڑا شہید درگاہ کہا جاتا ہے۔ اس جگہ پر بارہ قبریں ہیں۔ جنھیں شہیدوں کی قبریں کہا جاتا ہے۔ میں نے پوری کوشش کی کہ یہ جان سکوں کہ

یہ شہید کون تھے؟ لیکن مجھے معلوم نہ ہو سکا۔ اس درگاہ پر ایک بہت بڑا سالانہ میلہ لگتا ہے۔اس میلے کا نام "روٹیوں کی عید ہے"۔ یہ بڑا دلچسپ نام ہے۔جب میں نے یہ جاننا چاہا تو پتہ چلا کہ اس موقع پر لوگ اپنے گھروں سے پکی ہوئی روٹیاں لا کر ایک دوسرے سے روٹی کا تبادلہ کرتے ہیں۔ یہاں کے لوگ ایک پرانی روایت کو اب تک نبھا رہے ہیں۔ یہ کس نے شروع کی، کب کی کیوں کی، کسی کو کچھ معلوم نہیں ۔ میرے خیال میں جس نے بھی اس روایت کو شروع کیا ہوگا اس نے یہ چاہا ہوگا کہ لوگ ایک دوسرے کو کھانے کے لیے کچھ نہ کچھ دیں اور اب تک یہ روایت برقرار ہے۔ اب تک اس علاقے کے جن شہروں کا بھی ذکر کیا گیا ہے ان میں مسلمانوں کی تعداد دس فیصد کے قریب ہے لیکن نیلور میں مسلمانوں کی تعداد بیس فیصد کے قریب ہے جو اس شہر کی انفرادی خصوصیت محسوس ہوتی ہے۔

Roti Eid (Roti Exchange) at Neellore Photo Credit: https://www.nativeplanet.com

اس شہر سے ایک بڑا تاریخی واقعہ بھی منسوب ہے۔آندھرا پردیش بھارت کی وہ پہلی اسٹیٹ ہے جو زبان کی بنیاد پر بنائی گئی۔ تقسیم ہند کے فوراً بعد تیلگو زبان بولنے والوں نے اپنے لیے ایک الگ اسٹیٹ کا مطالبہ کر دیا تھا۔اس مقصد کے لیے تحریک چلائی گئی اور ایک صاحب جن کا نام پوٹی سریرا ملا تھا، نے اپنے مطالبات کے حق میں بھوک ہڑتال کر دی۔ انھوں نے 56 دن تک بھوک ہڑتال کی۔ اس بھوک ہڑتال کے نتیجے میں دسمبر 1952ء میں ان کی موت واقع ہو گئی۔اس ہلاکت سے ایک الگ اسٹیٹ بنانے کی تحریک نے مزید زور پکڑا اور بالآخر 1956ء میں آندھرا پردیش کی اسٹیٹ بنائی گئی۔اس بھوک ہڑتال کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس بھوک ہڑتال نے بھارت کا نقشہ بدل کر رکھ دیا۔ پوٹی صاحب کا تعلق بھی اسی شہر سے تھا۔اس تاریخی واقع نے نیلور کو بھی ایک تاریخی شہر بنا دیا۔

:

Photo Credit: https://www.facebook.com

تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ جب مغلوں نے دکن کو فتح کیا تو اُس وقت یہاں پر پہلے سے پانچ مسلمان ریاستیں موجود تھیں۔ پانچ ریاستوں میں ایک ریاست کا نام گولکنڈہ بھی ہے، جس میں نیلور کا علاقہ بھی شامل تھا۔ عالمگیر نے جب ان ریاستوں کو ختم کیا اور اس علاقے پر اپنا قبضہ کیا تو اُس نے مختلف علاقوں میں اپنے گورنر مقرر کیے۔ ان گورنروں نے نظام چلانے کے لیے اپنے معاون صوبیدار تعینات کیے۔ جیسے ہی مغل حکومت کمزور ہوئی تو ان لوگوں نے مغل حکومت سے علیحدگی کا اعلان کیا اور اپنی ریاست قائم کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ حیدرآباد کی ریاست بھی اسی طرح قائم ہوئی۔

ذوالفقار علی خاں اور ان کے والد نے دکن کی فتوحات میں بہت اہم کردار ادا کیا تھا۔ اس پر خوش ہو کر عالمگیر نے ذوالفقار علی خاں کو آرکوٹ جو کرناٹک میں واقع تھا کا صوبیدار بنا دیا لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ ریاست حیدرآباد کے ماتحت بھی تھے۔ یہ سلسلہ پچاس سال سے بھی زائد عرصہ تک اسی طرح چلتا رہا۔ جب 1744ء میں جب مغل حکومت کمزور پڑی تو ان لوگوں نے ریاست حیدرآباد سے علیحدگی کا اعلان کرتے ہوئے ایک خود مختار ریاست بنانے کا فیصلہ کر لیا۔ آرکوٹ میں رہنے کی وجہ سے یہ لوگ نواب آف آرکوٹ کہلانے لگے، آف انگریزی کا لفظ ہے جس سے یہ لگتا ہے کہ اِن لوگوں پر انگریزوں کے اثرات آنا شروع ہو گئے تھے۔ چند سال ایک خود مختار ریاست کے طور پر رہنے کے بعد 1749ء میں انھوں نے برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی کے ساتھ الحاق کر لیا اور ایک وفادار ساتھی کی حیثیت سے انگریزوں کو بے حد مالی اور فوجی امداد فراہم کی۔ اس کے بدلے انگریزوں نے ان کی سلطنت کو وسیع کرنے میں ان کی معاونت کی۔

اس طرح دونوں نے مل کر پورے کرناٹک پر قبضہ کر لیا۔ اسی وجہ سے انھیں نواب آف کرناٹک بھی کہا جاتا ہے۔ اِسی دوران فرنچ ایسٹ انڈیا کمپنی نے بھی اس علاقے میں اپنا اثر و رسوخ بڑھانے کی کوشش شروع کر دی۔ یہ میرے لیے بھی

ایک نئی بات تھی کہ فرانسیسی لوگوں نے بھی ہندوستان پر قبضہ کے لیے جو تجارت سے شروع ہو کر قبضہ تک جاتا تھا، فرنچ ایسٹ انڈیا کمپنی بنائی ہوئی تھی، جس طرح انگریزوں نے برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی بنائی تھی۔

کام بھی ایک جیسا اور نام بھی ایک جیسے، کیا حسن اتفاق ہے!

انگریزوں اور فرانسیسوں میں کئی جنگیں بھی ہوئیں جن کا مقصد ہندوستان کے زیادہ سے زیادہ علاقوں پر قبضہ کرنا تھا۔ ریاست حیدر آباد کی طرح آر کوٹ کے حکمرانوں نے بھی انگریزوں کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا۔ کسی وجہ سے نواب آف آر کوٹ کو انگریزوں سے ایک بڑی رقم سود پر لینی پڑی جو اتنی بڑی تھی کہ جس کی ادائیگی ممکن نہ تھی۔ اس کے بدلے وہ انگریزوں کی خاطر فرانسیسی لوگوں سے لڑائی کرتے تھے۔ ایسی ہی ایک لڑائی میں نواب آف آر کوٹ محمد انوار الدین 77 سال کی عمر میں شہید ہو گئے۔ اس کا یہ قدم دو بڑے غیر ملکیوں میں سے ایک کی مدد لے کر دوسرے کو ہندوستان سے نکالنے کے لیے تھا۔ فرنچ ایسٹ انڈیا کمپنی کو شکست ہوئی اور ان کو شکست سے دو چار کرنے میں نواب آف آر کوٹ کا بہت بڑا عمل دخل تھا۔ فرانسیسوں کی شکست کے بعد انگریز مزید طاقتور ہو گئے اور اب ہندوستان پر قبضہ کرنا ان کے لیے مزید آسان ہو گیا۔

انگریزوں کا قانون تھا کہ جس ریاست کے والی کا کوئی بیٹا نہیں ہوتا تو وہ اس پر براہ راست قبضہ کر لیتے تھے۔ ایسا انھوں نے ہندوستان میں واقع کئی ریاستوں کے ساتھ کیا۔ ایسی ہی ایک مثال ریاست جھانسی کی بھی ہے۔ اسی طرح کا واقع 1855ء میں ایک ایسا شخص نواب آف آر کوٹ بنا جس کا کوئی بیٹا نہیں تھا۔ جس کی وجہ سے انگریزوں نے اس ریاست پر قبضہ کر لیا۔ ملکہ وکٹوریہ نے خاندان کے باقی لوگوں میں سے کسی ایک کو پرنس کا خطاب دیا اور ٹیکس فری پنشن دے کر علیحدہ بٹھا دیا، پنشن دینے کا رواج انگریزوں میں عام تھا، بہادر شاہ ظفر کو بھی پنشن دی گئی تھی۔ انگریزوں کا خیال تھا کہ اگر ان لوگوں

کے اخراجات پورے ہوتے رہیں تو یہ بے ضرر ثابت ہوں گے۔ اس واقعے کے بعد ان سے نواب کا لقب ہٹا دیا گیا۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ لوگ اب تک اپنے آپ کو پرنس ہی کہلواتے ہیں۔ ان کی باقاعدہ ایک تاریخ ہے۔ ایک کے بعد دوسرا پرنس بنایا جاتا ہے۔ بھارتی حکومت بھی ان کو مکمل پروٹوکول دیتی ہے۔ پروٹوکول کی ترتیب میں پرنس آف آرکوٹ کا پندرہواں نمبر ہے۔ یہ لوگ اپنا سلسلہ نسب حضرت عمر فاروق سے جوڑتے ہیں۔ چند سال قبل ہمارے وزیر خارجہ خورشید قصوری صاحب نے چنائی میں رہائش پذیر موجودہ پرنس نواب عبدالعلی خان کے ساتھ ملاقات بھی کی تھی۔

ریاست ہو یا نا ہو پرنس تو ہو ہی سکتا ہے!

اس ریاست نے برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی کو بہت زیادہ سپورٹ دی جس کی وجہ سے وہ جنوبی ہندوستان کے مختلف علاقوں پر قابض ہوئے انھوں نے ریاست میسور سمیت کئی دیگر مراٹھا ریاستوں کو بھی نیست و نابود کیا۔ تاریخ پڑھیں تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ کچھ ریاستیں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ساتھ تھیں اور کچھ ریاستوں کے تعلقات فرنچ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ساتھ تھے۔ دونوں ممالک اس وقت یورپ میں بھی حالت جنگ میں تھے اور یہاں بھی آ کر انھوں نے ہندوستانی لوگوں کو اپنی فوج میں بھرتی کرکے جنگ کی۔ یہ ان کی جنگ تھی جو ہم نے لڑی۔ ایسا ہی حال پاکستان میں ہوا جہاں ہم لوگوں نے امریکہ کی جنگ افغانستان میں لڑی۔

فرانس کمزور تھا وہ واپس چلا گیا دوسرا سیانا اور طاقتور تھا، اس نے پہلے جنوبی ہندوستان پر قبضہ کیا اور پھر وہ شمال کی طرف آ گیا۔ بالآخر وہ ہندوستان کا حکمران بن بیٹھا، یہ تھا انگریز صاحب بہادر۔

ریاست آرکوٹ کے بارے میں درج ذیل کتابیں اور مضامین میں کافی دلچسپ معلومات دی گئیں ہیں جو تاریخ کا شغف رکھنے والے لوگوں کے لیے مفید ہیں۔

این ایس راماسوامی کی کتاب Political History of Carnatic Under the Nawabsراجموہن گاندھی کی کتاب Modern South India: A History from the 17th Century to Our Times

The International History Review میں چھپنے والا جم فلپ کا مضمون[32] A Successor to the Moguls: The Nawab of the Carnatic and the East India Company, 1763-1785اس کے علاوہ ایک مشہور کتاب "I am Nawab of Arcot Reconsidering the Political History of the Late Eighteenth Century Kingdom of Arcot Through the Eye of Nawab Muhammad Ali Wallajah (r.1749-1795) جسے Pimmanus Wibulsilp نے لکھا ہے۔ ان کتابوں میں اس ایک مسلمان ریاست کے بارے میں لکھا ہوا ہے جس سے ہمارا تعارف نا ہونے کے برابر ہے۔

اس کے علاوہ ایک اور مفید کتاب جسے

Osekhara Bandyopoadhyoa Ya, Śekhara Bandyopādhyāẏa

[32] https://www.jstor.org/stable/40105498

نے لکھا ہے اس کا عنوان ہے **From Plassey to Partition:** A History of Modern India یعنی جنگِ پلاسی سے تقسیم ہند تک۔ اس کتاب میں بھی انگریزوں کے طرزِ حکمرانی پر بہت کچھ لکھا ہوا ہے۔

نواب آف آرکوٹ کے علاقے سے ہم ملے جلے جذبات کے ساتھ آندھرا پردیش سے نکل آئے اور اب تامل ناڈو میں تھے۔

اس سے پہلے کہ میں آپ کو تامل ناڈو کے بارے میں کچھ معلومات فراہم کروں میں چاہوں گا کہ آندھرا پردیش سے متعلق چند دلچسپ واقعات اور حقائق آپ کی خدمت میں پیش کروں۔
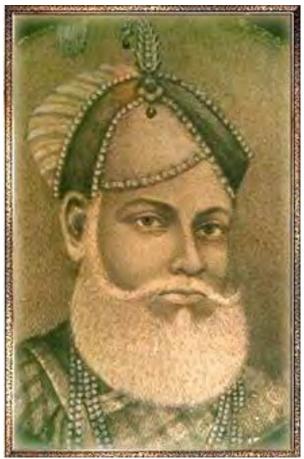
The aging Nawab Muhammad Anwaruddin, supported by the English, met the French army at Amburon 3 August 1749 and was killed in the battle at the age of 77.
Photo Credit: https://www.geni.com

Siege of Arcot 31st August to 15th November 1751 in the War in India, *Robert Clive 'Clive of India' wins the battle in 1751 said to have begun British rule in India* : picture by Cecil Doughty

آندھرا پردیش: بھارت میں زبان کی بنیاد پر بننے والی پہلی اسٹیٹ

آندھرا پردیش بھارت کی پہلی ریاست ہے جو زبان کی بنیاد پر بنائی گئی۔ اس علاقے میں صدیوں پرانی تیلگو زبان بولی جاتی ہے۔ یہ بھارت کی چوتھی سب سے زیادہ بولی جانے والی زبان ہے اور دنیا میں بولی جانے والی زبانوں میں اس کا گیارواں نمبر ہے ۔ تقسیم ہند کے بعد آندھرا پردیش کے نام سے ایک نئی اسٹیٹ بنانے کے لیے تحریک چلائی گئی جس میں ان تمام علاقوں کو شامل کرنے کا مطالبہ کیا گیا جہاں تیلگو زبان کثرت سے بولی جاتی تھی۔اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے مختلف فریقوں کے درمیان ایک معاہدہ طے پایا جس کا نام جنٹلمین ایگریمنٹ رکھا گیا۔ اس طرح 1953

ء میں آندھرا پردیش اسٹیٹ کا قیام عمل میں آیا۔ اس اسٹیٹ کا رقبہ ایک لاکھ باسٹھ ہزار مربع کلومیٹر اور آبادی 5 کروڑ سے بھی زائد ہے۔ آندھرا پردیش کا حدود اربعہ بہت دلچسپ ہے۔ یہ اسٹیٹ خلیج بنگال کے کنارے پر لمبائی کے رخ میں واقع ہے۔ اس کا ساحل تقریباً ایک ہزار کلومیٹر طویل ہے۔ اس کے شمال میں اڑیسہ ، شمال مشرق میں چھتیس گڑھ ، شمال مغرب میں تلنگانہ ، مغرب میں کرناٹکا، جنوب میں تامل ناڈو اور مشرق میں خلیج بنگال واقع ہے۔

یہ بات آپ کے لیے بھی دلچسپی کا باعث ہوگی کہ اس علاقے میں کلور مائنز ہیں جہاں سے کوہ نور ہیرا ملا تھا۔ اب بھی بے شمار لوگ ہیروں کی تلاش میں لگے ہوئے ہیں۔ انھیں یقین ہے کہ جہاں سے کوہِ نور نکلا ہے وہاں اور بھی ہیرے موجود ہوں گے۔

اس وقت آندھرا پردیش اسٹیٹ کا جی ڈی پی ایک سو تیس ارب ڈالر ہے جو پاکستان کے جی ڈی پی کا نصف ہے۔ یہ علاقے سیاحت کے لیے بے حد مشہور ہیں۔

آندھرا مسلم : جو اپنی ایک پہچان رکھتے ہیں

آندھرا پردیش میں رہنے والے چند مسلمانوں سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے بتایا کہ یہاں کچھ مسلمان تو وہ ہیں جو حملہ آوروں کے ساتھ اس علاقے میں آئے اور وہ مستقل طور پر آباد ہوگئے۔ شروع میں یہ لوگ فارسی بولتے تھے۔ بعد ازاں اس علاقے میں اردو زبان نے بے حد ترقی کی۔ اس کے علاوہ ایک کثیر تعداد ان مسلمانوں کی ہے جو یہاں کے مقامی ہیں۔ وہ لوگ تبلیغ کے نتیجہ میں مسلمان ہوئے۔ انھوں نے مزید بتایا کہ یہاں پر دو طرح کی اردو بولی جاتی ہے۔ ایک حیدرآبادی اردو ہے، جو وہ لوگ بولتے ہیں جو حیدرآباد کے قرب وجوار میں رہتے ہیں اور دوسری تیلگو اردو کہلاتی ہے جو قدرِ مختلف ہے۔

حیدر آباد سے تعلق رکھنے والے لوگ بہت صاف ستھری اردو بولتے ہیں۔ مقامی لوگ جن کی مادری زبان تیلگو ہے ان کا لہجہ حیدر آبادی لہجے سے بہت مختلف ہے اسے دکھنی اردو بھی کہا جاتا ہے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ آپ کی مادری زبان تو تیلگو ہے لیکن آپ اردو کیوں بولتے ہیں؟ جواب میں انھوں نے بتایا کہ اسلام کا زیادہ تر لٹریچر اردو میں ہے جس کی وجہ سے اس علاقے میں رہنے والا ہر مسلمان اردو پڑھنا اور لکھنا جانتا ہے۔ البتہ مقامی لوگوں کا لہجہ مختلف ہے۔ میں نے ایک اور بات محسوس کی کہ اس علاقے میں شیعہ حضرات کی ایک کثیر تعداد آباد ہے جس کی انھوں نے بھی تصدیق کی۔ سروجنی نائیڈو کا نام تو آپ نے ضرور سن رکھا ہوگا، ان کا تعلق بھی اسی علاقے سے تھا ۔

اب ہم تامل ناڈو میں داخل ہو چکے تھے۔ میرے ساتھی اپنا سامان باندھ رہے تھے۔ چہروں پر تھکاوٹ کے آثار تو تھے لیکن ایک اطمینان کی کیفیت بھی موجود تھی۔ اب ہم اپنی منزل کے قریب تھے۔ بھارت کے اتنے دور دراز علاقے میں آنے کا یہ پہلا موقع تھا۔ میں ہلکا سا خوف بھی محسوس کر رہا تھا۔ سفر میں اگر آپ کے ساتھ کچھ اور لوگ بھی موجود ہوں تو مشکلات میں کمی واقع ہو جاتی ہے اور آدمی کا حوصلہ بھی قائم رہتا ہے۔ اس لیے یہ کوشش کرنی چاہیے کہ جب بھی سفر کریں تو ایک گروپ کی شکل میں کریں۔ بیشک وہ گروپ دو افراد پر ہی مشتمل کیوں نہ ہو۔

اس دوران ہرجیت سدھو سلام کے لیے آگیا۔ اس کے سلام کا مقصد ہم سب کو معلوم تھا۔ ہم نے ان کی خدمت کی۔ ہرجیت سدھو کے ساتھ بہت اچھا وقت گزرا۔ اس نے ہماری دل سے خدمت کی۔ مجھے ہرجیت سدھو سے بہت ساری معلومات حاصل کرنے کا موقع ملا۔ اب چنائی کچھ ہی فاصلے پر تھا۔ چنائی کو کیسا پایا، وہاں کیسے لوگ رہتے ہیں، ان کا رہن

سہن کیسا ہے؟ اگلے صفحات میں اس کا تفصیلی ذکر آپ کی خدمت میں پیش کیا جائے گا۔ یاد رہے تامل ناڈو جے للیتا کی وجہ سے بھی بہت جانا جاتا ہے۔

چنائی آمد: جو کبھی مدراس تھا

ہماری ٹرین بروقت چنائی پہنچ گئی۔ ہم نے اپنے بھارتی ہمسفروں کو خدا حافظ کہا۔ اُس وقت موبائل فون کا اتنا رواج نہیں تھا، اس لیے رابطے کا کوئی ذریعہ موجود نہ تھا۔ میرا مشاہدہ ہے کہ دیر پا تعلق قائم رکھنے کے لیے کوئی نہ کوئی بہانہ ضرور ہونا چاہیے۔ اگر کوئی بہانہ نہ ہو تو اِس طرح کی ملاقات کا اثر اگلے چند گھنٹوں میں ختم ہو جاتا ہے۔ ایسا ہی ہمارے ساتھ بھی ہوا۔ ہمارا اور بھارتی دوستوں کا یہ اکتیس گھنٹوں کا سفر بہت ہی اچھا گزرا۔ بہترین سفری سہولتوں کی وجہ سے ہمیں کوئی دقت نہ ہوئی۔ راستے میں کوئی ایسا واقعہ بھی پیش نہیں آیا جو ہمارے لیے کسی مشکل کا باعث بنتا۔ یہ طویل سفر بخیر وعافیت طے ہونے پر ہم سب نے اللہ رب العزت کا شکر ادا کیا اور اپنی اپنی راہ لی۔

ہمارا یہ سفر نیو دہلی سے شروع ہوا، پھر ہم ہریانہ سے گزرے، اترپردیش بھی ہمارے راستے میں آیا، مدھیہ پردیش بھی ہم نے دیکھا، کچھ وقت ہم نے تلنگانہ میں بھی گزارا اور پھر آندھرا پردیش سے ہوتے ہوئے ہم تامل ناڈو پہنچ گئے۔ اس دوران ہمیں ہندی، پنجابی، اردو، مراٹھی، تیلگو، تامل کے علاوہ کئی مقامی زبانوں سے بھی واسطہ پڑا۔ ان میں سے اکثر کا رسم الخط بھی ایک دوسرے سے مختلف تھا۔ لوگوں کے رہن سہن لباس، کھانے پینے کا انداز اور بات چیت کا طریقہ ایک دوسرے سے خاصہ مختلف پایا جاتا ہے۔ میرے مطابق جو دیکھ کر سیکھا جاتا ہے وہ کتابیں پڑھ کر نہیں سیکھا جا سکتا۔ اس سفر نے ہمارے علم اور ہماری سوچوں میں بے حد اضافہ کیا اور ہمیں بھارت کے ایک ایسے حصے کو

بہت ہی قریب سے دیکھنے کا موقع ملا جس کے بارے میں ہماری معلومات بہت ہی محدود تھیں لیکن جسے دیکھنے کا بے حد اشتیاق تھا۔

ہم لوگ جب ریلوے سٹیشن سے باہر نکل رہے تھے تو میں نے دیکھا کہ سوائے چند قلیوں کے، کسی کے پاؤں میں جوتا نہیں تھا۔ ان کی جسمانی حالت بھی کافی کمزور نظر آتی تھی۔ میرا خیال ہے کہ اب ایسا نہیں ہو گا، حالات کافی تبدیل ہو گئے ہیں۔ یہاں پر ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا۔

ہماری کسی ہوٹل میں بکنگ نہیں تھی اور ہمیں کوئی ایسا کاؤنٹر بھی نظر نہ آیا جہاں سے اس طرح کی کوئی مدد مل سکتی۔ ان حالات میں ہم نے ایک قلی سے مدد لینے کا فیصلہ کیا۔ میں نے دیکھا کہ ایک طرف ایک قلی کھڑا تھا جس کے پاؤں میں چپل بھی تھی اور اس کی جسمانی حالت بھی یہ بتا رہی تھی کہ وہ قلیوں کا کوئی ٹھیکیدار ہے۔

اب مجھے یہ دقت پیش آئی کہ میں ان صاحب سے کس زبان میں بات کروں؟ کیونکہ اس علاقے کی زبان تامل ہے جو ظاہر ہے ہم میں سے کسی کو بھی نہیں آتی تھی۔ ہندی بولنے والے لوگ اردو بڑی اچھی طرح سے سمجھ لیتے ہیں۔ ہم انگلش میں ہی بات کر سکتے تھے۔ میں نے ڈرتے ڈرتے اِن صاحب سے انگریزی میں کہا کہ کیا آپ انگلش بول سکتے ہیں؟ انھوں نے مجھے خوبصورت انگلش لہجے میں جواب دیا کہ کیوں نہیں، میں ہندی، انگلش، تامل اور تیلگو سمیت چار زبانیں جانتا ہوں۔ آپ مجھ سے کس زبان میں بات کرنا پسند کریں گے؟ میں اس جواب کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کیونکہ وہ شخص اپنی حلیے اور چال ڈھال سے کوئی پڑھا لکھا شخص نظر نہیں آرہا تھا۔ یہ سب دیکھ کر مجھے بہت حیرانی ہوئی۔ یہ قلی بہت ہی خوبصورت انداز سے انگلش میں بات کر رہا تھا۔ جس سے مجھے لگا کہ وہ کسی سکول سے پڑھا ہوا ہے۔ میں نے جان بوجھ کر ہندی یعنی اردو کی بجائے انگریزی میں بات چیت کی۔ اس کی انگریزی نے مجھے یہ کہنے پر مجبور کر

دیا کہ ہندوستان میں انگریز سترھویں صدی کے آغاز میں آئے اور 1947ء میں خود تو چلے گئے لیکن اپنی زبان چھوڑ گئے جو آج بھی برِ صغیر کے ہر کونے میں بولی جاتی ہے۔ اسے کہتے ہیں تہذیبوں کے اثرات۔ وسطی ایشیاء اور افغانستان سے آکر صدیوں حکمرانی کرنے والوں کی زبان بولنے والا علاقہ پورے برِ صغیر میں کہیں بھی موجود نہیں ہے۔ قلی صاحب ہمارے ساتھ نہایت ہی احترام سے پیش آئے اور ایک ٹیکسی ڈرائیور سے ہماری بات بھی کروائی۔ اس طرح ہم اپنے ہوٹل کی طرف چل پڑے۔

قلی کا لفظ پچھلی دو صدیوں سے اُن لوگوں کے لیے بولا جاتا ہے جو ریلوے سٹیشن پر مسافروں کا سامان اٹھاتے ہیں۔ انھوں نے ایک سرخ رنگ کی قمیض پہنی ہوتی ہے جس سے ان کی پہچان میں آسانی ہوتی ہے۔ میں نے جب لفظ قلی کے بارے میں جاننا چاہا کہ یہ لفظ کب، کیسے اور کہاں سے شروع ہوا تو پتہ چلا کہ جب انگریز مدراس میں آئے اور انھوں نے یہاں ریل کا نظام شروع کیا تو انھیں ایسے لوگ درکار تھے جو ان کا سامان اٹھا سکتے ہوں۔ انھوں نے کچھ لوگوں کو اس کام کے لیے بھرتی کیا اور انھیں قلی کا نام دیا۔ قلی حضرات کو کوئی تنخواہ نہیں ملتی لیکن وہ ایک معاہدے کے تحت ریلوے سٹیشن پر کام کرتے ہیں۔ کوئی عام مزدور ریلوے سٹیشن پر مزدوری نہیں کر سکتا۔ میرے خیال میں ایسا سامان کی حفاظت کے نقطۂ نظر سے کیا ہو گا۔ ہندوستان میں مدراس وہ پہلا سٹیشن ہے جہاں قلی حضرات کو بھرتی کیا گیا اور ان سے سامان اٹھانے کا کام لیا گیا۔ ابھی حال ہی میں، میں نے مدراس ریلوے سٹیشن کی چند تصاویر دیکھی ہیں۔ ان تصویروں سے پتہ چلا کہ اب عورتیں بھی قلی کا کام کرتی ہیں۔ انھوں نے بھی سرخ رنگ کی شرٹ پہنی ہوتی ہیں۔ میرے خیال میں خاتون مسافر کسی مرد قلی کی نسبت خاتون قلی سے ہی خدمات لینے میں سہولت محسوس کرتی ہیں۔ اس لیے قلی خواتین کی تعداد میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ میں نے کہیں پڑھا کہ بھارت میں قلی کے لباس اور نام کی تبدیلی کی بات ہو رہی ہے۔ قلی کا سرخ لباس بھی ایک خاص معنی رکھتا ہے۔ آپ نے اس بات پر غور کیا ہوگا

سرخ نشان دور سے نظر آتا ہے۔ اسی لیے ہمارے ٹریفک کے سگنل سرخ رنگ کے ہوتے ہیں۔ اسی کو بنیاد بنا کر انگریزوں نے قلی کا لباس سرخ رنگ کا بنایا تاکہ آپ اسے بھیڑ میں بھی آسانی سے پہچان سکیں۔

ایک سو چالیس سال پہلے انگریز نے ہمارے ہندوستانی ان پڑھ مزدور کے لیے جو لفظ استعمال کیا اور جو لباس اسے فراہم کیا، آج بھی اسی کو لے کر چل رہے ہیں۔ وہ بھلے چار زبانیں جانتا ہو یا چودہ، اس سے اس کے نام اور کام پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ ابھی تک سرخ شرٹ پہن کر لوگوں کا سامان اٹھانے پر معمور ہے۔ اس کی نہ کوئی تنخواہ ہوتی ہے نہ پینشن۔ اسے ریلوے سٹیشن کی طرف سے ایک نمبر الاٹ ہوتا ہے جو اس کی پہچان بن جاتا ہے۔ وہ اکثر یہ نمبر اپنے بازو پر باندھے ہوتے ہیں۔ ہم اس کا نام تو بھول جاتے ہیں لیکن نمبر یاد رکھتے ہیں۔

نام سے نمبر آگے نکل گئے۔۔۔ یہ تو ہوتا ہے اُن کے لیے جن کا کوئی مقام نہیں ہوتا!

میں نے دیکھا ہے کہ اب کئی جگہوں پر عام مزدور کے لیے بھی قلی کا لفظ بولا جاتا ہے، جیسے لاری اڈہ وغیرہ لیکن وہاں قلی کا نمبر بھی نہیں ہوتا اور اس کا کوئی خاص لباس بھی نہیں ہوتا۔

Women Cooli at Chenai Rial Station Photo Credit: https://www.oneindia.com/india

چنائی میں ہمارا ہوٹل: جو ایک سکھ کی ملکیت تھا

چنائی میں ہوٹل میں قیام بھی ایک دلچسپ تجربہ تھا۔ ہوٹل کا مالک پنجاب کا رہنے والا ایک سکھ تھا جو اتنی دور آ کر ایک ہوٹل چلا رہا تھا۔ ہوٹل کے مالک سے ہماری دوستی ہو گئی اور ہم نے آپس میں گپ شپ بھی لگائی جس کا تذکرہ میں آئندہ صفحات میں کروں گا۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ اس نے ہوٹل کی ایک دیوار پر ہندو مندر، بابا گرو نانک، حضرت عیسیٰ اور خانہ کعبہ کی تصاویر اکٹھی لگائی ہوئیں تھیں۔ میں نے ان سے پوچھا کہ آپ نے ایسا کیوں کیا ہے؟ اس کا جواب لاجواب تھا۔ کہنے لگا، ہم سب کا پالنہار ایک ہے جو اوپر بیٹھا ہوا ہے اور یہ سب اس کے نیک بندے ہیں جو ہمیں اس سے ملواتے ہیں اور اس کی باتیں ہمیں بتاتے ہیں۔ اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ ہم پر ان سب کا احترام فرض ہے۔ یہ سب اسی احترام کا نتیجہ ہے کہ میں ان سب کو ایک ہی نظر سے دیکھتا ہوں۔ اس کے علاوہ اس نے چھت پر ایک باغیچہ بھی بنا رکھا تھا جو بہت ہی بھلا معلوم ہوتا تھا۔ مشترکہ زبان

ہو تو بات چیت میں بھی سہولت ہوتی ہے اور دوستی ہونے میں دیر بھی نہیں لگتی۔ یہاں بھی یہی ہوا۔ پنجابی زبان کی وجہ سے ہم جلد ہی بے تکلف ہوگئے۔ وہ شخص بھی بہت خوش ہوا کہ کچھ لوگ لاہور سے آکر اس کے پاس ٹھہرے ہیں۔اُس نے ہمیں یہ بتایا کہ آپ پہلے پاکستانی ہیں جو اس کے ہوٹل میں ٹھہرے ہیں۔

یاد رہے تقسیم ہند سے پہلے لاہور متحدہ پنجاب کا صدر مقام تھا اور اسی وجہ سے گورنر اور وزیر اعلیٰ کے دفاتر بھی اسی شہر میں تھے۔ یہی وجہ ہے کہ مشرقی پنجاب کے لوگ لاہور کے بارے میں ایک بہت ہی خوبصورت تاثر رکھتے ہیں۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ لاہور اور اس کے ساتھ ننکانہ صاحب کے علاوہ سچا سودہ، کرتار پور میں سکھوں کے بہت سے مقدس مقامات ہیں جن کی وجہ سے وہ ان علاقوں سے جانے والوں کا بے حد خیال کرتے ہیں۔ میں نے دیکھا ہے کہ جو سکھ زیادہ مذہبی ہوتے ہیں وہ لاہور سے آنے والوں سے یہ ضرور پوچھتے ہیں کہ آپ نے کون کون سے گردوارے دیکھے ہوئے ہیں؟

یہ بات انھوں نے ہم سے بھی پوچھی۔ یہ سب کچھ مذہبی جذبات کی تسکین کے لیے کیا جاتا ہے۔ خوراک کی طرح مذہبی جذبات کی تسکین بھی انسان کی ایک بنیادی ضرورت ہے۔

اس سے پہلے کہ میں آپ کو چنائی جو کبھی مدراس تھا کے بارے میں کچھ معلومات فراہم کروں میں چاہوں گا کہ اس کے ساتھ ساتھ میں مدراس سینٹرل ریلوے سٹیشن کی تاریخ آپ کی خدمت میں پیش کروں۔ یہ ریلوے سٹیشن ایک صدی سے بھی زیادہ پرانا ہے۔ ایک وقت میں اسے گیٹ وے آف ساؤتھ انڈیا کہا جاتا تھا۔

سابقہ مدراس موجودہ چنائی

میں نے جب یہ جاننا چاہا کہ مدراس کا نام چنائی کیوں رکھا گیا تو مجھے مختلف معلومات حاصل ہوئیں۔ میرے خیال میں سب سے مصدقہ بات یہ ہے کہ جب انگریزوں نے اس علاقے میں اپنی پہلی کالونی بسائی جس کا نام سینٹ فورٹ جارج رکھا گیا جس جگہ قلعہ بنایا گیا اس کے قریب ہی مچھیروں کی ایک بستی تھی جس کا نام مدراس پٹینام تھا۔ اس وجہ سے اس علاقے کو مدراس کہا جانے لگے۔ بعدازاں جب انگریزوں نے شہر کو آباد کرنا شروع کیا اور اس کے لیے ایک نئی جگہ کا انتخاب کیا تو وہ نئی جگہ کا نام چنائی تھا۔ یہاں کے لوگوں کے مطالبے پر مدراس کو چنائی کا نام دے دیا گیا۔ دونوں الفاظ ہی تامل زبان کے ہیں۔ ابھی بھی چنائی میں مدراس نام کے بے شمار ادارے موجود ہیں۔ اب آہستہ آہستہ مدراس کی جگہ چنائی کا نام استعمال ہو رہا ہے۔ ہمارا یہ دورہ 1999ء میں ہوا تھا اور اس وقت نام بدلے صرف تین سال ہوئے تھے اس لیے اکثر جگہوں پر مدراس ہی لکھا ہوا دکھائی دیتا تھا اور زیادہ تر لوگ اسی نام سے اس شہر کو یاد کرتے تھے۔

ڈیڑھ سو سال پرانا ریلوے سٹیشن چنائی

میں نے اس بات کا بغور مشاہدہ کیا ہے کہ انگریزوں کے آنے سے پہلے ہندوستان میں کسی بھی جگہ پر ریلوے کا کوئی نظام موجود نہیں تھا۔ جہاں جہاں انگریز قابض ہوتے گئے وہیں پر انھوں نے ریلوے کا نظام بھی شروع کر دیا۔ اُسی دور میں برطانیہ میں ریلوے انجن ایجاد ہوا اور اُس نظام تک رسائی صرف انگریزوں کو ہی تھی۔ اس لیے انگریز جیسے ہی کسی علاقے پر اپنا قبضہ کرتے تو سب سے پہلے اس علاقے میں اپنی آمدورفت کو تیز اور آسان کرنے کے لیے ریلوے کا نظام بھی قائم کرتے۔

سن 1856ء میں انگریزوں نے مدراس کے علاقے میں پہلا ریلوے سٹیشن رویاپرام کے مقام پر بنایا۔ بعد ازاں جب شہر کی آبادی میں اضافہ ہوا تو 1873ء میں مدراس سینٹرل ریلوے سٹیشن کا افتتاح ہوا۔اب اس ریلوے سٹیشن کا نام

PuratchiThalaivar.Dr. M.GRamachandranCentralRailway Station

ہے جو کہ دنیا میں کسی بھی ریلوے سٹیشن کا طویل ترین نام ہے۔اسے مختصر طور M. J. R. Central Chenai سٹیشن بھی کہتے ہیں۔ جن کے نام پر اس سٹیشن کا نام رکھا گیا ہے ان صاحب کی اس علاقے کے لیے بے حد خدمات ہیں .اس ریلوے سٹیشن کا آرکیٹیکٹ جارج ہارڈنگ تھا جو گوئیتھک فنِ تعمیر کا ماہر تھا۔اس ریلوے سٹیشن سے روزانہ پانچ لاکھ لوگ مستفید ہوتے ہیں اور دن کے کسی بھی اوقات میں ڈیڑھ سے دو لاکھ افراد یہاں موجود ہوتے ہیں۔ یہاں سے روزانہ انیس گاڑیاں روانہ ہوتی ہیں جبکہ دو سو گاڑیاں یہاں سے گزرتی ہیں۔

یہ بات میرے لیے بھی حیرانی کی تھی کہ اس ریلوے سٹیشن کا سالانہ ریونیو نو کروڑ ڈالر سے بھی زائد ہے ۔ یہ رقم پاکستانی روپوں میں ڈیڑھ ارب روپے کے قریب بنتی ہے۔ یہ انڈین ریل کے صرف ایک سٹیشن کی آمدن ہے۔ یہ ریلوے سٹیشن اپنی صفائی ستھرائی کے لحاظ سے بھارت میں ایک اہم مقام رکھتا ہے۔

جب ہم ریلوے سٹیشن سے باہر نکل رہے تھے تو میں نے دیکھا کہ یہاں پر بہت بڑا شاپنگ ایریا تھا جس کے ساتھ ساتھ کھانے پینے کی بے شمار دکانیں بھی موجود تھیں۔ مجھے یاد آیا کہ ستر کی دہائی تک لاہور ریلوے سٹیشن کا ریسٹورانٹ بھی اپنے کھانوں کی وجہ سے شہر بھر میں مشہور تھا۔ لوگ تفریح اور اچھا کھانا کھانے کے لیے ریلوے سٹیشن پر آتے تھے۔ چنائی کے ریلوے سٹیشن کو دیکھ کر مجھے یوں لگا کہ یہاں پر بھی بہت سے لوگ

شاید اسی کام کے لیے آتے ہیں۔ یہ بہت اچھی جگہ ہے۔ جہاں وہ شاپنگ بھی کریں گے کھانا بھی کھائیں گے اور اس کے ساتھ ساتھ ان کی تفریح بھی ہو جائے گی۔

ہندوستان میں ریل کے متعلق کئی کتابیں لکھی گئیں ہیں۔ اس موضوع پر ایک مقالہ سریتھا ایس آر نے

Colonialism and modernisation;history and

development of southern railway a case study

کے نام سے لکھا ہے[33]۔ اس کے علاوہ ایک انڈین ریل فین کلب نے بھی اپنی ویب پر چنائی ریلوے سٹیشن کے بارے میں لکھ رکھا ہے[34]۔

ایسا اسی وقت ممکن ہے جب بہترین سہولتوں کی فراہمی کو ممکن بنائی جائے۔

یاد رہے کہ چنائی ہندوستان کا وہ واحد شہر ہے جس پر جنگِ عظیم اوّل میں جرمن فوجوں نے حملہ کیا تھا۔ یہ حملہ ہندوستان پر نہیں تھا بلکہ اس حملے کا نشانہ انگریز تھے۔اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ جرمن فوجیں انگریزوں کے تعاقب میں کہاں تک آ پہنچی تھیں۔ چنائی کی میونسپل کارپوریشن لندن کے بعد دوسری قدیم ترین کارپوریشن ہے اور یہاں برِ صغیر کی سب سے پرانی فوجی چھاؤنی مدراس رجمنٹ کا سنٹر بھی ہے۔

---

[33]http://shodhganga.inflibnet.ac.in:8080/jspui/handle/10603/12705

[34] https://irfca.org/faq/faq-hist.html#first
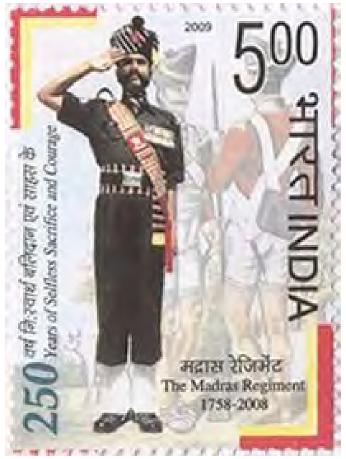
Madras Regiment 264 Years Old First Regiment in India
Photo Credit:
https://en.wikipedia.org/wiki/Madras_Regiment

Saint Gerge Fort: Photo Credit: https://theculturetrip.com

Chenai Central Rialway Station Photo Credit: https://en.wikipedia.org/wiki/Chennai_Central_railway station

تامل: ایک نہایت ہی قدیم تہذیب

تامل لوگوں کی اکثریت بھارت کے جنوب مشرق میں رہتی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ سری لنکا، ملائیشیا اور سنگاپور میں بھی انکی ایک بڑی تعداد آباد ہے۔ تقسیم ہند کے بعد اس علاقے سے تامل مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد ہجرت کر کے

پاکستان بھی آ گئی تھی۔ اس کے علاوہ سری لنکا میں جب تامل ناڈو کی تحریک چل رہی تھی تو اس وقت بھی کچھ تامل ہندو کراچی منتقل ہو گئے۔ کراچی میں بھی تامل لوگ آباد ہیں جن میں مسلمانوں اور ہندوؤں کے ساتھ ساتھ عیسائی بھی شامل ہیں۔ کراچی کے رہنے والے مدراسی پاڑا سے اچھی طرح واقف ہیں جہاں زیادہ تر تامل مسلمان رہتے ہیں جنھوں نے تقسیم ہند کے وقت پاکستان ہجرت کرنا پسند کیا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہجرت صرف شمالی ہندوستان سے ہی نہیں ہوئی تھی بلکہ ہجرت کرنے والوں میں جنوبی ہندوستان کے لوگ بھی شامل تھے۔ کراچی میں ماری ماتا کے نام پر تامل ہندوؤں کا ایک بہت بڑا مندر تھا جو 2012ء میں گرا دیا گیا۔ جس پر بھارتی میڈیا میں کافی شور مچا تھا۔ یہ بات بھی انتہائی دلچسپ ہے کہ نوبل انعام یافتہ سبرامنیم چندرسیکر کی پیدائش 1910ء میں لاہور میں ہوئی اور ان کا تعلق بھی ایک تامل ہندو خاندان سے تھا۔ اُن دنوں اُن کے والد ریلوے میں ملازمت کی وجہ سے لاہور میں مقیم تھے۔

اب بھارت کے اس علاقے کا نام تامل ناڈو ہے۔ ہندوستان کی تاریخ پڑھتے ہوئے مجھے معلوم ہوا کہ ہندوستان کے جنوبی علاقے شمالی علاقوں کی نسبت زیادہ قدیم ہیں۔ اب تک کی تحقیق سے پتہ چلا ہے کہ ان علاقوں میں پندرہ ہزار سال قبل مسیح بھی انسانی آبادیاں موجود تھیں۔ میں نے جب مزید جاننا چاہا تو مجھے علم ہوا کہ ہندوستان کی قدیم سیاسی اور مذہبی تاریخ کا تعلق بھی اسی علاقے سے ہے۔ سب سے عجیب و غریب واقعات بھی اسی علاقے میں رونما ہوئے انسانی تہذیب نے اپنی ترقی کا آغاز جن علاقوں سے کیا ان میں یہ علاقہ بھی شامل تھا۔ یہ بات بھی باعث حیرت ہے کہ اس علاقے کا وادی سندھ کی تہذیب سے ایک گہرا تعلق ہے۔ جس کا تفصیلی ذکر آئندہ صفحات میں آئے گا۔

اس سے پہلے کہ میں آپ کو مدراس کے بارے میں کچھ معلومات فراہم کرو ں میں چاہوں گا آپ کو تامل اور تامل ناڈو کے بارے میں کچھ بتایا جائے۔امید ہے کہ آپ میری اس بات سے اتفاق کریں گے کہ ہندوستان کی جو تاریخ ہم نے پڑھی ہے اس کا زیادہ تر تعلق شمالی ہندوستان سے ہے جس کی وجہ سے ہندوستان کے اس علاقے کے بارے میں ہمارے پاس بہت کم معلومات ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ جب تک ہم جنوبی ہندوستان کی تاریخ نہ پڑھ لیں، ہندوستان کی تاریخ، خاص طور پر مذہبی اور سیاسی تاریخ کا صحیح اندازہ نہیں لگا سکتے۔

چیرہ، چولا اور پانڈیا: جنوبی ہندوستان کے حکمران

کوروں اور پانڈوں کی لڑائی کی وجہ سے ہم پانڈیا کے نام سے تو واقف ہیں۔ ان تین حکمرانوں نے ایک طویل عرصہ تک اس علاقے پر حکمرانی کی۔ ان حکمرانوں کے درمیان بھی بے شمار جنگیں ہوئی۔ ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ نویں صدی میں اس علاقے میں چولا خاندان کی حکمرانی تھی جو چھتیس لاکھ مربع کلومیٹر پر پھیلی ہوئی تھی، اور خلیج بنگال اور آس پاس کے علاقے ان کی سلطنت میں شامل تھے۔ سترھویں صدی میں اس علاقے میں پرتیگیزیوں، انگریزوں اور فرانسیسیوں نے بھی آکر ڈیرے ڈالے۔ ہندوستان کی سرزمین پر زبردستی کے قبضے کو وسیع کرنے کے لیے ان کے درمیان لڑائیاں بھی ہوئیں۔ جن میں انگریزوں کی جیت ہوئی۔ انگریزوں کی ایسٹ انڈیا کمپنی نے اس علاقہ پر ایک مکمل کنٹرول حاصل کرنے کے بعد مدراس پریزیڈینسی کے نام سے اپنی حکمرانی کا آغاز کیا۔ انگریزوں نے اس کے علاوہ بمبئی اور کلکتہ پریزیڈینسی کے نام سے ہندوستان کے دیگر علاقوں پر بھی حکمرانی کی۔ میں تامل ناڈو کے ایک دلچسپ واقعے کا ذکر آپ کے سامنے کرنا پسند کروں گا۔

تامل ناڈو کے بارے میں مزید جاننے کے لیے درج ذیل کتابوں کا مطلعہ بے آپ کے مقصد کو حاصل کرنے میں مددگار ثابت ہوگا۔

چتھرامدھاوان کی کتاب : History and culture of Tamil Nadu as gleaned from the Sanskrit inscriptions. Vol. 1. Up to c. AD 1310

ان کی دوسری کتاب جس کا عنوان ہے History and Culture of Tamil Nadu: c. 1310-c. 1885 AD

اس کے ساتھ ساتھ

ساتھ سی مانورانج جیتھا مونی کی کتاب :History of Tamil Nadu From 1529 A. D. to 1801 A. D.

کیلے کی پتوں کی پلیٹ

ہوٹل آنے کے بعد ہم نے کچھ دیر آرام کیا۔ اس لیے کہ ٹرین بھی آرام دہ ہونے کی وجہ سے زیادہ تھکاوٹ نہیں تھی اور رات میں نیند پوری کرنے کا بھی موقع مل گیا تھا۔ دوپہر کے وقت ہم تینوں نے طے کیا کہ ہوٹل سے باہر جا کر کھانا کھائیں گے۔ دنیا کے بڑے ہوٹل اور ریسٹورانٹ تو ایک جیسے ہی ہوتے ہیں لیکن اصل فرق بازاروں میں واقع ریسٹورانٹ اور ڈھابوں کا ہوتا ہے جہاں عام لوگ کھانا کھاتے ہیں ۔ ان ریسٹورنٹس میں جانے سے آپ کو اس علاقے کے باشندوں کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملتا ہے۔ یہ بھی ایک عجیب سی بات ہے کہ اب ہم ریسٹورانٹ کو بھی ہوٹل ہی کہتے ہیں۔ حالانکہ ہوٹل سے مراد وہ جگہ ہے جہاں قیام کیا جاتا ہے۔ جبکہ ریسٹورانٹ کا مطلب کھانا کھانے کی جگہ ہوتی ہے۔ اب لوگ عام طور پر ریسٹورانٹ کو ہوٹل کا نام ہی دیتے ہیں اور

یہ بات اب ہم سب نے قبول بھی کر لی ہے ۔ ہم کھانا کھانے کے لیے ایک قریبی ریسٹورانٹ چلے گئے۔ یہاں ہم ایک تجربے سے گزرے جس کا ہمیں کوئی اندازہ نہ تھا۔

جیسے ہی ہم ریسٹورانٹ جا کر ایک چھوٹی سی میز کے گرد بیٹھے، تو ہمارا خیال تھا کہ کوئی صاحب آئیں گے، ہم سے آرڈر لیں گے اس کے بعد برتن چنے جائیں گے اور پھر ہم کھانا تناول فرمائیں گے لیکن سب کچھ اس سے مختلف ہوا۔ ایک صاحب آئے جن کے پاس پانی کی ایک بالٹی تھی اور بڑے سائز کے کیلے کے پتے تھے۔ انھوں نے ہم سب کے سامنے ایک ایک پتہ بچھا دیا۔ انھوں نے بالٹی سے پانی نکالا اور پتوں پر ڈال دیا اور ہمیں انگریزی میں کہا کہ آپ اس پانی سے اپنا پتہ صاف کر لیں۔ میز کے ساتھ ہی فرش پر ایک بالٹی پڑی تھی جس میں پتے دھونے کے بعد پانی ڈال دیا جاتا ہے۔ ہم نے بھی ایسا ہی کیا۔ ہمیں یہ احساس ہونے لگا کہ باقی معاملات بھی ایسے ہی ہوں گے۔ تھوڑی دیر بعد ایک صاحب آئے ان کے پاس ایک بڑی سی ٹوکری میں بہت سارے برتن تھے جن میں مختلف قسم کے کھانے تھے۔ یہ ریسٹورانٹ ایک ہندو کی ملکیت تھا اس لیے یہاں پر گوشت دستیاب نہیں تھا۔ ان کے ساتھ ایک صاحب تھے جن کے پاس سفید ابلے ہوئے چاول تھے۔ چاول والے صاحب نے ہمارے پتوں پر چاول ڈال دیے اور دوسرے صاحب نے ہم سے پوچھا کہ آپ کیا لیں گے؟ ان کے پاس مختلف قسم کی ڈشز تھیں جو دال اور سبزیوں پر مشتمل تھیں۔ ہم نے اپنی اپنی مرضی کے مطابق ان سے فرمائش کی جو انھوں نے بخوشی پوری کی۔ وہ دونوں صاحبان بعد میں ہمیں پوچھنے بھی آتے رہے۔ ہمیں میز پر کوئی چمچہ نظر نہ آیا۔ ارد گرد سب لوگ ہاتھوں سے ہی چاول کھا رہے تھے۔ ہم میں سے کوئی بھی ہاتھ سے کھانے کا عادی نہیں تھا۔ لیکن چمچہ ندارد۔ ہم نے بھی ہاتھ سے کھانے کا ہی فیصلہ کیا۔۔۔ اور اس پر عمل بھی کیا۔ جب ہم نے اپنا کھانا ختم کیا تو ایک صاحب آئے اور ہماری پلیٹ یعنی کیلے کے پتے اٹھا کر لے گئے۔ کیلے کے پتے پر کھانا رکھ کر کھانا ہم تینوں کا پہلا تجربہ تھا۔

چنائی میں مجھے ایک جنرل اسٹور پر جانے کا اتفاق ہوا۔ میں نے دیکھا کہ اسٹور میں موجود کام کرنے والے لوگوں نے سر پر سفید ٹوپی رکھی ہوئی تھی اور ان سب کے چہروں پر داڑھی بھی موجود تھی۔ اپنے حلیے سے وہ مسلمان لگ رہے تھے۔ اس کے علاوہ دکان میں موجود دینی کتابوں سے اس بات کی تصدیق بھی ہو رہی تھی۔ میں نے انھیں السلام علیکم کہا۔ انھوں نے میرے سلام کا بہت اچھے طریقے سے جواب دیا۔ میں نے انھیں بتایا کہ میں پاکستان سے ہوں۔ اس پر انھوں نے خوشی کا اظہار کیا اور پاکستان سے متعلق پوچھنے لگے۔ شروع میں ہم نے انگریزی میں بات چیت کی لیکن جلد ہی ہم نے اردو میں بات کرنا شروع کر دی۔ میں نے ان سے پوچھا کہ آپ نے اردو کہاں سے سیکھی ہے تو انھوں نے جواب دیا کہ زیادہ تر مذہبی کتابیں اردو میں ہیں اور اس کے علاوہ ہمارا تعلق بھی تبلیغی جماعت سے ہے۔ تبلیغی جماعت کے بہت سے لوگ یہاں آتے رہتے ہیں جن سے ہمیں اردو سیکھنے کا موقع ملتا رہتا ہے۔ البتہ جب ہم آپس میں بات کرتے ہیں تو تامل زبان میں

کرتے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ تامل ناڈو میں مسلمانوں کے حالات کیسے ہیں؟ انھوں نے بتایا کہ سچی بات تو یہ ہے کہ ہمیں کوئی مسئلہ نہیں ہے۔

Banana Leaf food serving at Chenai Photo Credit: https://www.holidify.com/pages/culture-of-tamil-nadu-124.html

Tamil Nadu Tarditiona Dress Photo Credit: https://www.youtube.com

چنائی کا ٹی نگر: ایک مصروف ترین قدیم مارکیٹ

ایک دن وقاص بھائی اور میں نے چنائی شہر کے پرانے علاقے دیکھنے کا پروگرام بنایا۔ ایک صاحب سے اس بارے میں دریافت کیا تو انھوں نے بتایا کہ آپ کو ٹی نگر جانا چاہیے۔ ہمیں جگہ کا نام بہت ہی خوبصورت اور دلچسپ لگا۔ ہم شروع میں یہ سمجھے کہ ٹی سے مراد چائے ہے لیکن ایسا نہیں تھا۔ چنائی کی تاریخ سے معلوم ہوا کہ 1920ء میں ٹاؤن پلاننگ ایکٹ بنایا گیا جس کے تحت چنائی میں بہت ساری عمارتیں، رہائشی بستیاں اور مارکیٹس بنائی گئیں۔ ایک مشہور وکیل اور سیاسی رہنما تھے جن کا نام تھا،

Sir Pitti Theagaraya Chetty

ان کے نام پر اس مارکیٹ کا نام رکھا گیا۔ اب پورا نام لکھنے کی بجائے صرف ٹی نگر لکھا جاتا ہے۔

اس مارکیٹ کے بارے میں معلوم ہوا کہ بھارت کی چند بڑی مارکیٹوں میں اس مارکیٹ کا نام سب سے اوپر ہے۔ تامل ناڈو کا دو تہائی سونے کا کاروبار اسی مارکیٹ میں ہوتا ہے۔ جب ہم مارکیٹ میں گئے تو دیکھا کہ ایک طرف بہت تنگ بازار تھے جہاں پیدل چلنا بھی دشوار تھا۔ دوسری طرف بے شمار پلازے تھے۔ میرا تعلق ٹیکسٹائل سے ہونے کی وجہ سے مجھے معلوم تھا کہ کسی زمانے میں مدراس کے پرنٹ بہت مشہور تھے۔ مدراس وہ پہلا شہر تھا جہاں سے سترہویں صدی میں برطانیہ کو پرنٹڈ کپڑا بھجوایا جاتا تھا۔ آپ یوں کہہ سکتے ہیں کہ مدراس برِصغیر کا وہ پہلا شہر ہے جس نے برطانیہ کو کپڑا برآمد کیا۔ حیرت ہے کہ آج بھی بھارت، پاکستان، بنگلہ دیش اور سری لنکا، برطانیہ کو کپڑا اور ملبوسات برآمد کرتے ہیں۔

نہ بیچنے والا بدلا نہ خریدنے والا اور نہ ہی سامانِ تجارت۔۔۔

اسے ہم کیا کہیں۔۔ترقی یا کچھ اور۔۔۔

اس کا فیصلہ آپ خود ہی کر لیں۔۔۔

T Nagar Market atChenai Photo Credit: https://www.thenewsminute.com

شرح خواندگی: شمال اور جنوب میں ایک واضح فرق

میرے مشاہدے کے مطابق جیسے ہی شمالی بھارت سے نیچے کی طرف سفر شروع کریں تو آہستہ آہستہ لوگوں کی رنگت جو پہلے سفید ہوتی ہے، گندمی ہونی شروع ہوتی ہے، بعد میں تھوڑی سیاہی مائل اور بالکل جنوب میں جا کر کافی گہری ہو جاتی ہے۔ اسی طرح سے قد کاٹھ اور نین نقش میں بھی فرق پڑتا ہے۔ایک اور بات جسے میں نے شدت سے محسوس کیا اس کا تعلق شرح خواندگی سے ہے۔ جیسے ہی آپ بھارت کی شمالی ریاستوں سے نیچے کی طرف آتے ہیں تو شرح خواندگی میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ میں نے بھارت کا 2011ء کے سروے کے نتائج دیکھے۔ اس سروے کے مطابق پنجاب اور ہریانہ کی شرح

خواندگی 76 فیصد ، یوپی اور سی پی میں 69 فیصد ، راجستھان میں 67 فیصد، تامل ناڈو میں 80 فیصد اور کیرالہ میں یہ شرح 93 فیصد تھی۔

ملک کافور: تامل ناڈو کی تاریخ کا ایک انمول کردار

تامل ناڈو کی تاریخ سے ایک ایسے کردار کا پتہ چلتا ہے جس کا نام میں نے پہلی مرتبہ سنا۔ اس کا نام ملک کافور تھا۔ اسے Taj al-Din Izz al-Dawla بھی کہتے تھے۔ یہ صاحب کون تھے اور انھوں نے کیا کیا کام کیے ؟ میں نے جب ان سے متعلق جانا تو میں بے حد حیران ہوا۔

علاؤالدین خلجی نے تیرہویں صدی کے آخر میں دکن کے علاقوں پر حملے کیے۔ اس کے ایک کمانڈر نصرت خان نے ایک بہت ہی امیر آدمی کے غلام کو بہت بھاری رقم دے کر خرید لیا۔ اس کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ ہندوستان میں غلاموں کی خرید و فروخت کا کام ہوتا تھا ۔ اس غلام کا نام ملک کافور تھا۔ ملک کا نام شاید ملکیت کی وجہ سے ہو کیونکہ غلام کسی شخص کی ملکیت ہوتا تھا۔ یہ میرا ذاتی خیال ہے، ممکن ہے کہ درست نہ ہو۔ یہ غلام ہندو مذہب سے تعلق رکھتا تھا۔ نصرت خان، ملک کافور سے بہت متاثر ہوا اور اسے تحفہ کے طور پر علاؤالدین خلجی کو پیش کیا۔ اس کی شکل و صورت ، جسمانی ساخت اور ذہانت سے علاؤالدین خلجی بے حد متاثر ہوا اور اسے اپنے دربار میں ایک اہم جگہ دی۔ اس دوران اس نے اسلام قبول کر لیا اور اس کا نام تاج الدین رکھا گیا۔

ایک وقت آیا کہ یہ علاؤالدین خلجی کا نائب بن گیا۔ اس نے اپنے دور میں منگولوں کا مقابلہ بھی کیا، امروہہ کی لڑائی میں بھی بہادری کے جوہر دکھائے۔ اس کا تعلق جنوبی ہندوستان سے تھا اس نے علاؤالدین خلجی کو اس بات پر راضی کیا کہ وہ اسے جنوبی ہندوستان فتح کرنے کی اجازت دے۔ وہ جانتا تھا کہ جنوبی ہندوستان ایک امیر ترین علاقہ ہے اور وہاں سے بہت سامالِ غنیمت حاصل کیا جا سکتا ہے۔ ملک کافور نے جنوبی

ہندوستان پر چڑھائی کی اور یہاں پر موجود بے شمار مقامی ریاستوں کو فتح کیا۔ ملک کافور نے یہاں سے بہت سامال غنیمت کا اکٹھا کیا اور اسے علاؤالدین خلجی کی خدمت میں پیش کیا۔ علاؤالدین خلجی کی وفات کے بعد اس نے امورِ سلطنت میں دخل اندازی کی کوشش کی جو خلجی کے خاندان کو بہت ناگوار گزری اور انھوں نے اسے قتل کر دیا۔

کہا جاتا ہے کہ وہ علاؤالدین خلجی کے انتہائی وفادار ساتھیوں میں شامل تھا۔ اس نے علاؤالدین خلجی کے کہنے پر اپنا مذہب تبدیل کیا اور اس کی سلطنت کی حفاظت کرتے ہوئے بے شمار لڑائیاں لڑیں۔ اس نے جنوبی ہندوستان کو فتح کیا اور بیش بہا مال و دولت لا کر علاؤالدین خلجی کے حوالے کیا۔ اور آج اس کی قبر کا کوئی نشان بھی نہیں ہے۔

جب بادشاہ چلا گیا تو اس کے وفاداروں کو بھی اسی کے پاس بھیج دیا گیا۔

ایسا تو ہوتا ہے۔۔۔ اور آج تک ہوتا چلا آ رہا ہے۔

یہ تامل ناڈو کی تاریخ میں بہت تفصیل سے لکھا جانے والا ایک واقعہ ہے۔ جب ملک کافور دلی واپس چلا گیا تو مقامی راجہ نے دوبارہ سے اپنی ریاست قائم کر لی۔ ملک کافور اس علاقے پر بہت تھوڑی دیر کے لیے قابض رہا اور دہلی دور ہونے کی وجہ سے زیادہ دیر تک قبضہ برقرار نہ رہا۔

اب تک جو میں نے پڑھا اس سے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ دلی کے حکمرانوں خاص طور پر سلاطین دلی نے سب سے پہلے ان علاقوں پر چڑھائی کی جس کی وجہ ان علاقوں کی دولت تھی لیکن وہ ان علاقوں پر تادیر حکومت قائم نہ رکھ سکے۔ انھوں نے جسے بھی یہاں اپنا جرنیل بنا کر بھیجا، جیسے ہی اسے معلوم ہوتا کہ بادشاہ تبدیل ہو گیا ہے تو وہ بھی آزادی کا اعلان کر دیتا۔ بارہا ایسا ہونے سے ان علاقوں میں کئ مسلمان ریاستیں قائم ہو گئیں۔ جب اورنگزیب نے دکن فتح کیا تو اس نے ان تمام ریاستوں کو ختم کر کے ایک ریاست حیدر آباد کی بنیاد رکھی۔ پھر جوں ہی اورنگزیب کی وفات ہوئی ریاست

حیدرآباد نے بھی آزادی کا اعلان کر دیا۔ تیرہویں صدی کے آغاز سے تقسیم ہند تک کئی مسلمان اور مقامی لوگوں کی ریاستیں برقرار رہیں ۔ کچھ ریاستوں پر انگریزوں نے لڑ کر قبضہ کر لیا اور وہ برٹش انڈیا کا حصہ بن گئیں اور جن ریاستوں نے اتحادی بننے کو ترجیح دی انھیں انگریزوں نے رہنے دیا لیکن وہ بھی تقسیم ہند کے بعد بھارت کا حصہ بن گئیں۔ اب ایسی کوئی ریاست تو موجود نہیں البتہ ریاست کا خاندان آپ کو جگہ جگہ مل سکتا ہے۔

ملک کافور کا ذکر ہمیں بہت کم پڑھنے کو ملتا ہے۔ اس کی کئی وجوہات ہو سکتی ہیں۔ جیسے اس کا غلام ہونا، دوسرا اس کا پیدائشی ہندو ہونا اور تیسرا ایک دور دراز علاقے سے تعلق ہونا۔ میں نے ملک کافور کے بارے جو کچھ پڑھا ہے اور ہاتھ سے بنائی گئی اس کی کچھ تصاویر دیکھی ہیں، ان سب کو دیکھ کر میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ میرے نزدیک ملک کافور کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جن کی قابلیت محنت ودیانت اور وفاداری نے مجھے متاثر کیا ہے۔

ملک کافور کے متعلق کئی کتابوں میں لکھا گیا ہے۔ میں چند کتابوں کے نام درج کر رہا ہوں جن سے آپ مزید معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔ میں نے تمامتر معلومات انھی کتابوں سے لی ہیں۔

رادھے شیام چوریسا کی کتاب History of Medieval India: From 1000 A.D. to 1707 A.D. جارج مائیکل اور مارک زیبر ووسکی کی کتاب Architecture and Art of the Deccan Sultanates, Volume 7 این جیاپلان کی کتاب History of India شانتی صادق علی کی کتاب The African Dispersal in the Deccan: From Medieval to Modern Times اس کے علاوہ بھی کئی مفید کتابیں ہیں۔ ملک کافور کی داستان ایک عجیب و غریب داستان ہے۔

میرے خیال میں ایسی داستان کم ہی پڑھنے کو ملتی ہے۔ بھارت میں اس موضوع پر کئی فلمیں بھی بنی ہیں۔ جن میں کچھ ایسا مواد پیش کیا گیا ہے جس پر بے شمار لوگوں کا اعتراض بھی ہے۔ میں ان اختلافی مسائل پر بات چیت کرنے سے پرہیز کرنے کو بہتر سمجھتا ہوں۔ اس لیے ایسے معاملات پر گفتگو نہیں کرتا۔ میں ایسا کیوں کرتا ہوں۔ اسے آپ کوئی بھی نام دے سکتے ہیں۔

تامل ناڈو اور وادی سندھ : ایک ہی تہذیب کے دو نام

حال ہی میں ہندوستان ٹائم اخبار نے ایک رپورٹ شائع کی ہے۔ جس کے مطابق جدید ترین تحقیق سے یہ بات ظاہر ہو رہی ہے کہ تامل ناڈو اور وادی سندھ کی تہذیبوں میں بے حد مماثلت پائی جا رہی ہے۔ اب اس پر عالمی سطح پر بھی تحقیق شروع ہو چکی ہے۔ تامل ناڈو میں حالیہ کھدائی کے دوران ایک گاؤں سے ملنے والی آرٹ کی بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو کھدائی کے دوران وادی سندھ کے بھی مختلف مقامات سے ملی ہیں۔ ان کی تعداد پندرہ ہزار سے بھی زائد ہے۔ اس بنیاد پر ماہرین کا یہ خیال ہے کہ یہ لوگ وادی سندھ سے جنوبی ہندوستان آئے تھے بنیادی طور پر یہ لوگ دراوڑ نسل سے تعلق رکھتے تھے۔

تحقیق سے ایک اور بات یہ ثابت ہوئی کہ ان لوگوں کا تعلق ہندو مذہب سے نہیں تھا۔ تامل ناڈو میں کھدائی کے دوران کوئی ایسی چیز نہیں ملی جس سے یہ کہا جا سکے کہ وہ لوگ مذہبی طور پر ہندومت کے ماننے والے تھے۔

میں نے جب اسے مزید جاننا چاہا تو مجھے پتہ چلا کہ چھٹی صدی قبل مسیح سے پہلی صدی قبل مسیح یعنی اڑھائی ہزار سال پہلے تک تامل ناڈو کے لوگوں کا وادی سندھ میں آنا جانا تھا۔ تاریخ کی کتابوں میں یہ لکھا ہوا ہے کہ وادی سندھ میں پیدا ہونے والی کپاس سے جو کپڑا بنایا جاتا تھا وہ فراعین مصر مُردوں کو محفوظ کرنے کے لیے استعمال کرتے

تھے۔اس طرح تامل ، وادی سندھ اور مصری تہذیب کے آپسی تعلق کی نشاندہی ہوتی ہے۔

بھارت میں شائع ہونے والے ایک اخبار دی ہندو نے ستمبر 2019ء میں ایک تفصیلی رپورٹ شائع کی ہے جس میں یہ بتایا گیا کہ وادی سندھ اور تامل ناڈو کی تہذیب کے درمیان بہت زیادہ مماثلت پائی جاتی ہے[35]۔ بہت سے ماہرین کا خیال ہے کہ یہ دونوں تہذیبیں آپس میں بہت ملتی جلتی تھی۔ میں نے تامل کے علاقے میں پائے جانے والے آثارِ قدیمہ اور موہن جو داڑو اور ہڑپہ کی تصاویر کا موازنہ کیا، مجھے ان میں بہت زیادہ مماثلت نظر آئی لیکن جب تک اس کا کوئی سائنسی ثبوت سامنے نہیں آتا تب تک کوئی بات حتمی طور پر نہیں کہی جا سکتی۔

میں نے بھی مشاہدہ کیا کہ وادی سندھ کے رہنے والے لوگ جس طرح کے بیل پالتے ہیں وہ تامل ناڈو کے بیلوں سے خاصے ملتے جلتے ہیں۔ اگر میں کپڑوں کے حوالے سے بات کروں تو یوں لگتا ہے کہ جیسے مدراسی پرنٹ بہت مشہور تھے بالکل اسی طرح وادی سندھ میں اجرک کا پرنٹ بھی بے حد مشہور ہے۔ اس طرح کی کئی چیزیں ماہرین کے نظریے کو ماننے میں معاون ثابت ہو رہی ہیں۔

آپ یہ نہ سمجھیے کہ میں زبردستی تامل ناڈو اور وادی سندھ کو آپس میں رشتہ دار ثابت کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ جہاں سائنس دانوں نے اپنے خیالات ظاہر کیے وہاں مجھے بھی تو اپنا خیال ظاہر کرنے کا اختیار ہے۔اُس وقت تک یہ سب مفروضہ ہے جب تک کوئی سائنسی ثبوت سامنے نہیں آجاتا۔

---

[35] https://www.hindustantimes.com/india-news/new-study-connects-tamil-nadu-with-indus-valley-civilisation/story-ESlR55vEIZQPvq2Q0jXeVP.html

انا إسحاق نے اس موضوع پر ایک تفصیلی مضمون لکھا ہے جس کا عنوان ہے Major discovery in Tamil Nadu's Keezhadi: A possible link to Indus Valley Civilisationاس مضمون میں انا إسحاق نے اس بات کی کھوج کی ہے تامل ناڈو سے ملنے والے آثارِ قدیمہ سے اس بات کا ثبوت ملنے کا کافی امکان ہے کہ اس علاقے کا وادیِ سندھ سے ایک گہرا تعلق رہا ہے[36]۔

اس بارے میں اروا تھام مایدوان نے اپنی کتاب Early Tamil Epigraphy from the Earliest Times to the Sixth Century A.D.میں اس بات کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ دونوں علاقے زمانہ قدیم سے ایک دوسرے کے ساتھ رابطے میں رہے ہیں۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اس بات کا قوی امکان ہے کہ جب کسی وجہ سے سندھ میں بسنے والے لوگ مشکل میں تھے تو انھوں نے تامل ناڈو کی طرف نقل مکانی کی اور اسی طرح کا رہن سہن یہاں شروع کیا۔

تامل ناڈو میں ایک بہت ہی دلچسپ کھیل کھیلا جاتا ہے جسے جالی کاٹو کہتے ہیں۔اس کھیل کے کئی اور نام بھی ہیں یہ ایک صدیوں پرانا کھیل ہے۔ میں نے اس کی کئی ویڈیوز دیکھی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ انتہائی خطرناک کھیل ہے۔اس کھیل میں ایک طاقتور اور بڑے بڑے نوکدار سینگوں والے بیل کو مجمع میں کھلا چھوڑ دیا جاتا ہے۔ درمیان میں کافی کھلی جگہ ہوتی ہے جہاں لوگ اسے تنگ کرتے ہیں جس پر بیل مشتعل ہو جاتا ہے اور لوگوں کو مارنے دوڑتا ہے۔ لوگ بچنے کے لیے ارد گرد لگے جنگلوں کے پیچھے چلے جاتے ہیں۔ کچھ لوگ بیل کے سامنے بھی آ جاتے ہیں۔اس کھیل میں بیل کو قابو کرنا لوگوں کے لیے ایک چیلنج ہوتا ہے۔کچھ وقت کے بعد بیل تھک جاتا

[36]https://www.thenewsminute.com/article/major-discovery-tamil-nadu-s-keezhadi-possible-link-indus-valley-civilisation-109165

ہے تو پھر کوئی نوجوان آگے بڑھتا ہے اور اس کی کمر کے ابھرے ہوئے حصے آپ اسے بیل کا کوہان بھی کہہ سکتے ہیں کو پکڑ کر اس کے ساتھ لٹک جاتا ہے اور پھر دونوں میں مقابلہ ہوتا ہے۔ بیل آدمی کو گرانے کی کوشش کرتا ہے۔ اور اسے قابو کرنے کی اس کشمکش میں کافی وقت گزر جاتا ہے۔ بالآخر بیل تھک کر ایک جگہ پر رُک جاتا ہے۔ اس پر کھیل ختم ہو جاتا ہے۔ اس کھیل میں لوگ زخمی بھی ہو جاتے ہیں۔ کچھ لوگ اس کھیل کے خلاف ہیں اور وہ سپریم کورٹ تک گئے۔ عدالت نے اس کھیل پر محدود پابندی بھی لگائی ایک صدیوں پرانے کھیل کو ختم کرنا مشکل ہوتا ہے۔ یہی اس کھیل کے ساتھ بھی ہوا۔

اگر آپ بھی خوبصورت بیل دیکھنے اور قابو کرنے والا منظر دیکھنا چاہتے ہیں تو اس کے لیے سوشل میڈیا پر بے شمار ویڈیوز موجود ہیں۔ پہلی مرتبہ یہ کھیل آج سے پچیس سو سال پہلے کھیلا گیا تھا۔ میں نے ایک ویڈیو دیکھی جس میں ایک بیل تھک کر کھڑا ہو جاتا ہے، اس دوران اس کا مالک آتا ہے اور وہ بیل کے منہ کو اپنے کندھے پر رکھ کر اسے پیار کرتا ہے اور بیل بھی اس کے ساتھ بے حد محبت کا اظہار کرتا ہے۔

مجھے یاد ہے کہ میرا خاندان تقسیم ہند سے پہلے خوبصورت بیل پالنے کے سلسلے میں علاقے بھر میں مشہور تھا۔ میرے پردادا علی بخش مانگٹ ایک مانے ہوئے بیل شناس تھے۔ ہمارا آبائی علاقہ ریاست پٹیالہ کا شہر سرہند تھا۔ تقسیم ہند کے بعد میرے دادا جان نے پنڈی بھٹیاں میں اپنے بھائیوں کے ساتھ مل کر کاشتکاری شروع کی۔ اس دوران میں بھی ان کے پاس جایا کرتا تھا۔ دادا جان نے بڑے خوبصورت بیل رکھے ہوئے تھے جو مجھے بے حد پسند تھے۔ میں ان سے اسی طرح سے پیار کرتا تھا جیسے بچے آپس میں ایک دوسرے سے پیار کرتے ہیں۔ میں اب بھی خواہش رکھتا ہو کہ زندگی رہی تو میں بھی اپنی خاندانی روایت کا پاس رکھتے ہوئے بیل پالوں گا۔

600 BC city found in Tamil Nadu shows a link with Indus Valley civilization Photo Credit: https://www.hindustantimes.com|

The Meenakshi Temple is a famous pilgrimage spot, and pilgrims from all over India Photo Credit: https://www.thetoptours.com

مدراس: ہندوستان کا معاشی مرکز

وقاص جعفری بھائی اور میں نے مل کر چنائی کے کئی علاقے دیکھے۔ میں آپ کو یہ بتانا چاہوں گا مدراس شہر کب آباد ہوا اور کن لوگوں نے اسے آباد کرنے میں اپنا

کردار ادا کیا اس وقت یہ شہر کن باتوں کے لیے مشہور ہے اور بھارتی معاشی اور معاشرتی ترقی میں یہ کتنا اہم کردار ادا کر رہا ہے؟

ایک پرتگیزی سیاح، واسکوڈے گاما 1498ء میں ہندوستان آیا۔ اس سے ہندوستان اور پرتگال کے درمیان ایک رابطہ قائم ہو گیا۔ ایم این پیرسن نے اپنی کتاب The Portuguese in India میں لکھا ہے کہ واسکوڈے گاما جس نے کئی سال قبل اپنے سفر کا آغاز کیا تھا نے 20 مئی 1498ء کو کلکتہ میں اپنے سفر کیا اختتام کیا تھا۔ یہ کسی بھی یورپین کا ہندوستان کی زمین پر پہلا قدم تھا اور ہندوستان اور یورپ کے درمیان رابطہ کا یہ نقطہ آغاز ہے۔ ایم این پیرسن مزید لکھتے ہیں کہ 1522ء میں پرتگیزی وہ پہلے یورپین ہیں جو تجارت کی غرض سے اس علاقے میں آئے اور 1608ء میں ان کے بعد انگریزوں نے سورت کے مقام پر ہندوستان میں اپنا پہلا قدم رکھا۔ ان کے ساتھ ساتھ فرانسیسی اور ڈچ بھی ہندوستان آئے۔ یہ ایک بڑی دلچسپ تاریخ ہے کہ کس طرح اہلِ مغرب نے ہندوستان کی سرزمین پر قبضہ کیا اور یہاں کے لوگوں کو اپنا غلام بنایا۔ اس تاریخ کو پڑھ کر اس کا موازنہ موجودہ حالات سے کرنا چاہیے اس سے کئی باتوں کو سمجھنے میں آسانی ہو سکتی ہے۔ چنائی، تامل ناڈو کا ایک اہم شہر ہے اور اپنی صدیوں پرانی تاریخ رکھتا ہے لیکن اس وقت میں آپ کے سامنے اس کی پچھلی چار صدیوں کی تاریخ بیان کرنا چاہتا ہوں۔

ایک وقت آیا کہ ہالینڈ سے آئے ہوئے لوگوں نے ہندوستان میں اپنا قدم رکھا اور اپنی تجارتی کوٹھیاں بنائیں۔ انھی دنوں انگریز بھی اس علاقے میں آنا شروع ہو گئے۔ اس وقت اس علاقے میں بہت اعلیٰ طریقے سے کپڑے پر پرنٹنگ کا کام کیا جاتا تھا اور ایسے کپڑے کی یورپ میں بہت مانگ تھی۔

ڈیوڈ گللیمور نے اپنی کتاب The British in India: Three Centuries of Ambition and Experienceمیں لکھا ہے کہ انگریزوں اور باقی یورپین لوگوں کی سب سے زیادہ دلچسپی اسی کپڑے میں تھی۔ مقامی لوگوں کی مہارت میں کمی اور محدود پیداواری صلاحیت کی وجہ سے انھیں اپنی ضرورت کے مطابق کپڑا دستیاب نہ تھا۔ جس کی وجہ سے انگریزوں نے اس علاقے میں اس کام کے لیے ایک فیکٹری لگانے کا فیصلہ کیا۔ اس وقت تک وہ سورت میں اپنی فیکٹری لگا چکے تھے۔ ڈیوڈ گللیمور نے اپنی ایک کتاب میں The British in India: A Social History of the Rajاس بات کا ذکر کیا ہے کہ 1615ء وہ سال ہے جب انگریزوں نے ہندوستان میں اپنا پہلا تجارتی دفتر کھولا اور ہندوستان سے مصالحہ جات، پارچات لے جانا شروع کیا اور یورپ سے ہتھیار اور سونا چاندی لانا شروع کیا۔ وہ مزید لکھتے ہیں کہ

اس کام کے لیے انھوں نے 1639ء میں مدراس کے ایک مقامی راجہ سے کچھ جگہ حاصل کرکے وہاں اپنی فیکٹری لگائی اور ساتھ ہی رہائش کے لیے

George .Fort St کے نام سے ایک بستی بھی بسالی۔

انگریز بڑی تعداد میں اس بستی میں آکر رہنے لگے۔ اسی دوران میں انگریزوں نے اپنی فوجی طاقت میں بھی اضافہ کرنا شروع کر دیا۔ ان کا خیال تھا کہ تجارتی مفادات کے تحفظ کے لیے فوجی طاقت کا ہونا ضروری ہے۔ یہ انگریزوں کے پہلے فوجی تھے جنھوں نے ہندوستان کی دھرتی پر تجارت کے ساتھ ساتھ زبردستی قبضے کا آغاز کیا۔ اس کے بعد حالت یہ تھی کہ تجارتی مہارت ہو یا جنگی حکمت عملی، دونوں میں یہ لوگ مقامی آبادی سے کہیں آگے تھے۔ ان کے ساتھ ساتھ ڈچ، فرانسیسی اور پرتگیزی بھی کسی سے پیچھے نہ رہے۔ ابھی ان کے درمیان لڑائیاں شروع نہیں ہوئی تھیں۔

مدراس میں واقع فورٹ کو وائٹ ٹاؤن اور باقی لوگوں کی بستیوں کو بلیک ٹاؤن کہا جاتا تھا۔ انگریزوں کی آمد سے مقامی لوگوں میں ایک عدم تحفظ کا احساس پیدا ہونا ایک فطری بات تھا۔ مقامی لوگوں نے کئی مرتبہ انگریزوں کے خلاف چھوٹے پیمانے پر لڑائیاں بھی کی لیکن اپنی کمزوریوں کی وجہ سے اکثر ناکام رہے۔ انگریزوں کا بنایا ہوا قلعہ ابھی بھی موجود ہے۔ میری بڑی خواہش تھی کہ میں وہ قلعہ دیکھ سکوں لیکن دور ہونے کی وجہ سے ہم اسے نہ دیکھ سکے۔

قلعے کے ارد گرد شہر آباد ہونا شروع ہو گیا اور ایک وقت ایسا آیا کہ اس شہر کی آبادی چالیس ہزار ہو گئی جن میں اکثریت انگریزوں کی تھی۔ انگریزوں کو مراعات حاصل کرنے کے لیے مغل حکمرانوں کے سامنے پیش ہونا پڑتا تھا۔ تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ مغل فوجوں نے انگریزوں اور دیگر یورپینز کو بڑی تعداد میں قتل کیا۔ میرے لیے اس بات کا یقین کرنا بہت مشکل ہے۔ یہ بات کئی لوگوں نے لکھی ہے لیکن کوئی مصدقہ حوالہ نہیں ملا۔ یاد رہے کہ یہ وہ دور تھا جب دلی میں اکبر اور جہانگیر یکے بعد دیگرے بادشاہ تھے۔ مغلیہ سلطنت کے خاتمے کے بعد ان علاقوں میں انگریزوں اور دیگر یورپینز کے سامنے کوئی بڑی رکاوٹ نہ رہی۔ اب دو قابض گروہوں کے درمیان مقابلہ تھا۔ تاریخ میں اس کشمکش کو انگریزوں اور فرانسیسیوں کی جنگوں کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

ایک وقت آیا کہ فرانسیسیوں نے انگریزوں کو شکست دی اور انھیں اس علاقے سے بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ لیکن جلد ہی انگریز دوبارہ قابض ہو گئے۔ اس دور میں انگریزوں اور حیدر علی، بعد میں ٹیپو سلطان کے درمیان جنگیں بھی ہوئیں۔ ان جنگوں میں فرانسیسیوں نے ریاست میسور کا ساتھ دیا۔ ریاست میسور کے خاتمے کے بعد علاقے پر انگریزوں کا مکمل قبضہ ہو گیا۔

مدراس کی بندرگاہ تجارت کے لیے بے حد اہم تھی۔ اسی دور میں صرف دو سال کے اندر قحط کی وجہ سے 40 لاکھ لوگ بھوک سے مرے۔ یاد رہے اُس وقت یہاں کی تمام تر تجارت پر انگریزوں کا قبضہ تھا۔ بعد ازاں انگریزوں نے اس علاقے میں مدراس پریذیڈنسی کے نام سے اپنی حکومت شروع کی اور اس شہر میں ریلوے لائن کا انتظام کیا، سٹاک ایکسچینج بنائی، بے شمار تعلیمی ادارے بنائے، معاشی اور معاشرتی ترقی کے لیے کئی دوررس اقدامات کیے جن سے عام لوگ اب تک مستفید ہو رہے ہیں۔ انگریزوں کے ان کاموں سے انکار ممکن نہیں۔ جنگ عظیم اوّل میں جرمنز نے مدراس کی بندرگاہ پر حملہ کیا اور تیل کے بہت سارے گودام تباہ کر دیے۔ جس میں پانچ مقامی افراد کی موت واقع ہوئی اور ایک تجارتی جہاز بھی تباہ ہوا۔ ڈیوڈ گللیمور نے ان تمام باتوں کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔

چنائی خلیج بنگال کی ایک ساحلی پٹی پر واقع ہے۔ اس وقت یہ جنوبی ہندوستان کا سب سے بڑا تجارتی مرکز اور ہندوستان کے گنجان آبادی والے شہروں کی فہرست میں چھٹے نمبر پر ہے۔ بھارت میں آنے والے سیاحوں کی اکثریت اسی شہر میں آتی ہے۔ چند سال قبل بھارت نے میڈیکل ٹورازم کے نام سے ایک پروگرام شروع کیا تھا۔ اس پروگرام کے تحت یورپ اور امریکہ میں کام کرنے والے بھارتی ڈاکٹرز نے بھارت میں ہسپتال بنائے اور ان کا معیار وہی رکھا جو مغرب میں تھا۔ یہاں پر کئی چیزوں کے سستا ہونے کی وجہ سے انھوں نے مغربی ممالک کے لوگوں کو پیشکش کی کہ وہ علاج کے لیے بھارت آئیں۔ اس کے بعد پوری دنیا سے لوگ بھارت میں علاج کروانے کے لیے آنے لگے۔ اس کام میں چنائی سب سے آگے ہے۔ چنائی کو بھارت کا انڈر رائٹ بھی کہا جاتا ہے کیونکہ بھارت میں بننے والی ہر تیسری گاڑی چنائی میں تیار ہوتی ہے۔

چنائی، دہلی سے کم و بیش 2200، ممبئی سے 1350 اور بنگلور سے 350 کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ چنائی کو یہ بھی اعزاز حاصل کہ 1884ء میں یہاں ایک میٹنگ ہوئی جس میں سترہ لوگ شریک تھے اس میٹنگ میں سیاسی مفادات کے تحفظ کے

لیے ایک سیاسی جماعت بنانے کا نظریہ پیش کیا گیا اور پھر اسی نظریہ کو آگے بڑھا کر کانگریس کی بنیاد رکھی گئی۔ انگریزوں کے دور میں بنائی جانے والی عمارتیں یورپی طرز کی ہیں۔ البتہ کہیں کہیں ہندو اور اسلامی طرز تعمیر بھی نظر آتا ہے لیکن وہ بہت کم ہے۔

ہندی کو سرکاری زبان بنانے کی کوشش کے خلاف مقامی لوگوں نے ایک تحریک چلائی جو کامیاب ہوئی اور اب تامل، تامل ناڈو کی سرکاری زبان ہے۔ انگریزی زبان کا چلن بھی عام ہے۔ شہر کی خوبصورت عمارتوں میں مدارس ہائی کورٹ کی بلڈنگ جو 1892ء میں بنائی گئی تھی اپنی ایک الگ ہی شان رکھتی ہے۔ چنائی کا جی ڈی پی 90 بلین ڈالر ہے یعنی پاکستان کے جی ڈی پی کا تقریباً تیسرا حصہ۔ آئی ٹی کی برآمدات میں یہ شہر بھارتی شہروں میں دوسرے نمبر پر ہے۔ سترہویں صدی میں برطانیہ کو ٹیکسٹائل کی ایکسپورٹ اسی شہر سے شروع ہوئی۔ اس وجہ سے تین سو سال تک یہ شہر ٹیکسٹائل کی صنعت کا مرکز رہا ہے۔ اب ٹیکسٹائل کا تو اتنا بڑا حصہ نہیں ہے۔ اس وقت یہ شہر آئی ٹی اور آٹو موبائل کے لیے بہت مشہور ہے۔

ٹیکسٹائل کانفرنس: ایک روایتی گیت اور رقص

ٹیکسٹائل کانفرنس چنائی کے ایک فائیو سٹار ہوٹل میں منعقد ہوئی جس میں چالیس ممالک سے سو کے قریب لوگ شریک ہوئے۔ پاکستان سے ہم تین لوگ تھے۔ جن میں عمر صاحب اور میرے علاوہ کریسنٹ گروپ کے ایک ڈائریکٹر بھی شامل تھے۔ انھوں نے ایک سیشن کی صدارت بھی کی، جو ہمارے لیے ایک اعزاز تھا۔ کانفرنس میں بے شمار لوگوں سے ملنے کا موقع ملا۔ میں اس سے قبل بھی استنبول میں ہونے والی اسی طرح کی ایک کانفرنس میں شریک ہو چکا تھا، اس لیے کئی چیزیں میرے لیے پرانی تھیں۔ عام طور پر کانفرنس کا پہلا سیشن بہت بھرپور ہوتا ہے اور اس کی صدارت کے لیے کسی نہ کسی مشہور شخصیت کو بلایا جاتا ہے۔ کانفرنس کے پہلے سیشن میں مجھے ایک خوبصورت

فقرہ سننے کو ملا، یقیناً آپ بھی اسے پسند کریں گے۔ میں نے پچھلے بیس سال میں بہت سے لوگوں سے یہ بات کی ہے اور سب نے اس سے خوب لطف اٹھایا۔

کانفرنس کے ابتدائی سیشن کی صدارت کے لیے ایک صاحب کو بلوایا گیا جو چنائی میں واقع کئی ٹیکسٹائل ملز کے مالک تھے اور اسی ناطے بہت سی فلاحی تنظیموں سے بھی منسلک تھے۔ اسٹیج پر کھڑے صاحب نے ان کا تعارف بڑے زور دار طریقے سے کروایا اور کئی منٹ تک ان کی خدمات کا ذکر کرتے رہے۔ ایسا کرنا بالکل جائز بھی تھا کیونکہ وہ صاحب واقعی ایسی تعریفوں کے لائق تھے۔ ان کی عمر ستر سال کے قریب ہوگی۔ جب انھیں بلوایا گیا تو انھوں نے سب سے پہلے شکریہ ادا کیا، خوش آمدید کہا، پھر کچھ دیر خاموش کھڑے رہے اور کہنے لگے کہ اگر آپ نے میری اتنی تعریفیں کرنی تھیں اور اتنے سارے لوگوں کے سامنے مجھے بہت ہی عظیم آدمی ثابت کرنا تھا تو یہ بات مجھے پہلے بتانی چاہیے تھی۔ ان کی یہ بات سن کر اسٹیج پر کھڑے صاحب نروس ہو گئے کہ جانے میں کون سی غلطی کر بیٹھا ہوں۔

چند لمحوں بعد صاحب صدر نے کہا کہ اگر مجھے یہ پتہ ہوتا کہ میرے متعلق آپ لوگوں کی یہ رائے ہے تو اپنی بیوی کو بھی ساتھ لے آتا اور اسے بتاتا کہ دیکھو تم جسے گھر میں گھاس تک نہیں ڈالتی اور ہر وقت یہی کہتی رہتی ہو کہ تمھیں کچھ پتہ نہیں، دیکھو لوگ ایسے شخص کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟

ان کا یہ کہنا تھا کہ پورا ہال تالیوں سے گونج اٹھا اور سب ہی ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر ہنسنے لگے اور اکثر لوگوں نے کہا کہ اس میں ہمارے لیے بھی سبق ہے۔

میں نے بھی ایک آدھ مرتبہ ایسی ہی کوشش کی لیکن یقین مانیں کہ سارا زمانہ تو مان سکتا ہے کہ آپ ایک بڑے آدمی ہیں لیکن آپ کی بیوی نہیں مان سکتی۔ یہ میرا دعویٰ ہے۔ آزمائش شرط ہے۔

کانفرنس کی روایت ہے کہ پہلے دن کے اختتام پر ایک کلچرل شو ہوتا ہے جس میں مقامی کلچر سے جڑا کوئی پروگرام پیش کیا جاتا ہے، جیسے کوئی فوک میوزک، رقص وغیرہ۔ جب ٹیکسٹائل کانفرنس لاہور میں منعقد ہوئی تھی تو یہاں بھی ایک مقامی فنکار کو بلوایا گیا تھا۔ انھوں نے بھی کچھ لوک فنکار بلوائے ہوئے تھے۔ جنھوں نے ایک منفرد قسم کی پرفارمنس دی۔

اسٹیج پر دس کے قریب لوگ مختلف ساز لے کر ایک دائرے کی شکل میں بیٹھ گئے۔ ان کے گلوں میں رومال تھے، انھوں نے صرف ایک دھوتی پہنی ہوئی تھی اور ان کے ماتھوں پر سفید نشان لگے ہوئے تھے۔ گرم مرطوب علاقوں میں سخت پسینہ آتا ہے اس لیے آپ کو اکثر لوگ بغیر قمیض کے ہی نظر آتے ہیں۔ ان کے ساتھ ایک لڑکی بھی تھی جس نے مدراس کا روایتی لباس پہن رکھا تھا۔

فنکاروں نے میوزک شروع کیا اور ساتھ ہی تامل زبان میں کچھ گانے بھی سنائے۔ لڑکی نے بھی رقص شروع کر دیا۔ جسے رقص کہنا مشکل ہے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اشاروں میں کوئی کہانی بیان کر رہی ہو۔ کبھی وہ آسمان کی طرف دیکھتی تو کبھی وہ ہاتھوں کو پھیلا کر ہاتھ میں پکڑے تصوراتی برتن کو دیکھتی۔ کبھی وہ زمین پر جھک جاتی اور یوں محسوس ہوتا کہ جیسے وہ زمین میں پودے لگا رہی ہے۔ وہ کبھی کبھار آسمان کی طرف دیکھتی اور اپنے ہاتھوں کو دعائیہ انداز میں پھیلاتی۔ غیر ملکی لوگ بھی یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے اور یقیناً کسی کو اس کی سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیا ہو رہا ہے۔ میرا بھی یہی حال تھا۔ میرے ساتھ ایک مقامی صاحب تشریف فرما تھے۔ میں نے ان سے اس بارے میں جاننا چاہا جس پر انھوں نے مجھے بہت ہی اچھے انداز میں بتایا کہ یہ اس علاقے کی ایک لوک کہانی ہے جو لڑکی اپنے جسم کو مختلف حرکات دے کر سنا رہی ہے۔ انھوں نے بتایا کہ آپ کے علم میں ہے کہ ہمارے علاقے میں چاول بڑی مقدار میں پیدا ہوتا ہے جس کے

لیے بارشیں انتہائی ضروری ہیں۔اس کہانی میں یہ بتایا جارہاہے کہ بارش نہ ہونے کی وجہ سے چاول کی فصل تیار نہیں ہو رہی اور خوف ہے کہ اگر مطلوبہ مقدار میں چاول پیدا نہ ہوا تو کہیں قحط نہ پڑ جائے۔ لڑکی بار بار ہاتھ اٹھا کر اوپر والے سے دعا مانگ رہی ہےاور اسے دکھا رہی ہے کہ میرے برتن خالی ہیں، میرے کھیت سوکھے ہیں اور بارش نہ ہوئی تو میرا خاندان بھوکوں مر جائے گا۔ انھوں نے مجھے اس رقص کے بارے میں اسی طرح کی بہت سی تفصیلات بتائیں۔ مجھے وہ بہت ہی منفرد لگا۔ وہ تقریباً ایک گھنٹے سے زیادہ کا پروگرام تھا۔ میرا خیال ہے کہ میرے علاوہ اس پروگرام میں شریک کسی بھی غیر ملکی کو معلوم نہ تھا کہ کیا ہو رہا ہے؟

میں نے شروع ہی میں تفصیلات معلوم کرلی تھیں اس لیے مجھے اس خاتون کی تمام باتیں سمجھ آ رہی تھیں۔ایک قدیم ترین روایت کو برقرار رکھنے پر میں نے اپنے ساتھ بیٹھے صاحب سے کہا کہ یہ تو ایک صدیوں پرانی روایت ہے جسے آپ لوگ زندہ رکھے ہوئے ہیں۔اس پر انھوں نے بتایا کہ جب بھی ہمارے ہاں کوئی مہمان آتے ہیں تو ہم ان کے سامنے اسی طرح کا شو پیش کرتے ہیں۔انھوں نے یہ بھی بتایا کہ بے شمار قدیم کہانیاں ہیں جن میں پیار محبت کے قصے بھی ہیں جو جسمانی حرکات کی مدد سے پیش کیے جاتے ہیں۔کچھ لوگ اسے اعضا کی شاعری بھی کہتے ہیں۔

شمالی اور جنوبی ہندوستان : زمینی، معاشی و معاشرتی فاصلے

بھارت اٹھائیس ریاستوں اور آٹھ مرکزی علاقہ جات پر مشتمل ایک ملک ہے۔آبادی کے لحاظ سے اس کی سب سے بڑی ریاست اتر پردیش ہے جس کی آبادی بیس کروڑ جبکہ رقبہ اڑھائی لاکھ مربع کلو میٹر ہے۔اس کی آبادی پاکستان کے برابر اور رقبہ میں کم و بیش تین گنا کم۔ سب سے کم آبادی والی ریاستوں میں سکم اور میزورام شامل ہیں جنکی آبادی دس لاکھ سے بھی کم ہے۔

شمالی، وسطی، جنوبی اور مغربی ہندوستان کے سفر کے دوران میں نے محسوس کیا کہ ہندوستان میں مختلف تہذیبیں پائی جاتی ہیں جو واضح طور پر ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ میں نے جب بھارت کی ریاستوں کے بارے میں مزید جانا تو اس نتیجے پر پہنچا کہ بھارت میں چھ مختلف تہذیبیں آپس میں مل جل کر مرکز کے تحت ایک قوم بن کر رہ رہی ہیں۔ یہ سب لوگ بھارتی کہلاتے ہیں اور بھارت ماتا کی بات کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اختلافات اپنی جگہ پر موجود ہیں اور رہیں گے لیکن ہم ایک خاندان ہیں، ہماری ماں ایک ہے اور ہم سب آپس میں کزن ہیں۔ ان علاقوں کے درمیان کوئی واضح لائن لگانا نہایت ہی مشکل ہے۔ میں نے جو تقسیم کی ہے اس کی بنیاد وہ معلومات ہیں جو میں نے مختلف ذرائع سے حاصل کی ہیں۔ ان سے اختلاف ممکن ہے۔ ان چھ مختلف تہذیبوں کے نام کچھ اس طرح سے ہیں۔

شمالی علاقے جن میں پنجاب، ہریانہ، دہلی، اتر پردیش وغیرہ پائے جاتے ہیں۔ جنوبی علاقے جن میں، آندھرا پردیش، تامل ناڈو، تلنگانہ، کیرالہ، کرناٹک وغیرہ شامل ہیں۔ مغربی علاقے جن میں گجرات اور راجستھان کے علاوہ بھی کئی علاقے شامل کیے جا سکتے ہیں۔ مرکزی ہندوستان میں مدھیہ پردیش اور چھتیس گڑھ کو رکھا جا سکتا ہے۔ شمال مشرقی ہندوستان میں آسام، منی پور، میزورام، سکم اور تری پورا کے علاقے گنے جا سکتے ہیں۔ مشرقی علاقوں میں بہار، جارکھنڈ، اڑیسہ پایا جاتا ہے۔

میں شمالی اور جنوبی علاقوں کے درمیان معاشی و معاشرتی فرق اور ان کی سوچ آپ کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں۔ اس کا مقصد آپ کو ایک نہایت ہی تاریخی حقیقت سے آگاہ کرنا ہے، جس کے بارے میں مجھے بھی علم نہیں تھا۔

یہ ہم سب کو معلوم ہے کہ باہر سے آنے والے لوگ ہندوستان میں دو بڑے راستوں سے داخل ہوئے۔ مغربی سمت سے وسطی ایشیا، ایران اور افغانستان سے لوگ

آئے۔ ان کا اثر زیادہ تر شمالی ہندوستان پر ہی رہا اور یہ لوگ درہ خیبر کے ساتھ ساتھ وسطی ہندوستان اور بنگال پر بھی قابض رہے۔ ان لوگوں کا جنوبی ہندوستان تک بھی جانا ہوا لیکن ان کا اصل ٹھکانا شمالی اور وسطی ہندوستان ہی تھا۔اس کے ساتھ ساتھ مشرقی ہندوستان کے بھی بہت سے علاقے ان کے کنٹرول میں تھے۔ ہندوستان میں جنوب کی طرف سے آنے والے لوگ یورپین اور عرب تھے جو سب سمندر کے راستے ہندوستان میں داخل ہوئے۔

مغرب کی طرف سے آنے والے لوگ جنگجو تھے۔ وہ فوجوں کے ساتھ آئے۔ انھوں نے بہت زیادہ جنگیں لڑیں۔ پہلا حملہ سکندر نے کیا جس کا مقابلہ ایک مقامی حکمران نے کیا۔ بعد ازاں جو لوگ بھی آئے انھیں مقامی لوگوں نے روکنے کی کوشش کی جس کے نتیجے میں بہت بڑی بڑی جنگیں ہوئیں لیکن وہ ناکام ہوئے۔ اس طرح مغرب سے آنے والے لوگ شمالی ہندوستان پر صدیوں تک حکمرانی کرتے رہے۔

اس وجہ سے شمالی ہندوستان کے لوگ جنگوں سے بہت اچھے طریقے سے آشنا ہیں۔ بھارت اور پاکستان کی فوج میں ان علاقوں کے رہنے والوں کی اکثریت پائی جاتی ہے۔ جنگوں کی وجہ سے یہاں کے لوگوں کو نقل مکانی بھی کرنا پڑتی تھی اسی وجہ سے یہ لوگ ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے میں عار محسوس نہیں کرتے۔جب یہ لوگ اپنے علاقے سے دوسرے علاقوں میں گئے تو اپنی تہذیب سے بھی ان کا تعلق کمزور ہو گیا اور انھوں نے دوسروں کی باتوں کو اپنانا شروع کر دیا۔ شمالی علاقہ جات میں بے شمار دریا صحرا اور پہاڑ موجود ہیں یہ علاقے کافی کھلے اور جنوب کی نسبت کم گنجان آباد ہیں۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ افریقہ سے بھی لوگ یہاں آئے لیکن اس بات کے حق میں مجھے کوئی زیادہ معلومات نہ مل سکیں۔

سمندر کے راستے آنے والے تاجر پہلے کئی سو سال تک تو صرف تجارت ہی کرتے رہے۔ مقامی لوگوں نے ان کے ساتھ تعاون کیا۔ انھیں فیکٹریاں لگانے اور رہنے کے لیے جگہ بھی دی اور ان سے بہت کچھ سیکھا بھی۔ یہاں پر چار بڑے ممالک سے لوگ آئے جن میں برطانیہ، پرتگال، ڈچ اور فرانس شامل ہیں۔ کچھ لوگ تو جلد واپس چلے گئے لیکن انگریز یہاں دیر تک رہے۔ اسی طرح عرب تاجر بھی یہاں آئے اور انھوں نے اسلام کی تبلیغ بھی کی جس سے اس علاقے کے لوگوں کی بڑی تعداد مسلمان ہوئی۔ مسلمانوں کی سندھ کی فتح بھی ایک فوجی کاروائی کا نتیجہ تھی۔

مجھے پہلی مرتبہ علم ہوا کہ نبی پاک ﷺ کی حیات مبارکہ ہی میں کیرالہ کے راجانے چاند کے دو حصوں میں تقسیم ہونے والے واقعے سے متاثر ہو کر آپ ﷺ کو پیغام بھجوایا کہ میں نے آپ کے ماننے والوں کی عبادت کے لیے ایک جگہ مختص کر دی ہے۔ یہ ہندوستان میں بننے والی پہلی مسجد ہے جس کا نام چیرامان مسجد ہے۔ پرتگیزیوں کے ایک حملے میں یہ مسجد شہید ہو گئی تھی۔ اب اسے دوبارہ سے تعمیر کیا گیا ہے۔ اس واقعہ کی تفصیل تاریخ کی کتابوں میں موجود ہے۔ اس کی تصاویر سوشل میڈیا پر موجود ہیں۔

مہرداد شاکونی نے اپنی کتاب Muslim Architecture of South India: The Sultanate of Ma'bar and the Traditions of Maritime Settlers on the Malabar and Coromandel Coasts (Tamil Nadu, Kerala and Goa) میں اس مسجد کے بارے میں لکھا ہے (صفحہ نمبر 141) کہ یہ مسجد آٹھویں ہجری میں اس وقت بنائی گئی جب یہاں کا راجہ ایک صحابی کی تبلیغ کے نتیجہ میں مسلمان ہوا۔ یہ وہ وقت تھا جب اسلام کی دعوت عرب سے نکل کر عجم میں پھیل رہی تھی۔ یہ سب جان کر میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ مالا بار کے اس علاقے میں قائم ہونے

والی مسجد جو پوری شان و شوکت کے ساتھ اب بھی موجود ہے ہندوستان بھر میں پہلی مسجد ہے اور یہاں کا راجہ پہلا مسلمان ہے۔

Kerala's Cheraman Juma Masjid, India's Oldest Mosque
Photo Credit: https://www.india.com

کچھ عرصے بعد جب انگریزوں نے جنوبی ہندوستان میں اپنے قدم جما لیے اور جنوبی علاقے کے لوگوں نے ان کے ساتھ مل جل کر رہنا سیکھ لیا تو انھوں نے شمال کی طرف سفر کرنا شروع کیا۔ جو مان جاتا انگریز اسے اتحادی بنا لیتے اور جو نہ مانتا اس سے جنگ کرکے اس کی ریاست پر قبضہ کر لیتے۔ انھوں نے سورت 1608ء میں اور 1639ء میں مدراس میں قدم رکھا اور 1857ء میں دہلی پر قبضہ کرکے بلا شرکت غیر ہندوستان پر قبضہ کر لیا۔ یہ قبضہ بنگال سے پشاور اور تبت سے راس کماری تک تھا۔ یہ سارے علاقے ان کی جاگیر بن گئے اور ان علاقوں میں رہنے والے ان کے غلام بن گئے۔ انھوں نے سورت اور مدراس سے دلی تک کا سفر اڑھائی سو سال میں طے کیا اور نوے سالہ حکمرانی اور مذہب کی بنیاد پر ہندوستان کو تقسیم کرکے سمندر ہی کے راستے واپس چلے گئے۔

میں نے ایک اور بات محسوس کی کہ شمال میں موجود حکمرانوں، خاص طور پر مسلمانوں نے جنوبی ہندوستان پر حملے کیے اور وہاں پر اپنی ریاستیں بھی قائم کیں (جن کا تفصیلی ذکر پچھلے صفحات میں کیا جا چکا ہے) لیکن جنوب سے کبھی بھی کسی حکمران نے شمالی علاقہ جات پر نہ حملے کیے اور نہ ہی کبھی اس کی کوشش کی۔ البتہ مراٹھوں نے شمالی ہندوستان پر حملے کیے لیکن وہ کبھی بھی شمالی ہندوستان پر اپنی حکومت قائم نہ کر سکے۔ ان کا تعلق بھارت کے مغربی علاقوں سے تھا جنوب سے نہیں۔ ہندوستان کے مغربی علاقے بھی حملہ آوروں کا نشانہ بنتے رہے ہیں۔ اہلِ ایران اور عرب اسی طرف سے حملہ آور ہوتے تھے۔ محمود غزنوی بھی ملتان سے براستہ سکھر، تھر، سومنات کی طرف سے آتا جاتا رہا ہے۔ اس وجہ سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان کا مغربی ساحل بھی ایک جنگی مزاج رکھتا ہے لیکن جنوبی اور خاص طور پر جنوب مشرقی حصہ حملہ آوروں سے ہمیشہ ہی محفوظ رہا ہے۔ یہاں کے لوگوں نے تجارت، علم و ہنر، موسیقی، آرٹ کے کاموں میں دلچسپی لی ہے۔ اس بات کے ثبوت کے طور پر یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ آج بھی بھارت میں سب سے معاشی اور علمی ترقی اسی علاقے میں ہے۔

بھارت کی جنوبی ریاستوں میں تعلیم بھی بہت زیادہ ہے اور دولت کے لحاظ سے بھی وہ سب سے آگے ہیں۔ ابھی حال ہی میں بھارت میں تعلیم، ترقی، انسانی وسائل اور امن و امان وغیرہ کی بنیاد پر تمام ریاستوں کی ایک فہرست شائع کی گئی۔ پہلی پانچ ریاستوں میں سے چار کا تعلق جنوبی ریاستوں سے ہے جس سے جنوبی ریاستوں کی بقیہ ریاستوں پر برتری ثابت ہوتی ہے۔

کبھی کبھار جنوبی ریاستوں کے لوگ یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ ہم کماتے ہیں اور شمال کے لوگ ہماری کمائی پر عیاشی کرتے ہیں۔ وزیر اعظم مودی 2018ء نے چنائی کا دورہ کیا۔ اس دوران بہت سے لوگوں نے اس کے خلاف مظاہرے بھی کیے۔ مظاہرین

سے بچنے کے لیے حکومت نے مودی کو ہیلی کاپٹر کے ذریعے ایک جگہ سے دوسری جگہ لیجانے کا فیصلہ کیا۔ مظاہرین نے بہت بڑے بڑے غباروں پر احتجاجی نعرے لکھ کر فضا میں چھوڑے اور اس طرح فضا میں بھی مودی کو سکھ کا سانس نہ لینے دیا۔

مجھے یہ دلچسپ بات پہلی مرتبہ پتہ چلی کہ احتجاج فضا میں بھی کیا جا سکتا ہے۔ یقیناً آپ نے بھی ایسا احتجاج پہلی مرتبہ سنا ہو گا!

جنوب کی تہذیب شمال کی تہذیب کی نسبت زیادہ محفوظ ہے اور جنوبی بھارت کے لوگ اپنی تہذیب کے ساتھ ایک گہری وابستگی بھی رکھتے ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ وہاں کے لوگوں کا دوسرے علاقوں میں آنا جانا کم رہا ہے، اس وجہ سے وہ اپنی تہذیب کے ساتھ شدت سے جڑے ہوئے ہیں۔ میں نے شمالی ہندوستان میں جنوبی ہندوستان کے بہت کم لوگوں کو دیکھا البتہ سرکاری افسران میں جنوبی ہندوستان کے لوگوں کی ایک بہت بڑی تعداد میں موجود ہے، جس کی وجہ تعلیم میں ان کا آگے ہونا ہے لیکن مجھے جنوبی ریاستوں میں بہت سے لوگ ایسے ملے جو شمال سے آئے تھے۔ اس کی ایک مثال ہمارے ہوٹل کی ہے جسے ایک سردار صاحب چلا رہے تھے۔

جب بھارت میں زبان کی بنیاد پر کئی نئی ریاستوں کا وجود عمل میں آیا تو جواہر لال نہرو نے اس کی سخت مخالفت کی اور کوشش کی کہ ہندی کو بھارت کی زبان بنا لیا جائے۔ ان کا خیال تھا کہ اس سے وحدت کا تصور مضبوط ہو گا لیکن اس نظریے کی سخت ترین مخالفت کی گئی اور کئی سال کی جدوجہد کے بعد جنوبی بھارت کے لوگوں کا مطالبہ مان لیا گیا اور جنوب کی کئی ریاستیں زبان کی بنیاد پر وجود میں آئیں۔

جو بات میں نے آپ کے سامنے رکھی اس کی بنیاد پر میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ کبھی کبھی جو ہم یہ سنتے ہیں کہ بھارت میں علیحدگی پسند کئی تحریکیں چل رہی ہیں تو وہ اگر صرف طاقت یعنی فوجی انداز سے چل رہی ہوتیں تو ان کی کامیابی ناممکن تھی جب تک ان

کے ساتھ ایک بھرپور سیاسی طاقت نہ ہوتی، یعنی عوام کی اکثریت ان کا ساتھ نہ دے رہی ہو۔ صرف بندوق کے زور پر کسی علاقے کو علیحدہ نہیں کیا جاسکتا۔ میرا یہ یقین ہے کہ چند لوگوں کے بندوق اٹھانے سے کوئی بھی علاقہ کسی بڑے ملک سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔

میرے علم کے مطابق بھارت کے مختلف علاقوں میں کئی علیحدگی پسند تحریکیں چل رہی ہیں لیکن ان میں سے کسی کو بھی قابلِ ذکر عوامی و سیاسی حمایت حاصل نہیں ۔اس لیے میں مستقبل قریب میں کسی بھی ایسی تحریک کی کامیابی کے امکانات نہیں دیکھتا البتہ جب بھی کوئی تحریک کامیاب ہو گی تو اس میں سب سے زیادہ قصور مرکز کا ہو گا۔ اگر مرکز نے صوبوں کو مناسب آزادی نہ دیے رکھی تو کوئی نا کوئی علیحدگی پسند تحریک ضرور کامیاب ہو جائے گی۔اس کی بنیاد بھی تہذیب و تمدن اور زبان ہو گی، مذہب نہیں ہوگا۔ بھارتی سیاسی قیادت کا خدشہ، جو انھوں نے تقسیم ہند کے فوراً بعد ظاہر کیا تھا، درست ثابت ہو سکتا ہے۔ تقسیم بھارت کی بنیاد مذہب کبھی بھی نہیں ہو سکتا، کیونکہ اس وقت بھارت میں اسی فیصد سے زائد لوگوں کا تعلق ہندو مت سے ہے۔ مسلمانوں کی آبادی پندرہ سے بیس فیصد کے درمیان ہے اور وہ پورے بھارت میں پھیلے ہوئے ہیں۔

خلیج بنگال پر واقع میرینا بیچ

کانفرنس کے اختتام پر شرکاء کے لیے انتظامیہ نے میرینا بیچ پر ایک یادگار شام کا اہتمام کیا۔ اس کے ایک دن بعد ہماری روانگی تھی۔ ابھی بھی بہت کچھ دیکھنا باقی تھا کہ روانگی کا وقت بھی آن پہنچا۔ وقت ہمیشہ ہی کم ہوتا ہے۔ انتظامیہ کی طرف سے مہیا کی گئی سواری کے ذریعے ہم تینوں دوست مرینا بیچ پہنچ گئے۔ مرینا بیچ کا تعارف کروانے سے پہلے میں ایک واقعہ کا ذکر کرنا چاہوں گا۔

ایک بڑے اور خوبصورت ریسٹورانٹ میں عشایئے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ ریسٹورانٹ کے گیٹ پر دو نوجوان لڑکیاں روایتی تامل لباس پہنے کھڑی تھیں۔ ان کے ہاتھوں میں ماتھے پر تلک لگانے کے لیے سرخ رنگ تھا۔ وہ سب آنے والوں کے ماتھے پر سرخ رنگ سے ایک نشان لگاتی تھیں جو عام طور پر ہندو مرد اور خواتین لگاتے ہیں۔ تلک زیادہ تر خواتین لگاتی ہیں لیکن کہیں کہیں مرد بھی یہ کام کرتے ہیں۔ جب ہم تینوں ان کے پاس پہنچے تو انھوں نے ہمیں روایتی انداز میں خوش آمدید کہا اور ساتھ ہی اپنی انگلی سے ہمارے ماتھے پر نشان لگانے کی کوشش کی۔ جس پر ہم نے معذرت کی اور کہا کہ آپ ہمارے ساتھ یہ نہ کریں۔ اس پر انھوں نے برا نہ منایا۔ ہم نے انھیں بتایا کہ ہم پاکستان سے ہیں اور مسلمان ہیں۔ اس پر انھوں نے ہمیں السلام علیکم کہا۔ جس سے ہمیں بڑی خوشی ہوئی۔

اس کے بعد ہم ریسٹورانٹ چلے گئے جہاں سمندر کے کنارے عشایئے کا انتظام تھا، جو بہت ہی خوب تھا۔ ہم لوگ کافی دیر تک وہاں موجود رہے۔ کھانا کھانے کے بعد کچھ لوگوں نے ساحل سمندر کی سیر بھی کی جس میں میں سب سے آگے تھا۔

چنائی میں ہماری یہ آخری شام تھی جو انتہائی یادگار تھی۔ ریسٹورانٹ بہت ہی خوبصورت انداز سے سجایا گیا تھا۔ رات کا وقت تھا، ٹھہرے ہوئے ساحل سمندر اور تاروں بھری رات نے مل کر اس منظر کو تادیر یاد رکھنے میں مدد کی۔ میں اپنی عادت کے مطابق سمندر کو دیر تک دیکھتا رہا جس سے وہ منظر میرے دل و دماغ پر نقش ہو گیا۔ میں اب بھی چشمِ تصوّر سے اس منظر کو دیکھتا ہوں اور لطف اٹھاتا ہوں۔

میرا کانفرنس کی انتظامیہ میں شامل میگا نامی لڑکی سے تعارف ہوا جس کی عمر بیس سال کے لگ بھگ تھی۔ میگا کے ساتھ بات چیت کا موقع ملا۔ اسے یہ جان کر بہت خوشی ہوئی کہ میری بھی ایک بیٹی ہے، جس کی اس وقت عمر 15 سال تھی۔ میگا نے کہا کہ

میں پاکستان کے بارے میں بہت کچھ جاننا چاہتی ہوں لیکن میرا پاکستان میں کوئی دوست، رشتے دار نہیں ہے۔ میں نے اس سے کہا کہ اگر وہ پسند کرے تو میری بیٹی سے رابطہ رکھ سکتی ہیں۔ اس پر وہ بہت خوش ہوئی اور اس نے میرا ای میل لے لیا اور بعد میں میرے ای میل کے ذریعے میری بیٹی سے رابطہ رکھا جو ایک مدت تک قائم رہا۔ بعدازاں میگا کی چھوٹی بہن بھی ان کے ساتھ شامل ہو گئی۔ ایک مرتبہ انھوں نے میری بیٹی کیلیے کچھ تحائف بھی بھیجے جس کے جواب میں ہم نے بھی کچھ تحائف بھیجے۔ چند سال تک یہ رابطہ برقرار رہا اور پھر لائن کٹ گئی۔

مرینا بیچ: دنیا کا دوسرا طویل ساحلِ سمندر

سترہویں صدی میں جب انگریزوں نے اس علاقے کو آباد کرنا شروع کیا تو انھوں نے سمندر کے قریب رہنے کو ترجیح دی۔ ممکنہ طور پر اس کی دو وجوہات ہو سکتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ ان کی تجارت سمندر کے ذریعے تھی۔ اس وجہ سے انھوں نے بندرگاہ کے قریب کالونی بنانے کو ترجیح دی۔ دوسری یہ کہ وہ جس ملک سے آئے تھے یعنی برطانیہ سے وہ چاروں طرف سے سمندر میں گھرا ہوا ہے۔ اس وجہ سے انھیں سمندر کے قریب رہنا زیادہ پسند ہو۔ چھ کلومیٹر طویل قدرتی ساحل پر انھوں نے خوبصورت انداز سے ریت بچھا کر اسے لمبائی کے لحاظ سے دنیا کا دوسرا بڑا قدرتی بیچ بنا دیا۔ جو کئی صدیوں سے لوگوں کے لیے ایک بہترین تفریح گاہ ثابت ہو رہا ہے۔ اس کی چوڑائی ایک ہزار فٹ سے پندرہ سو فٹ تک ہے۔ پانی میں داخل ہونے پر سخت پابندی ہے۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ سمندری حیات کو محفوظ کرنے کے لیے یہاں ہر طرح کے شکار پر پابندی ہے۔ اس وجہ سے یہاں پر بے شمار اقسام کی نایاب اور انتہائی خوبصورت مچھلیاں اور دیگر آبی حیات پائی جاتی ہیں۔

میری خواہش تھی کہ ہم دن کے وقت بھی اس ساحل پر آتے لیکن ایسا ممکن نہ تھا۔ ہم اسے صرف رات کے وقت ہی دیکھ سکے۔ میں سوچ رہا تھا کہ جو ساحل رات کے وقت اتنا خوبصورت لگتا ہے وہ دن کی روشنی میں جب سورج کی شعاعوں سے ریت چمک رہی ہو، تاحدِ نگاہ ایک پر سکون سمندر نظر آ رہا ہو، کنارے پر واقع بلند و بالا عمارات، خوبصورت ہوٹل، لکڑی سے بنے ہٹ ہوں یقیناً بہت خوبصورت منظر ہو گا۔

میں نے چنائی کے بارے میں جو کچھ لکھا اس پر ڈاکٹر اشتیاق احمد گوندل صاحب کا تبصرہ نہایت دلچسپ ہے۔ انھوں نے درست کہا کہ یہ سب کچھ پڑھنے کے بعد لگتا ہے کہ ہمیں بھی چنائی جانا چاہیے۔ آپ کی کیا کیفیت ہے ؟ معلوم نہیں۔ اگر مجھے بھارت کے جنوبی علاقوں کو دیکھنے کا موقع ملے تو ضرور جاؤں گا اور کیرالہ میں واقع اس مسجد کو بھی دیکھوں گا جس کی بنیاد نبی محترم ﷺ کی زندگی میں ہی رکھی گئی تھی۔

مدر آف تامل ناڈو جے للیتا

چنائی میں پانچ دن گزارنے کے بعد ہماری اگلی منزل ممبئی تھی۔ اس سے پہلے کہ میں آپ کو اپنے اگلے سفر سے متعلق معلومات فراہم کروں میں چاہوں گا کہ ایک بہت ہی مشہور شخصیت مدر آف تامل ناڈو کے بارے میں چند دلچسپ معلومات آپ کی خدمت میں پیش کروں۔

میرے علم کے مطابق بھارت میں مہاتما گاندھی کو فادر آف نیشن اور جے للیتا کو مدر آف تامل ناڈو کہا جاتا ہے۔ جے للیتا بنیادی طور پر ایک فلم ایکٹریس تھی اس نے ڈیڑھ سو کے لگ بھگ فلموں میں کام کیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس نے چھ مختلف زبانوں میں اداکاری کی، جن میں مقامی زبانوں کے علاوہ انگریزی اور ہندی بھی شامل ہیں۔ اپنے وقت میں وہ سب سے زیادہ معاوضہ لینے والی اداکارہ تھیں۔ بعد ازاں انھوں نے سیاست میں حصہ لینا شروع کیا اور وہ ایک کامیاب سیاستدان ثابت ہوئیں۔ انھوں

نے بطورِ وزیر اعلی، تامل ناڈو میں بہت سے ایسے کام کیے جو بہت ہی منفرد تھے۔ جس کی بنیاد پر انھیں ماں کہا جانے لگا۔ ان کے دور میں تامل ناڈو نے بے حد ترقی کی۔

ایک مدت سے تامل ناڈو میں یہ رواج چلا آ رہا تھا کہ بچیوں کو پیدائش کے فوراً بعد مار دیا جاتا تھا۔ یہ ایک بہت ہی ظالمانہ رسم تھی۔ لڑکوں کی خواہش میں کچھ لوگ ایسا کرتے تھے۔ جے للیتا نے ایک نیا سسٹم متعارف کروایا جس کے تحت سکول میں داخل ہونے والے بچوں کے لیے ان کی ماں کا نام ہی کافی تھا۔ اس طرح انھوں نے مخنثوں کے لیے بھی سکولوں میں داخل ہونے کا بندوبست کیا۔ اس طرح کی مختلف سکیموں کی وجہ سے انھیں 1991ء میں ماں کا خطاب دیا گیا۔

ان کے دور حکومت میں صحت کی سہولتوں میں بھی اضافہ ہوا۔ اس وقت تامل ناڈو جی ڈی پی کے لحاظ سے بھارت کی دوسری بڑی ریاست ہے۔ آٹو موبائل، لیدر، ٹیکسٹائل، سولر اور آئی ٹی کے شعبوں میں اس کی پورے بھارت میں اوّل پوزیشن ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس سب کی بنیاد جے للیتا کے دور حکومت میں رکھی گئی اور تامل ناڈو کو یہاں تک پہنچانے میں بھی جے للیتا کا ایک اہم کردار ہے۔

ان کی باتیں پڑھنے کے بعد میرے اس خیال کو تقویت پہنچی کہ جو بھی لوگوں کی خدمت کرتا ہے اللہ کے ہاں تو اس کا اجر ضرور ہے لیکن دنیا بھی اس کی قدر کرنے میں کوئی کمی نہیں چھوڑتی۔

مدراس رجمنٹ: جس کی بنیاد 1758ء میں رکھی گئی

اس بات کا ذکر پچھلے صفحات میں کیا جا چکا ہے کہ انگریز 1639ء میں مدراس آئے تھے۔ شروع میں ان کا مقصد صرف تجارت تھا لیکن جلد ہی انھیں یہ احساس ہوا کہ وہ طاقت کے ذریعے ہندوستان پر قبضہ کر سکتے ہیں۔ چند سال بعد ہی انھوں

نے برطانیہ سے تجربہ کار فوجی افسروں کو بلایا جنھوں نے مقامی لوگوں کو سپاہی بھرتی کرکے اپنی فوج کھڑی کرنا شروع کردی۔ پہلی فوجی کمپنی 1704ء میں بنائی گئی۔ پھر اس میں اضافہ کیا جاتا رہا اور 1758ء میں مدراس رجمنٹ کے نام سے انھوں نے ایک بڑی فوج کی بنیاد رکھی۔

مدراس رجمنٹ کا ہیڈ کوارٹر تامل ناڈو میں ہے، مدراس رجمنٹ نے انگریزوں کے لیے کئی اہم جنگیں لڑیں۔ مدراس رجمنٹ کا بڑا کارنامہ برما میں جاپانیوں کے خلاف جنگ ہے۔ اب یہ رجمنٹ بھارت کی بھی ایک اہم رجمنٹ ہے۔ یہ سب بتانے کا مقصد صرف یہ ہے کہ وہ جو تاجر بن کر آئے وہ یقیناً تاجر نہیں تھے۔ وہ ہندوستان پر قبضہ کرنے ہی آئے تھے اور تجارت تو صرف ان کا بہروپ تھا۔ انھوں نے لوگوں کو اپنی تجارت کے ذریعے بہت سارے فوائد پہنچائے اور روزگار کے مواقع بھی فراہم کیے۔ پھر ان کی ہمدردیاں حاصل کرکے انھی میں سے فوجی بھرتی کیے جنھوں نے انگریزوں کو ہندوستان فتح کرنے میں مدد فراہم کی۔ مدراس رجمنٹ آج بھی ان کارناموں کا ذکر بڑے فخر سے کرتی ہے کہ انھوں نے ہندوستان کے مختلف علاقوں میں انگریزوں کے لیے جنگیں لڑیں اور ان کا ہندوستان پر قبضے میں بھی ایک اہم کردار تھا اور اس دوران لا تعداد ہندوستانیوں کو قتل کرنے کا کارنامہ بھی ان ہی کا ہے۔

یہ بات قابلِ غور ہے کہ کیا یہ کارنامہ قابل ستائش ہے یا اس پر کسی کو شرمندگی ہونی چاہیے!

الوداع چنائی: تو دیر تلک یاد رہے گا

ہم چنائی میں پانچ دن گزار کر آج ممبئی کے لیے روانہ ہو رہے تھے۔ ہمارے یہ پانچ دن خاصے مصروف گزرے۔ ہمیں بہت کچھ سیکھنے اور جاننے کو بھی ملا۔ جس پر ہم اللہ رب العزت کے بے حد شکر گزار ہیں۔ ہماری اگلی منزل ممبئی شہر تھا۔ چنائی سے ممبئی

پونے تیرہ سو کلو میٹر ہے جو چنائی ایکسپریس تئیس گھنٹے میں طے کرتی ہے۔ عمر صاحب اور میرے ویزے کے لیے ہمیں پولیس سٹیشن رپورٹ کی ضرورت نہیں تھی لیکن وقاص بھائی کے پاس ویزے کی وجہ سے ہمیں شہر میں آتے اور جاتے وقت پولیس سٹیشن جا کر رپورٹ کرنا ہوتی تھی۔ میں وقاص بھائی کے ساتھ ایک قریبی پولیس سٹیشن چلا گیا۔

ایک طرف میں چنائی کی بلند و بالا عمارات اور انتہائی ترقی یافتہ شہری سہولتوں کو دیکھتا اور دوسری طرف اس تھانے کی عمارت کو یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ تقسیم ہند سے پہلے کی بنی ہوئی ہے یعنی انگریزوں کے دور کی ایک عمارت ۔ اس کا وہی پرانا ڈیزائن تھا یعنی سرخ اینٹوں سے بنی ہوئی اونچی اونچی چھتیں، کھلے کھلے برآمدے وغیرہ۔

یہاں تک تو حیرانی ٹھیک تھی لیکن جب ہم تھانے میں داخل ہوئے اور ایک فرد سے ہمارا واسطہ پڑا تو مجھے محسوس ہوا کہ جیسے ہم پاکستان کے کسی تھانے میں ہی ہیں۔ محسوس ہوا کہ پولیس رویوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔جب میں نے اس پر غور کیا کہ اتنی مماثلت کیوں ہے۔ یہ صرف چنائی ہی کی بات نہیں دہلی اور بمبئی میں بھی پولیس سے ہمارا واسطہ پڑا۔ سب ہم سے ایک ہی طرح کا سلوک کر رہے تھے۔

غور کرنے پر مجھے احساس ہوا کہ تقسیم ہند سے قبل پولیس انگریزوں کے گھر کی باندی تھی وہ اس کے ذریعے اپنے جائز اور ناجائز کام کرواتے تھے۔ پولیس کی طاقت منوانے کے لیے وہ ہر حد تک جاتے تھے۔ اس وجہ سے نسل در نسل یہ رویہ چلتا آ رہا ہے کہ جو فرد بھی تھانے آتا ہے وہ دراصل ایک محکوم قوم سے ہے۔ اب بھی پولیس شکایت کنندہ کی بجائے سائل کا لفظ ہی لکھتی ہے۔ یہ انگریزوں کے دور کی ایک اصطلاح ہے جس میں وہ ہر آنے والے کو سائل یعنی سوال کرنے والا کے نام سے پکارتے تھے۔ عدالت میں درخواست لکھیں تب بھی یہی لکھا جاتا ہے کہ سائل کچھ کہنا چاہتا ہے، تھانے جائیں تب بھی یہ لکھا جاتا ہے کہ سائل کی کچھ مشکل ہے۔

پولیس کی یہ ذہنیت انگریزی دور میں ان کی ضرورت کے عین مطابق تھی لیکن اب تک ہم نے اسے ایسا کیوں رکھا ہوا ہے؟ اس کی وجہ سوائے اس کے کچھ نہیں کہ انگریز جنھیں اپنی جگہ اس ملک کا حکمران بنا کر گئے تھے انھیں وہ اپنا طرزِ حکمرانی بھی دے کر گئے تھے۔ خود تو وہ طاقت کے ذریعے حکمران بنے تھے اور موجودہ حکمران ہمارے ووٹ سے بنتے ہیں لیکن دونوں کی ضرورت ایک جیسی ہی ہیں، یعنی لوگوں کو محکوم بنا کر رکھنا۔ اس لیے پولیس اپنا رویہ تبدیل نہیں کرتی یا میں یوں کہہ سکتا ہوں کہ حکمران اسے تبدیل نہیں کرنا چاہتے کیونکہ یہ ان کی جائز اور ناجائز تمام تر ضرورتیں پوری کرتی رہی ہے۔ اس سلسلے میں بھارت اور پاکستان کی پولیس میں کوئی فرق نہیں ہے۔

چنائی کے لوگ سادہ بھی ہیں اور ملنسار بھی۔ وہ اپنے کام سے کام رکھتے ہیں اور زیادہ ارد گرد نہیں دیکھتے۔ ہندوستان میں سمندر کے کنارے رہنے والے لوگوں کو آپ علم و ہنر میں سب سے آگے پائیں گے۔ اس میں جنوبی ہندوستان اور بنگال کے ساحلی علاقے ، جن میں کلکتہ سرِ فہرست ہے بھی شامل ہیں اور اس کے علاوہ ممبئ بھی ایک نمایاں مقام رکھتا ہے۔ ان سب کو دیکھ کر میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ اگر آپ بھارت کی علمی، معاشرتی اور معاشی ترقی کا جائزہ لیں تو آپ جان سکیں گے کہ اس میں سب سے زیادہ حصہ سمندر کے کنارے رہنے والوں کا ہے۔ یہ سلسلہ کلکتہ سے شروع ہو کر چنائی، کیرالا، ممبئ اور سورت تک جا پہنچتا ہے۔ اگر آپ پاکستان کی صورتحال کا جائزہ لیں تو آپ محسوس کریں گے کراچی جو ساحل سمندر پر واقع ہے کا پاکستانی معیشت کے ساتھ ساتھ علم اور سیاست میں بے حد اہم کردار ہے۔

یہ سب اس وجہ سے ہے کہ کراچی پر کبھی بھی کسی وار ئیر نے حملہ نہیں کیا۔ جو بھی آیا وہ کاروبار کے لیے آیا۔ اسی لیے آپ کو کراچی میں بڑی تعداد میں پارسی ملتے ہیں جو کاروباری دنیا میں ایک نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ کسی زمانے میں یہاں یہودی بھی

رہتے تھے جن کا ایک قبرستان بھی موجود ہے۔ان کے علاوہ میمنوں کی بڑی تعداد کاروبار میں تب بھی تھی اوراب بھی موجود ہے۔ میمن برادری کا زیادہ تر تعلق ممبئ اوراس کے دیگر علاقوں سے ہے۔ انھوں نے ہجرت کرکے کراچی میں رہنے کو ترجیح دی۔ شاید ہی پاکستان کے کسی اور شہر میں آپ کو میمن برادری کے لوگ ملیں۔ وہ کاروباری لوگ تھے سمندر کے کنارے رہتے تھے اور پاکستان آکر بھی انھوں نے سمندر کے کنارے ہی رہنا پسند کیا۔

آپ بھی اس بات کا جائزہ لیں مجھے امید ہے آپ بھی اس نتیجہ پر پہنچیں گے، جہاں میں پہنچا ہوں کہ سمندر کے کنارے رہنے والے لوگوں نے اپنے ملک کی علمی، معاشی اور معاشرتی ترقی میں ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔ سمندر کے فوائد جس قدر بھی ہوں انکار نہیں لیکن،

لاہور لاہور اے!

چنائی ایکسپریس اور ہمارا سفر

ہم اپنے ہوٹل کے سکھ میزبان کو خدا حافظ کہہ کر چنائی سنٹرل سٹیشن پر پہنچ گئے۔ ٹائم ٹیبل کے مطابق ہماری ٹرین کا وقت شام پانچ بجے کا تھا اور ہمیں دوسرے دن چار بجے ممبئ پہنچنا تھا۔ اس طرح یہ سفر تئیس گھنٹوں پر مشتمل تھا۔ ہم پچھلے کئ دن سے سفر میں تھے اس لیے تھکاوٹ کا ہونا ایک فطری امر تھا لیکن نئے علاقے کو دیکھنے کا شوق بھی اپنی جگہ پر موجود تھا اور اسی شوق نے ہمیں تھکاوٹ کا احساس بھی نہ ہونے دیا۔

ممبئ روانہ ہونے پہلے میں اور وقاص بھائی قانون کے مطابق پولیس سٹیشن رپورٹ کرنے گئے۔ رپورٹ کرنے کے بعد ہم نے تھانے میں تشریف فرما صاحب سے پوچھا کہ کیا آپ اس بات کی اجازت دے سکتے ہیں کہ ہم براستہ میسور ممبئ چلے جائیں؟

ایسا کرنے سے ہم سلطان ٹیپو کے مزار پر جا سکیں گے۔ اس نے حسب معمول جواب دیا کہ آپ کو اس بات کی اجازت نہیں ہے۔ آپ کو یہاں سے براہ راست ممبئ جانے والی ریل پر ہی جانا ہوگا۔ البتہ آپ سابق ریاستِ میسور سے ضرور گزریں گے۔ ہماری یہ خواہش تھی کہ ہم سلطان ٹیپو جن کا نام ہم بچپن سے سنتے آرہے ہیں اور اپنے بچوں کے نام بھی ان کے نام پر رکھتے ہیں کے مزار کو دیکھ پاتے لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ ایک دفعہ مجھے ایڈنبرا سکاٹ لینڈ جانے کا اتفاق ہوا تو میں نے وہاں ایک عجائب گھر میں سلطان ٹیپو کے ہتھیار دیکھے تھے۔ اگر زندگی نے وفا کی پاکستان اور بھارت کے تعلقات میں کشیدگی کم ہوئی تو ان شاء اللہ سلطان ٹیپو کے مزار پر جانے کی خواہش بھی پوری کرنے کی کوشش کروں گا۔

ہم اکثر ٹرینوں کے تین طرح کے نام سنتے ہیں۔ کچھ کے نام کے ساتھ ایکسپریس، کسی کے ساتھ میل اور کچھ کے ساتھ پیسینجر لکھا ہوتا ہے۔ میں نے یہ فرق جاننے کی کوشش کی تو پتہ چلا کہ ایکسپریس اس ٹرین کو کہتے ہیں جو بہت طویل فاصلے طے کرتی ہے اور اس کے اسٹاپ بھی بہت کم ہوتے ہیں۔ میل اسے کہتے ہیں جو طویل فاصلے تو طے کرتی ہے لیکن اس کے سٹاپ زیادہ ہوتے ہیں۔ ایسی ٹرینیں ڈاک لانے اور لیجانے کے لیے استعمال ہوتی تھیں۔ ہمارے ہاں بھی پشاور سے کراچی جانے کے لیے خیبر میل چلتی تھی جس کا آغاز انگریزوں کے دور میں 1920ء میں کیا گیا تھا۔ تیسری طرح کی ٹرین کو پیسینجر ٹرین کہتے ہیں جو کم فاصلوں پر چلتی ہے اور راستے میں آنے والے ہر سٹیشن پر رکتی ہے۔

چنائی سے ممبئ جانے کے لیے کئی ٹرینیں چلتی ہیں جن میں ممبئ میل، ممبئ ایکسپریس اور چنائی ایکسپریس وغیرہ شامل ہیں۔ سب سے کم وقت چنائی ایکسپریس کا تھا جسے ہم نے اپنے سفر کے لیے چنا تھا۔

ہم وقت سے پہلے چنائی سنٹرل سٹیشن پہنچ گئے جہاں حسب معمول بہت رش تھا لیکن ہمیں اپنی ٹرین اور کوچ تک پہنچنے میں کوئی دقت محسوس نہ ہوئی۔ جب ہم اپنے کیبن تک پہنچے تو وہاں پر پہلے سے چند مسافر موجود تھے۔ ان میں سے کچھ ایسے تھے جنہوں نے ممبئ تک ہمارے ساتھ سفر کرنا تھا اور کچھ ایسے تھے جنہیں رات سے پہلے راستے میں اترنا تھا۔ ہمارے تمام تر ہمراہی جنوبی ہندوستان کے رہنے والے تھے۔ ان کے لیے ہم تین پاکستانی بالکل اجنبی تھے ۔ ہم پاکستانیوں کا جنوبی ہندوستان بالخصوص مشرقی جنوب میں بسنے والے بھارتی لوگوں سے رابطہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس بات کا احساس ہمیں اپنے ہمراہیوں سے بات چیت کرنے کے بعد ہوا۔ اکا دکا کے علاوہ کسی کو ہندی نہیں آتی تھی اس لیے ہم زیادہ تر بات انگریزی میں ہی کرتے تھے۔

انگریزی میں بات چیت تو ہو سکتی ہے لیکن گپ شپ نہیں!

Jayalalithaa Mother of Tamil Nado : Photo Credit: https://en.wikipedia.org/wiki/J._Jayalalithaa
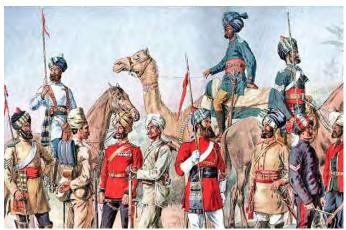
In 1758, the first regiment of the Indian Photo Credit: https://www.dtnext.in

چنائی سے ممبئی تک ہمارے ہمراہی۔ بولی وڈ اور کولی وڈ فلموں کی دوڑ

چنائی ایکسپریس اپنی سہولتوں کے لحاظ سے ایک مناسب ٹرین تھی لیکن جس طرح کا تجربہ ہمیں تامل ناڈو ایکسپریس کا تھا، یہ ٹرین ان سہولتوں کے اعتبار سے کہیں کم تھی۔ اس میں کھانے پینے کی سہولت بھی موجود تھی، سونے کے لیے بستر بھی مہیا کیا گیا تھا، ایئر کنڈیشنڈ بھی ٹھیک کام کر رہے تھے۔ جس سے ہمیں کافی آرام ملا۔ زیادہ سٹاپ ہونے کی وجہ سے کافی لوگ ہمارے کیبن میں آتے جاتے رہے۔ جس وجہ سے کسی بھی صاحب سے تفصیلی بات نہیں ہو سکی سوائے ایک شخص کے جن کا تعلق فلم انڈسٹری سے تھا جو ایکٹر تو نہیں تھے لیکن فلم کی پروڈکشن کے حوالے سے ان کا کوئی اہم کردار تھا اور ایک خاتون سے، جو اپنے بچوں کے ساتھ ممبئی جا رہیں تھیں۔ ان دونوں سے تفصیلی گفتگو ہوئی۔ ان سے کیا بات ہوئی، اس کا ذکر میں اگلے صفحات میں کروں گا۔

فی الحال میں آپ کو اتنا بتانا چاہتا ہوں کہ ہمارے ساتھ جو خاتون اپنے بچوں کے ساتھ سفر کر رہی تھی اس کا خاندان ممبئی میں رہتا تھا وہ مناسب ہندی بول لیتی تھیں

جس کی وجہ سے ان سے بہت سارے معاملات پر گفتگو ہوئی جو زیادہ تر خاندانی نظام سے متعلق تھے۔ ان خاتون سے بات کرکے مجھے بھارت کے جنوب میں رہنے والے لوگوں کے خاندانی معاملات کو جاننے میں کافی مدد ملی۔ ان کا تعلق چنائی کے قریب کسی قصبے سے تھا جبکہ ان کے خاوند ممبئی میں ملازمت کرتے تھے۔ جب ہم ممبئی پہنچے تو انھوں نے ہمیں اپنے خاوند سے ملاقات بھی کروائی انھوں نے اپنے خاوند کو بتایا کہ ان لوگوں نے میرا بہت خیال رکھا اور ہمارے بچوں کے ساتھ بھی کافی مانوس ہوئے جس کی وجہ سے ان کا سفر بہت اچھا گزرا۔ اس پر ان کے خاوند نے ہم سب کا شکریہ ادا کیا۔

بالی وڈ اور کولی وڈ: فلم انڈسٹری کے دو بڑے مراکز

میں سب سے پہلے فلم انڈسٹری سے تعلق رکھنے والے انبوہ صاحب سے ہونے والی گفتگو کا خلاصہ بیان کرتا ہوں۔ عام طور پر تامل لوگوں کے نام کافی طویل ہوتے ہیں۔ میں انھیں انبوہ کے نام سے پکارتا تھا جو ان کے نام کا ایک حصہ تھا۔

فلموں کے بارے میں میرا علم بہت ہی کم ہے لیکن مجھے اتنا معلوم تھا کہ بھارت میں فلم انڈسٹری کا ایک مرکز ممبئی اور دوسرا چنائی ہے جہاں تامل فلمیں بنتی ہیں۔ ان دونوں کے درمیان ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کی دوڑ لگی رہتی ہے۔ جس کی وجہ سے وہ ایک دوسرے پر تنقید بھی کرتے ہیں اور اس طرح ایک مقابلے کی فضا بھی بنی رہتی ہے۔ جب میں نے یہ جاننے کی کوشش کی کہ ان میں سے کون زیادہ بہتر ہے تو پتہ چلا کہ نمبرون کی دوڑ لگی ہوئی ہے اور فیصلہ کرنا مشکل ہے۔ یوں لگتا ہے کہ ایک غیر اعلانیہ جنگ کا سا سماں ہے۔

میں نے انبوہ صاحب سے کہا کہ مجھے بھارتی فلمی مراکز کا تعارف کروائیں اور یہ بتائیں کہ ان دونوں میں کیا فرق ہے اور معاشرے پر ان کے کیا اثرات ہیں؟ میرے سوال کے جواب میں جو انھوں نے جو کچھ بتایا اس کا خلاصہ حاضرِ خدمت ہے۔

انھوں نے بتایا کہ ایک کو بولی وڈ کہتے ہیں اور دوسرے کو کولی وڈ کہتے ہیں. جس طرح امریکہ میں بننے والی فلموں کو ہالی وڈ کہتے ہیں اور لاہور میں بننے والی فلموں کو لالی وڈ کہتے ہیں ۔ان کا کہنا تھا کہ کولی وڈ میں تامل اور تلگو زبان کے علاوہ دیگر زبانوں میں بھی فلمیں بنتی ہیں۔ان کے دیکھنے والوں کی تعداد زیادہ نہیں ہے۔جب کہ بولی وڈ میں بننے والی فلمیں ہندی اور پنجابی کے علاوہ کئی دیگر زبانوں میں بھی بنتی ہے جن کے دیکھنے والوں کی تعداد کولی وڈ کی نسبت بہت زیادہ ہے۔ان کے بقول ٹیکنالوجی میں خاص فرق نہیں ہے۔ فلم کا بجٹ دونوں طرف ہی بہت زیادہ ہوتا ہے اور فلمیں بھی بہت زیادہ بزنس کرتی ہیں۔

میرا سوال تھا کہ ٹیکنالوجی اور بجٹ کے علاوہ دونوں فلموں کی کہانیوں اور ان میں پیش کی گئی باتوں، مختلف کرداروں کے لباس اور مناظر میں کیا فرق ہے؟

ان کا جواب بہت دلچسپ تھا کہ کولی وڈ کی فلمیں اپنی کہانی کی بنیاد پر چلتی ہیں اور یہ کہانیاں بہت ہی دلچسپ ہوتی ہیں جبکہ بولی وڈ میں بننے والی فلمیں کسی ایک واقعہ کو لیکر چلتی ہیں۔اس کے علاوہ جو مناظر بولی وڈ کی فلم میں دکھائے جاتے ہیں یا جس طرح کے لباس بولی وڈ کے کردار پہنتے ہیں وہ کولی وڈ کی فلموں میں نہیں ہوتے۔اگر ہم سادہ الفاظ میں کہیں تو کولی وڈ کی فلمیں بولی وڈ کی نسبت زیادہ باحیاء ہوتی ہیں۔

ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ تامل ایک قدیم علاقہ ہےاور تامل زبان دنیا کی سب سے قدیم ترین زبان ہے جس کی عمر دو ہزار سال سے بھی زیادہ ہے۔اس وجہ سے ہمارا میوزک، ڈانس اور اداکاری، بولی وڈ سے کہیں بہتر ہے۔انھوں نے مجھے ایک اور دلچسپ بات بتائی کہ بولی وڈ بہت زیادہ میک اپ پر چلتا ہے جبکہ کولی وڈ میں حقیقت پسند کردار زیادہ پیش کیے جاتے ہیں۔ میں نے تامل فلموں کے معاشرے پر اثرات کے حوالے سے جاننا چاہا تو انھوں نے بتایا کہ کولی وڈ فلموں کے معاشرے پر اتنے منفی اثرات نہیں

ہیں جتنے بولی وڈ کے ہیں۔ان کا کہنا تھا کہ بولی وڈ جو کلچر پیش کرتا ہے وہ معاشرے کی اصل تصویر سے کہیں دور ہوتا ہے جبکہ کولی وڈ میں ایسا کلچر پیش کیا جاتا ہے جو معاشرے کی اصل صورت سے بہت قریب ہوتا ہے۔ اس وجہ سے آپ دیکھ سکتے ہیں کہ جنوبی ریاستوں میں ابھی تک ہمارا کلچر جو صدیوں پرانا ہے بدستور قائم ہے جبکہ بولی وڈ کی فلموں کی وجہ سے نئی نسل نے غیر ملکی کلچر کو پسند کرنا اور اس کے مطابق زندہ رہنا بھی شروع کر دیا ہے۔

جب میں نے یہ بات کچھ اور لوگوں سے بھی کی تو انھوں نے بھی اس بات کی تصدیق اور کہا کہ بولی وڈ اور کولی وڈ میں یہی بنیادی فرق ہے۔آپ کی کیا رائے ہے؟آپ ہی بہتر جانتے ہیں۔ البتہ میں ایک گواہی ضرور دے سکتا ہوں کہ بھارت کا جنوب اب تک اپنے کلچر سے جڑا ہوا ہے جبکہ شمال میں رہنے والے لوگوں نے اپنے کلچر سے دوری اختیار کر لی ہے۔

انبوہ صاحب نے بڑے شوق سے اے آر رحمٰن کا ذکر کیا جو اس وقت موسیقی کی دنیا میں ایک اعلیٰ مقام رکھتے ہیں۔ وہ ایک ہندو خاندان میں پیدا ہوئے۔ بعد ازاں وہ مسلمان ہوئے۔ انھیں بھارت کا تیسرا بڑا سول ایوارڈ بھی دیا جا چکا ہے۔ان کا اصل نام اللہ رکھا رحمان ہے اور وہ چنائی میں پیدا ہوئے تھے۔ان کے والد ان کے بچپن میں ہی فوت ہو گئے تھے ان کی والدہ نے انھیں بہت ہی مشکل حالات میں پالا۔ اس وقت وہ بھارتی فلم انڈسٹری کے ایک بہت ہی مایہ ناز موسیقار ہیں۔اس کے ساتھ ساتھ وہ گانا بھی گاتے ہیں۔ وہ ایک مرتبہ پاکستان بھی آئے تھے اور انھوں نے نصرت فتح علی خان صاحب کے ساتھ مل کر ایک گانا بھی ریکارڈ کروایا تھا۔اے آر رحمٰن ہمارے نصرت فتح علی خان سے بہت متاثر تھے اور انھیں اپنا استاد تسلیم کرتے تھے۔ اسے Gurus of Peace کہا جاتا ہے۔ میں نے بھی اس نظم کو سنا ہے۔ مجھے موسیقی کے فن کے بارے

میں تو کچھ زیادہ علم نہیں لیکن یہ کہہ سکتا ہوں کہ یہ گانا اپنے اندر کسی بھی شخص کو متاثر کرنے کی بے پناہ صلاحیت رکھتا ہے۔

اراکونام: جنوبی بھارت کا سب سے بڑا ریلوے جنکشن

عام طور پر جنکشن کا لفظ اس ریلوے سٹیشن کے لیے بولا جاتا ہے جہاں دو طرف سے زائد ٹرینوں کی آمد ورفت ہو۔ اراکونام ایک ایسا ریلوے سٹیشن ہے جہاں سے ریل گاڑیاں دس مختلف شہروں کی طرف جاتی ہیں۔ اس لحاظ سے یہ جنوبی بھارت کا سب سے بڑا جنکشن ہے۔

پاکستان میں ایگریکلچر سپلائی کارپوریشن، پاسکو نام کا ایک ادارہ موجود ہے جس کے ذمہ کسانوں سے اناج خرید کر ذخیرہ کرنا ہے تاکہ قلّت کی صورت میں خوراک کی کمی کو پورا کیا جاسکے۔ ایسا ہی ایک ادارہ، فوڈ کارپوریشن آف انڈیا کے نام سے بھارت میں ستر کی دہائی میں قائم ہوا تھا۔ یہ ادارہ کسانوں سے چاول اور گندم خرید کر ذخیرہ کرتا ہے اور اناج کی قلّت کی صورت میں لوگوں کو گندم اور چاول فراہم کرتا ہے۔ بھارت میں اس کے پانچ بڑے مراکز ہیں اور اس کا ایک مرکز اراکونام میں بھی ہے۔ فوڈ کارپوریشن آف انڈیا، بھارت کی سب سے بڑی کارپوریشن ہے اور ایک رپورٹ کے مطابق یہ ایشیاء میں سپلائی چین کا سب سے بڑا نیٹ ورک ہے۔

اس شہر میں مسلمانوں کی آبادی دس فیصد کے قریب ہے جبکہ آٹھ فیصد کے قریب عیسائی بھی یہاں رہتے ہیں۔ اگر آپ بھارت کے مختلف شہروں کا جائزہ لیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ جہاں پر انگریز زیادہ دیر تک رہے وہاں عیسائی مذہب سے تعلق رکھنے والے لوگوں کی آبادی بھی زیادہ ہے۔ انھوں نے جہاں ہندوستان پر قبضے کے لیے جنگیں لڑیں وہیں انھوں نے اپنے مذہب کو پھیلانے کے لیے چرچ بھی بنائے اور عیسائیت کی تبلیغ کے لیے پادریوں کو بھی ہندوستان بلوایا۔ عیسائی مذہب کے پھیلاؤ میں جہاں

انگریزوں نے انفرادی طور پر کوششیں کی وہیں پر انھوں نے سرکاری طور پر بھی ہندوستان میں عیسائی مذہب کی ترویج کے لیے بھی سنجیدہ کاوش کی۔ اس کا ایک ثبوت ہندوستان کے ہر بڑے شہر اور قصبہ میں چرچز اور اس کے ساتھ ساتھ مشنری سکول اور ہسپتال کی موجودگی بھی ہے۔ چنائی شہر میں عیسائی آبادی کا آٹھ فیصد ہیں ۔جب کہ مسلمانوں کی تعداد دس فیصد کے قریب ہے۔ مختلف شہروں کے بارے میں جاننے سے یہ معلوم ہوا ہے کہ ہندوستان کے جنوبی علاقوں میں جہاں انگریز پہلے آئے وہاں پر عیسائیوں کی تعداد باقی ہندوستان کی نسبت زیادہ ہے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ جب بھی ہندوستان کی تاریخ کا ذکر کیا جاتا ہے تو کہا جاتا ہے کہ ہندو حکمران، مسلمان حکمران اور انگریز راج۔ انگریزوں کے دور کو عیسائیوں کا دور نہیں کہا جاتا جب کہ انگریزوں نے عیسائیت کی تبلیغ کے لیے سرکاری طور پر کوششیں کیں ۔ انھی کوششوں کی وجہ سے ہندوستان بھر میں عیسائیت کی تشہیر ہوئی۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ انگریزوں کی ہندوستان آمد کا ایک مقصد عیسائیت کی تبلیغ بھی تھا۔ یہ بات اگر سو فیصد درست نہ بھی ہو تب بھی اس میں وزن ضرور پایا جاتا ہے۔

چتور: جو کبھی ریاست میسور کا حصہ تھا

اراکونام کے بعد ہم آندھرا پردیش میں داخل ہو چکے تھے۔ اگر آپ نقشے میں دیکھیں تو تامل ناڈو لمبائی میں زیادہ اور چوڑائی میں کم ہے۔ اس کے شمال اور مغرب میں آندھرا پردیش واقع ہیں۔ ہماری ٹرین کا اگلا سٹاپ رینیگنتا تھا جو ایک چھوٹا سا شہر ہے لیکن جنکشن ہونے کی وجہ سے یہاں پر ہر ٹرین رکتی ہے۔اس شہر میں کوئی خاص بات نہیں لیکن ایک بات اسے خاص بنا دیتی ہے وہ یہ کہ یہ شہر ضلع چتور میں واقع ہے جس کا گہرا تعلق حیدر علی اور سلطان ٹیپو سے ہے۔ ہماری ٹرین کا رخ شمال مغرب کی طرف تھا جبکہ ریاست میسور ہمارے جنوب مغرب میں تھی۔ اس لیے ہم اس کے پاس سے گزر رہے

تھے۔ چتور وہ علاقہ ہے جو کبھی نواب آف آرکوٹ کی ریاست کا حصہ تھا۔ حیدر علی نے یہاں سے ہی اپنی سپاہیانہ زندگی کا آغاز کیا تھا۔اس لیے میں نے ضروری سمجھا کہ حیدر علی اور سلطان ٹیپو کے بارے میں چند معلومات آپ کی خدمت میں پیش کی جائیں۔

حیدر علی ایک دور رس اور بہادر انسان

حیدر علی کی تاریخ پیدائش سے متعلق مختلف آراء پائی جاتی ہیں لیکن اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ وہ 1717ء سے 1722ء کے درمیان پیدا ہوئے۔ حیدر علی کے آباؤاجداد کے بارے میں بھی مختلف باتیں کہی جاتی ہیں۔ کچھ کا کہنا ہے کہ ان کا تعلق افغانستان سے تھا۔ اور کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ وہ عرب تھے اور ان کا تعلق قبیلہ قریش سے تھا۔ کچھ کا تو یہ بھی کہنا ہے کہ وہ پنجاب سے تعلق رکھتے تھے۔ سلطان ٹیپو کے آباؤ اجداد عرب تھے جس کا ذکر ایک فرانسیسی نے اپنی کتاب میں کیا ہے کہ حیدر علی نے خود بتایا کہ وہ عرب کے قبیلہ قریش سے تعلق رکھتے ہیں۔ اگر ایسا ہے تو یقینی طور پر یہ لوگ سمندر کے ذریعے ہی اس علاقے میں آئے۔ اگر وہ افغان یا وسطی ایشیاء سے ہوتے تو وہ ملتان یا پشاور کے راستے ہندوستان میں داخل ہوئے ہوں گے۔ انھوں نے کچھ عرصہ دلی میں بھی گزارا ہوگا اور بعد میں وہ اس علاقے میں آئے ہوں گے۔ میرے خیال میں وہ عرب تھے۔ اس کی وجہ جو میں سمجھا ہوں وہ یہ ہے کہ اگر وہ پنجاب یا اِفغانستان سے ہوتے تو ان کی دلی میں موجودگی کی کوئی نہ کوئی نشانی ضرور ہوتی۔ جبکہ ایسا نہیں ہے۔

محمود خان محمود نے اپنی کتاب Kingdom of Hyder Ali and Tipu Sultan: Sultanat E Khudadad میں اس بارے میں لکھا ہے (صفحہ 30) کہ اس بات کا قوی امکان ہے کہ حیدر علی کا خاندان قریش سے تعلق رکھتا ہو۔ وہ پہلے مکہ سے بغداد آئے۔ اس وقت بغداد سے ہندوستان آنے کے دو راستے تھے، ایک ایران اور دوسرا

اِفغانستان اور پنجاب۔ اس لیے ممکن ہے کہ وہ کچھ عرصہ پنجاب میں رہے ہوں جس کی وجہ سے یہ غلط فہمی پیدا ہوئی کہ ان کا تعلق پنجاب سے تھا۔

پرا کسی فرنینڈس اپنی کتاب The Tigers of Mysore: A Biography of Hyder Ali & Tipu Sultan میں (صفحہ 17) لکھتے ہیں کہ سولویں صدی میں حید علی کے جد امجد شیخ ولی محمد دلی سے گلبرگہ آئے تھے۔ یہ بات محمود خان محمود کی اس بات کی تصدیق کرتی ہے کہ حیدر علی کا تعلق عرب سے ہی لیکن وہ ہندوستان براستہ پنجاب آئے۔ انھوں نے دلی سے جنوبی ہندوستان کا سفر کیا۔ جس کی وجہ سے یہ بات عام ہے کہ ان کا تعلق پنجاب سے ہے۔ کچھ لوگوں کا تو یہ بھی کہنا ہے کہ ان آبائی علاقہ پنڈہ بھٹیاں ضلع حافظ آباد تھا۔ یہ علاقہ بھی افغانستان سے آنے والے لوگوں کی گزرگاہ رہا ہے۔

یہ سب جان کر میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ان کا تعلق عرب سے ہی تھا۔ وہ ضرور پنڈی بھٹیاں میں ٹھہرے ہو گیں لیکن یہ ان کا اصل وطن نہیں تھا۔

لیون بینتھام بورینگ اپنی کتاب Haidar Alí and Tipú Sultán and the Struggle with the Musalmán Powers of the South جو 1893ء میں شائع ہوئی تھی میں تفصیل سے لکھا ہے کس طرح حیدر علی ایک نواب کی فوج کے سپاہی سے ترقی کرتے کرتے ایک ریاست کا سلطان بنا (صفحہ 20 لے کر 40)۔ میں جو اس کتاب میں پڑھا اس کا خلاصہ پیش خدمت ہے۔

حیدر علی کے والد کا نام فتح محمد تھا۔ وہ نواب آف کرناٹک کی فوج میں ایک کمانڈر تھے۔ بعد ازاں انھوں نے میسور کے راجہ کی ملازمت اختیار کر لی۔ میسور کے ہندو راجہ نے انھیں نائک کا خطاب بھی دیا اور ایک جاگیر بھی ان کے نام کی۔ حیدر علی کے والد ہندو راجہ کی طرف سے لڑتے ہوئے ایک جنگ میں مارے گئے۔اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ لوگ مسلمان ہونے کے باوجود ہندو راجاؤں کی فوج کے سپاہی بھی تھے اور ان کی

خاطر جنگیں بھی لڑتے تھے۔ عام طور پر راجہ کا لفظ ہندو حکمرانوں اور نواب کا لقب مسلمان حکمرانوں نے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔

حیدر علی نے نواب آف آرکوٹ کی فوج میں ملازمت اختیار کرلی اور چتور کے علاقے میں براہِ راست نواب آف آرکوٹ کے نمائندے عبدالوہاب کی ماتحتی میں رہے۔ وہ اپنے والد کی وفات کے بعد وہ میسور کے ہندو راجہ کی فوج میں بھرتی ہو گئے۔ بعد میں جب حیدر علی نے چتور کو فتح کیا تو عبدالوہاب کو قیدی بنا کر میسور لے گیا۔

حیدر علی بڑا قابل آدمی تھا وہ اپنی صلاحیتوں کے بل بوتے پر فوج کا کمانڈر بن گیا ۔اس نے ریاست میسور کی طرف سے ریاست کے مخالفین کے ساتھ کئی جنگیں لڑیں۔ حیدر علی نے اپنی ریاست کو بچانے کے لیے ریاست حیدر آباد اور مراٹھوں کے ساتھ بہت سی لڑائیاں لڑیں، ایک وقت میں اس نے بنگلور کو بھی اپنے قبضے میں لے لیا۔ یہ ایک لمبی تاریخ ہے کہ کس طرح سے حیدر علی نے میسور کے مخالفین کو شکست فاش دی۔ ان میں ریاست حیدرآباد کا بھی کردار سامنے آتا ہے۔ یہ ایک دلچسپ تاریخ ہے جو پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ چند باتیں میرے لیے بھی نئی تھیں جو نہایت ہی دلچسپ ہیں۔ میں کوشش کروں گا کہ نہایت ہی اختصار سے واقعات آپ کی خدمت میں پیش کروں۔

حیدر علی سپہ سالار سے نواب اور پھر سلطان

حیدر علی نے اپنی صلاحیتوں کی بنیاد پر ریاست میسور میں بے حد مفید اصلاحات کی۔ انھیں کھانڈے راؤ کی زبردست حمایت حاصل تھی۔ راؤ ایک بہت ہی دانا اور حساب کتاب میں بہت ماہر شخص تھا۔ ایک وقت ایسا آیا جب راجہ نے حیدر علی کو نواب کا خطاب دیا۔ یہ کسی بھی مسلمان کو ریاست میسور میں دیا جانے والا پہلا خطاب تھا۔

راجہ کی وفات کے بعد اس کے کمسن بیٹے کو راجہ بنایا گیا اور جس سے خاندان میں بہت سی چپقلش پیدا ہو گئی۔ کچھ لوگ حیدر علی کے خلاف ہو گئے جن کی قیادت کھانڈے راؤ کر رہے تھے۔ ان لوگوں کی آپس میں جنگیں بھی ہوئیں اور ان جنگوں میں کھانڈے راؤ کو شکست ہوئی اور اس طرح ریاست میسور پر حیدر علی کا قبضہ ہو گیا۔ اب وہ نواب کے بجائے سلطان کہلانے لگے۔ یہ اس دور کی بات ہے جب دلی میں شاہ عالم کا انگریزوں سے معاہدہ ہو گیا اور وہ انگریزوں کی طرف سے دی جانے والی پنشن پر گزارہ کرنے لگا۔

ایسی صورت میں حیدر علی نے اپنی الگ سلطنت کا اعلان کیا اور نواب کی بجائے سلطان بن گیا۔ ایک ان پڑھ انسان جو ریاست میسور کی فوج کا ایک عام آدمی تھا صرف چند سالوں میں اس کا حکمران بن گیا۔ اس نے فتح حاصل کرنے کے بعد کھانڈے راؤ کو جیل میں ڈال دیا۔ راجہ کی ماں اپنی جان بچانے کے لیے کسی اور کی پناہ لینے پر مجبور ہو گئی۔ بعدازاں حیدر علی نے اپنی ریاست کی حفاظت کے لیے انگریزوں اور مراٹھوں کے ساتھ کئی لڑائیاں بھی لڑیں ان جنگوں میں فرانسیسی فوجیں حیدر علی کے ساتھ تھیں یعنی ایک طرف انگریز اور ان کے حواری نظام اور مراٹھے اور دوسری طرف حیدر علی اور فرانسیسی۔ تاریخ نے فیصلہ انگریزوں کے حق میں دیا۔ حیدر علی نے پوری کوشش کی کہ کسی طرح نظام اور مراٹھے اس کے ساتھ مل کر انگریزوں کو ہندوستان سے نکال باہر کریں لیکن ایسا نہ ہوا۔

پھر نہ مراٹھے بچے، نہ ہی نظام اور نہ ہی حیدر علی۔ سب غلام بن گئے، کوئی بلا واسطہ اور کوئی بلواسطہ۔

لیون بینتھام بورینگ کی کتاب سے مزید پتہ چلتا ہے کہ سلطان حیدر علی اور سلطان ٹیپو کی قیادت میں میسور نے بے حد ترقی کی۔ ریاست میسور کے راجہ نے اپنی فوج

کے لیے فرانسیسی لوگوں کی مدد سے راکٹ تیار کروائے۔ حیدر علی کے والد فتح محمد راکٹوں کے بے حد ماہر تھے۔ حیدر علی اور سلطان ٹیپو نے اپنے دور حکومت میں راکٹ بنانے کے کام کو تیزی سے آگے بڑھایا۔ ان کے بنائے ہوئے راکٹوں کو میسوری راکٹ کہا جاتا ہے۔ ریاست میسور اپنے دور کی بہت ہی مضبوط معیشت رکھنے والی ایک ریاست تھی۔ کہا جاتا ہے کہ اُس ریاست میں اس وقت فی کس آمدنی یورپ کے لوگوں سے بھی زیادہ تھی۔

سلطان حیدر علی کا دوسرا اہم ترین کارنامہ بحری فوج کا قیام تھا۔ اس سے پہلے کسی بھی مسلمان حکمران نے بحری فوج قائم نہیں کی۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ ان لوگوں کی حکومت سمندر سے کہیں دور تھی۔ ریاست حیدرآباد کا کچھ حصہ خلیج بنگال سے ضرور ملتا تھا لیکن ان کی زیادہ تر توجہ وسطی ہندوستان کی طرف تھی جس کی وجہ سے انھوں نے بحری فوج کا نہیں سوچا۔ بحری فوج بنانے میں فرانس کے لوگوں نے حیدر علی کی بے حد مدد کی۔ حیدر علی کو اس بات کا احساس تھا کہ انگریزوں کا مقابلہ کرنے کے لیے بحری فوج کا ہونا ضروری ہے۔ حیدر علی اور انگریزوں کی بحری فوجوں کے درمیان لڑائی بھی ہوئی۔

جیسا کہ پچھلے صفحات میں بیان کیا جا چکا ہے کہ اس بات کا زیادہ امکان ہے کہ حیدر علی کے آباؤاجداد عرب سے آئے تھے عرب سے جو بھی لوگ آئے وہ زیادہ تر سمندر کے راستے ہی آئے اور ان کی منزل جنوبی ہندوستان ہی تھا۔ صرف محمد بن قاسم نے اپنے آپ کو سندھ تک محدود رکھا تھا۔ اس طرح یہ کہا جا سکتا ہے کہ حیدر علی کے آباؤاجداد سمندری سفر کے عادی تھے۔ وہ یقیناً سمندری سفر کے معاملات کو بہتر طور پر جانتے ہوں گے۔ اسی بنیاد پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ حیدر علی نے بحری فوج کا سوچا اور وہ ایک مضبوط بحری بیڑا بنانے میں بھی کامیاب ہوا۔ حیدر علی کے دور میں میسور کا رقبہ ایک لاکھ ساٹھ ہزار

مربع کلومیٹر تھا۔آپ اس کا اندازہ اس بات سے لگا سکتے ہیں کہ پاکستانی پنجاب کا رقبہ دو لاکھ پانچ ہزار کلومیٹر ہے۔

ہم چتور سے گزر رہے تھے اور میں چشمِ تصور سے حیدر علی اور اس کی فوجوں کو تن تنہا انگریزوں کا مقابلہ کرتے دیکھ رہا تھا۔ حیدر علی نے اس علاقے میں اپنی زندگی کی آخری سانسیں لیں اور 1782ء میں ایک کامیاب سپہ سالار اور حکمران کی زندگی گزار کر اپنے رب کے حضور پیش ہو گئے۔حیدر علی کی وفات کے وقت سلطان ٹیپو مالا بار کی مہمات پر تھا۔ اسے واپس بلایا گیا۔ ان کے چچا نے انھیں سلطان بنانے کی مخالفت کی اور ان کے بھائی کو سلطان بنانا چاہا لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ سب نے ٹیپو کی حمایت کی اور اسے ریاست کا سلطان بنا دیا گیا۔

ریاست میسور ایک ہندو ریاست تھی جس کا قیام 1339ء میں عمل میں آیا ۔حیدر علی اور سلطان ٹیپو نے 1761ء سے 1799ء تک یہاں حکومت کی لیکن اس دوران بھی ریاست کے سابقہ حکمران اپنے حقِ حکمرانی سے دستبردار نہیں ہوئے۔ جبکہ عملاً ان کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ جیسے ہی سلطان ٹیپو کی شہادت ہوئی تو وہ دوبارہ اس ریاست کے حاکم بن گئے۔اب ان کے راستے میں کوئی بھی رکاوٹ موجود نہیں تھی۔ یہی وجہ ہے کہ مراٹھے ریاست میسور کے خلاف تھے اور انھوں نے اسے ختم کرنے کے لیے انگریزوں کا ساتھ دیا تھا۔ بعد ازاں اس ریاست پر مراٹھوں اور انگریزوں نے باری باری حکومت کی۔شاید یہ ان دونوں کے درمیان کسی معاہدے کا حصہ ہو۔

Portrait of Hyder Ali British Museum Photo Credit:
https://www.notesonindianhistory.com

سلطان ٹیپو: ریاست میسور کا آخری شہید حکمران

لیون بینتھام بورینگ نے یہ بھی لکھا ہے کہ بھارت کے جنوبی علاقے میں کئی مسلمان ریاستیں موجود تھیں۔ کئی ایسی ریاستیں بھی تھیں جو رقبہ کے لحاظ سے بہت چھوٹی تھیں۔ایسی ہی ایک ریاست جسے آپ ایک جاگیر بھی کہہ سکتے ہیں، گورم کنڈا بھی تھی۔ حیدر علی نے گورم کنڈا کے نواب کی بیٹی فخر النساء سے شادی کی جن کے بطن سے ٹیپو سلطان کی پیدائش ہوئی۔اس طرح چتور ٹیپو سلطان کا ننھیال بھی بنتا ہے۔ شام ہو

چکی تھی اور اس وقت ہماری ٹرین ٹیپو سلطان کے نَنھیال سے گزر رہی تھی۔ سب لوگ کھانے کا انتظار کر رہے تھے اور میں سلطان ٹیپو کے نَنھیال کو دیکھ رہا تھا۔ یہ علاقہ وہی ہے جہاں حیدر علی کی وفات بھی ہوئی۔ اس کی تدفین سرنگا پٹم میں کی گئی تھی اور سلطان ٹیپو نے ان کا مزار بھی بنوایا تھا۔ سلطان ٹیپو کو بھی اسی مزار میں دفنایا گیا باپ اور بیٹے کی قبریں ساتھ ساتھ ہیں۔

سلطان ٹیپو جنہیں ہم عام طور پر ٹیپو سلطان کہتے ہیں، صحیح نام سلطان ٹیپو ہے، کی پیدائش بنگلور کے قریب 1750ء میں ہوئی۔ حیدر علی بہت دانا آدمی تھا لیکن وہ پڑھا لکھا نہیں تھا۔ اس نے اپنے بیٹے کی تعلیم و تربیت کے لیے بہت اعلیٰ بندوبست کیا۔ دینی تعلیم کے لیے عالموں کا بندوبست کیا اور اس کے علاوہ اردو عربی، فارسی کی تعلیم کا بھی بندوبست کیا۔ ایک فرانسیسی شخص کو ان کی فوجی تربیت کے لیے مختص کیا گیا۔ اس طرح سلطان ٹیپو جس کا نام اس علاقے کے ایک نہایت قابل احترام بزرگ کے نام پر رکھا گیا تھا کی تعلیم وتربیت میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی گئی۔ حیدر علی کو سلطان ٹیپو پر اتنا اعتماد تھا کہ 17 سال کی عمر میں اسے جنگ میں شریک کیا گیا اور فوج کے ایک حصے کی کمان بھی اس کے کندھوں پر ڈالی گئی۔

لیون بینتھام بورینگ لکھتے ہی کہ میں جب 1782ء حیدر علی کی وفات ہوئی تو اس وقت سلطان ٹیپو کی عمر 32 سال تھی۔ وہ پندرہ سال سے جنگی معاملات میں حصہ لے رہا تھا۔ حیدر علی کی وفات کے بعد اس نے ریاست میسور کی ذمہ داری سنبھالی اور اسے بہت اچھے طریقے سے نبھایا۔ اس دوران اس نے مراٹھوں اور انگریزوں کے خلاف کئی جنگیں لڑیں۔ اس پر سب سے برا وقت تب آیا جب انگریزوں کے ساتھ ایک جنگ میں وہ محاصرے میں آگیا اور حالات کی وجہ سے اس نے ایک معاہدہ کیا جس کے تحت اسے آدھی سلطنت انگریزوں اور ان کے اتحادیوں کو دینا پڑی۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک

بہت بڑی رقم دینے کا بھی وعدہ کیا گیا۔ ظلم کی انتہا یہ کہ انگریز سلطان ٹیپو کے دو بچوں کو بطور ضمانت اپنے ساتھ مدراس لے گئے۔ سلطان ٹیپو نے تاوان کی رقم ادا کر کے اپنے بیٹوں کو رہا کروایا۔

چوتھی جنگ میں انگریز اور ان کے اتحادیوں کو فتح حاصل ہوئی اور سلطان ٹیپو میدانِ جنگ میں شہید ہو گیا۔ یہ ایک بہت ہی تکلیف دہ واقعہ ہے۔ اس میں جہاں ایک طرف انگریزوں نے اپنا کام کیا وہیں انگریزوں کے ساتھ مقامی ریاستوں کی فوجیں بھی شریک تھیں۔ جن میں مسلمان بھی تھے اور ہندو بھی۔

یہ سب جان کر میں اس نتیجہ پر پہنچتا ہوں کہ ان سب لوگوں نے یہ محسوس کیا کہ اگر سلطان ٹیپو کو نہ روکا گیا تو ارد گرد کی تمام ریاستیں اس کے قبضے میں آ جائیں گی۔ اس وجہ سے علاقے کی تمام ہندو اور مسلمان ریاستیں، ریاست میسور کے خلاف ہو گئیں۔ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انھوں نے سلطان ٹیپو سے سلطنت واپس لے کر ریاست میسور کے سابق ہندو حکمرانوں کے حوالے کی۔ اس کام کے لیے انھوں نے انگریزوں کی حمایت کی۔ انگریزوں کے لیے بھی وہ ایک بڑا ہی اہم موقع تھا کہ وہ ان تمام لوگوں کی مدد سے سلطان ٹیپو جو دراصل ان کا سب سے بڑا دشمن تھا کو ختم کر دیا جائے۔ مقامی راجاؤں اور نوابوں نے اپنی ریاستیں تو بچا لیں لیکن ہندوستان پر انگریزوں کے قبضہ میں حائل سب سے بڑی رکاوٹ کو ختم کر دیا۔ اس کے بعد انگریزوں کو کسی بھی جگہ ایسی سخت مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

سلطان ٹیپو نے انگریزوں کو نکالنے کے لیے بے حد کوشش کی۔ اس کام کے لیے اس نے سلطنت عثمانیہ کی مدد لینے کی بھی کوشش کی۔ افغانستان کے حکمرانوں سے بھی رابطہ کیا۔ فرانس کے فوجیوں نے سلطان کی فوجوں کی تربیت بھی کی اور راکٹ بنانے میں بھی مدد کی۔ اس کے ساتھ میدانِ جنگ میں کھڑے بھی رہے۔ اس سے یہ پتہ چلتا

ہے کہ سلطان ٹیپو نے انگریزوں کے جن مخالفین سے رابطے کیے وہ سب بھی غیر ملکی تھے۔ حیدر علی اور سلطان ٹیپو کی کوشش تھی کہ مقامی ریاستوں کی مدد سے مشترکہ طور پر انگریزوں کا مقابلہ کیا جائے لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ اس کے بعد انھوں نے ہندوستان سے باہر کے لوگوں سے مدد طلب کی، جو نہ مل سکی۔

The British making hostage of two sons of Tipu Sultan after they won the war as guarantee to get mone. (Photo: Wikipedia Commons)

ایک طرف حیدر علی اور سلطان ٹیپو تھے اور دوسری مقامی ریاستوں کی حمایت یافتہ انگریز فوجیں یہ سب مل کر شیرِ میسور پر چڑھ دوڑے اور اس کی ریاست کا خاتمہ کر دیا۔ بالآخر سلطان ٹیپو میدان جنگ میں شہادت کے رتبے پر فائز ہو گئے۔ ان کی شہادت کے بعد سابقہ ہندو راجا کے خاندان نے دوبارہ ریاست میسور پر اپنی حکومت قائم کر لی۔ سلطان ٹیپو کے خاندان پر کیا گزری، اس بارے میں مجھے کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ یقیناً انگریزوں اور ان کے اتحادیوں نے سلطان ٹیپو اور اس کے خاندان کے ساتھ ساتھ ان کے ساتھیوں پر بھی ظلم کے پہاڑ ہی توڑے ہوں گے۔

ہندوستان کے جنوب میں جتنی بھی مسلمان ریاستیں تھیں ، حیدرآباد اور دکن سمیت سب کے حاکم وسطی ایشیاء سے آنے والے لوگ تھے۔ میرے اندازے کے مطابق مقامی مسلم ریاستوں کی مخالفت کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ وہ ایک عرب کی بالادستی قبول کرنے کو تیار نہ تھے۔

غیر ملکیوں کے ساتھ جن ریاستوں نے بطور ریاست جنگیں کی ہیں ان میں ریاست میسور، جھانسی کی ریاست، نواب سراج الدّولہ کی ریاست اور پنجاب کے سکھوں کے علاوہ موجودہ کے پی کے میں واقع قبائل جو در حقیقت ایک ریاست کی مانند ہی تھے شامل ہیں۔ ان کے علاوہ بھی کئی ایسی ریاستیں ہو سکتی ہیں جن کا مجھے علم نہیں ہے۔

انگریز ہندوستان پر تین اطراف سے حملہ آور تھے۔ ممبئ میں بھی انھوں نے بمبئ پریذیڈنسی بنائی ہوئی تھی جو ایک طرح سے ان کا جی ایچ کیو تھا۔ اس کے علاوہ انھوں نے مدراس اور کلکتہ میں بھی پریذیڈنسیز بنائیں ہوئیں تھیں۔ اگر آپ نقشے میں دیکھیں تو آپ جان سکیں گے کہ انگریزوں نے ہندوستان میں بطور تاجر قدم رکھا۔ ان کے تجارتی جہاز کے اوپر مال ہوتا اور اس کے نیچے بارود۔ ان کے ایک ہاتھ میں لوگوں کے مفادات کی چیزیں تھیں اور دوسرے ہاتھ میں بندوق۔ انھوں نے کسی کو مفادات کی زنجیر میں باندھا اور کسی کو بندوق کے زور پر دبایا۔ پھر ایک وقت آیا کہ وہ پورے ہندوستان کے مالک بن بیٹھے۔

اس میں ان کی طاقت ، علم و عقل فوجی صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ اور ہمارے حکمرانوں کی نااہلیوں کا بھی ایک اہم کردار ہے۔

چند سال پہلے کرناٹکا اسٹیٹ جس میں اب ریاست میسور کا علاقہ شامل ہے نے اپنا قومی دن منایا اور اس کی مناسبت سے ایک بہت بڑی پریڈ کا اہتمام کیا گیا۔ اس پریڈ میں ایک فلوٹ پر سلطان ٹیپو کا ایک بہت بڑا مجسمہ رکھا ہوا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ

کرناٹکا کی سرکار نے سرکاری طور پر سلطان ٹیپو کی انگریزوں کے بڑھتے ہوئے قدموں کو روکنے کی کوشش کو بے حد سراہا ہے۔اس کے علاوہ حیدر علی اور سلطان ٹیپو نے ریاستِ میسور کی معیشت کو جس نئے طریقے سے پروان چڑھایا ،اس کا بھی سرکاری اور غیر سرکاری طور پر اعتراف کیا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے معاشرتی طور پر ہندوؤں کی فلاح و بہبود کے لیے بھی بے شمار کام کیے جن میں بے شمار مندروں کی تعمیر بھی شامل ہیں۔ اس فلوٹ میں کسی نظام، کسی نواب آف آرکوٹ کا مجسمہ نہیں ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ انھیں یاد رکھتے ہیں جنوں نے ان کی آزادی کی خاطر جان دی انھیں نہیں جنہوں نے سات سمندر پار سے آنے والے لوگوں کی اہلِ ہند کو غلام بنانے میں مدد دی۔

دوسری طرف ایسے ہندو بھی موجود ہیں جو سلطان ٹیپو پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ اس نے بہت بڑی تعداد میں ہندوؤں کو قتل کیا۔ گو کہ ایسا کہنے والوں کی تعداد کافی کم ہے لیکن عام طور پر یہ بحث کی جاتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ کرناٹکا کا بطورِ ریاست سلطان ٹیپو کی خدمات کا اعتراف کرنا اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ سلطان ٹیپو نے قابلِ قدر کارنامے سرانجام دیے۔ سلطان ٹیپو کے نام پر ایک یونیورسٹی کا نام بھی رکھا جا رہا ہے۔ دوسری طرف بی جے پی کی حکومت نے کتابوں سے سلطان ٹیپو سے متعلق مواد کو نکالنے کی کوشش کی جس کی عام لوگوں نے بے حد مخالفت کی۔ایک ہندو تاریخ دان نے لکھا ہے کہ اگر سلطان ٹیپو ہندو ہوتا، توآج اس کی ایک بھگوان کے طور پر پوجا ہو رہی ہوتی۔

ٹیپو سلطان کی زندگی پر بھگوان ایس گیدوانی نے ایک تاریخی ناول لکھا ہے جس کا عنوان ہےThe Sword of Tipu Sultan اس ناول پر ایک صاحب کا تبصرہ یہ جاننے کے لیے کافی ہے کہ آج بھی بھارت کے لوگ اس عظیم شخص کے بارے میں کیا سوچتے ہیں۔ تبصرہ کچھ یوں ہے:

This historical novel tells the story of Tipu Sultan--- the man, the lover, the soldier, the prince, the king. It speaks of those who loved and betrayed him; of his interactions with charming ladies and brilliant men; of his greatness and of the craftiness of his contemporaries; of the wit and folly of his times; and of the struggle of men and ideas in the march of history. Based on extensive research, The Sword of Tipu Sultan is an original contribution to historical literature which gives insights into the character of its hero, and the period in which he lived. Tipu, maligned by historians as a cruel and bigoted ruler, emerges here as a humane, enlightened ruler who believed that God is not confined to any one religion and that all religions therefore deserve equal respect. He was opposed to colonialism, welcomed the American Declaration of Independence and applauded the spirit of the French Revolution. The author establishes him as the first among modern Indian nationalists who knew that India was weakened not by outside powers but the decadence and disunity within. A vivid portrayal of the drama of Tipu's times, The Sword of Tipu Sultan captures the amazing spirit of the man who, in the midst of

disaster, lost neither his dignity nor his faith. He chose to court death when he could have saved himself, for he firmly believed that his sacrifice would serve as an example for the future generations of India. Special Edition: With 30 exclusive illustrations, handpicked by the author, from the T.V. Serial which are not part of the Printed book.

یہ تبصرہ ایک ہندو کی لکھی ہوئی کتاب پر کیا گیا ہے۔ میری ذاتی رائے میں ٹیپو سلطان کا نام ہندوستان کی آزادی کی جنگ لڑنے والوں اور عوام کی بھلائی کے کام کرنے والوں کی فہرست میں ایک نمایاں مقام رکھتا ہے۔ وہ شخص اپنی ذاتی زندگی میں بھی ایک پاک باز انسان تھا۔

باری علیگ کی کتاب کمپنی کی حکومت میں سلطان ٹیپو کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہوا ہے۔ وہ کتاب کے صفحہ 249 میں لکھتے ہیں جب سلطان ٹیپو نے حکومت سنبھالی تو انھوں نے بڑے زمینداروں سے زمین لیکر ان لوگوں میں تقسیم کر دی جو اس زمین پر کاشتکاری کرتے تھے اور کہا کہ زمین اس کی جو کاشت کرے گا۔ اس بات سے عام لوگ تو بہت خوش ہوئے لیکن بڑے بڑے زمیندار مخالف ہوگئے۔ جنہوں نے انگریزوں کے ساتھ مل کر سلطان کی ریاست کا خاتمہ کیا۔

میرے خیال میں ہندوستان کی تاریخ میں یہ پہلا ایسا واقعہ ہے۔ کیا ہم اسے سوشل ازم کی ابتدائی شکل کہہ سکتے ہیں؟ آپ کا کیا خیال ہے؟

Two commonly available photos of SultanTip, one is fake. Photo Credit: https://thelogicalindian.com

Tomb of Hyder Ali and Sultan Tipu Photo Credit: https://commons.wikimedia.org

Tipu Jayanti Celebrations Karnataka Photo Credit: https://www.india.com

کڈاپا جو کبھی نیک نامہ آباد بھی تھا اور ریاست میسور کا حصہ بھی

اب رات کے ساڑھے آٹھ بج رہے تھے اور سب لوگ کھانے سے فارغ ہو کر سونے کی تیاری کر رہے تھے۔ ٹرین میں موجود سٹاف نے ہمیں بستر وغیرہ فراہم کر دیے ۔ میں نے ان حضرات سے بات کرنے کی کوشش کی لیکن تامل زبان آڑے آ گئی۔ اس لیے بات صرف حال چال پوچھنے تک ہی محدود رہی۔ ہم کڈاپا پہنچ رہے تھے۔ کڈاپا کئی لحاظ سے ایک تاریخی شہر ہے۔ میں اس کا ایک مختصر تعارف آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔

برٹانیکا انسائکلوپیڈیا کے مطابق تیلگو زبان میں کڈاپا کا مطلب ایک بڑا دروازہ ہوتا ہے۔ اس کی وجہ سے یہ تھی کہ شمال سے جنوب کی طرف آنے ہندو یاتری یہاں سے ایک نئے علاقے میں داخل ہوتے تھے۔ دی ہندو ٹائم نے 31 اگست 2020ء کو آر ڈی رنگراجان کی ایک رپورٹ شائع کی ہے جس میں یہ کہا گیا ہے کہ کڈاپا کے علاقے سے ایک

صدیوں پرانی پتھر کی سلیٹ ملی ہے جس میں بدھ ازم کے متعلق کچھ لکھا ہوا ہے۔ یہ سب یہ ظاہر کرتا ہے کہ یہ علاقے صدیوں سے آباد چلا آ رہا ہے۔

تواابول ریڈی نے ایک طویل مضمون کڈاپا کی تاریخ کے بارے میں لکھا ہے جسے ضلع کڈاپا کی سرکاری ویب سائٹ نے شائع کیا ہے۔ اس مضمون میں اس علاقے کی صدیوں قبل تاریخ سے لیکر حیدر علی تک کے واقعات کا ذکر ملتا ہے۔ اس مضمون کے مطابق 1309ء میں پہلی مرتبہ خلجی کے دور میں اس کے ایک کمانڈر الاحد دین نے اس علاقے پر حملہ کیا تھا اور اسے فتح کیا تھا۔ یہ کسی بھی مسلمان کا اس علاقے میں پہلا قدم تھا۔ اسکے بعد حیدر علی اور ٹیپو سلطان کے دور میں یہ علاقے ریاست میسور کا حصہ رہا۔ پھر ایک وقت آیا جب 1800ء میں انگریزوں نے اس علاقے پر قبضہ کر لیا اور وہ تمام بڑے زمیندار جن سے ٹیپو نے زمین لے کر کاشتکاروں کو دی تھی واپس آ گئے اور انگریزوں نے ان کی زمینیں واپس دلوا دیں۔ اس کی وجہ ان کی انگریزوں سے وفاداری تھی اور ٹیپو کی شکست میں ان کا ایک اہم کردار تھا۔

کڈاپا میونسپل کارپوریشن کے مطابق انگریزوں نے اس شہر میں 1868ء میں میونسپل کمیٹی کی بنیاد رکھی تھی جو اس علاقے کی ایک قدیم کمیٹی ہے۔

اسطرح سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ کڈاپا کو سلاطین دلی کے دور میں خلجی نے فتح کیا اور بعد میں اس علاقہ پر حیدر علی نے قبضہ کر لیا۔ پھر ایک معاہدے کے تحت یہ علاقہ ریاست حیدر آباد کا حصہ بن گیا۔ ایک وقت میں یہ علاقہ قطب شاہی ریاست کا بھی حصہ تھا۔ اس وقت یہاں کا کمانڈر نیک نام خان تھا جس کا تعلق افغانستان سے تھا۔ ان صاحب نے شہر کا نام بدل کر نیک نامہ آباد رکھ دیا۔ یہ نام زیادہ دیر تک نہ چل سکا اور پھر دوبارہ سے کڈاپا بن گیا۔

پرانے شہروں کا نام بدل کر اپنے نام پر شہر کا نام رکھنا ایک پرانی روایت ہے۔

یہاں پر بے شمار آثار قدیمہ موجود ہیں جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس علاقے میں دو ہزار سال پہلے بھی آبادی موجود تھی۔ یہ شہر حیدرآباد سے چار سو کلومیٹر، بنگلور سے پونے تین سو کلومیٹر اور دلی سے دو ہزار کلومیٹر سے بھی زیادہ فاصلے پر واقع ہے ۔اس شہر کی آبادی چار لاکھ کے قریب ہے اور شہر میں مسلمان بتیس فیصد سے زائد ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس شہر میں ہر تیسرا شخص مسلمان ہے۔ مسلمانوں کے الگ محلے ہیں جن میں عام طور پر اردو زبان بولی جاتی ہے۔ تیلگو اس علاقے کی سب سے زیادہ بولی جانے والی زبان ہے۔ اس شہر میں ایک بہت ہی معروف بزرگ پیر امین کا مزار بھی ہے وہ سترہویں صدی میں یہاں آئے تھے۔ ان کی وفات کے بعد اس وقت کے نواب نے ان کا مزار بنوایا، جسے آستانہ مخدوم الٰہی کیا جاتا ہے۔ یہ درگاہ ہندوستان بھر میں مشہور ہے۔

جب میں اس شہر سے گزر رہا تھا تو مجھے سب سے زیادہ خوشی اس بات کی تھی کہ بڑی دیر بعد ایک ایسا شہر آیا ہے جہاں مسلمانوں کی آبادی دس فیصد نہیں بلکہ تیس فیصد سے زائد ہے۔ اس شہر میں بے شمار مساجد موجود ہیں۔ یہ سب کچھ اس وجہ سے ہے کہ یہ علاقہ مدتوں سلاطین دلی اور اس کے بعد میسور اور ریاست حیدرآباد کے تحت رہا ہے اور ان کی کوششوں سے یہاں کے بہت سے لوگ مسلمان ہوئے۔

گوٹی قلعہ جو کبھی انگریزوں کی جیل تھا

رات کے تقریباً ساڑھے گیارہ بجے سب لوگ اپنے بستروں میں جا چکے تھے جن میں کئی سو بھی گئے تھے۔ میں نے ٹائم ٹیبل دیکھا تو مجھے پتہ چلا کہ ساڑھے گیارہ بجے کے قریب ہم گوٹی سے گزریں گے۔ گوٹی ایک چھوٹا سا شہر ہے لیکن یہاں پر ایک ایسی جگہ موجود ہے جو تاریخ میں بہت ہی نمایاں مقام رکھتی ہے، پہاڑ کی بلند چوٹی پر گوٹی کا ایک قلعہ ہے۔ یہ قلعہ ایک ہزار سال پہلے بنایا گیا تھا۔ اونچائی پر قلعہ بنانے کا مطلب تھا کہ اسے آسانی سے فتح نہ کیا جاسکے۔

آرکیالوجی آف انڈیا کے حیدرآباد سرکل میں شائع ہونے والے ایک مضمون میں اس قلعے کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔ اس کے مطابق یہ قلعہ ایک سرکل میں بنا ہوا ہے۔ یہ سطح سمندر سے دوہزار فٹ بلندی پر واقع ہے۔ یہ قلعہ کئی پہاڑیوں کے درمیان واقع ہے۔ اسطرح سے یہ ایک وسیع رقبہ پر پھیلا ہوا ایک قلعہ ہے۔ رپورٹ میں مزید یہ کہا گیا ہے کہ اس قلعے کے ایک کونے میں ایک اونچی چٹان پر ایک تخت بنایا گیا ہے جس پر ایک مراٹھا سردار، مراری راؤ بیٹھا کرتا تھا۔

اٹھارہویں صدی پر اس علاقے میں قطب شاہی سلطنت قائم ہوئی جس کا ہیڈ کوارٹر گولکنڈہ تھا۔ مسلمان حکمرانوں نے مقامی ہندو راجاؤں سے لڑائی کرکے اس پر اپنا قبضہ کرلیا۔ بعد ازاں مغل حکمرانوں نے قطب شاہی حکمرانوں سے اس قلعے کو چھین لیا۔ پھر ایک وقت آتا کہ جب حیدر علی نے اس قلعے کا محاصرہ کیا جو دو ماہ تک جاری رہا۔ بالآخر حیدر علی نے اس قلعے پر قبضہ کرلیا۔ ریاست میسور کے خاتمے کے بعد انگریزوں نے اس قلعے پر قبضہ کیا اور اس قلعے کو ایک محفوظ مقام قرار دیتے ہوئے اسے ایک جیل میں تبدیل کردیا۔ اس جیل میں انھوں نے بہت سے لوگوں کو لاکر بند کیا۔ میں نے پوری کوشش کی کہ یہ معلوم ہوسکے کہ جیل میں کون لوگ قیدی تھے۔ تلاش بسیار کے باوجود اس سلسلہ میں مجھے کوئی سراغ نہ مل سکا۔ میں سمجھتا ہوں چونکہ یہ ریاست میسور کے قریب واقع تھا اور ریاست میسور کے لوگ اس پر قابض تھے لہٰذا انگریزوں نے ریاست پر قبضہ کرنے کے بعد سلطان ٹیپو کے ساتھیوں کو ہی اس جیل میں رکھا ہوگا۔ یہ قلعہ دوہزار فٹ بلند ایک پہاڑی پر واقع ہے جس کے چاروں طرف گہری کھائیاں موجود ہیں اس وجہ سے یہاں سے کسی کا فرار ہونا ممکن نہ تھا۔ اسی چیز کو ذہن میں رکھتے ہوئے انھوں نے اسے جیل بنایا۔

آج جب ہم اس گوٹی قلعے کے پاس سے گزر رہے تھے تو میں سوچ رہا تھا کہ یہ صرف قلعہ نہیں ہے۔ یہ اس ظلم کی گواہی ہے جو انگریزوں نے اس علاقے کے لوگوں پر

کیے۔ میں اپنی نیند کو تھوڑی دیر کے لیے روک کر اس شہر کو دیکھنے لگا اور چشمِ تصور میں اس قلعے میں ہونے والے واقعات دیکھتا رہا اور اس سے اٹھنے والی چیخیں بھی مجھے سنائی دیتی رہیں۔

یہ وہ لوگ تھے جو انگریزوں کے بڑھتے ہوئے قدم روکنا چاہتے تھے۔۔۔ لیکن وہ ایسا نہ کرسکے۔۔۔ یہ ہار ان کی نہیں تھی۔۔۔ بلکہ یہ اہلِ ہند کی بدقسمتی تھی۔۔۔ وہ تو اپنا فرض نبھاتے ہوئے اپنی جان نچھاور کر گئے۔۔۔

اڈونی قلعہ : ایک تین ہزار سال پرانا شہر اور جہاں افریقہ کے لوگ بھی حکمران رہے

ہماری گاڑی رات بارہ بجے کے بعد اڈونی سے گزرنی تھی۔ ٹائم ٹیبل دیکھنے سے مجھے معلوم ہوا کہ ہماری ٹرین اڈونی سٹیشن پر کچھ دیر کے لیے رکے گی۔ اس علاقے کی تاریخ پڑھتے ہوئے جو چند باتیں مجھے بہت ہی عجیب و غریب لگیں ان میں سے کچھ کا تعلق اڈونی سے بھی تھا۔ یہ شہر دلی سے دو ہزار اور حیدر آباد سے تین سو کلومیٹر کے فاصلہ پر واقع ہے۔

اڈونی کا قلعہ عام قلعوں سے بہت مختلف ہے یہ ایک بہت بڑے علاقے میں پھیلا ہوا ہے جس کے تین اطراف بڑی بڑی پہاڑیاں ہیں۔ جو نیچے سے آپس میں جڑی ہوئی ہیں۔ آج سے تین ہزار سال پہلے اس علاقے کے حکمرانوں نے اسے ایک محفوظ ترین جگہ سمجھتے ہوئے یہاں یہ قلعہ بنایا تھا۔ اس قلعے میں تیس ہزار سے زائد فوجی رہائش رکھ سکتے ہیں۔ سولہویں صدی تک اس علاقے پر ہندو راجاؤں کی حکومت تھی۔ سولہویں صدی کے وسط میں اس علاقے پر بیجاپور اور گولکنڈہ کے مسلمان حکمرانوں نے قبضہ کر لیا اور اپنی ریاستوں کا حصہ بنا دیا۔ کچھ علاقہ بیجاپور میں شامل تھا اور کچھ علاقے پر گولکنڈہ کی ریاست

کا قبضہ تھا۔ بیجا پور کے جرنیل علی عادل شاہ نے اس علاقے کو فتح کرنے میں ایک اہم کردار ادا کیا۔

ایک صاحب جن کا نام سیّدی مسعود خاں ہے، ان کے والد کا نام سیّدی جوہر تھا جن کا تعلق افریقہ سے تھا، وہ اس علاقے کی تاریخ میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔ کچھ لوگوں نے انھیں شیدی کا نام بھی دیا ہے۔ یہ ایک دلچسپ کہانی ہے کہ یہ لوگ کون تھے اور کب افریقہ سے ہندوستان پہنچے۔ میں نے اس بارے میں جاننے کی کوشش کی تو بہت ہی دلچسپ معلومات حاصل ہوئیں جو میرے لیے کئی لحاظ سے حیران کن تھیں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ سب جاننے کے بعد آپ کی کیفیت بھی مختلف نہ ہو گی۔

کینتھ ایکس رابن اور جان میکلوڈ کی کتاب African Elites in India: Habshi Amarat کے مطابق جنوبی ہندوستان میں یہ لوگ ہزاروں سال قبل افریقہ سے ہندوستان آئے تھے۔ وہ کون لوگ تھے اور اب کہاں رہ رہے ہیں؟ اس بارے میں ابھی تک تحقیقات جاری ہیں۔ جنوبی ہندوستان میں بسنے والے چند قبائل اور افریقہ میں بسنے والے لوگوں کے ڈی این اے سے اس بات کی تحقیق کی جارہی ہے کہ کیا واقعی یہ بات سچ ہے کہ یہاں بہت سے لوگ ایسے ہیں جو افریقہ سے آئے تھے۔ وہ مزید لکھتے ہیں کہ حالیہ برسوں میں کی گئی تحقیق کے مطابق تقریباً پانچ صدیاں پہلے بہت سے لوگ افریقہ سے جنوبی ہندوستان آئے۔ ان کا یہ کہنا ہے کہ لفظ سیّدی دراصل سیّدی یعنی میرے سردار کی بگڑی ہوئی شکل ہے جس کی وجہ سے ان افریقی لوگوں کو سیدی یا شیدی کہا جاتا ہے۔ گوادر اور کراچی کے درمیان بہت سے ایسے لوگ رہتے ہیں جنہیں ہم شیدی کہتے ہیں۔ ممکن ہے یہ وہی لوگ ہوں جو جنہیں جنوبی ہندوستان میں سیدی کہا جاتا ہے۔

یہ کتاب ہمیں بتاتی ہے کہ اس قبیلے سے تعلق رکھنے والے ایک صاحب مسعود خان کسی وقت میں راجہ انوپ سنگھ آف بیکانیر کے کی فوج میں ملازم تھے۔ بعد ازاں یہ

صاحب بیجاپور کی فوج میں شامل ہو گئے اور انھوں نے ان کے لیے بھی لڑائیاں بھی لڑیں۔ وہ ایک بہادر جرنیل تھے۔ پھر ایک وقت آیا کہ انھوں نے اڈونی کے علاقے میں اپنی خود مختار ریاست قائم کرلی۔ وہ 1678ء سے 1688ء تک اس علاقے میں حکمران رہے۔ اس دوران انھوں نے اڈونی قلعے میں ایک بہت ہی خوبصورت جامع مسجد بنائی۔ آرکیالوجی سروے آف انڈیا کے مطابق یہ جامع مسجد سکندر عادل شاہ کے گورنر مسعود خان نے 1683ء میں بنوائی تھی۔

رچرڈ ایم لیٹن اور رچرڈ ایم لیٹن کی کتاب **A Social History of the Deccan, 1300-1761:** Eight Indian Lives, Part 1, Volume 8 میں بھی مسعود خان سیدی کا ذکر ملتا ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے تقریباً پانچ صدیوں پر محیط تاریخ کو رقم کیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ جب میں نے اندارنی چترجی اور رچرڈ ایم لیٹن کی سربراہی میں چھپنے والی ایک کتاب Slavery and South Asian History جسے انڈیانہ یونیورسٹی پریس نے شائع کی ہے کا مطالعہ کیا تو معلوم ہوا کہ ہندوستان بھی غلامی کی لعنت سے پاک نہیں تھا۔ یہ ہندوستان میں کب شروع ہوا اور کہاں تک یہ کاروبار پہنچا، یہ سب اس کتاب میں لکھا ہے۔ اس کتاب میں کئی نامور مصنفیں کے مضمون شامل ہیں۔

جو میں اس کتاب اور دیگر کتابوں سے جان سکا اسکے مطابق ہندوستان میں غلامی کا رواج عربوں کی وجہ سے ہوا۔ یہ لوگ جب ہندوستان میں آئے تو اپنے ساتھ غلام بھی لیکر آئے۔ ان غلاموں کا تعلق افریقہ سے تھا اس لیے ہمیں ایک بڑی تعداد میں افریقی ہندوستان کے جنوب میں ملتے ہیں۔ عرب بھی ہندوستان کے جنوب میں ہی آئے تھے۔ ہندوؤں کی تاریخ میں غلاموں کی ذکر نہیں ملتا۔ ان کے ہاں شودر کا ذکر تو ضرور ہے جو تھے تو آزاد لیکن ان کی زندگی غلاموں سے بھی بدتر تھی۔

اس ساری گفتگو سے پتہ چلتا ہے کہ ہم اب تک جو کہتے آ رہے تھے کہ ہندوستان پر صرف یورپ، وسطی ایشیاء اور افغانستان سے آ کر ہی لوگوں نے حملے کیے، وہ بات ٹھیک نہیں تھی۔ تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان، افریقی لوگوں کے لیے بھی بے حد کشش رکھتا تھا۔ انھوں نے بھی ہندوستان کے کئی علاقوں پر حکومت کی۔ وہ ایک بڑی سلطنت تو نہ بنا سکے لیکن جو ان کے بس میں تھا وہ انھوں نے ضرور کیا۔ ایک چھوٹے علاقے پر ایک افریقی باشندہ حکمران بن گیا۔

اس بات کا مجھے کوئی ثبوت نہیں ملا کہ افریقہ کے لوگوں نے ہندوستان پر حملہ کیا ہو۔ البتہ یہ بات ضرور ملتی ہیں کہ وہ بطور غلام ہندوستان میں لائے گئے اور پھر ان میں سے کچھ نے اپنی ذاتی صلاحیت کی بناء پر کوئی ریاست قائم کی ہو جس طرح مسعود خان سیدی کا قصہ ہے۔ ایک اور صاحب کا بھی ذکر ملتا ہے جس کا اِحوال میں اس سفر نامہ کے اگلے صفحات میں کروں گا۔

جب کوئی کمزور ہوتا ہے تو اس کے ساتھ ایسا ہی سلوک کیا جاتا ہے جو اہل ہند کے ساتھ یورپین، افغانی، مغلوں، ایرانیوں، افریقیوں اور وسطی ایشیاء لوگوں نے کیا۔ کسی نے بھی اسے نہ بخشا۔۔۔

اہلِ ہند نے ہندوستان سے باہر کسی بھی علاقے کو فتح کرنے کا نہ کبھی سوچا اور نہ ہی کیا۔ وہ زیادہ سے زیادہ کابل اور قندھار تک ہی گئے جنہیں وہ ہندوستان کا حصہ ہی سمجھتے تھے۔

یہ سلسلہ آریاؤں سے شروع ہوا سکندر نے بھی اس پر حملہ کیا اور پھر ایک کے بعد دوسرا اور یہ سلسلہ اب تک چل رہا ہے ۔۔۔اب ہتھیار بدل گئے ہیں ۔۔۔ لیکن خواہش سب کی ایک ہی ہے۔۔۔ قبضہ اور صرف قبضہ۔۔۔

ریچُر : جہاں اشوک نے بھی حکومت کی

رات کا ایک بج رہا تھا۔ سب لوگ گہری نیند سو رہے تھے۔ میں جاگنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ میری صرف ایک ہی خواہش تھی کہ آگے آنے والے شہر ریچُر کی ایک جھلک ضرور دیکھ لوں۔ ایسا کرنے کی سب سے اہم وجہ یہ تھی کہ مجھے بڑی دیر بعد ایک ایسا علاقہ دیکھنے کا موقع مل رہا تھا جہاں اشوک کے دور میں پتھروں پر لکھی ہوئی تحریریں موجود تھیں۔ مجھے ایک دفعہ مانسہرہ جانے کا اتفاق ہوا۔ مانسہرہ شہر میں ایک جگہ کچھ پتھر موجود تھے جن پر پرانے وقتوں کی کچھ تحریریں تھیں۔ اس کے علاوہ ہمارے شمالی علاقہ جات میں بھی کئی جگہ پر اشوک کے دور کی تحریریں پائی جاتی ہے۔

اشوک کے بارے میں ہم اتنا جانتے ہیں کہ وہ موریہ خاندان کا ایک اہم فرد تھا، اس نے پورے ہندوستان پر حکومت کی۔ اس نے بدھ مت اختیار کیا اور اس کی ترویج کے لیے بے حد کام کیا۔ ریچُر شہر میں اس کے دور میں پتھروں پر لکھی ہوئی تحریریں یہ بات ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں کہ اشوک ایک وقت میں ہمارے شمالی علاقہ جات اور ہندوستان کے جنوبی علاقہ جات کا بھی حکمران تھا۔ یہ شہر دلی سے انیس سو اور حیدرآباد سے دو سو کلومیٹر کے فاصلہ پر واقع ہے۔

میرے لیے یہ چھوٹا شہر اس لیے اہمیت اختیار کر گیا کیونکہ یہ تاریخ میں بہت اہم مقام رکھتا ہے۔ اس لیے میں نے اسے رات کے وقت دیکھنے کی کوشش کی لیکن مجھے کچھ خاص نظر نہیں آیا۔ بحر حال میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں نے پاکستان کے شمالی علاقہ جات کے ساتھ ساتھ اس شہر کو بھی دیکھا ہے جو ہندوستان کے جنوب میں واقع ہے اور دونوں کے درمیان ہزاروں میل کا فاصلہ ہے لیکن اشوک کی لکھی ہوئی تحریریں ایک جیسی ہیں کیونکہ ان دونوں علاقوں کا حکمران ایک ہی تھا۔ اشوک بہت ہی عادل حکمران مانا جاتا تھا۔

اس علاقے کی دوسری اہم بات یہ ہے کہ یہ ان علاقوں میں شامل ہے جہاں چودہویں صدی کے آغاز میں سب سے پہلے بہمنی سلطنت کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ ڈیل ہوبرگ Students' Britannica India, Volumes 1-5 جو 2000ء میں شائع ہوا کے صفحہ 240 پر لکھتے ہیں کہ 1489ء میں پہلی مرتبہ یہ شہر بیجاپور کی ریاست میں شامل کیا گیا تھا۔ اس کتاب میں اس علاقے میں مسلمان حکمرانوں کی آمد اور ان کی حکمرانی کے بارے میں دلچسپ معلومات فراہم کی گئیں ہیں۔ یہ لوگ ایران سے تعلق رکھتے تھے اور سلاطین دلی کے ساتھی تھے۔ بعد ازاں انھوں نے دلی سے آ کر اس علاقے میں اپنی حکومت قائم کی۔ یہاں پر آٹھ سو سال پرانا ایک قلعہ بھی موجود ہے۔ اس قلعے کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کے اندر بے شمار زبانوں میں تحریریں لکھی ہوئی ہیں جو مقامی زبانوں کے علاوہ سنسکرت، عربی، فارسی اور اردو میں ہیں۔ جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کبھی اس علاقے پر عرب اور ایرانیوں کے ساتھ ساتھ مغل بھی حکمران تھے۔ علاقے کی خوبصورتی، کھیتی باڑی کے لیے زرخیز زمین، معتدل موسم، میٹھے پانی کے چشمے، ان کے علاوہ بہت کچھ ایسا تھا جس کی وجہ سے ہر حکمران اس علاقے پر قبضہ کرنے کی خواہش رکھتا تھا۔

اس علاقے کی خوبصورتی ہی اس کی تباہ و بربادی کا سبب بنی۔

وکاس کھتری نے World Famous Wars and Battles کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے جس میں دنیا بھر میں ہونے والی بڑی جنگوں کا حال بیان کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں وہ 1520ء میں ریچُر میں ہونے والی ایک جنگ کا حال لکھا ہے۔ یہ جنگ کیسے شروع ہوئی اور کن کن کے درمیان لڑی گئی، یہ سب کچھ بے حد دلچسپ ہے۔

وکاس کھتری لکھتے ہیں کہ یہاں کے ایک راجہ کرشنا دیواریہ نے اپنی فوج میں کام کرنے والے ایک مسلمان جرنیل جس کا نام سید ملا نکر تھا کو ایک بڑی رقم دے کر گوا

میں گھوڑے خریدنے کے لیے بھیجا۔ سید صاحب یہ رقم لے کر ایک قریبی ریاست کے حاکم عادل شاہ کے پاس چلا گیا۔ اس پر راجہ بہت ناراض ہوا۔ واپسی کا مطالبہ کیا گیا۔ جواب میں طبلِ جنگ بجایا گیا اور یوں ایک جنگ ہوئی جس میں راجہ کی طرف سے سات لاکھ سے زائد سپاہی تھے اور تیس ہزار گھوڑے تھے۔ یہ جنگ ہوئی۔ ابھی ہار جیت کا فیصلہ نہیں ہوا تھا کہ راجہ بیمار ہو کر فوت ہو گیا۔ اس جنگ کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے بعد ہندوؤں کی حکمرانی ختم ہو گئی۔ مسلمان حکمران بن گئے۔ بعد میں انگریزوں کا سکہ چلنے لگا۔ تقسیم ہند کے نتیجہ میں چھ صدیوں کی ماتحتی کے بعد ہندوؤں کو اپنے علاقے پر حکمرانی کرنے کا موقع ملا۔

آندھرا پردیش سے کرناٹک اور گلبرگہ جو مسلمانوں کی عظمت کی ایک نشانی ہے

آندھرا پردیش کا آخری ضلع کرنول تھا اور ہم نے اس کے ایک اہم شہر اڈونی سے گزر کر ریچُر سے ہوتے ہوئے یاد گرِ کو بھی دیکھا۔ ریچُر کرناٹک کا پہلا ضلع ہے اور اس کے بعد یاد گرِ دوسرا جب ہماری ٹرین یاد گرِ سے گزری اس وقت رات کے دو بج رہے تھے۔ مجھ میں اتنی ہمت نہ تھی کہ میں اس شہر کی روشنیوں کو ہی دیکھ لیتا لیکن اس سے متعلق مجھے جو چند معلومات ملی ہیں وہ ضرور آپ کے سامنے رکھنا چاہوں گا۔

یہ علاقہ صدیوں تک ہندو راجاؤں کے ماتحت رہا۔ عادل شاہی ریاست نے 1504ء میں اس علاقے پر قبضہ کیا اور اسے اپنی ریاست میں شامل کر لیا۔ بعدازاں مغل حکمرانوں نے اس پر حملہ کر کے اسے صوبہ حیدرآباد کا حصہ بنا دیا۔ اس شہر میں مسلمانوں کی آبادی پندرہ فیصد کے قریب ہے لیکن شہر میں مساجد کی ایک کثیر تعداد کی وجہ سے اسے گنبدوں کا شہر بھی کہا جاتا ہے۔

یہاں پر ایک خوبصورت مسجد ہے ۔ میں نے اس کے بارے میں جاننے کی کوشش کی تو یہ معلوم ہوا کہ یہ اپنی نوعیت کی ایک منفرد مسجد ہے جس کی مثال بھارت میں نہیں ملتی۔ یہاں پر ایک ولی اللہ کا مزار بھی ہے جنہیں آنکس ولی خاں کہا جاتا ہے۔ لوگ دور دراز سے ان کے مزار پر آتے ہیں۔ان کا اصل نام سید پیر بخاری تھا، عرف عام میں انھیں آنکس خان ولی کہا جاتا تھا۔آپ عادل شاہی ریاست کے ایک وزیر تھے۔ اور بہت ہی نیک آدمی تھے۔ ان کی درگاہ بہت مشہور ہے۔

The Jama Masjid, Gulbarga – A Blend Of Spirituality And Art Photo Credit: https://budgetindianvacations.wordpress.com

کالابُراگی جو کبھی گلبرگہ تھا جو بہمنی سلطنت کا پایہ تخت بھی رہ ہے

یہ 1980ء کی بات ہے کہ میرے آبائی شہر ٹوبہ ٹیک سنگھ کا نام دارالسلام رکھنے کی تحریک شروع ہوئی۔ کچھ لوگوں نے اس کی حمایت کی اور کچھ لوگ اس کی مخالفت میں بھی سرگرم رہے۔ جو حمایت کر رہے تھے ان کا کہنا تھا کہ یہ ایک سکھ کا نام ہے اس لیے اسے بدلنا ضروری ہے۔ جو لوگ مخالفت میں تھے ان میں سے ایک صاحب نے دلچسپ تبصرہ کیا جو مجھے اب تک یاد ہے۔ اس نے کہا مریض کا بستر تبدیل کرنے سے مریض ٹھیک نہیں ہو سکتا۔ نام کی تبدیلی کی مخالفت کرنے والے لوگوں کا یہ بھی کہنا تھا

کہ بھارت میں بے شمار شہروں کے نام مسلمانوں نے رکھے ہوئے ہیں اگر ہم نے پاکستان میں ایسا کام شروع کر دیا تو ہندو یہی کریں گے اور اس سے بہت نقصان ہو سکتا ہے۔ یہ تحریک ناکام ہو گئی اور ٹوبہ ٹیک سنگھ کا نام تبدیل نہ کیا گیا۔اسی عرصے میں لائلپور کا نام بدل کر فیصل آباد رکھنے کی کوشش کی گئی جو کامیاب ہوئی اور اب لائل پور نہیں فیصل آباد ہے۔

اس طرح کے بے شمار واقعات بھارت میں بھی رونما ہوئے۔ جب ہم 1999ء میں یہاں سے گزر رہے تھے، اس وقت یہاں پر ایک بہت ہی اہم شہر گلبرگہ موجود جس کا مطلب ہے پھولوں کا شہر تھا۔ یہ فارسی کا لفظ ہے۔

کرناٹکا میں 2014ء مسلمان حکمرانوں کے رکھے گئے ناموں کو تبدیل کرنے کی ایک مہم چلی۔ مہم چلانے والوں کا کہنا تھا کہ ہم وہی نام دوبارہ رکھیں گے جو صدیوں سے ان شہروں کے نام چلتے آئے ہیں۔ اس تحریک کے نتیجہ میں بارہ مختلف شہروں کے نام تبدیل کیے گئے جن میں گلبرگہ بھی شامل ہے۔اب یہ گلبرگہ کی بجائے کالاُبراگی کہلاتا ہے۔ان بارہ شہروں کے نئے ناموں کی فہرست دیکھ کر پتہ چلا کہ یہ نام نئے نہیں بلکہ صدیوں پرانے تھے جو مسلمانوں نے اپنے دور حکومت میں بدل دیے تھے۔ کسی کو تو بہت ہی بدلا اور کسی کو بہت کم۔ مثلاً کالاُبراگی جس کا مطلب پتھروں اور کانٹوں کی زمین ہے کو انھوں نے گلبرگہ میں بدل دیا۔ اس پر کرناٹکا کے لوگوں کی بہت دیر سے یہ مانگ تھی کے ان شہروں کے پرانے نام بحال کیے جائیں۔ایک وقت آیا کہ بھارتی حکومت نے ان کا یہ مطالبہ مان لیا اور بارہ شہروں کے نام بدل دیے گئے۔ جس پر مسلمانوں نے بے حد احتجاج کیا۔ حکومت کے نزدیک یہ احتجاج قابل قبول نہ تھا اس طرح سے گلبرگہ دوبارہ کالاُبراگی بن گیا۔

ان شہروں کے نام کرناٹکا سٹیٹ کی سرکاری ویب سائٹ پر موجود ہیں۔ان کی تفصیل کچھ یوں ہے۔

S#	Old Name	New Name
1	Bangalore	Bengaluru
2	Belgaum	Belagavi
3	Bellary	Ballari
4	Bijapur	Vijapura
5	Chikmagal	Chikkamagalu
6	Gulbarga	Kalaburgi
7	Hospet	Hosapete
8	Hubli	Hubballi
9	Mangalore	Mangaluru
10	Mysore	Mysuru
11	Shimoga	Shivamogga
12	Tumkur	Tumakuru

ہمارے ہاں کچھ ایسے شہر بھی ہیں جن کے نام پہلے کچھ اور تھے، جیسے ساہیوال کا نام منٹگمری کر دیا گیا تھا اور اٹک کو کیمبل پور کہا جانے لگا تھا۔ بعدازاں لوگوں کے مطالبے پر ان شہروں کے پرانے نام بحال کر دیے گئے۔ میں نے دیکھا ہے کہ سکھوں اور ہندوؤں کے نام پر بنے شہروں کو اب اسلامی نام دیے جانے لگے ہیں۔ مثال کے طور پر شیخوپورہ کے قریب منڈی ڈھاباں سنگھ کا نام صفدر آباد رکھ دیا گیا۔ یہ صفدر صاحب یہاں کے ایم پی اے تھے۔

ڈاکٹر سنتوش کمار یادیو نے اپنی کتاب The History of Bahamani Kingdom: A Reviewجو 2017ء میں شائع ہوئی ہے میں بہمنی ریاست کے متعلق تفصیل سے لکھا ہے۔ ان کے مطابق علاؤالدین بہمن شاہ کا تعلق ایران سے تھا اور وہ سلاطین دلی کے دربار سے منسلک تھا۔ کسی وجہ سے وہ ان سے الگ ہو کر اس دور دراز علاقے میں آ گیا اور 1347ء میں سلاطین بہمنیہ کے نام سے اپنی ریاست قائم کی۔ یہ ریاست 1527ء میں پانچ چھوٹی ریاستوں میں تقسیم ہو گئ .اس کا تفصیلی ذکر میں پچھلے صفحات میں کر چکا ہوں۔ بعدازاں عالمگیر نے ان ریاستوں کو ختم کرکے حیدرآباد کا حصہ بنا دیا۔ حیدرآباد کو مغلیہ سلطنت کا ایک صوبہ بنایا گیا۔ علاؤالدین نے گلبرگہ کو اپنا پایہ تخت بنایا. اس وقت اس شہر کا نام کالابُراگی تھا جسے بدل کر حسین آباد رکھا گیا اور بعد میں اسے گلبرگہ کہا جانے لگا۔ اس سے پہلے یہاں ہندوؤں کی حکومت تھی۔

میرے خیال میں کالابُراگی ان شہروں میں سے ایک ہے جو اپنی تاریخ اور روایات کے لحاظ سے بھارت میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔ جب ہم کالابُراگی پہنچے تو صبح کے پانچ بج رہے تھے۔ سورج ابھی طلوع ہو رہا تھا۔ روشنی بھی آہستہ آہستہ بڑھ رہی تھی اور شہر کے خدوخال نظر آ رہے تھے۔ اس طرح میری اس شہر کو دیکھنے کی حسرت بھی پوری ہوئی۔

کالابُراگی شہر بنگلور سے سو چھ سو حیدرآباد سے سوا دو سو کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔اس شہر کو صوفیوں کا شہر بھی کہا جاتا ہے۔ یہاں پر کئی اہم عمارتیں بھی موجود ہیں جو اپنے ڈیزائن، وسعت اور نقش و نگار کی وجہ سے پورے بھارت میں جانی پہچانی جاتی ہیں۔

یہاں پر خواجہ بندہ نواز کی درگاہ ہے خواجہ بندہ نواز ایک بہت ہی مشہور صوفی بزرگ تھے۔ ان کا ذکر رچرڈ ایم ایٹن، نے اپنی کتاب **A Social History of the Deccan, 1300-1761:** Eight Indian Lives, Part 1, Volume 8 کے صفحہ 33 پر خواجہ صاحب کی پیدائش اور ان کے کارناموں کی تفصیل لکھی ہے۔ اب بھی ایک بڑی تعداد میں مسلمان ان کے مزار پر آتے ہیں۔ ان کا اصل نام سید محمد بن یوسف الحسینی ہے۔آپ کو حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز بھی کہا جاتا ہے۔آپ کی وفات 1422ء میں ہوئی۔ یہاں پر سات گنبدوں والی ایک عمارت بھی موجود ہے جس کے ہر گنبد کی اپنی ایک الگ تاریخ ہے۔کالابُراگی میں موجود جامع مسجد بہت ہی عظیم الشان مسجد ہے۔اس کے بنانے میں کئی حکمرانوں نے اپنا حصہ ڈالا۔ یہاں پر ہندوؤں کا بہت بڑا مندر اور بدھ مت کا بدھاہار بھی دیکھنے کے لائق ہے۔کالابُراگی میں موجود قلعہ بارہویں صدی میں بنایا گیا اور بعد میں مسلمانوں نے اس پر قبضہ کیا۔ ایک وقت آیا کہ ہندوؤں نے ایک جنگ میں شکست کھانے کے بعد اسے تباہ و برباد کر دیا۔ پھر مسلمان حکمرانوں نے اس کی از سرنو تعمیر کی۔

ڈاکٹر سنتوش کمار یادیو مزید لکھتے ہیں کی ان حکمرانوں میں ایک حکمران حسن بھی تھا، جس نے کالابُراگی کا نام اپنے نام پر حسن آباد رکھا۔ کہا جاتا ہے کہ شمالی ہندوستان میں شیعہ مسلک کے لوگ ہمایوں کی وجہ سے آئے۔ جب ہمایوں دربدر ہو کر ایران کے حکمرانوں سے مدد لے کر تخت پر بیٹھا تو اس کے ساتھ بہت سے ایرانی بھی آئے، جو شیعہ

مسلک سے تعلق رکھتے تھے۔ جنوبی ہندوستان میں شیعہ مسلک کے لوگ بہمنی سلطنت کی وجہ سے آئے۔ انھوں نے اپنے دور حکومت میں ایران، عراق اور وسطی ایشیاء سے شیعہ مسلک سے تعلق رکھنے والے بہت سے لوگوں کو بلوایا۔ یہاں کی جامع مسجد کا ڈیزائن قرطبہ کی مسجد جیسا ہے۔ یوں لگتا ہے کوئی ایسا حکمران بھی یہاں پر تھا جو اسپین میں موجود مسجد قرطبہ سے بہت متاثر تھا۔ لمبائی کے لحاظ سے دنیا کی سب سے بڑی لمبی توپ بھی کالاُبراگی کے قلعے میں موجود ہے۔اسے بارہ گزی توپ بھی کہا جاتا ہے

کالاُبراگی وہ شہر ہے جہاں پر چالیس فیصد سے زائد مسلمان رہتے ہیں۔ میں اس بات کی کھوج لگاتا رہا کہ بھارت کے شمال میں وہ کونسا شہر ہے جہاں مسلمانوں کی تعداد بیس فیصد سے زائد ہو۔ لکھنوایک ایسا شہر ہے جہاں مسلمان 26 فیصد ہیں جبکہ دلی میں مسلمانوں کی تعداد پندرہ فیصد سے زائد نہیں ہے۔ مظفر نگر اتر پردیش میں واقع ایک شہر ہے جہاں چالیس فیصد سے زائد مسلمان بستے ہیں۔ میرے علم کے مطابق ہریانہ اور پنجاب میں چند شہر ایسے ہیں جہاں مسلمان آبادی کے تیس فیصد سے زائد ہیں۔ ان کا ذکر میں اس سفر نامہ کے تیسرے حصے میں کروں گا۔

جنوبی ہندوستان خاص طور پر حیدرآباداور اس کے ارد گرد کےعلاقوں میں جہاں کبھی قطب شاہی، عادل شاہی اور میسور کی ریاستیں موجود تھیں، مسلمان ایک بڑی تعداد میں رہتے ہیں ۔ جہاں چالیس فیصد مسلمان ہوں تو وہ یقینی طور پر اقلیت نہیں کہلاتے اور بڑے آرام سے اپنے مذہب اور عقیدے کے مطابق زندگی گزارتے ہیں۔ یہاں پر مسلمان ایک مناسب تعداد میں ہیں جس کی وجہ سے ہندو اور مسلمان آپس میں بہت ہی مل جل کر رہتے ہیں ۔اس سے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اس علاقے میں حکمرانوں نے اسلام کی تبلیغ کا کام بھی نہایت ہی اچھے طریقہ سے کیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلمانوں کی حکومت شمالی ہندوستان کے برعکس جنوبی ہندوستان میں ایک

محدود علاقے تک ہی تھی۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ ایران اور جنوب مغربی اِفغانستان سے آنے والے لوگوں نے جنگ و جدل کے ساتھ ساتھ اپنے اعلیٰ اخلاق و کردار کی مدد سے اسلام کی اشاعت میں ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔

کالابُراگی کی تاریخ اور اس کی تہذیب سے متعلق جاننے کے بعد میں نے کالابُراگی کو ان شہروں کی فہرست میں رکھا ہوا ہے جہاں میں جانا چاہتا ہوں۔ اللہ کرے بھارت اور پاکستان کے تعلقات نارمل ہو جائیں تو میں اس شہر کی سیر کو ضرور جاؤں گا، خواجہ بندہ نواز کے دربار پر بھی فاتحہ خوانی کروں گا اور جامع مسجد بھی دیکھوں گا۔ اللہ کرے ایسا ہو جائے۔

سولہ پور جس نے 1930ء میں آزادی کا اعلان کر دیا تھا

صبح کے سات بج رہے تھے ہماری ٹرین سولہ پور پہنچ گئی۔ دن کی روشنی میں مجھے وہ شہر دیکھنا نصیب ہو رہا تھا جس کے ساتھ ہندوستان کی تاریخ کا ایک اہم منفرد اور جرأت مندانہ واقعہ جڑا ہوا ہے۔ میرے ساتھی بھی بیدار ہو چکے تھے۔ ہمارے ساتھ سفر کرنے والی خاتون اور ان کے بچے بھی جاگ گئے تھے۔ اب سب ناشتے کا انتظار کر رہے ہیں۔ حسب معمول ایک صاحب آئے اور انھوں نے ہم سے ہماری پسند کا پوچھا اور کچھ ہی دیر بعد ناشتہ ہمارے سامنے تھا۔

میں نے موقع غنیمت جانا اور سولہ پور شہر کو غور سے دیکھنا شروع کیا۔ یہاں پر ٹرین تھوڑی دیر کے لیے رکی۔ تامل ناڈو، آندھرا پردیش اور کرناٹکا سے ہوتے ہوئے اب ہم مہاراشٹر اسٹیٹ میں داخل ہو چکے تھے۔ میں نے تاریخ میں سولہ پور کے بارے میں ایک ایسا واقعہ پڑھا تھا جس نے میرے دل میں اس شہر کے لیے خاص دلچسپی پیدا کر دی تھی۔ مجھے یقین ہے کہ یہ ایک ایسا واقعہ ہے جس کا ذکر ہماری تاریخی کتابوں میں بہت ہی کم پایا جاتا ہے۔

اس سے پہلے کہ میں اس واقعہ کی طرف آؤں میں اس شہر کا مختصر تعارف آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں۔

سولہ پور مہاراشٹر کا ایک اہم شہر ہے جو بمبئی سے چار سو، پونا سے اڑھائی سو اور حیدرآباد سے تین سو تیرا کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ تاریخ میں اس کا نام شولاپور بھی استعمال ہوا ہے اور کہیں کہیں سولاگی بھی لکھا ہوا ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ یہاں سولہ گاؤں تھے جن کی وجہ سے اس کا نام سولہ پور ہے۔ اس شہر کی تاریخ تقریباً ایک ہزار سال پرانی ہے۔ شہر کی آبادی پانچ لاکھ سے زائد ہے اور مسلمانوں آبادی کا بائیس فیصد ہیں۔ اس شہر میں شرح خواندگی پچانوے فیصد سے بھی زائد ہے۔ تقسیم ہند سے پہلے یہاں پر ایک صاحب رہتے تھے جن کا نام راؤ مالا پا وار اد تھا۔ یہ صاحب انڈین چیمبر آف مرچنٹ جو کہ ملکہ وکٹوریہ نے بنائی تھی کے ممبر تھے۔ ان کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ آپ ہندوستان میں ٹریکٹر لانے والے پہلے شخص تھے۔ علاقے کی ترقی کے لیے بھی ان کی بے حد خدمات ہیں۔ آج بھی لوگ ان کا نام احترام سے لیتے ہیں۔

ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد کے دوران ایک موقع پر انگریزوں کے خلاف "ہندوستان چھوڑ دو" کے نام سے ایک تحریک چلائی گئی۔ اس تحریک نے لوگوں میں بہت جوش و جذبہ پیدا کیا۔ اس تحریک سے متاثر ہو کر سولہ پور کے شہریوں نے بغاوت کا اعلان کر دیا اور 9 مئی 1930ء کو شہر کی میونسپل کمیٹی کی عمارت پر ہندوستانی پرچم لہرا دیا۔ موجودہ بھارتی پرچم تقسیم ہند کے بعد بھارت کا قومی پرچم بنا ہے۔ انھوں نے کونسا پرچم لہرایا اس کی تفصیل مجھے نہیں ملی۔ صرف انھوں نے پرچم ہی نہیں لہرایا بلکہ ایک طرح سے غلامی سے آزادی کا اعلان کر دیا تھا۔

اس واقع کی تفصیل سو پان ایس جیوال نے اپنے ایک مضمون[37] MARSHAL LAW & FOUR MARTYRS IN SOLAPUR میں اس واقعہ کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ جس کا خلاصہ میں آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔

انگریزوں کو یہ کیسے برداشت ہو سکتا تھا۔ انھوں نے 11 مئی 1930ء لوگوں کو گرفتار کیا اوران پر مقدمہ چلایا گیا 12 مئی 1931ء کو اس شہر کے چودہ افراد کو پھانسی کے تختے پر چڑھا دیا گیا۔ اور یوں آزادی کا اعلان کرنے والے لوگ اپنی جان کی بازی ہار گئے۔ پھانسی چڑھنے والے لوگوں میں مسلمان بھی تھے اور ہندو بھی۔اس لیے لوگ اس شہر کو شہیدوں کا شہر بھی کہتے ہیں۔

عام طور پر ہم شہید کا لفظ خاص مسلمانوں کے لیے بولتے ہیں لیکن میں نے بے شمار ہندوؤں اور سکھوں کو ان لوگوں کے لیے بھی یہ لفظ استعمال کرتے دیکھا ہے جو کسی بڑے مقصد جیسے آزادی کی کوشش میں اپنی جان سے گئے۔ کچھ لوگوں کو غیر مسلموں کے لیے شہید کا لفظ استعمال کرنے پر اعتراض ہے۔ میرے خیال میں شہید کے لفظ کی وسعت کی وجہ سے اب بہت سے لوگ اسے استعمال کرتے ہیں۔ انگلش میں اس کے لیے مارٹائر کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔

جب میں سولہ پور کی غلامی سے آزادی کے واقعات کی تحقیق کر رہا تھا تو مجھے معلوم ہوا کہ اترپردیش میں واقع بلیلہ کے شہریوں نے بھی 19اگست 1942ء کو بغاوت کا اعلان کرکے چیتو پانڈے کو اپنا سربراہ بنا یا تھا۔ یقیناً یہ ایک بہت بڑا واقعہ ہے۔ اس کے نتیجے میں انگریزوں نے بہت سے لوگوں کو پھانسی کی سزا دی۔ایک اور بات یہ پتہ

[37] Golden Research Thoughts Volume 2, Issue. 12, June. 2013 ISSN:-2231-5063

چلی کہ بلیلہ وہ شہر ہے جہاں منگل پانڈے نے جنم لیا تھا۔ یہ منگل پانڈے وہی صاحب ہیں جنہوں نے انگریزوں کے دیئے ہوئے کارتوس استعمال کرنے سے انکار کیا تھا اور بہت سے انگریزوں کو موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ منگل سنگھ پانڈے جنگِ آزادی کا پہلا پھانسی پانے والا فرد ہے۔ اس کی موت نے 1857ء کی جنگ آزادی کی بنیاد رکھی۔ بلیلا شہر میں پانڈے کا بڑا مجسمہ بھی موجود ہے۔

میرے علم کے مطابق اب تک بھارت اور پاکستان میں صرف یہ دو شہر ایسے ہیں جنہوں نے انگریزوں کے دور ہی میں بغاوت کا اعلان کر دیا تھا اور انھیں اپنے شہر سے بھگا دیا۔ یہ قبضہ بہت دیر تک تو برقرار نہ رہ سکا لیکن یہ ایک ایسا واقعہ ضرور تھا جس کی گونج لندن تک سنائی دی۔ اس بغاوت کے نتیجے میں بھی بے شمار لوگوں کو موت کی سزا سنائی گئی۔

سولہ پور میں رانی لکشمی بائی آف جھانسی کا ایک بڑا مجسمہ جس میں وہ گھوڑے پر سوار ہیں بھی موجود ہے۔ اس سے اہلِ شہر کا آزادی کے لیے جانیں دینے والوں کی قدر ظاہر ہوتی ہے۔

FORTY-EIGHTH YEAR

Troops Crush Sholapur Revolt; Native Rule Is Short Lived; Arrest Six, Gandhists Flee

Martial Law Ends Attempt at Swaraj — Civil Disobedience Leaders Control City Despite Police Efforts — Machine Guns Control Traffic.

FACES ARMY OUSTER

Cagle Married For Two Years; Faces Dismissal

West Point Football Star Wed August 1928 — Wife on Way North.

Sholapur announces Indpenedence in Nov 1930 much earlier than 1947 Photo Credit: https://www.amazon.com/

کلیان : پہلی ہندوستانی ڈاکٹر خواتین کا شہر

دوپہر بارہ بجے کے قریب ہم پونا پہنچے۔ پونا کا تاریخ میں اہم مقام ہے۔ بھارت کے تیسرے دورے پر مجھے پونا آنے کا موقع ملا تھا۔ میں اس شہر کا تفصیلی تعارف میں اس سفر نامہ کے تیسرے حصہ میں کروں گا۔ اب میں آپ کو کلیان کے بارے میں کچھ بتانا چاہتا ہوں۔

ممبئی سے ساٹھ کلومیٹر پہلے کلیان نام سے ایک شہر آباد ہے۔ جب ہم شہر سے گزرے تو دوپہر کے دو بج رہے تھے۔ اس شہر کی تاریخ بھی بے انتہا دلچسپ ہے۔ یہ شہر سمندر سے کچھ فاصلے پر واقع ہے لیکن بندرگاہ قریب ہونے کی وجہ سے صدیوں تک تجارت کے لیے نہایت اہم رہا ہے۔ کہتے ہیں کہ موریا اور گپتا خاندان نے بھی اس شہر کو تجارتی مقاصد کے لیے استعمال کیا تھا۔ صدیوں تک اس علاقے میں ہندوؤں کی حکومت رہی۔ پہلی مرتبہ ریاست احمد نگر کے والی نے اس پر قبضہ کیا اور اس کا نام گلشن آباد رکھ دیا۔ ایک وقت آیا جب یہ شہر بیجاپور کی ریاست میں بھی شامل تھا۔

شاہجہاں نے اپنے دور حکومت میں اورنگزیب کو دکن فتح کرنے کے لیے بھیجا تھا۔ جب شاہ جہاں کی وفات ہوئی تو اُس وقت وہ دکن کی مہم پر ہی تھا۔ شاہجہاں نے یہاں پر ایک بہت ہی مضبوط قلعہ بنایا جس میں چار بڑے دروازے اور گیارہ مینار بنائے گئے تھے۔ اس قلعے کا رقبہ ستر ایکڑ ہے۔ ایک وقت آیا کہ یہاں انگریزوں نے اپنی اجارہ داری قائم کرلی۔ انگریزوں نے اپنے دور حکومت میں اس قلعے کو تباہ و برباد کر دیا اور یہاں کا سامان بھی اٹھا کرلے گئے۔

اس شہر کو ایک ایسا اعزاز بھی حاصل ہے جو شاید پورے برصغیر میں کسی اور کے پاس نہیں ہے۔ یہاں کی دو خواتین نے 1886ء میں یورپ سے ڈاکٹری کی تعلیم

حاصل کی۔ ان میں سے ایک خاتون امریکہ بھی گئی۔ کہا جاتا ہے کہ یہ دنیا کی پہلی ہندو خاتون تھیں جس نے امریکہ کی دھرتی پر قدم رکھا۔
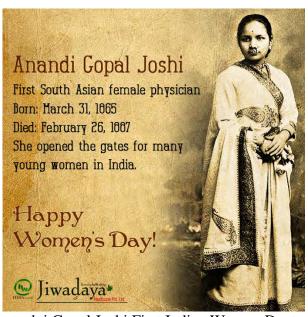
Anandni Gopal Joshi First Indian Women Doctor,
Photo Credit: https://in.pinterest.com

این ڈی ٹی وی نے ایک مضمون 31 مارچ 2018 ء کو Anandi Gopal Joshi: The Inspiring Story Of India's First Female Doctor کے نام سے شائع کیا ہے۔ اس میں اس بارے میں تفصیل سے لکھا ہے کہ کس طرح ایک دور دراز علاقے اے ایک خاتوں یورپ جاتی ہے اور طب کی اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے آتی ہے۔

ہماری منزل یعنی ممبئی بالکل قریب آ رہی تھی اور ہم تھکاوٹ بھی محسوس کر رہے تھے۔ ہمیں سفر کٹنے کی خوشی بھی تھی۔ اس سفر کے دوران ہمارے ساتھ سفر کرنے والی خاتون اور ان کے بچوں سے ہماری گفتگو بے حد مفید رہی جو زیادہ تر خاندانی معاملات

سے متعلق تھی۔ میں ان سے کی گئی بات چیت کا خلاصہ آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔

جنوبی بھارت کا رہن سہن ایک خاتون کی زبانی

ہمارے ہاں عام طور پر خواتین اپنے ہاتھوں میں انگوٹھیوں کا استعمال کرتی ہیں۔ میں نے پہلی مرتبہ دیکھا کہ ہمارے ساتھ سفر کرنے والی خاتون نے اپنے پاؤں کی انگلیوں میں بھی انگوٹھیاں پہن رکھی تھیں۔ اب انھیں انگوٹھی کہاں جائے یا کچھ اور معلوم نہیں لیکن میں نے یہ پہلی مرتبہ دیکھااور اس کے بعد مجھے کبھی بھی ایسا دیکھنے کا موقع نہیں ملا۔

میں نے خاتون سے بات کرتے ہوئے پوچھا ہے کہ ہمارے ہاں جب بھی خواتین چاند کو دیکھتی ہیں تو بچوں کو یہ کہتی ہیں کہ یہ چندا ماموں ہے۔ کبھی یہ نہیں کہتی کے چاچو چندا ہیں یا پھوپھا چندا ہیں۔ کیا صرف ماموں ہی چندا ہوتے ہیں؟ چچا یا تایا چندا نہیں ہو سکتے؟ اس پر انھوں نے کہا کہ ہمارے ہاں بھی یہی رواج ہے کہ چاند جو بہت ہی خوبصورت لگتا ہے کو دیکھ کر ماں ہمیشہ اپنے بچوں کو یہ کہتی ہے کہ یہ چندا ماموں ہیں۔ شاید یہ مشرقی عورت کی بھائیوں سے محبت کا اظہار ہے۔

میں نے ان سے یہ پوچھا کہ آپ کے ہاں خاندان کتنا مضبوط ہے اور کیا خاندانی روایات برقرار ہیں؟ ان کا جواب بہت ہی مناسب تھا۔ انھوں نے بتایا کہ میرا تعلق تامل ناڈو کے ایک چھوٹے سے قصبے سے ہے لیکن اس وقت میں اپنے میاں کی ملازمت کی وجہ سے ممبئ میں رہائش پذیر ہوں اس طرح مجھے ممبئ اور تامل ناڈو دونوں کو دیکھنے کا موقع مل رہا ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ تامل ناڈو میں ابھی تک ہم پرانے رسم و رواج جن میں ساس کی عزت و احترام، بہو کے ساتھ ہونے والی تھوڑی بہت زیادتیاں، بڑوں کا ادب، مشترکہ خاندانی نظام وغیرہ شامل ہیں کے ساتھ کافی حد تک جڑے ہوئے ہیں۔

دوسری اہم بات انھوں نے یہ بتائی کہ ہمارے ہاں بچیوں کی تعلیم پر بہت زور دیا جاتا ہے اور بچیوں نے تعلیم کے میدان میں بہت کامیابیاں بھی حاصل کی ہیں۔ ایک وقت تھا جب ہمارے ہاں لڑکیاں بہت کم ملازمت کرتی تھیں لیکن اب ایسا نہیں ہے۔ اب خواتین آپ کو ہر جگہ کام کرتی نظر آئیں گی۔ شاید ہی کوئی ایسی لڑکی ہو جو پڑھی لکھی ہو اور اس نے پروفیشنل تعلیم بھی حاصل کی ہو اور وہ کوئی نوکری نہ کر رہی ہو۔ ایسا کرنے سے کچھ مسائل نے بھی جنم لیا ہے۔

پہلا مسئلہ یہ ہے کہ کام کرنے والی خواتین کم بچے پیدا کرنا پسند کرتی ہیں۔ جس سے آبادی میں اضافہ اب نہ ہونے کے برابر ہے اور آہستہ آہستہ یہ مزید کم ہوتا جا رہا ہے۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ برسرِ روزگار خواتین اپنے خاوند سے اس طریقے سے بات نہیں کرتیں جس طریقے سے وہ خواتین کرتی ہیں جو برسرِ روزگار نہیں ہیں۔ میں اسے معاشی آزادی کہہ سکتی ہوں۔ لڑکیوں کے ملازمت کرنے کی وجہ سے طلاق کی شرح میں بھی اضافہ ہو رہا ہے۔ جسے اچھا نہیں سمجھا جا رہا۔ انھوں نے ایک اور بات بتائی کہ اب پڑھی لکھی برسرِ روزگار لڑکیاں طلاق کو برا بھی نہیں سمجھتیں۔ وہ سمجھتیں ہیں کہ جب آپس میں گزارا نہیں ہو سکتا تو علیحدہ ہونے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

میں جو آپ کو بات بتا رہا ہوں وہ آج سے بیس سال پرانی ہے۔ اب جب میں نے اسے دوبارہ سے دیکھا تو پتہ چلا کہ معاملہ پہلے سے بھی بے حد تک بگڑ چکا ہے اور اس میں پاکستان اور بھارت میں کوئی فرق نہیں ہے۔ جو کچھ ہمارے ہاں پاکستان میں ہو رہا ہے ویسا ہی بھارت میں بھی ہو رہا ہے۔

یورپ اور امریکہ میں رہنے والے کچھ بڑی عمر کے لوگوں سے بات چیت کر کے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ آج سے پچاس قبل وہاں بھی خاندانی روایات کا احترام کیا جاتا تھا اور خاندانی نظام مضبوط بھی تھا۔ اس وجہ سے طلاق کی شرح بہت کم تھی۔ جیسے

جیسے معاشی ترقی ہوئی، تعلیم عام ہوئی اور خواتین گھر سے نکل کر دفاتر اور فیکٹری میں آ گئیں تو طلاق کی شرح میں بھی اضافہ ہو گیا یہی صورتحال اب بھارت اور پاکستان میں بھی ہے۔ یہ کہنا کہ یہ سب تعلیم کی وجہ سے ہے درست نہیں ہوگا۔ اس کی بہت سی دیگر وجوہات بھی ہو سکتی ہیں۔ حال ہی میں مختلف لوگوں کی کی گئی تحقیق کے مطابق خواتین کا برسرِ روزگار ہونا انھیں معاشی آزادی کی طرف لے کر گیا ہے۔ جس نے ان کے اندر ایک اعتماد پیدا کیا ہے۔ دوسرا انھیں اپنے حقوق کا بھی علم ہوا ہے۔ان دو نکات نے طلاق کی شرح میں نمایاں اضافہ کیا ہے۔

آخر کار ہم ممبئی پہنچ گئے۔ سٹیشن پر ہماری ہم سفر خاتون جن کا ہم نام بھی نہ پوچھ سکے۔۔۔

مشرقی شرم و حیا کی وجہ سے۔

سٹیشن پر ان کے خاوند آئے ہوئے تھے۔ ان سے بھی ہماری سلام دعا ہوئی۔ انھوں نے ہمارا شکریہ بھی ادا کیا۔

ممبئی: جسے خوابوں کا شہر بھی کہتے ہیں

بھارت جانے سے پہلے میرا ممبئی کی ایک کیمیکل کمپنی سے رابطہ ہو گیا تھا۔ کمپنی کے مالک کشور گپتا نے ہمارے لیے مصطفیٰ ہوٹل میں بکنگ کروا دی تھی۔ یہ ہوٹل ممبئی شہر کے مرکز میں واقع تھا اور ریلوے سٹیشن سے زیادہ دور بھی نہیں تھا۔ ہم ریلوے سٹیشن سے مصطفیٰ ہوٹل پہنچ گئے۔ مصطفیٰ ہوٹل کے مالک ایک مسلمان میمن تھے۔ ہمیں ان سے مل کر بہت خوشی ہوئی اور انھوں نے بھی ہمیں انتہائی محبت سے خوش آمدید کہا اور ہمارے لیے بہترین کمروں کا انتظام کر دیا۔ ممبئی میں ہمارا قیام تین دن کا تھا۔ مجھے چند کیمیکلز بنانے والوں سے ملنا تھا جبکہ باقی دونوں دوستوں نے صرف سیاحت کرنا تھی۔ ہم

نے وہ تین دن بہترین انداز سے گزارے۔ اس سے پہلے کہ میں ان سرگرمیوں کا ذکر کروں جو ہم نے ممبئ میں سرانجام دیں، میں ممبئ کا ایک مختصر تعارف آپ کی خدمت میں پیش کرنا چاہوں گا۔

ممبئ کی تاریخ جاننے کے لیے میں نے درج ذیل دو کتابوں کا مطالعہ کیا۔ دونوں کتابیں نیٹ پر موجود ہیں۔

پہلی کتاب جیمز ڈگلس کی لکھی ہوئی A Book of Bombay ہے۔ یہ کتاب 1883ء میں شائع ہوئی تھی اس کے کل صفحات 566 ہیں۔ دوسری کتاب گیان پرکاش نےMumbai Fablesکے نام سے لکھی ہے۔ یہ کتاب 2010ء میں شائع ہوئی ہے۔ اس کے کل صفحات 396 ہیں۔ میں نے جو ان دو کتابوں میں پڑھا ہے اس کی خلاصہ پیش خدمت ہے۔

بچپن سے ہم اس شہر کا نام بمبئ سنتے آئے تھے لیکن 1995ء میں اس کا نام ممبئ رکھ دیا گیا۔ جو بولنے میں نسبتاً مشکل ہے۔ تاریخ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ جب پرتگیزیوں نے یہاں اپنے قدم جمائے تو انھوں نے اس شہر کو بمبئ کا نام دیا۔ پرتگیزی زبان میں "بیم "سمندر سے نکلنے والی ایک تنگ خلیج کو کہتے ہیں۔ اسی مناسبت سے اسے بمبئ کہا جانے لگا۔

پرتگیزیوں کے جانے کے بعد انگریزوں نے بھی اسی نام کو برقرار رکھا۔ ممبئ اب ایک ہندو دیوی، ممبا کے نام سے منسوب ہے۔ اس سے کچھ لوگوں کو اختلاف بھی ہے۔ اس علاقے کی ایک سیاسی پارٹی شیو سینا نے یہ مطالبہ کیا کہ بمبئ کا نام ہمارے غیر ملکی حکمرانوں کا دیا ہوا ہے اور اس سے غلامی کی بو آتی ہے۔ اسی چیز کو بنیاد بنا کر بمبئ کا نام ممبئ کر دیا گیا۔ جیمز ڈگلس نے اس شہر کا نام بمبے لکھا ہے۔ جس کا مطلب ہے کہ پہلے اس شہر کا نام بمبے تھا۔ بمبئ نام بعد میں رکھا گیا ہے۔ اس طرح یہ شہر بمبے، سے بمبئ اور پھر

ممبئی۔ ڈگلس مزید لکھتا ہے (صفحہ 71) کہ 1880ء میں انگریزوں نے اس شہر پر قبضہ کرنے کے بعد یہاں پر موجود پارسیوں اور ہندوؤں کی کئی عبادت گاہوں کے گرا دیا۔ اس نے یہ بھی لکھا ہے کہ انگریز اس شہر کی تعمیر نو کرتے وقت بہت ہی سنگدلی کا ثبوت دیتے تھے۔

تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اس علاقے میں کئی صدیاں قبل مسیح بھی آبادی موجود تھی لیکن اس کی شکل ایک شہر جیسی نہیں تھی بلکہ یہاں پر سات جزیرے تھے جن پر لوگ آباد تھے۔ وہ کون تھے؟ کہاں سے آئے تھے؟ یہ ابھی تک معلوم کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ یہاں پر ہونے والی کھدائی سے بے شمار غاروں کا پتہ چلتا ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ پتھر کے زمانے میں بھی لوگ یہاں آباد تھے۔ یہ صرف قیاس آرائیاں نہیں بلکہ ماہرین کے پاس اس بات کے ٹھوس ثبوت بھی موجود ہیں۔

تیسری صدی قبل مسیح میں یہ علاقہ موریہ سلطنت کا اہم شہر تھا۔ موریا خاندان کے اہم ترین حکمران اشوک کے دور کی نشانیاں بھی یہاں پائی جاتی ہیں۔ ممبئی شہر میں ایک علاقے کا نام اندھیری ہے۔ مجھے بھی اس علاقے میں جانے کا اتفاق ہوا ہے۔ اب تو یہ ایک بہت ہی مصروف صنعتی اور رہائشی علاقہ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہاں پر بھی پرانے وقتوں کی غاریں پائی جاتی ہیں۔ تیرھویں صدی تک یہاں پر مختلف ہندو حکمرانوں کی حکومت رہی۔ سلاطین دلی نے 1347ء میں اس علاقے پر قبضہ کیا لیکن یہ قبضہ صرف ساٹھ سال تک رہا۔ بعد ازاں اس علاقے پر سلاطین گجرات نے قبضہ کر لیا اور مدت تک یہ علاقہ ان کے ماتحت رہا۔ سلاطین گجرات میرے لیے ایک نیا انکشاف تھا۔ اس سے پہلے میں نے کبھی بھی سلاطین گجرات سے متعلق نہ کہیں پڑھا نہ سنا۔ اس سلطنت کے بانی ایک راجپوت تھے جو ہندو دھرم چھوڑ کر مسلمان ہوئے تھے۔ گجرات کے ایک وسیع

علاقے پر ان کی حکمرانی تھی۔ انھوں نے سلاطینِ دلی کو شکست دی اور ممبئی پر قبضہ کر لیا۔

پرتگیزیوں کی آمد

یہ کتنی دلچسپ اور حیران کن بات ہے کہ ہندوستان میں آنے والا کوئی بھی یورپین بغیر بلائے نہیں آیا۔ وہ تجارت یا عیسائیت کی تبلیغ کے لیے ہی آئے لیکن مقامی لوگوں نے کسی نہ کسی طرح اپنے ذاتی مقصد کے لیے انھیں ہندوستان کی سرزمین پر قبضہ جمانے کی اجازت دی اور ان سے سیاسی مفادات حاصل کرنے کی خاطر انھیں بے شمار سہولیات بھی فراہم کیں۔ جب ان کے قدم جم گئے تو انھوں نے طاقت کے زور پر باقی جگہوں پر بھی قبضہ کر لیا۔ ایسا ہی مدراس اور ممبئی میں بھی ہوا۔

پرتگیزیوں کی آمد کے بارے میں جیمز ڈگلس نے (صفحہ 12) پر لکھا ہے کہ جب پرتگیزی 1532ء میں اس علاقے میں آئے ہیں اس وقت یہاں پر کلپا دیوی نامی ایک گاؤں تھا۔ ان کے کہنے کے مطابق ممبئی کی ترقی کی وجہ اس کا جغرافیہ تھا۔ یہ ایک ساحل تھا جہاں یورپین لوگوں کو پہنچنے میں سہولت تھی۔ یاد رہے مغلوں کی حکومت 1526ء میں قائم ہوئی تھی۔ اس وقت ممبئی کے موجودہ علاقے میں ریاست گجرات کے قطب الدین بہادر شاہ کی حکومت تھی۔ 1534ء میں ایک معاہدے کے تحت انھوں نے ایک وسیع علاقہ پرتگیزیوں کو دے دیا جہاں انھیں ہر طرح کی آزادی تھی لہٰذا انھوں نے چرچ بھی بنائے، تجارتی کوٹھیاں اور دفاعی قلعے بھی۔

ایسا کیوں کیا گیا؟

یہ کہنا کسی حد تک درست ہے کہ مغلوں نے یورپیوں کو ہندوستان میں قدم جمانے کے لیے سہولت فراہم کی۔ دوسری طرف تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ 1534ء میں گجرات کے مسلمان حکمرانوں نے مغلوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کے خوف

سے اور اپنی ریاست کو مغلوں سے محفوظ رکھنے کے لیے غیر ملکیوں کو ہندوستان کی سرزمین دی تاکہ بوقتِ ضرورت وہ ریاست کی حفاظت میں ان کی مدد کر سکیں۔

چند سال بعد نہ ہی گجرات کی ریاست بچی اور نہ ہی مغلوں کی سلطنت۔ سب پر اس کا قبضہ ہو گیا جسے اپنی باہمی لڑائیوں کی وجہ سے اپنے گھر گھسنے کی دعوت دی تھی۔

یہ سب باتیں تاریخ کا حصہ ہیں جنہیں جھٹلانا ممکن نہیں ہے۔

ممبئی شہر میں اب بھی بے شمار ایسے چرچز پائے جاتے ہیں جو پرتگیزیوں نے بنائے۔ اس دور میں اس شہر کو (Bombian) کہا جانے لگا۔ بعد ازاں یہ بمبئی بن گیا اور اب اسے ممبئی کہا جاتا ہے۔ یہ کہانی بھی آپ کے لیے انتہائی دلچسپ ہو گی کہ جب اس علاقے میں پرتگیزی قبضہ جمائے بیٹھے تھے تو انگریز بھی اس وقت تک جنوبی ہندوستان کے کچھ علاقوں پر قبضہ کر چکے تھے۔ ان کی شدید خواہش تھی کہ وہ بمبئی کو بھی اپنے قبضے میں لیں۔ کیونکہ اس وقت بمبئی تجارت کے لیے ایک بہت ہی اہم مقام تھا۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے چھوٹی موٹی جنگیں بھی کیں لیکن کامیاب نہ ہوئے۔ پھر ایک دلچسپ واقعہ رونما ہوا۔

اس واقعہ کا ذکر جیمز ڈگلس نے Bombay Marraiage Treaty کے نام سے اپنی کتاب A Book of Bombay میں (صفحہ 4) پر تفصیل سے کیا ہے کہ کس طرح برطانیہ کے بادشاہ چارلس دوئم اور پرتگیز کے بادشاہ الفونسس پنجم کے درمیان 1661ء ایک معاہدہ کے تحت ممبئی کا علاقہ انگریزوں کے قبضہ میں آیا تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ ایک انگریز شہزادے کی شادی پرتگال کے بادشاہ کی بیٹی سے ہوئی۔ پرتگیزی بادشاہ نے افریقہ کا ایک زیر قبضہ شہر اور بمبئی کا ایک وسیع علاقہ اپنی بیٹی کو بطور جہیز دے دیا۔ اس طرح یہ علاقہ انگریز بادشاہ کی ملکیت بن گیا۔ اس واقعے کے صرف سات سال بعد انگریز

بادشاہ سلامت نے یہ تمام علاقے ایسٹ انڈیا کمپنی کو لیز پر دے دیے۔ یہ لیز صرف دس پونڈ سالانہ تھی۔

On 25th June 1661, The King of Portugal gave his daughter in marriage to King Charles II and included in her dowry the island of Bombay.
Photo Credit: https://www.reddit.com

یہ تھی قیمت ہندوستان کی سونا اگلتی ہوئی زمین کی، جسے ایک مسلمان سلطان نے اپنی سلطنت بچانے کی غرض سے ایک غیر ملکی کو دے دی۔

ہم بکے بھی تو کتنے سستے۔۔۔ یہ بکنا بند نہ ہوا۔۔۔ حتیٰ کہ کشمیر بھی انگریزوں نے بیچا۔۔۔

جب یہ سب کچھ ہو رہا تھا اس وقت دلی میں عالمگیر کی حکومت تھی۔ اس نے اسے برداشت نہ کیا اور اپنے ایک جرنیل یاقوت خان کو اس علاقے پر قبضہ کرنے کے لیے

بھیجا لیکن وہ اس علاقے کو واپس نہ لے سکا۔ یہ وہی دور ہے جب شاہجہاں نے دکن کے علاقے پر اپنے حملوں آغاز کیا اور عالمگیر نے اسے مکمل کیا لیکن وہ ممبئ پر اپنا قبضہ نہ کر سکا۔ بعد ازاں مراٹھوں نے بھی اس علاقے پر قبضہ کیا۔ بالآخر انگریزوں نے اسے مکمل طور پر اپنے قبضہ میں لے لیا۔ انھوں نے 1687ء میں اپنا ہیڈ کوارٹر سورت سے بمبئ منتقل کر لیا اور بمبئ پریذیڈنسی کی بنیاد رکھی اور پھر یہیں سے انھوں نے ہندوستان کے دیگر علاقوں پر بھی چڑھائی شروع کر دی۔

ممبئ تقسیم ہند کے بعد: بھارت کا معاشی کیپیٹل

تحریک آزادی میں ممبئ کے لوگوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اس بات کا تفصیلی ذکر اوشا ٹھاکر اور سندھیا مہتا نے اپنی کتاب

Gandhi in Bombay: Towards Swaraj میں کیا ہے۔ ان کے مطابق اس ممبئ میں آزادی کی تحریک نے اس وقت زور پکڑا جب 1915ء میں گاندھی جنوبی افریقہ سے واپس اس شہر آئے اور ان کا پرتپاک استقبال کیا گیا۔ گاندھی کی سربراہی میں ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد کی تاریخ میں بمبئ کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس کے بعد 1919ء میں رولٹ ایکٹ کے خلاف ایک تحریک کا آغاز بھی اسی شہر سے ہوتا ہے جس کی قیادت بھی گاندھی نے ہی کی۔ اسی طرح 1920ء میں عدم تعاون تحریک کے آغاز بھی ممبئ سے ہی ہوا تھا۔ قائدِ اعظم کا بھی ممبئ سے ایک گہرا تعلق رہا ہے۔ انھوں نے اپنی زندگی کا ایک طویل عرصہ یہیں گزارا۔

انگریزوں کے دور حکومت میں ممبئ میں بہت زیادہ صنعتی ترقی ہوئی۔ ایک بہت ہی مصروف بندرگاہ ہونے کی وجہ سے یہاں پر تجارت کے بہت زیادہ مواقع تھے۔ اسی وجہ سے گجرات اور جنوبی ہندوستان کے بہت سے لوگ ممبئ آ کر آباد ہوگئے۔ ان میں پارسی، ہندو اور مسلمان سبھی شامل تھے۔ ممبئ کی قدیم زبان مراٹھی ہے۔ جب

گجرات سے لوگ ممبئ آئے تو مراٹھی بولنے والوں کی تعداد کم ہونے لگی۔ تقسیم ہند کے فوراً بعد بمبئ اسٹیٹ کے نام سے ایک صوبہ بنایا گیا جس میں بہت سی قریبی ریاستوں کو ضم کر دیا گیا لیکن جب بعد میں پورے بھارت کو نئے سرے سے تقسیم کیا گیا تو بمبئ کو گجرات سے الگ کرکے مہاراشٹر میں شامل کر لیا گیا۔ جس کی بہت سخت مخالفت ہوئی۔ اس دوران بے شمار ہنگامے بھی ہوئے جن میں سینکڑوں لوگ مارے گئے۔آخر کار مہاراشٹر کے نام سے ایک الگ اسٹیٹ بنائی گئی اور مراٹھی بولنے والے علاقوں کو اس کا حصہ بنادیا گیا۔ یہ تقسیم زبان کی بنیاد پر کی گئی۔ گجرات میں رہنے والے لوگوں کی اکثریت گجراتی بولتی ہے جبکہ مہاراشٹر میں رہنے والوں کی اکثریت مراٹھی زبان بولتی ہے۔

شیو سینا کے نام سے یہاں پر ایک سیاسی جماعت بنائی گئی۔ انھیں باہر سے آ کر بمبئ میں رہنے والے سبھی نا پسند تھے۔ ان میں مسلمان اور جنوبی ہندوستان سے آنے والے بھی شامل تھے۔ اگر آپ کو یاد ہو تو 1950ء کی دہائی میں دنیا کے اکثر مقامات پر سوشلزم کی بات ہو رہی تھی جن کا سب سے بڑا ہتھیار مزدور تھے اس وقت ایک مزدور لیڈر جارج فرنینڈوز کا نام بہت سننے میں آتا تھا ان کا تعلق بھی ممبئ سے تھا۔ ممبئ اپنی فلم انڈسٹری کی وجہ سے بھی بہت جانا جاتا ہے۔

ممبئ کے بارے میں بہت زیادہ لکھا جا سکتا ہے لیکن مختصراً ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس وقت یہ بھارت کا ایک اہم ترین شہر ہے۔ بھارت کے جی ڈی پی میں اس شہر کا سات فیصد حصہ ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ بھارت کے سب سے زیادہ ارب پتی لوگ بھی اسی شہر میں رہتے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ 1885ء میں انڈین نیشنل کانگریس کا پہلا اجلاس بھی ممبئ میں ہی ہوا تھا۔

دنیا میں سب سے زیادہ پارسی بھی ممبئ میں ہی رہتے ہیں۔ اس شہر کی آبادی سوا کروڑ کے قریب ہے جس میں بیس فیصد مسلمان ہیں۔ ٹرانسپورٹ کا نظام بہت وسیع

ہے لیکن آبادی زیادہ ہونے کی وجہ سے ہر وقت بھیڑ کا سماں رہتا ہے۔ ممبئ کے کچھ علاقے جنہیں ہم سلم (Slums) کہہ سکتے ہیں بہت ہی بری حالت میں ہیں۔ وہاں بہت تھوڑی جگہ پر بہت زیادہ لوگ رہتے ہیں جس کی وجہ سے صحت و صفائی کے بے شمار مسائل جنم لیتے ہیں۔ ایک طرف ارب پتیوں کی کمی نہیں ہے تو دوسری طرف غریب بھی بے شمار ہیں۔ پچھلے چند سالوں میں دہشت گردی کے واقعات کی وجہ سے شہر میں خوف وہراس پایا جاتا ہے۔ سمندر کے کنارے ہونے کی وجہ سے اس کے ساحل خاصے مصروف ہوتے ہیں۔

مصطفیٰ ہوٹل بمبئ

اب تک ہم جن ہوٹلز میں بھی ٹھہرے ان میں سے کوئی بھی ہوٹل کسی مسلمان کا نہیں تھا۔ اس سے بظاہر کوئی فرق تو نہیں پڑتا لیکن اگر آپ کسی ایسے ہوٹل میں ٹھہرتے ہیں جن کے مالکان مسلمان ہوں تو وہاں پر آپ کو بہت ساری سہولیات خود بخود میسر آجاتی ہیں مثلاً کھانے میں یقینی طور گوشت مل جاتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ نماز وغیرہ کا بھی بندوبست کیا گیا ہوتا ہے۔

ہوٹل کے مالک عبدالسمیع کافی لمبی چوڑی جسامت کے مالک تھے اور اونچی آواز میں بات کرنے کے بھی عادی تھے۔ میں فارغ وقت میں ان کے پاس بیٹھ کر ان سے ممبئ کے بارے میں وہ باتیں کرتا رہتا جن کا تعلق مسلمانوں اور ہندوؤں کے آپسی تعلقات اور شہر کی معاشی و معاشرتی زندگی سے تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ عمومی طور پر یہاں پر کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہوتا۔ یہ حقیقت ہے کہ شہر میں ہندوؤں کی آبادی 60 فیصد سے زائد ہے اور کچھ لوگوں کے مزاج میں شر پسندی بھی پائی جاتی ہے لیکن ایسے لوگوں کی تعداد کم ہے۔

مسلمانوں کے لیے زیادہ مشکلات نہیں ہیں۔ البتہ جس چیز کو ہم ہندوؤں کی مسلمانوں سے نفرت کہتے ہیں وہ ان کے دھرم کا حصہ ہے۔ مثلاً ہندو دھرم میں گوشت

کھانا بہت برا سمجھا جاتا ہے اور وہ کسی ایسے شخص کو ملنا بھی پسند نہیں کرتے جو گوشت کھاتا ہو۔ اگر کوئی ایسا شخص ان کے گھر چلا جائے تو وہ یقینی طور پر یہ سمجھتے ہیں کہ ان کا گھر ناپاک ہو گیا ہے۔آپ اسے ہندوؤں کی مسلمان دشمنی کا نام دیں یا کوئی اور یہ ان کے دھرم کا حصہ ہے۔ وہ ہر غیر ہندو کے ساتھ ایسا ہی کرتے ہیں۔ یہ کوئی خاص مسلمانوں کے لیے نہیں ہے۔

یہ 1999ء کی بات ہے۔ مجھے یاد ہے کہ اس وقت بھی میں کچھ ہندوؤں کے گھر گیا تھا اور مجھے کسی طرح کا کوئی بھی مسئلہ پیش نہیں آیا۔ اس پر میں نے ان سے بات کی تو انھوں نے بتایا کہ یہ مسئلہ پرانی نسل کا ہے نئی نسل کا نہیں۔ نئی نسل کے ہندو لڑکے اور لڑکیاں گوشت کھاتے بھی ہیں اور نہیں بھی کھاتے لیکن جو جتنا مذہبی ہوتا ہے وہ اتنی ہی احتیاط کرتا ہے۔ نئی نسل دوسری طرح کے لوگوں سے ملنے میں کوئی دقت محسوس نہیں کرتی۔

میں نے ان سے مسلمانوں کے بارے میں بات کی۔ جس پر ان کا کہنا تھا کہ مسلمانوں کی اکثریت اپنی روایت سے جڑی ہوئی ہے۔ اقلیت میں ہونے کی وجہ سے ہم میں اتحاد بھی مناسب ہے۔ ابھی تک لوگ جدید رجحانات کا شکار نہیں ہوئے۔ ہمارے لباس میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی۔ البتہ ہمارے بچے نئے رجحانات کے مطابق لباس پہنتے ہیں۔

کاروبار کے بارے میں انھوں نے بتایا کہ ہندو اور پارسی بڑی دیر سے کاروبار کر رہے ہیں۔ اس لیے کوئی شک نہیں کہ زیادہ تر کاروبار انھی لوگوں کے پاس ہیں لیکن اب آہستہ آہستہ مسلمان بھی کاروبار میں آ رہے ہیں۔ پرانی نسل کے لوگ زیادہ تر مزدوری کرتے تھے۔ میں نے عبدالسمیع صاحب سے پوچھا کیا آپ کا تعلق گجرات سے ہے؟ میں نے سنا ہے کہ ممبئی کے لوگ گجرات والوں کو پسند نہیں کرتے، اس میں کتنی حقیقت ہے؟ اس پر انھوں نے کہا کہ یہ بات درست ہے۔ ان لوگوں نے اس کام کے لیے

تحریک بھی چلائی اور اپنی زبان کی بنیاد پر ایک الگ اسٹیٹ کی مانگ بھی کی۔ جو انھیں مل گئی لیکن اب حالات بدل گئے ہیں اور اب کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا۔ آنے والے دنوں میں یہ فرق مزید کم ہو جائے گا۔ اللہ کرے ایسا ہی ہو۔ شیو سینا سے متعلق میں نے ان سے جاننا چاہا، جس پر انھوں نے زیادہ بات نہیں کی لیکن ان کا کہنا تھا کہ شیو سینا کی پالیسیز عمومی طور پر ناپسند کی جاتی ہیں۔ انھیں اس وقت اندازہ نہیں تھا کہ شیو سینا آگے جا کر کتنی طاقتور ہو جائے گی۔

ایک دن عبدالسمیع صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ کیا آپ منی بیگم کو جانتے ہیں؟ میں نے کہا جی ہاں میں جانتا ہوں وہ غزلیں گانے والی ایک خاتون ہے جو بڑی عمر کے لوگوں کو بہت پسند ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ انھیں بھی انکی گائیکی بہت پسند ہے لیکن یہاں پر ان کی کیسٹس نہیں ملتیں۔ اُس وقت ابھی انٹرنیٹ عام نہیں ہوا تھا اور کمپیوٹر بھی ہر جگہ پہ موجود نہیں تھا۔ ٹیپ ریکارڈ کا دور تھا۔ انھوں نے مجھے کہا کہ اگر آپ کا آئندہ آنا ہو تو میرے لیے منی بیگم کی کیسٹس ضرور لے کر آنا۔ میں جب دوبارہ ممبئی گیا تو میں ان کے لیے منی بیگم کی کیسٹس ساتھ لے کر گیا جس پر وہ بہت خوش ہوئے شکریہ بھی ادا کیا۔

گیٹ وے آف انڈیا

ہمیں ہوٹل پہنچتے پہنچتے شام ہو گئی۔ ہم پچھلے چوبیس گھنٹے سے سفر میں تھے۔ تھکاوٹ ایک فطری عمل تھا لیکن ممبئی میں پہلی مرتبہ آنا ہوا تھا اور کچھ اندازہ بھی نہیں تھا کہ آئندہ کب آیا جائے گا۔ اس لیے ارادہ تھا کہ ہم زیادہ سے زیادہ جتنا ممبئی دیکھ سکتے ہیں ہمیں دیکھنا چاہیے۔ ہم نے عبدالسمیع صاحب سے پوچھا کہ ہمیں کہاں کہاں جانا چاہیے تو انھوں نے کئی جگہوں کے نام بتائے جن میں سے ایک گیٹ وے آف انڈیا تھا۔

یاد رہے اس سے پہلے میں انڈیا گیٹ دلی کا تذکرہ کر چکا ہوں۔ انڈیا گیٹ، انگریزوں کی طرف سے مختلف جنگوں میں مارے جانے والے لوگوں کی یاد میں بنایا گیا

تھا لیکن گیٹ وے آف انڈیا جارج پنجم کے دورے کی یاد میں بنایا گیا۔ جارج پنجم نے 1911ء میں ہندوستان کا دورہ کیا تھا۔ جس کا تفصیلی ذکر میں پچھلے صفحات میں کر آیا ہوں۔ وہ بحری جہاز کے ذریعے انگلینڈ سے آیا اور بمبئی آکر رکا تھا۔ جہاں اس کا جہاز رُکا تھا اسی علاقے میں سمندر کو مٹی سے پُر کرکے ایک جگہ پر گیٹ وے آف انڈیا بنایا گیا۔ یہ گیٹ تاج محل ہوٹل کے بالمقابل واقع ہے۔ یہ وہی تاج محل ہوٹل ہے جہاں 2008ء میں دہشت گردی کا واقع پیش آیا تھا۔ اس گیٹ کا سنگ بنیاد بمبئی کے گورنر نے رکھا۔ یہ 1924ء میں مکمل ہوا اور اس کا افتتاح اس وقت کے وائسرائے سنڈیمن نے کیا تھا۔ یہ وہی سنڈیمن ہیں جن کے نام سے انگریزوں نے ژوب کے قریب سنڈیمن فورٹ بنایا تھا۔

تقسیم ہند کے بعد جب انگریز یہاں سے واپس گئے تو 28 فروری 1948ء کو انگریزوں کی آخری کمپنی کا آخری سپاہی اسی گیٹ سے بحری جہاز پر سوار ہو کر انگلینڈ واپس گیا تھا۔ یہ ہندوستان کی حقیقی آزادی کی پہلی گھڑی تھی۔ یاد رہے ہم نے ان جانے والے انگریزوں کو جنھوں نے ہندوستان پر تین سو سال سے زائد جابرانہ حکومت کی اور آزادی کی جنگ لڑنے والے ہزاروں لوگوں کو قتل کیا جانے سے پہلے اٹھائیس توپوں کی سلامی بھی دی تھی۔ اٹھائیس توپوں کی سلامی بھی انگریزوں کی ہی ایجاد ہے۔

جب ہم گیٹ وے آف انڈیا پر پہنچے تو شام کا وقت ہو چکا تھا۔ یہ گیٹ اب ایک پکنک پوائنٹ بن چکا ہے۔ یہاں پر بہت سے لوگ تفریح کے لیے آتے ہیں۔ شام میں زیادہ رش ہوتا ہے۔ جب ہم تینوں دوست گیٹ وے آف انڈیا پر پہنچے تو ہم نے دیکھا کہ وہاں ایک فلم کی شوٹنگ ہو رہی تھی۔ یہ ہمارے لیے بھی نئی بات تھی۔ ہم ایک جگہ پر کھڑے ہو کر وہ سب دیکھنے لگ گئے۔ ایک ہی سین کو بار بار کیا جا رہا تھا اور جب تک ڈائریکٹر کا

اطمینان نہ ہوا اس وقت تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ جس سے ہمیں اندازہ ہوا کہ یہ تو خاصا مشکل کام ہے۔

Gate Way Of India Mumbai Photo Credit: https://en.wikipedia.org

گیٹ وے آف انڈیا کی اونچائی 85 فٹ جبکہ اوپر سے اس کی گولائی 50 فٹ ہے۔ اسے پیلے رنگ کے مقامی پتھروں سے بنایا گیا ہے۔ اس کے آرکیٹیکٹ کا تعلق سکاٹ لینڈ سے تھا۔ جس طرح انڈیا گیٹ پر بادشاہ جارج پنجم کا مجسمہ رکھا گیا تھا بعد میں جسے ہٹانا مشکل ہو گیا تھا، اسی طرح یہاں پر بھی جارج پنجم کا مجسمہ رکھا ہوا تھا پھر مقامی لوگوں کی مخالفت کی وجہ سے اسے ہٹا کر شیوا جی کا مجسمہ رکھ دیا گیا اور جارج پنجم کا مجسمہ ایک چھوٹے سے میوزیم میں منتقل کر دیا گیا۔

کین ڈوئل کا ایک ناول **Gateway of India:** Book One جو ممبئی کی تاریخ جاننے کے لیے بے حد مفید ہے۔ اس کتاب میں کین ڈوئل نے گیٹ وے آف

انڈیا کے بارے تفصیل سے لکھا ہے۔ کیرن نے لکھا ہے کہ گیٹ وے آف انڈیا بیسویں صدی کے اوائل میں تعمیر کیا گیا تھا۔ آج، یہ شہر کا سب سے مشہور مقام ہے۔ اس ناول میں ایک ڈاکٹر اور اس کی بیوی ریٹائر منٹ کے بعد شہر چھوڑنے کا فیصلہ کرتے ہیں لیکن جلد ہی انھیں کئی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہ کہانی بڑی ہی دلچسپ ہے۔ اس کہانی میں ایک پولیس انسپکٹر کا کردار بھی شامل ہے۔ میں نے اس ناول کے کچھ حصے پڑھے ہیں۔ اسطرح کے ناول ایک خوبصورت اور دلچسپ طریقہ سے تاریخ سے آگاہی فراہم کرتے ہیں۔

حاجی علی درگاہ جن کی قبر سمندر میں واقع ہے

ممبئ میں جو چند بہت مشہور جگہیں ہیں ان میں ایک حاجی علی کی درگاہ بھی ہے جو ممبئ کے مرکزی سٹیشن سے زیادہ دور نہیں ہے۔ یہ درگاہ کئ لحاظ سے بے حد اہم اور منفرد ہے۔ ازبکستان میں پندرہویں صدی کے آغاز میں ایک امیر آدمی رہتے تھے۔ خواب میں انھیں کوئی اپنی مدد کے لیے پکار رہا تھا۔ ایسا خواب انھیں بار بار آرہا تھا۔ اس خواب کا ذکر انھوں نے اپنی والدہ محترمہ سے کیا اور ان کی اجازت سے اپنے بھائی کے ساتھ ایک طویل سفر پر نکل کھڑے ہوئے۔ دنیا بھر کا سفر کرنے کے بعد وہ موجودہ ممبئ کے علاقے میں آکر ٹھہر گئے اور یہاں اسلام کی تبلیغ شروع کی اس کے ساتھ ساتھ اپنی تمام تر دولت بھی ضرورت مندوں میں تقسیم کر دی۔ ان کی وجہ سے اس علاقے میں اسلام کا نام لیا جانے لگا۔ یاد رہے اس وقت تک یہاں پر کوئی مسلمان حکمران نہیں آیا تھا۔ اس طرح اس علاقے میں اسلام کی اشاعت ایک نیک بزرگ کا کارنامہ ہے جنہیں کسی بھی طرح کی کوئی ریاستی مدد حاصل نہ تھی۔

انھوں نے اپنی وفات سے قبل اپنے مریدوں سے کہا کہ مجھے زمین میں دفن کرنے کی بجائے میرے کفن کو سمندر میں ڈال دینا اور جہاں جا کر میرا کفن رک جائے

وہیں مجھے دفنا دینا۔ ان کے پیروکاروں نے ایسا ہی کیا۔ انھوں نے دیکھا کہ ساحل سمندر سے پانچ سو میٹر اندر ایک چھوٹی سی چٹان کے پاس ان کا کفن رک گیا ہے۔ یہ چٹان سمندر کے اندر تھی۔ حکم کے مطابق اسی چٹان پر انکی تدفین کر دی گئی۔ بعدازاں یہاں پر ایک مسجد بھی بنائی گئی۔ مسجد اور مقبرے تک جانے کے لیے ایک چھوٹا سا راستہ بھی بنا لیا گیا ہے۔ میں ایک دفعہ ایک کیمیکل کمپنی کی طرف جا رہا تھا تو میں نے دیکھا کہ مزار ہمارے راستے میں ہی تھا۔ میرے پاس تھوڑا سا وقت بھی تھا لہٰذا میں ان کی درگاہ پر چلا گیا۔ وہاں بہت ہی خوبصورت انداز سے مسجد بنائی گئی ہے اور مقبرے کو بھی بہت اچھا سجایا گیا ہے۔

جب میں وہاں گیا تو مجھے یوں لگا جیسے میں داتا علی ہجویریؒ لاہور، کے مزار پر آگیا ہوں۔ وہی سب کچھ ہو رہا تھا جو لاہور میں داتا صاحب کے مزار پر ہوتا ہے۔ میں اب تک جتنے بھی مزاروں پر گیا ہوں وہاں ایک طرح سے قوالی پیش کرنے والے لوگوں کا قبضہ ہے۔ بڑی مشکل سے وہ نماز کے وقت یہ کام بند کرتے ہیں ورنہ ہر وقت قوالی چلتی رہتی ہے۔

حاجی علی درگاہ کے منتظمین نے خواتین کی مقبرہ کے اندر آنے پر پابندی لگا رکھی تھی۔ اس کی مخالفت میں ایک تحریک چلائی گئی جس کا عنوان تھا" حاجی علی سب کے لیے "۔ خواتین نے عدالت کا رجوع کیا۔ عدالت نے خواتین کی درخواست قبول کر لی۔ اس طرح خواتین کو مقبرے کے اندر جانے کی اجازت مل گئی۔

ڈاکٹر نور جہاں صفیہ نیاز اور زکیہ سومان نے اپنی کتاب **Reclaiming Sacred Spaces:** Muslim Women s Struggle for Entry into Haji Ali Dargah میں اس کیس کے بارے میں تفصیل سے لکھا ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے مجھے یہ معلوم ہوا کہ (Bhartiya Muslim Mahila Andolan BMMA) کے نام سے ایک تنظیم بنائی گئی جس کی ایک لاکھ سے زائد خواتین ممبر ہیں۔ یہ ایک خود مختار، سیکولر،

حقوق پر مبنی عوامی تنظیم ہے جس کی قیادت ذکیہ سومن کرتی ہے جو ہندوستان میں مسلمانوں کے شہریت کے حقوق کے لیے لڑتی ہے۔

حاجی علیؒ کے بارے میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ ان کے دربار پر اتنے مسلمان نہیں جاتے، جتنے غیر مسلم بالخصوص ہندو جاتے ہیں۔ ایسا تقریباً ہندوستان میں واقع ہر مزار پر ہوتا ہے۔ان لوگوں کی وجہ سے اس علاقے میں اسلام پھیلا۔ اللہ رب العزت ان کی ان کاوشوں کو قبول فرمائے۔ آمین، ثم آمین۔

ہندو لوگ مسلمان صوفیاء کے مزاروں پر کیوں جاتے ہیں؟ عام طور پر یہ سوال کیا جاتا ہے۔ میں نے اس کا جواب جاننے کے لیے کئی ہندو لوگوں سے بات کی۔ جن کے جواب کا لب لباب یہ تھا کہ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ تمام مذاہب؛ ہندو مذہب ہو یا اسلام، عیسائیت، جین، سکھ مت سب اس بات کو مانتے ہیں کہ پیدا کرنے والا کوئی ایک ہے، وہی ہمیں مارنے والا ہے، وہی ہمیں دوبارہ زندہ کرنے والا، وہی ہمارا رازق ہے اور ہم سب اس کی مخلوق ہیں۔ جب تک یہ عقیدہ نہ ہو تب تک کوئی بھی مذہب،مذہب نہیں بن سکتا۔ دوسری چیز ہم یہ سمجھتے ہیں کہ جتنے بھی لوگوں نے ہندومت کو پھیلایا یا اسلام کی تبلیغ کی یا عیسائیت کی اشاعت کے لیے کام کیا، یہ سب کسی نہ کسی انداز سے اوپر والے سے جڑے ہوئے تھے۔ وہ سب اُسی کی باتیں کرتے تھے۔ اس لیے ہم سمجھتے ہیں کہ ہمیں ان سب کا احترام کرنا چاہیے۔ ان میں سے کوئی بھی ہمیں اپنی پوجا کی طرف نہیں بلاتا بلکہ یہی کہتا ہے کہ اوپر والے کو یاد کریں۔ تیسری بات یہ ہے کہ جتنی بھی کتابیں خواہ ہندو مت کی ہیں یا اسلام کی یا کسی اور مذہب کی،ان سب کے بارے میں ہم سمجھتے ہیں کہ وہ سب اوپر والے کا ہی کلام ہیں جو مختلف لوگوں کے ذریعے ہم تک پہنچا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کتابوں میں لوگوں نے اپنی طرف سے بھی باتیں لکھ دی ہوں گی لیکن اسے کوئی نہیں مانتا، سب یہی کہتے ہیں کہ یہ سب اوپر والے کا کلام ہے۔ ان سب چیزوں کو

مد نظر رکھتے ہوئے ہم اوپر والے کی بات کرنے والے ہر شخص کا احترام کرتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ ہم اس کی قبر پر جائیں گے اور اس کے ذریعے اوپر والے سے بات کریں گے تو ہمارے مسائل حل ہو جائیں گے۔ ہم اسی لیے مسلمان صوفیاء کے مزاروں پر جاتے ہیں اور منت مانگتے ہیں۔

میں نے ڈرتے ہوئے کچھ لوگوں سے یہ سوال پوچھا کہ پھر اختلاف کہاں ہے؟ ان کا جواب تھا کہ بڑی باتوں میں تو اختلاف نہیں ہے۔ جیسے اوپر والے کے خالق ہونے میں اس کے رازق ہونے میں اس کے پالن ہار ہونے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ بنیادی اخلاقیات تمام مذاہب میں پائی جاتی ہیں۔ کوئی مذہب بھی ظلم زیادتی پسند نہیں کرتا، کوئی مذہب بھی جھوٹ کی طرف داری نہیں کرتا بلکہ اگر ان تمام مذاہب کو دیکھیں تو آپ کو ان میں بہت ساری اخلاقی باتیں مشترک ملیں گی۔ اختلاف اس کے بعد آتا ہے ہم کس طریقے سے عبادت کرتے ہیں، مسلمان کس طریقے سے عبادت کرتے ہیں، سکھ عبادت کا کونسا طریقہ اختیار کرتے ہیں یا عیسائی کیسے اپنے خدا کی پوجا کرتے ہیں۔ ایک اور بات تصور خدا میں بھی اختلاف ہے خدا کے بارے میں ہمارے اور مسلمانوں کے تصور میں فرق ہے۔ اسی طرح سے عیسائیوں کے تصور میں بھی فرق ہے۔ اس میں تو کوئی دو رائے نہیں کہ وہ موجود ہے البتہ اس میں فرق ضرور موجود ہے کہ اوپر والا کیسا ہے اور ہمارا اس سے کیا رشتہ ہے؟

میں نے ایک یونیورسٹی کے پروفیسر سے بات کی تو انھوں نے ایک اور بات سامنے رکھی۔ انھوں نے بتایا کہ مذاہب میں فرق اپنی جگہ موجود ہے اسے ماننا پڑے گا لیکن دوسرا فرق مختلف مذاہب کے پیروکاروں کے سیاسی، معاشی اور معاشرتی مفادات کی وجہ سے جنم لیتا ہے جس سے ہم ایک دوسرے سے دوری اختیار کرتے ہیں۔ دنیا میں مختلف مذاہب کے لوگوں کے درمیان بہت سی لڑائیاں ہوئیں۔ انھوں نے یہ کہہ کر بات

ختم کی کہ مذہب میں فرق تو موجود ہے جو بہت کم ہے لیکن مختلف مذاہب کے پیروکاروں میں جو فرق ہے وہ بہت زیادہ ہے اور اس کے ختم ہونے کا بھی کوئی امکان نہیں۔

درج بالا باتوں سے آپ کس قدر اتفاق کرتے ہیں یہ تو آپ ہی جانتے ہیں لیکن دنیا میں بہت سے لوگ ایسی باتیں کرتے ہیں اور اس پر مکمل یقین بھی رکھتے ہیں۔

Haji Ali Dargah in the Sea: Photo Credit: https://economictimes.indiatimes.com

کشور گپتا میرا میزبان

میں پاکستان میں کیمیکلز کی خرید و فروخت کا کام کرتا تھا۔ اس سلسلے میں، میں نے ممبئ میں واقع دیوی انڈسٹریز کے مالک کشور گپتا سے رابطہ کیا۔ مجھے ممبئ کے ویزے کے لیے ان کی طرف سے دعوتی خط درکار تھا جو انھوں نے بھجوادیا۔ ان کے اس خط کی وجہ سے ہم تینوں کو ممبئ جانے کی اجازت مل گئ۔ یاد رہے ان دنوں صرف تین شہروں کا بھارتی ویزا دیا جاتا تھا۔ ہمارے پاس دلی کے علاوہ آگرہ، چنائی اور ممبئ کا ویزا تھا باقی ہم نے جو کچھ دیکھا وہ سفر کے دوران ہی دیکھا۔ میں نے کشور گپتا صاحب سے رابطہ قائم کیا اور ان سے رہنمائی لے کر ایک ٹیکسی پر ان کے ہاں چلا گیا۔ ان کا دفتر اور فیکٹری ممبئ کے ایک مشہور علاقے اندھیری میں واقع تھی۔

جب میں نے کشور گپتا سے فون پر بات کی تو مجھے یوں لگا جیسے وہ ایک بڑی عمر کے صاحب ہیں۔ ان کی گفتگو بہت ہی سلجھی ہوئی تھی اور وہ بڑے دھیمے لہجے میں بات کر رہے تھے لیکن جب میں ان سے ملا تو مجھے معلوم ہوا کہ وہ تیس سال کے نوجوان ہیں جنھوں نے کیمیکل انجینئرنگ میں ڈگری حاصل کی ہوئی ہے۔ انھوں نے بڑی محبت سے میرا استقبال کیا۔ یہ ان کا کسی بھی پاکستانی سے پہلا رابطہ تھا۔ میں نے اپنے اس احساس کا ذکر کیا تو انھوں نے خوب انجوائے کیا۔ ان کے والد صاحب ایک بڑی ٹیکسٹائل مل میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھے اور اب ریٹائرڈ زندگی گزار رہے تھے۔ وہ چار بہن بھائی تھے اور سب ہی اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے۔

کشور گپتا کی رنگت بہت صاف اور نین نقش انتہائی خوبصورت تھے۔ میں نے باتوں باتوں میں پوچھا کہ مجھے لگتا ہے آپ جنوبی ہندوستان سے نہیں بلکہ بھارت کے شمال میں واقع کسی پہاڑی علاقے سے ہیں۔ اس پر انھوں نے کہا کہ آپ نے ٹھیک پہچانا ۔ چند دہائیاں قبل میرے آباؤاجداد کشمیر سے آ کر ممبئی میں بس گئے تھے۔ میں نے حیرانی سے پوچھا کہ ایسا کیوں ہوا؟

انھوں نے بتایا کہ اس کی ایک وجہ تو بہتر روزگار کی تلاش تھی اور دوسری وجہ شاید ہمارے خاندان کا مذہبی ہونا تھی۔ وہ کشمیر کے جس علاقے میں رہتے تھے وہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ ان کی خواہش تھی کہ وہ کسی ایسے علاقے میں جا کر رہیں جہاں ہندو اکثریت میں ہوں تاکہ انھیں اپنی مذہبی رسومات ادا کرنے میں آسانی ہو۔ کشور گپتا جی کا کہنا تھا کہ یہ میرا اندازہ ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انھیں مسلمانوں سے کوئی مسئلہ نہیں تھا۔

اپنے کام کے سلسلے میں میں نے ان سے بات کی لیکن میرا اصل مقصد ان سے بہت کچھ جاننا تھا خاص طور پر میں یہ جاننا چاہتا تھا کہ بھارتی معاشرہ کس رخ جا رہا ہے؟

اس سلسلے میں انھوں نے مجھے بہت ساری باتیں بتائیں لیکن ایک بہت ہی دلچسپ بات مجھے آج بھی یاد ہے اور شاید دیر تک یاد رہے۔

میں نے ان سے کرپشن کے بارے میں پوچھا تو جواب میں انھوں نے بتایا کہ مشتاق جی اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارے ادارے کوئی بھی کام بغیر رشوت کے نہیں کرتے۔ لہٰذا اب یہ ایک عام سی بات ہے اور اب ہم اسے برا بھی نہیں سمجھتے ہیں۔ ہم کاروبار کرتے ہیں اور سرکاری محکموں سے پالا بھی پڑتا ہے اور انھیں خوش کیے بغیر ہمارے جائز کام بھی نہیں ہوتے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہم کچھ غیر قانونی رعائتیں بھی طلب کرتے ہیں، جو وہ ہمیں دے دیتے ہیں۔

میں نے یہ بھی جاننا چاہا کہ عام آدمی کی زندگی میں کرپشن کہاں تک داخل ہو چکی ہے۔ انھوں نے کہا کہ عام آدمی ابھی اس لعنت سے بچا ہوا ہے۔ انھوں نے مزید بتایا کہ مشتاق جی میں آپ کو ایک ذاتی واقعہ سناتا ہوں۔ میرے پتا ایک بڑی ٹیکسٹائل مل میں اعلیٰ عہدے پر فائز رہے ہیں ۔ جہاں وہ تنخواہ کے علاوہ مختلف ڈائز اور کیمیکل کے سپلائرز سے بے شمار کمیشن لے سکتے تھے اور ایسا ہوتا بھی ہے لیکن میرے والد نے کبھی ایسا نہیں کیا۔ ایک دن ہم سب بہن بھائی اور والدہ بیٹھے ہوئے تھے تو ہم نے والد صاحب سے پوچھا کہ آپ نے ساری عمر تنخواہ میں گزارا کیا ہے۔ آپ نے کمیشن لیا ہوتا تو آج ہم بھی سیٹ ہوتے ۔ کسی بڑے گھر میں رہ رہے ہوتے۔ آپ کے کئی ساتھی بہت امیر ہیں۔ آپ نے ایسا کیوں نہیں کیا؟ ہمارا مقصد صرف مذاق ہی تھا لیکن والد صاحب نے اسے سنجیدہ لے لیا۔ جس کا ہمیں افسوس ہوا۔ وہ کچھ دیر خاموش رہے پھر والدہ کی طرف اشارہ کرکے کہنے لگے یہ سب آپ کی والدہ کی وجہ سے ہوا ہے۔

ہم نے والدہ کی طرف مڑ کر دیکھا اور ان سے کہا کہ آپ نے ایسا کیوں کیا؟

ہم سب بہن بھائی مذاق کے موڈ میں تھے لیکن والدہ نے بھی اسے بہت سنجیدگی سے لیا اور ان کی آنکھوں میں نمی بھی آ گئی۔ یہ دیکھ کر ہمیں بھی افسوس ہونے لگا کہ ہم نے ایسی بات کیوں کر دی۔ تھوڑی دیر خاموشی کے بعد والدہ بولیں کہ شادی کے وقت میں ایک غریب گھرانے سے تعلق رکھتی تھی اور آپ کے پِتا بھی امیر آدمی نہیں تھے۔ رخصتی کے وقت مجھے میرے والد نے یہ کہہ کر بھیجا تھا کہ مردوں کو ناجائز طریقے سے حرام کمانے پر ان کی بیویاں ہی مجبور کرتی ہیں۔ تمہاری ماں نے مجھے مجبور نہیں کیا تم بھی اپنے میاں کو مجبور نہ کرنا۔ یہ بات میں نے اپنے پلے باندھ لی۔

شادی کے چند روز بعد میں نے آپ کے پِتا سے کہا کہ میں آپ سے ایک ضروری بات کرنا چاہتی ہوں اور چاہتی ہو کہ آپ یہ بات دھیان سے سنیں۔ میں نے کہا کہ آپ مجھے دو سفید سوتی ساڑھیاں لے دینا، میں زندگی بھر اور کپڑا نہیں مانگوں گی، میں کبھی کسی دور دراز مندر میں پوجا کے لیے بھی نہیں کہوں گی، آپ جو کچھ لا کر دیں گے وہ سب سے پہلے آپ کو اور آپ کے بچوں کو دوں گی اور جو بچ جائے گا اسے صبر شکر کر کے کھا لوں گی۔ میں کبھی آپ سے یہ نہیں کہوں گی مجھے کسی پارٹی میں جانا ہے یا مجھے کسی کی بہت اچھی دعوت کرنی ہے۔

جب میں نے کافی باتیں کر لیں تو آپ کے پِتا نے پوچھا کہ آپ یہ سب کیوں کہہ رہی ہیں؟ میں نے ان سے کہا کہ میں یہ سب اس لیے کہہ رہی ہوں تاکہ آپ کو میری کوئی ضرورت پوری کرنے کے لیے حرام نہ کمانا پڑے۔ آپ کو جو تنخواہ ملے گی، ہم اس میں خاموشی سے گزارا کر لیں گے۔ زیادہ ہوگا، زیادہ کھا لیں گے، کم ہوگا تو کم کھا لیں گے۔ بھگوان سے امید ہے کہ اگر ہم نے اپنے بچوں کو حرام سے بچائے رکھا تو ہمارے بچے بھی حرامی نہیں ہونگے، نیک کام کریں گے، اور عمر بھر ہمیں کسی دقت کا سامنا نہیں ہوگا۔

یہ بول کر والدہ چپ ہو گئیں۔ اس کے بعد پِتا جی نے صرف اتنا کہا کہ جب بھی زندگی میں کوئی حرام کمانے کا موقع آیا تو مجھے تمہاری والدہ کی باتیں یاد آ جاتیں اور بھگوان مجھے کرپشن سے بچا لیتا۔ آج اسی کا نتیجہ ہے کہ آپ سب لوگ بہترین زندگی گزار رہے ہیں، سب نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی ہے، سب شادی شدہ اور برسرِ روزگار ہیں۔ ہم دونوں بھی خوش ہیں۔ آپ کی والدہ کی سب حسرتیں بھی پوری ہو گئیں ہیں۔ اب ان کے پاس بے شمار ساڑھیاں بھی ہیں اور سیر و سیاحت کے لیے پیسے بھی۔

یہ سب سننے کے بعد میں نے کشور گپتا سے کہا کہ میں آپ کے پِتا جی سے ملنا چاہتا ہوں۔ اس پر انھوں نے بتایا کہ وہ ریٹائرڈ زندگی گزار رہے ہیں لیکن شام میں کچھ دیر کے لیے میرے دفتر آ جاتے ہیں۔ ابھی آنے ہی والے ہیں۔ وہ آتے ہیں تو آپ سے ملاقات بھی ہو جائے گی۔ میں نے ان سے ملنے کے لیے انتظار کرنا ہی مناسب سمجھا۔ اتنے میں شام ہو گئی اور مجھے کہیں جانا بھی تھا لیکن میں اس شخص سے ملے بغیر نہیں جانا چاہتا تھا جس نے کرپشن سے پاک زندگی گزاری اور کرپشن کرنے والوں سے بڑھ کر پرُسکون زندگی گزار رہے ہیں۔

میں ان سے ملا تو کوئی بات نہ کی صرف سنتا رہا اور تکتا رہا!

My Host Kishore Gupta

شیواجی ریلوے سٹیشن جو کبھی وکٹوریہ ریلوے سٹیشن تھا

ممبئ کا مرکزی ریلوے سٹیشن جسے عام طور پر وکٹوریہ ریلوے سٹیشن کہا جاتا ہے مصطفیٰ ہوٹل سے بہت ہی قریب تھا۔ ایک دن ہم اس کی سیر کے لیے چلے گئے۔ یہ سٹیشن بھارت کا قدیم ترین ریلوے سٹیشن ہے اور اس کا شمار دنیا کے مصروف ترین ریلوے سٹیشنز میں کیا جاتا ہے۔

گیان پرکاش نے اپنی کتاب Mumbai Fables میں اس ریلوے سٹیشن کے بارے میں تفصیل سے لکھا ہے۔ وہ لکھتے ہیں (صفحہ 47) کہ اس کی تعمیر بہت منفرد ہے

اور اسے دنیا کے بہت سارے اعزازات بھی مل چکے ہیں۔ اس کی طرز، تعمیر گوئتھک طرز تعمیر کا ایک شاندار نمونہ ہے۔ اس کے ساتھ اس کی تعمیر کرتے وقت اس بات کا خیال رکھا گیا تھا کہ اس سے برطانیہ کا رعب و دبدبہ بھی ظاہر ہونا چاہیے۔ ان سب چیزوں نے ہماری دلچسپی میں اضافہ کیا اور ہم یہ ریلوے سٹیشن دیکھنے کے لیے چلے گئے۔

میں اس بات کا ذکر پچھلے صفحات کر آیا ہوں کہ انیسویں صدی میں انگریزوں نے دنیا بھر میں جتنے بھی ریلوے سٹیشن بنائے ان کی تعمیر میں بہت سی مشترک چیزیں پائی جاتی ہیں۔ اگر کبھی آپ کو موقع ملے تو آپ لاہور کا ریلوے سٹیشن، دلی کا پرانا سٹیشن یا انگلینڈ کے مختلف اسٹیشنز کو سامنے رکھیں تو آپ محسوس کریں گے کہ ان کے طرز تعمیر میں بے حد مماثلت پائی جاتی ہے۔ ہندوستان میں پہلی مسافر ریل گاڑی کا آغاز بھی ممبئ میں ہی ہوا تھا۔ پھر جب ممبئ میں کاروبار بڑھنے لگا تو ایک بڑے ریلوے سٹیشن کی ضرورت پیش آئی۔ ملکہ برطانیہ کی حکمرانی کے پچاس سال مکمل ہونے پر اس ریلوے سٹیشن کو ان کے نام سے منسوب کر دیا گیا۔

پھر ایک وقت آیا کہ 1996ء میں اس ریلوے سٹیشن کا نام چھترپتی شیواجی رکھ دیا گیا۔ تقسیم ہند کے بعد بھارت میں ایک تحریک چلائی گئی جس کے تحت انگریزوں کے دور کی بے شمار نشانیوں کو ختم کیا گیا۔ انگریزوں نے بہت سی عمارتیں بنائیں جن کے نام اپنے لوگوں پر رکھے، لیکن شہروں کے نام بھی اپنے لوگوں کے نام پر رکھ دیئے جیسے لائلپور، فورٹ منرو وغیرہ۔ اس مہم کے نتیجے میں اس ریلوے سٹیشن کا نام بھی بدل دیا گیا اور علاقے کی ایک مشہور ہندو شخصیت شیواجی جس نے مراٹھا ریاست کی بنیاد رکھی تھی کے نام پر رکھا گیا۔ اب اس ریلوے اسٹیشن کا سرکاری نام

Chhatrapati Shivaji Maharaj Terminus

ہے۔ ہندوستان میں پہلی ٹرین 16 اپریل 1853ء کو ممبئ میں چلائی گئ۔ جس جگہ سے یہ ٹرین چلائی گئ اسی جگہ کو بعد میں وکٹوریا سٹیشن بنایا گیا۔ وکٹوریا سٹیشن 1878 میں شروع ہوا اور دس سال کے عرصے میں مکمل ہوا۔ یہ ریلوے سٹیشن تقریباً سات ایکڑ پر بنایا گیا ہے۔ اس کے ارد گرد اڑھائی سو ایکڑ کے قریب جگہ چھوڑی گئ ہے۔ یہ سٹیشن اٹالین، ہندوستانی اور برطانوی طرزِ تعمیر کا ایک خوبصورت مجموعہ ہے۔ اس وقت یہ سٹیشن آثار قدیمہ کی فہرست میں شامل ہے۔

ہم کافی دیر سٹیشن پر گھومتے رہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ایک قابلِ رشک عمارت ہے ۔اس ریلوے سٹیشن کا ڈیزائن ایک انگریز آرکیٹیکٹ نے تیار کیا تھا۔ سٹیشن کی تعمیر کے بعد یہاں ملکہ وکٹوریہ کا مجسمہ بھی رکھا گیا۔ بعد ازاں اسے ہٹا دیا گیا۔) مجسمے کو ہٹانا بھی اسی تحریک کا حصہ تھا جس کا مقصد انگریزوں کی تمام تر نشانیوں کو ختم کرنا تھا(۔ ابھی تک یہ معمہ حل نہیں ہو سکا کہ وہ مجسمہ کہاں گیا۔

جب بادشاہ ختم ہو جائے تو رعایا بادشاہت کی نشانیاں بھی ختم کر دیتی ہے!

سدا بادشاہی صرف اسی کی باقی رہتی ہے جو ہم سب کا خالق و مالک ہے۔

آپ کو یاد ہو گا کہ 2008ء میں ممبئ میں دہشت گردی کے کئ واقعات ہوئے تھے ان میں سے ایک واقعہ اس ریلوے سٹیشن پر بھی ہوا تھا۔ بہت سے لوگ مارے گئے تھے صرف اجمل قصاب زندہ بچا اور اس کے بعد بھارتی حکومت نے عدالتوں کے ذریعے اسے پھانسی دے دی۔

Victoria Terminal Photo Credit:Mumbai Mirror

ایک ٹیکسی ڈرائیور کی داستان اور بھارت کا ٹیکس سسٹم

ایک دن مجھے ایک صاحب سے ملنے کے لیے ہوٹل سے کافی دور جانا تھا۔ ہوٹل انتظامیہ سے راہنمائی حاصل کی۔ توانھوں نے مجھے یہ کہا کہ اگر آپ ٹیکسی پر جاتے ہیں تو بہت وقت لگ سکتا ہے۔ راستے میں رش بھی ہوتا ہے لیکن سفر مشکل نہیں ہوتا۔ اگر آپ برداشت کر سکتے ہیں تو لوکل ٹرین پر سفر کریں۔ یہ مشکل سفر ہوتا ہے۔ میں نے ان کی بات سن کر طے کیا کہ میں ٹیکسی پر جاؤں گا اور واپسی لوکل ٹرین پر آؤں گا تاکہ میں دونوں طرح کا تجربہ حاصل کر سکوں۔

ممبئ میں اُس وقت بھی ایک لاکھ سے زیادہ ٹیکسیاں تھیں۔ میں نے ایک ٹیکسی والے کے ساتھ سفر شروع کیا تو مجھے احساس ہوا کہ شاید ہماری اسپیڈ پیدل چلنے والوں سے بھی کم ہے لیکن اس کا فائدہ یہ ہوا کہ مجھے شہر کو بڑے اچھے انداز سے دیکھنے کا موقع مل گیا۔ ممبئ ان شہروں میں سے ایک ہے جو تجارتی نقطۂ نظر سے برصغیر میں

سب سے پہلے آباد ہوا۔ ممبئی کے نقشے کو دیکھیں تو آپ جان سکیں گے کہ یہ لمبائی میں زیادہ اور چوڑائی میں کم ہے۔اس لیے اگر آپ کو ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا پڑے تو آپ کو طویل فاصلہ طے کرنا پڑتا ہے۔ میں ٹیکسی میں بیٹھ گیا اور حسب معمول ڈرائیور سے باتیں کرنے لگا۔ وہ سفر تقریباً ایک گھنٹے سے زیادہ تھا اس لیے مجھے ان صاحب کے ساتھ بہت ساری باتیں کرنے کا موقع ملا۔

چند باتیں انتہائی دلچسپ ہیں جو میں آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔

ٹیکسی ڈرائیور راجستھان کے کسی علاقے سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ راجستھانی لہجے میں بات کر رہے تھے جسے وہ کھڑی بھاشا کہتے ہیں۔ اس کا ذکر میں نے دلی سے متعلق لکھتے ہوئے کیا ہے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ آپ کتنے بھائی ہیں۔اس نے بتایا کہ وہ دو بھائی ہیں۔اس کے ساتھ ہی اس نے مجھے ایک کہاوت بھی سنائی جو میں نے اس سے پہلے کبھی نہیں سنی تھی۔ وہ کہاوت کچھ یوں تھی کہ "ایک کی ماں اندھی اور دو کی ماں کانی"۔ میں نے ان سے اس کا مطلب پوچھا تو انھوں نے کہا کہ اگر ایک بیٹا ہو تو ماں کو پوری دنیا میں صرف اپنا بیٹا ہی نظر آتا ہے باقی دنیا کے لیے وہ اندھی ہوتی ہے۔ دو بیٹے ہوں تو پھر وہ ایک آنکھ سے بیٹوں کو اور دوسری آنکھ سے پوری دنیا کو دیکھتی ہے۔

میں نے ان سے پوچھا کہ کیا ٹیکسی آپ کی ہے؟ انھوں نے جواب دیا کہ ٹیکسی میری ہے لیکن میرے نام پر نہیں ہے۔ میں نے حیرانی سے پوچھا کہ ایسا کیوں ہے؟ یاد رہے کہ یہ 1999ء کی بات ہے۔

اس نے جواب میں کہا کہ ہمارے ہاں ٹیکس کا نظام بہت سخت ہے۔ میں بڑی دیر سے ممبئی میں ٹیکسی چلا رہا ہوں میرے پاس کچھ پیسے بھی اکٹھے ہو گئے تھے لیکن میں ٹیکسی نہیں لے سکتا تھا کیونکہ میں انکم ٹیکس نہیں بھرتا تھا۔ یہاں پر قانون ہے کہ وہی ٹیکسی خرید سکتا ہے جو ٹیکس ادا کرتا ہو۔ میرے ایک کزن بینک میں کام کرتے ہیں۔ میں

نے یہ پیسے انھیں دے دیئے اور انھوں نے مجھے بینک سے گاڑی لے کر دی۔ اب وہ بینک کو اس کی قسطیں ادا کرتے ہیں۔ اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ میں نے یہ گاڑی کیسے لی ہے تو میں بتاتا ہوں کہ بینک سے قرض لیکر خریدی ہے۔ اس طرح میں بغیر ٹیکس دیے گاڑی خریدنے میں کامیاب ہو گیا۔

میں نے اس سے مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان تعلقات کے بارے میں پوچھا۔ اس کا جواب بہت خوشگوار نہیں تھا۔ میں نے بھارت کے شمال اور جنوب میں کئی لوگوں سے مسلمانوں کے بارے میں پوچھا ہے۔ ان کے خیالات سننے کے بعد میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ سب ایسا ہی ہے لیکن میں یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ بھارت کے شمال میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اس قدر ہم آہنگی نہیں ہے جس قدر جنوبی بھارت میں پائی جاتی ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ جتنے بھی فاتحین آئے؛ جو انتہائی جنگجو تھے، انھوں نے شمال میں واقع مختلف ہندو ریاستوں کو ختم کیا اور ان علاقوں پر اپنی حکمرانی قائم کی۔ ان کی آبادی کبھی بھی دس فیصد سے زائد نہ رہی جبکہ جنوب میں بہت سے مسلمان تجارت کی غرض سے آئے اور انھوں نے وہاں کوئی جنگ نہ کی بلکہ امن سے رہے اس طرح یہاں پر ایسے بہت سے شہر موجود ہیں جہاں مسلمانوں کی تعداد چالیس فیصد سے بھی زائد ہے۔

ٹیکسی میں سفر کرتے کرتے میں نے ارد گرد بہت ساری ایسی چیزیں دیکھیں جو بہت ہی دلچسپ تھیں۔ ایک جگہ گائے اور اس کے ساتھ چارہ بیچنے والا بھی موجود تھا۔ آپ کو اس بات کا علم ہو گا کہ ہندو گائے کی پوجا کرتے ہیں اسے بے حد مقدس سمجھتے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ کئی لوگ گائے کے پاس سے گزرتے ہوئے چارے والے سے چارہ خرید کر گائے کو ڈال رہے تھے۔ یہ ایک طرح سے ان کا گاؤ ماتا کے لیے احترام تھا۔ یہ بالکل اسی طرح سے جیسے لاہور میں ہمارے ہاں لوگ نہر کے کنارے گوشت لے کر کھڑے ہوتے

ہیں اور لوگ ان سے گوشت خرید کر پرندوں کو ڈالتے ہیں۔ اگر آپ کا راوی کے پل سے گزرنے کا اتفاق ہو تو وہاں پر بھی لوگ اسی طرح کھڑے ہوتے ہیں۔ میں نے یہ بھی دیکھا کہ لوگ دریائے راوی میں سکے بھی ڈالتے تھے۔ کچھ لوگ پرندوں کو دانہ ڈالنا بھی ثواب کا کام سمجھتے ہیں۔ ثواب کا یہ تصوّر تقریباً ہر جگہ پایا جاتا ہے۔ میں نے یہ بھی دیکھا کہ ممبئ میں پیپل کے درخت کے نیچے کئ مورتیاں رکھی ہوتی تھیں اور لوگ آتے جاتے وہاں پر بھی کچھ سکے ڈال دیتے تھے۔ آپ نے لاہور میں بھی دیکھا ہو گا کہ اکثر سڑکوں کے کنارے موجود مزاروں پر بھی لوگ آتے جاتے کچھ نہ کچھ ڈال دیتے ہیں۔

یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ ایسا صرف پاک و ہند میں ہی نہیں ہوتا بلکہ میں نے ایک منظر تائیوان میں بھی دیکھا جہاں بدھ مت کے ماننے والے رہتے ہیں۔ تائیوان کے ایک ٹیمپل میں جعلی کرنسی نوٹ ملتے تھے۔ لوگ اصلی نوٹ دے کر بہت سے جعلی نوٹ خرید لیتے تھے اور پھر ان کو وہیں پر آگ میں جلا دیتے۔ میں نے اپنے میزبان سے پوچھا کہ ایسا کیوں ہے؟ ان کا کہنا تھا کہ ہمارا عقیدہ ہے کہ آگ میں جتنے نوٹ جلیں گے اتنے ہی اصلی نوٹ ہمیں دوبارہ مل جائیں گے۔

مسلمان اور ممبی : ایک بزرگ مسلمان کی زبانی

میں ایک مشکل سفر کے بعد ان صاحب کے پاس پہنچ گیا جن سے ملنا تھا۔ وہ ایک مسلمان تھے جو بوائلرز کا کام کرتے تھے۔ اپنے کام کی بات کرنے کے بعد میں نے ہندو مسلم تعلقات کے بارے میں پوچھا۔ میرے میزبان سیّد تھے وہ بڑے سلجھے ہوئے انسان تھے۔ ان کی عمر ساٹھ سال سے زائد تھی اور وہ مدت سے ممبئ کے رہائشی تھے۔

میرے پوچھنے پر وہ گویا ہوئے کہ مشتاق بھائی، بظاہر ہمیں کوئی مسئلہ نہیں ہے اور ہم سب امن سے رہتے ہیں۔ ایسا اس لیے بھی ہے کہ ہم اقلیت میں ہیں۔ مسلمان معاشی طور پر بھی مضبوط نہیں ہیں اور انکی آبادی بھی کم ہے۔ سیاسی طور پر بھی ہماری

آواز میں جان نہیں ہے۔ اس لیے ہمارا خاموش رہنا ہی بہتر ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ میں یہ تو نہیں کہتا کہ ہمیں ہندوؤں سے کوئی مسئلہ ہے یا ہمارے ساتھ برا سلوک ہوتا ہے۔ سب کچھ اچھے طریقے سے چل رہا ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ جیسے پاکستان میں مسلمان اکثریت میں ہیں اور ہندو اقلیت میں ۔ لہٰذا میرا یہ ماننا ہے کہ پاکستان میں مسلمان جس اعتماد سے رہ رہے ہیں شاید اس اعتماد سے ہندو نہیں رہتے۔ انھوں نے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا کہ اگر آپ یورپ اور امریکہ کی مثال لیں جہاں انسانی حقوق کی برابری کی بات کی جاتی ہے وہاں بھی پاک و ہند کے لوگ اس اعتماد کے ساتھ نہیں رہتے جو اعتماد مقامی لوگوں کو حاصل ہے۔ جہاں اعتماد کم ہوگا وہاں معاشی اور معاشرتی ترقی میں بھی کمی ہونا لازم ہے۔

میرا یہ خیال ہے کہ اکثریت ہمیشہ پُر اعتماد ہوتی ہے اور اقلیت ہمیشہ خوف کے سائے میں ہی رہتی ہے۔

میں بہت دیر تک ان کے پاس بیٹھا مختلف موضوعات پر بات کرتا رہا۔ جس کے بعد مجھے احساس ہوا کہ اقلیت میں رہنا واقعی ایک مشکل کام ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ جہاں سے میں گیا تھا یعنی پاکستان سے وہاں مسلمان اکثریت میں ہیں۔

میں نے واپسی کا سفر بذریعہ ٹرین کرنے کا فیصلہ کیا۔ آپ کسی بھی سٹیشن کا ٹکٹ کسی بھی دوسرے سٹیشن سے لے سکتے تھے۔ ابھی کمپیوٹر اتنا عام تو نہیں ہوا تھا لیکن پھر بھی یہ سہولت موجود تھی۔ میرے میزبان نے سٹیشن تک میری رہنمائی کی۔ میں نے ایک ٹرین میں سوار ہو کر اپنے سفر کا آغاز کیا لیکن آدھے راستے میں ہی مجھے اسے چھوڑنا پڑا ایسا کیوں ہوا۔ اس کی وجہ آئندہ سطور میں آپ کے سامنے رکھوں گا۔

ممبئ لوکل ٹرین میں ایک یادگار اور جان لیوا سفر

اس سے پہلے کہ میں آپ کو ٹرین کے سفر کے بارے میں بتاؤں میں چاہوں گا کہ ممبئ ٹرین کی ایک مختصر تاریخ آپ کے سامنے رکھی جائے۔

ہندوستان میں ریل لی تاریخ پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ انند کمار چوہدری اورڈاکٹر سری نواس راو نے History of Rail Transportation and Importance of Indian Railways (IR) Transportationکے نام سے ایک مضمون لکھا ہے[38]۔

ان کے مطابق 1837 ء ہندوستان کی پہلی مال بردار گاڑی مدارس ماربل ڈھونے کے لیے چلائی گئی تھی۔ مسافر بردار گاڑی دو شہروں کے درمیان نہیں بلکہ مقامی تھی جو 16 اپریل 1953ء کو موجودہ سینٹرل ریلوے سٹیشن سے ایک قریبی ریلوے سٹیشن تک گئی تھی یہ فاصلہ صرف چوبیس کلومیٹر ہے۔ ٹرین نے یہ فاصلہ ایک گھنٹہ اور پچیس منٹ میں طے کیا تھا۔ اس ٹرین میں چودہ بوگیاں لگی ہوئی تھیں۔ اس طرح ایک مقامی ٹرین کا آغاز ہوااور اب یہ ممبئ کاایک بہت بڑا نظام بن گیاہے۔ اس وقت ممبئ لوکل ٹرین کے روٹ کی لمبائی 390 کلومیٹر ہے اور ایک اندازے کے مطابق ہر روز 75 لاکھ لوگ ان ٹرینوں پر سفر کرتے ہیں مختلف مقامات سے ڈھائی ہزار سے زائد ٹرینیں چلتی ہیں۔ جن کا آغاز صبح چار بجے ہوتا ہے اور رات اڑھائی بجے تک یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ میں نے یہ سفر 1999ء میں کیا تھااور ان دنوں فرسٹ کلاس ڈبے نہیں ہوا کرتے تھے۔ اب میں نے کہیں پڑھا تھاکہ ممبئ میں انڈر گراؤنڈ ریلوے بھی شروع ہو گئ ہے۔ پچھلے صفحات میں، میں نے بھارت کے ٹرین کے نظام سے متعلق تفصیل سے لکھا ہے۔ بھارت

[38] © IJEDR 2018 | Volume 6, Issue 3 | ISSN: 2321-9939

ایک وسیع ملک ہے جہاں فاصلے طویل ہیں۔ ان طویل فاصلوں کو سڑک کے ذریعے طے کرنا خاصا مشکل کام ہے۔ وفاقی نظام ہونے کی وجہ سے بہت سے ملازمین بھارت کے مختلف علاقوں میں کام کرتے ہیں اور اس وجہ سے لوگوں کی آمد و رفت زیادہ ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ کاروباری دنیا کے لوگ بھی تجارت کے لیے آتے جاتے ہیں اسی وجہ سے ریل کا نظام ان کے لیے انتہائی مفید ہے۔

لوکل ٹرین پر سفر کرنے کے لیے میں ایک قریبی ریلوے سٹیشن پر چلا گیا۔ جو کوئی خاص بڑا نہیں تھا۔ مسافروں کی سہولت کے لیے ہر جگہ رہنمائی کے نشانات لگے ہوئے تھے جس سے مجھے پلیٹ فارم ڈھونڈنے میں کوئی دقت پیش نہ آئی۔ جہاں سب لوگ کھڑے ٹرین کا انتظار کر رہے تھے میں بھی ان کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ کچھ دیر بعد ٹرین آ گئی۔ جسے دیکھتے ہی میرے اوسان خطا ہو گئے۔ میں نے دیکھا کہ ٹرین کا کوئی دروازہ نہیں تھا اور دروازے کی جگہ پر آٹھ سے دس فٹ چوڑی کھلی جگہ تھی اور جہاں لوگ پھنس کر کھڑے ہوئے تھے۔ کچھ لوگ باہر بھی لٹک رہے تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ہم اس ٹرین میں داخل کیسے ہوں گے۔ ٹرین رکی تو میں نے دیکھا کہ دروازے میں کھڑے بیسیوں لوگ ایک دھکے سے باہر آ گئے اور باہر کھڑے بیسیوں لوگ ایک ہی جھٹکے سے ٹرین میں داخل ہو گئے۔ اس سارے عمل میں صرف 16 سیکنڈ لگے اور ٹرین دوبارہ روانہ ہو گئی۔ میرے لیے یہ سب حیران کن تھا لیکن مقامی لوگوں کے لیے اس میں کوئی دقت نہ تھی۔

ٹرین میں داخل ہونے کے بعد میں نے دیکھا کہ ڈبے کے درمیان تھوڑی سی جگہ خالی ہے۔ میرا اسٹیشن کافی دور تھا اس لیے میں بوگی کے درمیان میں آ گیا۔ کچھ ہی دیر میں میرے ارد گرد بہت سارے لوگ آ گئے اور وہ جسے کہتے ہیں کہ تل دھرنے کی بھی جگہ نہ تھی، ایسا ایک عجیب منظر بن گیا۔

تھوڑی دیر تک تو مجھے زیادہ مشکل پیش نہ آئی لیکن میں نے جلد ہی محسوس کیا کہ مجھے سانس لینے میں دقت پیش آ رہی ہے۔ اس کی وجہ آکسیجن کی کمی تھی۔ جب اتنے زیادہ لوگ اتنی کم جگہ پر موجود ہوں تو سانس لینے میں دشواری ایک فطری بات ہے۔ کچھ دیر تو میں نے کوشش کی کہ میں اپنے آپ کو ماحول کے مطابق ڈھال لوں لیکن میں نے جلد ہی محسوس کیا کہ ٹرین کی چھت اور لوگوں کے سروں کے درمیان فاصلہ بہت کم ہے۔ یہ سب دیکھ کر میں نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ اس ٹرین کا کوئی دروازہ یا کھڑکی بند نہیں ہے۔ جب ٹرین چلتی تو تیز ہوا ڈبے میں آ جاتی اور کچھ دیر کے لیے سانس لینے میں سہولت ہو جاتی۔ میں پنجوں کے بل کھڑا ہو گیا تا کہ میرا سر باقی لوگوں سے اونچا ہو جائے اور مجھے سانس لینے میں سہولت ہو۔ اس کے لیے میں نے ارد گرد کھڑے لوگوں پر بوجھ بھی ڈالا لیکن مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہ اس کا علاج نہیں ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ اگر مزید میں یہاں پر کھڑا رہا تو یقینی طور پر میرا سانس بند ہو سکتا ہے۔ ایسی صورتحال میں مجھے کوئی راستہ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ بالآخر میں نے یہ فیصلہ کیا کہ میں اگلے سٹاپ پر ٹرین سے اتر جاؤں اور ٹیکسی لے کر ہوٹل پہنچوں گا۔

پھر میں نے ایسا ہی کیا اور ٹرین کو راستے میں ہی چھوڑا۔ باہر نکل کر پلیٹ فارم پر کافی دیر تک کھڑا رہا اور اپنا سانس بحال کر کے باہر کی طرف چل پڑا۔ جب میں باہر نکل رہا تھا تو میں نے دیکھا کہ ایک جگہ کچھ لوگ کسی نہ کسی کو بلا کر اس کا ٹکٹ چیک کر رہے تھے۔ یاد رہے ٹرین پر چڑھتے وقت کسی نے بھی ہمارا ٹکٹ چیک نہیں کیا اور سفر کے دوران تو اس کا کوئی امکان ہی نہیں تھا لیکن انتظامیہ نے اس کا علاج ڈھونڈ رکھا تھا کہ جب لوگ باہر نکلیں تو ان کا ٹکٹ چیک کیا جائے۔ ٹکٹ چیکر نے مجھے بھی اشارے سے بلایا اور ٹکٹ چیک کیا۔ ان صاحب کا برتاؤ انتہائی مناسب تھا اور مجھے کسی طرح کی رعونت محسوس نہ ہوئی۔

بھارت کے شمالی علاقہ جات میں مجھے جب بھی کسی سرکاری افسر سے بات کرنے کا موقع ملا تو اس نے ہمیشہ ہی برتر ہونے کا ثبوت دیا۔ اس کے مقابلے میں جنوبی ہندوستان کے لوگ دھیمے مزاج کے ہیں۔ یہ میرا ذاتی تجربہ ہے آپ کو اس سے اختلاف بھی ہو سکتا ہے۔

Mumbai Local Train Photo Credit:
https://www.ndtv.com/mumbai-news

جس ٹرین میں میں نے سفر کیا اس کے ایک ڈبے میں کچھ لوگ بیٹھے ہوئے تھے جن کے پاس کھانے کے بہت سارے ڈبے پڑے ہوئے تھے۔ ممبئ میں ایک بہت پرانی روایت ہے کہ لوگ دوپہر کا کھانا گھر سے منگواتے ہیں۔ ممبئ میں انھیں ڈبے والے کہا جاتا ہے۔ ہر ٹرین میں ان کا ڈبہ الگ ہوتا ہے تاکہ وہ بآسانی لوگوں کو کھانا پہنچا سکیں۔ ان پر کئ ڈاکومنٹریز بھی بنی ہیں جو نہایت دلچسپ ہیں۔ اب چونکہ ڈبے کی جگہ لنچ باکس نے لے لی ہے تو اب ڈبے والوں کو یقینی طور پر لنچ باکس والے ہی کہنا چاہیے۔ میں نے ایک اور بات بھی دیکھی کہ خواتین کے ڈبے الگ تھے اور ان میں بھی وہی رش والی

کیفیت تھی۔ مخصوص اوقات میں مقامی ٹرینوں میں بہت رش ہوتا ہے جو دنیا بھر میں عام سی بات ہے۔

جب میں ٹرین سے نکل کر باہر آ رہا تھا تو میں نے دیکھا کے ہزاروں لوگ ایک ہی رفتار سے ایک سمت میں چل رہے ہیں اور میں بھی انھی کے درمیان چل رہا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے ہم سب کیڑے مکوڑوں کی طرح زمین پر چل رہے ہیں اور کسی کی بھی کوئی انفرادی حیثیت نہیں ہے۔ بڑے شہروں کی یہی ایک خاص بات ہے کہ یہ اپنے ہاں رہنے والوں کے ساتھ عام طور پر ایک جیسا ہی سلوک کرتے ہیں جب کہ ہمارے دیہات میں لوگوں کی پہچان ان کی ذات برادری اور کاروبار کی وجہ سے ہوتی ہے۔ شہروں میں پہچان کے پیمانے مختلف ہیں۔

ٹرین سے باہر آ کر میں نے ایک ٹیکسی لی اور اپنے ہوٹل کی طرف چل پڑا۔ ٹیکسی والے نے مجھے سٹیشن سے آتے دیکھ لیا تھا اور جب میں نے اس سے کہا کہ میں نے فلاں جگہ جانا ہے تو اس نے مجھے کہا کہ آپ تو سٹیشن سے آ رہے ہیں اور جس ٹرین سے آپ اترے ہیں وہ اسی طرف تو جا رہی تھی جہاں جانے کے لیے آپ مجھے کہہ رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ مجھے جان عزیز تھی اس لیے ٹرین سے اتر آیا ہوں۔ اس پر وہ ہنس پڑا اور کہنے لگا۔ آپ کی بات صحیح ہے کہ جو لوگ ٹیکسی کا کرایہ ادا کر سکتے ہیں وہ ٹرینوں پر سفر نہیں کرتے۔ یقینی طور پر ان ٹرینوں میں سفر کرنا آسان کام نہیں ہے۔

اس سے باتیں کرتے کرتے میں ہوٹل پہنچ گیا۔ ہوٹل سے پہلے ایک چوراہے پر میں نے دیکھا کہ بیسیوں ٹیکسیاں ایک اشارے پر رکی ہوئی ہیں لیکن سب کی ہیڈ لائٹس بند ہیں، ہماری ٹیکسی کی بھی ہیڈ لائٹ بند تھی۔ میں نے ڈرائیور سے پوچھا کہ ایسا کیوں ہے؟ اس نے بتایا کہ سڑک پر اتنی روشنی ہے کہ ہم ٹیکسی ڈرائیور اپنی ہیڈ لائٹ بند کر

لیتے ہیں، جس سے ہماری بیٹری کی بچت ہو جاتی ہے۔ معلوم نہیں کہ بچت ہوتی ہے یا نہیں لیکن اس سے یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے کے سڑک پر روشنی بہت زیادہ تھی۔

میں نے ٹیکسی سے اتر کر اپنے ہوٹل کی راہ لی۔ راستے میں میں نے دیکھا کہ ایک صاحب دیوار کے ساتھ بیٹھے بیگز بیچ رہے تھے۔ میں نے غور سے دیکھا تو وہ مجھے چہرے سے پختون لگے اور جب میں نے ایک بورڈ پر ان کا نام پڑھا تو مجھے یقین ہو گیا کہ یہ صاحب پختون ہیں۔ ان کا نام کعبۃ اللہ تھا۔۔۔

میں نے کعبۃ اللہ سے تھوڑی بہت بات چیت کی لیکن انھوں نے مجھ سے زیادہ باتیں کرنے سے گریز کیا اس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے، معلوم نہیں۔ ان کے لہجے سے معلوم ہو رہا تھا کہ وہ بھارت میں مدت سے نہیں ہیں بلکہ ان کے لہجے میں آبائی وطن کی جھلک تازہ تھی۔ وہ دلچسپ نام مجھے آج بھی یاد ہے اور بہت حد تک ان کا چہرہ بھی۔

میں ایک مصروف دن کے بعد ہوٹل پہنچا عمر اور وقاص صاحب میرا انتظار کر رہے تھے۔ پریشانی ان کے چہروں سے عیاں تھی کیونکہ دن بھر کوئی رابطہ نہیں ہوا تھا اور موبائل کا ابھی دور دورہ نہیں تھا۔ خیریت سے واپس پہنچ کر اللہ کا شکر ادا کیا اور اگلے دن کی تیاری شروع کر دی۔

Taj Mahal Palace: Photo Credit:
http://www.walkthroughindia.com

سورت: ایک قدیم شہر جو دو دفعہ جلایا گیا

ممبئی میں ہمارا قیام بہت ہی مختصر مدت کا تھا۔ اس دوران مجھے اپنے کاروبار کے سلسلے میں بھی کچھ لوگوں سے ملنا تھا اس لیے ہم تفصیل سے ممبئی کو نہ دیکھ سکے۔ سن دوہزار میں مجھے دوبارہ ممبئی جانے کا موقع ملا اس دوران میں نے مزید جگہوں کا دورہ بھی کیا جس کا ذکر میں آئندہ صفحات میں کروں گا۔

میں نے دیکھا کہ طویل فاصلے کے لیے ریل گاڑیاں عام طور پر شام کے وقت چلتی ہیں اور رات بھر میں اپنا سفر طے کرتی ہے۔ پاکستان میں بھی ایسا ہی ہے۔ لاہور سے کراچی جانے والی ٹرینیں بھی عام طور پر شام کے وقت اپنا سفر شروع کرتی ہیں اور صبح تک کراچی پہنچ جاتی ہیں۔ ممبئی میں بھی ایسا ہی تھا۔ شام میں دلی کے لیے کئی ریل گاڑیاں چلتی ہیں۔ ان میں کچھ بہت ہی زیادہ وقت لیتی ہیں اور کچھ جلد ہی اپنی منزل پر پہنچ جاتی ہیں۔ ہم نے بھی ایک ٹرین کا انتخاب کیا جس کی روانگی شام ساڑھے چار بجے تھی اور اگلے دن صبح ساڑھے آٹھ بجے اسے دہلی پہنچنا تھا۔

یہ تقریباً سولہ گھنٹے کا سفر تھا۔ دلی سے ممبئی کے درمیان اسے 1384 کلومیٹر کا فاصلہ طے کرنا تھا۔ ان ٹرینوں میں وہ تمام تر سہولیات موجود تھیں جن کی وجہ سے ہمارا سفر نہایت آرام سے طے ہوا۔ ٹرین میں داخل ہونے کے فوراً بعد ہمیں شام کی چائے اور پھر رات کا کھانا، صبح کی چائے اور ناشتہ وغیرہ سب کچھ میسر تھا۔ ہمارے ہمراہی بھی بہت خوش اخلاق تھے اور ان کے ساتھ اچھی گپ شپ رہی۔ یہاں پر بھی ایک صاحب کے خاندان کی بنوں سے ہجرت کی داستان سنی۔ اس کا ذکر میں آئندہ صفحات میں کروں گا۔ ممبئی سے نکل کر پہلا سٹاپ بوریوالی تھا۔ بوریوالی ممبئی کا ہی حصہ ہے۔ اس سے متعلق مجھے بہت زیادہ معلومات تو نہ مل سکیں لیکن جو بھی معلومات ملیں ان کا تعلق ممبئی سے ہی تھا۔

ہمارا اگلا سٹاپ سورت تھا۔ ہم سات بجے کے قریب سورت پہنچ گئے۔ میں نے سفر کے لیے ہندوستان کے بارے میں ایک کتاب لے رکھی تھی اور دوران سفر اس کا مطالعہ بھی کر رہا تھا۔ عجیب اتفاق ہوا کہ جب ہم سورت پہنچے تو میں کتاب کے اس حصے کا مطالعہ کر رہا تھا جس کا تعلق سورت سے تھا۔اس سے پہلے کہ میں آپ کو اپنے ہمراہیوں کا تعارف کرواؤں میں چاہوں گا کہ آپ کو سورت سے متعلق کچھ معلومات فراہم کروں۔

میں نے سورت کے بارے میں فلپ اینڈرسن کی کتاب **The English in Western India:** Being the Early History of the Factory at Surat, of Bombay, and the Subordinate Factories on the Western Coast. From the Earliest Period Until the Commencement of the Eighteenth Century. Drawn from Authentic Works and Original Documents جس میں تفصیل سے انگریزوں کی ہندوستان میں آمد کے بارے میں لکھا گیا ہے بے حد مفید پایا ہے۔ یہ کتاب 1854ء میں لکھی گئی تھی۔ زیادہ اچھی بات ہے کہ یہ کتاب نیٹ پر موجود ہے۔ اس کے علاوہ برٹانیکا انسائکلوپیڈیا میں سورت بارے میں مفید معلومات ملتی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ سورت شہر کی اپنی ویب سائٹ پر سورت بارے کافی مواد موجود ہے۔

فلپ اینڈرسن کے مطابق (صفحہ 3) تھامس سٹیفن پہلا انگریز تھا جو اکسفورڈ کا پڑھا ہوا تھا نے اپریل 1579ء میں انگلینڈ سے سفر شروع کیا اور اسی سال اکتوبر میں گوا میں قدم رکھا۔ اس سے پہلے پرتگیزی ہندوستان آ چکے تھے۔

ممبئی مہاراشٹرا میں واقع ہے جب کہ سورت گجرات اسٹیٹ کا ایک اہم ترین شہر ہے۔ گجرات اسٹیٹ کا کیپیٹل گاندھی نگر ہے۔ سمندر کے قریب ہونے کی وجہ سے

سورت بہت بڑی اور مصروف بندرگاہ ہے۔ ممبئی کے ترقی کرنے کی وجہ سے سورت کی ترقی میں کمی واقع ہوئی ہے۔ سورت شہر ہیرے جواہرات کے لیے دنیا بھر میں مشہور ہے صرف اس شہر سے سالانہ بارہ ارب ڈالر کی ایکسپورٹ ہوتی ہے۔ یاد رہے پاکستان کی ٹوٹل ایکسپورٹ پچیس بلین ڈالر ہے جب کہ بھارت کے ایک شہر سے صرف ہیرے جواہرات کی ایکسپورٹ بارہ ارب ڈالر ہے۔ گاندھی نگر سے اس کا فاصلہ پونے تین سو کلومیٹر ہے۔ یہ شہر احمد آباد کے جنوب میں اڑھائی سو کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ ممبئی سے اس کا فاصلہ تین سو کلومیٹر ہے۔ یہ شہر دریائے تاپتی کے کنارے پر ہے جو بحر عرب سے بہت قریب ہے۔

برٹانیکا انسائکلوپیڈیا کے مطابق گوپی نام کے ایک صاحب نے اس شہر کو آباد کیا۔ شہر کے نام کے بارے میں مختلف دعوے کیے جاتے ہیں۔ ایک دعوے کے مطابق اس کا نام سورج پور تھا۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ جب ڈچ یہاں آئے تو انھوں نے اس کا نام Sourratte رکھا جو کہ ایک ڈچ لفظ ہے لیکن اب اسے سورت ہی کہا جاتا ہے۔ ایک بین الاقوامی رپورٹ کے مطابق سورت شہر تیزی سے ترقی کرنے والے شہروں میں بہت نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ بھارت میں ہونے والے ایک سالانہ سروے کے مطابق 2013ء میں سورت کو بھارت کا بہترین شہر قرار دیا گیا۔ میں نے پچھلے صفحات میں بھارت کے ایک سو سمارٹ سٹی والے منصوبے کے بارے میں آپ کو بتایا تھا۔ اس منصوبے کے تحت سورت وہ پہلا شہر تھا جسے سمارٹ سٹی کا درجہ دیا گیا ہے۔ سورت سے متعلق ایک اور اہم بات کا بھی پتہ چلا کہ یہاں ستر فیصد لوگ انٹرنیٹ استعمال کرتے ہیں۔ ایسا کسی قریبی ملک میں بھی نہیں ہے۔ یہ شہر صفائی کے لحاظ سے بھی کسی سے پیچھے نہیں ہے۔ بھارت میں صفائی کے اعتبار سے بننے والی فہرست میں سورت کا دوسرا نمبر ہے۔

سورت شہر کی ویب کے مطابق پہلی فیکٹری 1612ء میں انگریزوں نے قائم کی تھی اور سر تھامس رو ہی وہ شخص تھا جس نے جہانگیر سے تجارتی راہداری حاصل کی تھی۔ فلپ اینڈرسن نے یہ بھی لکھا ہے کہ انگریزوں کو آنے کی دعوت یہاں پر پہلے سے موجود حکمرانوں نے دی تھی اسکی وجہ پرتگیزیوں کا نامناسب رویہ تھا۔ انگریزوں نے 1826ء میں اس شہر میں سکول قائم کیا تھا۔ پہلا انگلش سکول 1842ء میں قائم کیا گیا۔ اس طرح ہندوستان میں انگریزی کی تعلیم کا آغاز ہوا۔

تیرہویں صدی میں سلاطین دلی نے اس علاقے میں اپنی حکومت قائم کی۔ یہاں پر ایک ریاست گجرات بھی قائم تھی۔ سلاطین گجرات نے مغلوں کے ڈر سے پرتگیزیوں کے ساتھ معاہدے کیے۔ بعد ازاں پرتگیزیوں نے اس علاقے پر قبضہ کر لیا اور انھوں نے ایک ایسا کام کیا جس کی مثال ملنا بے حد مشکل ہے۔ انھوں نے دو مرتبہ اس شہر کو فتح کرنے کے بعد آگ لگا دی اور یہ شہر جل کر راکھ ہو گیا۔

غلام اے نادری کی کتاب Eighteenth-Century Gujarat: The Dynamics of Its Political Economy, 1750-1800 کے مطابق مغلوں نے دکن کی فتوحات سے قبل اس علاقے کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا تھا۔ یہ سولہویں صدی کے آخر کی بات ہے۔ ہندو حکمران شیواجی نے اس شہر پر دو حملے کیے اور جنوب مغربی ہندوستان سے مسلمانوں کی ریاستوں کو ختم کرنے میں ایک اہم کردار ادا کیا۔ اس شہر میں انگریزوں، فرانسیسیوں، پرتگیزی اور ترکوں کے علاوہ آرمینیوں نے بھی اپنی اپنی کوٹھیاں قائم کر رکھی تھیں۔ کوئی ایسا نہیں تھا جس نے ہندوستان پر حملہ نہ کیا ہو۔ اہلِ ہند نے کبھی کسی پر حملہ نہیں کیا بلکہ ان حملہ آوروں کو روکنے کی بے حد کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوئے۔ وجہ آپس کی نااتفاقی کے علاوہ کچھ نہ تھی۔

غلام اے نادری مزید لکھتے ہیں (صفحہ 190) کہ 1630ء میں سورت اور اس کے ارد گرد علاقوں میں زبردست قحط پڑا تھا جس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ اس کے ساتھ

ساتھ وہ یہ بتاتے ہیں کہ 1666ء اور 1670ء میں سورت شہر پر شیواجی نے کامیاب حملے کیے۔ جس کے نتیجہ میں سورت تباہ ہو گیا لیکن جلد ہی سورت دوبارہ اپنی اصلی حالت میں آگیا۔ سورت کی تاریخ جاننے والوں کے لیے یہ کتاب انتہائی مفید ہے۔

یہ جان کر آپ کو حیرت ہوگی کہ جین مت کے لوگ جو کسی بھی جاندار کو مارنے کے قائل نہیں ہیں انھوں نے اس شہر میں ایک ہسپتال بنایا تھا جہاں جانوروں کے ساتھ ساتھ مکھیوں اور مچھروں وغیرہ کا علاج بھی کیا جاتا تھا۔ یہ وہی شہر ہے جہاں سے ہندوستان میں انگریزوں کی حکمرانی کی داستان شروع ہوتی ہے۔انگریزوں نے 1612ء میں یہاں پہلی فیکٹری بنائی ۔ اس کے بعد ان کی دوسری فیکٹری چنائی میں لگی ۔اس فیکٹری کا مقصد ہندوستان کا سستا خام مال اور سستی لیبر استعمال کرکے مہنگے داموں ایکسپورٹ کرنا تھا۔آج چار سو سال بعد بھی یہی صورت ہے۔ ہم سستی کپاس اور سستے مزدوروں کی مدد سے سستا مال بنا کر یورپی تاجروں کو دیتے ہیں اور وہ اسے مہنگے داموں بیچ دیتے ہیں۔

چار سو سال میں کچھ بھی تو نہیں بدلا۔اس شہر پر قبضے کے لیے ڈچ اور انگریزوں کے درمیان لڑائی ہوئی بالآخر انگریز کامیاب ہوئے۔ جنوب مشرقی ہندوستان میں انگریزوں نے فرانسیسوں کو شکست دی، ممبئی میں انھوں نے پرتگیزیوں اور سورت میں ڈچ کو علاقہ چھوڑنے پر مجبور کیا۔ اس بارے میں فلپ اینڈرسن سے بہت تفصیل سے لکھا ہے۔

سورت شہر کی ٹیکسٹائل انڈسٹری ایک کامیاب انڈسٹری ہے۔ کہا جاتا ہے کہ بھارت میں پولیسٹر سے بننے والے کپڑے کا ساٹھ فیصد صرف اس شہر میں بنتا ہے۔ سورت کا ریلوے سٹیشن 1860ء میں بنایا گیا تھا۔ اپنی صفائی ستھرائی کے لحاظ سے یہ سٹیشن پورے بھارت میں اول نمبر پر ہے۔ مشہور کرکٹر ہاشم آملہ جو ساؤتھ افریقہ کی کرکٹ ٹیم میں کھیلتے ہیں کا تعلق بھی اسی شہر سے ہے۔

اس شہر میں ایک مسلمان حکمران نے 1644ء میں ایک مغل سرائے بنائی جو اب تک قائم ہے۔ 1844ء میں انگریزوں نے اس پر ایک بڑی گھڑی لگا دی۔ سورت میں ایک قلعہ بھی پایا جاتا ہے جسے احمد آباد کے سلطان محمود کے حکم سے تعمیر کیا گیا۔ اسے بنانے کا مقصد شہر کو غیر ملکی حملہ آوروں سے بچانا تھا۔ یہ قلعہ سولھویں صدی میں بنایا گیا اور اسے بنانے والا ایک ترک باشندہ تھا۔ اس کے کام سے خوش ہو کر سلطان نے اسے "خداوند خان" کا خطاب دیا۔ سورت میونسپل کی سرکاری دستاویزات میں اس قلعے میں بارے کافی کچھ لکھا ہوا ہے جس کا خلاصہ پیش خدمت ہے۔

سورت قلعہ سوہلویں صدی میں بنایا گیا تھا۔ اس کا بنیادی مقصد حملہ آوروں سے شہر کا دفاع تھا۔ اسے بنانے کے سہرا احمد آباد کے بادشاہ سلطان محمود سوم (1538-1554ء) کے سر ہے جو سورت کی حملہ آوروں کے ہاتھوں مسلسل تباہیوں کی وجہ سخت پریشان تھے انھوں نے شہر کے دفاع کے لیے ایک بہت مضبوط قلعہ بنانے کا حکم دیا اور یہ کام ایک ترک سپاہی صفی آغا کے سپرد کیا۔ جنہیں بعد میں خداوند خان کا لقب دیا گیا۔ اس قلعے سے ایک دلچسپ واقعہ جڑا ہوا ہے جو شاید ہی کسی اور قلعے کے ساتھ پیش آیا ہو۔ تاریخ کے مطابق قلعے کی تعمیر کا کام 1546 میں مکمل ہوا۔

شہنشاہ اکبر (1573ء) نے سورت پر قبضہ کرنے کے بعد قلعہ پر اپنا ایک کمانڈر مقرر کر دیا۔ اسی دوران انگریزوں نے بھی اس قلعے کے کچھ حصے پر قبضہ کر لیا۔ اب یہ صورت حال تھی کہ مورز اور انگریزوں کا دونوں کا ہی اس قلعہ پر قبضہ تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان کی آپس میں صلح بھی تھی۔ اس لیے قلعے کی دیواروں سے دو جھنڈے لہرائے گئے، جنوب مغرب میں انگریزوں کا نشان اور جنوب مشرقی حصے پر مورز کا۔ یہ طریقہ کار 1842ء تک میں جاری رہا۔ پھر ایک وقت آیا کہ سورت کے آخری نوابوں کی موت کے بعد انگریزوں کا مکمل قبضہ ہو گیا۔

سورت سے گزرتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ کس طرح دنیا بھر کے لوگوں نے ہندوستان کو اپنے گھر کی کھیتی بنایا ہوا تھا۔ جو بھی آیا اس نے اپنی طاقت کے مطابق حکمرانی کی۔ ایسا کیوں ہوا؟

میرے مطابق سوائے اس کے کوئی اور وجہ نہیں ہو سکتی کہ ہندوستان میں کوئی مرکزی حکومت نہیں تھی۔ بہت چھوٹی چھوٹی ریاستیں تھی۔ ہر کوئی اپنی ریاست بچانے کے لیے غیر ملکی امداد لینے پر مجبور تھا۔ ان غیر ملکیوں نے اپنی طاقت اور ٹیکنالوجی کی بنیاد پر اہل ہند کو اپنا غلام بنائے رکھا پھر ایک دن جب وہ متحد ہوئے تو انھوں نے ان غیر ملکیوں کی غلامی سے اپنے آپ کو آزاد کروالیا۔

سورت سٹیشن پر ہمارا سٹاپ صرف پانچ منٹ کا تھا۔ اس لیے میں صرف ریلوے سٹیشن ہی دیکھ سکا۔ جو نہایت ہی خوبصورت تھا۔ اس سٹیشن کو تقریباً سوا سو سال پہلے بنایا گیا تھا۔ یہاں اکثر لوگ گجراتی میں بات کر رہے تھے۔ جس کے کچھ الفاظ سمجھ میں آتے تھے۔ کھانا دینے والے صاحب اردو بول رہے تھے اس لیے ہمیں کوئی دقت نہیں ہوئی۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ ہم سے زیادہ بات کرنے کے موڈ میں نہیں ہیں۔ مجھے یوں لگا کہ ہم لوگ اس علاقے میں اجنبی ہیں۔ بھارت کے شمالی علاقہ جات تو میں پاکستان سے لوگ آتے جاتے ہیں لیکن جنوب مغربی علاقے میں پاکستانی لوگوں کا آنا جانا نہ ہونے کے برابر ہے۔

کراچی میں بڑی تعداد میں میمن لوگ آباد ہیں جن کا آبائی وطن گجرات ہی ہے۔ میرا خیال ہے کہ پاکستانی سرحد سے دور ہونے کی وجہ سے پاکستانیوں کا یہاں آنا جانا کافی کم ہے۔ جب ہمارے ہمراہیوں کو پتہ چلا کہ ہم پاکستان سے ہیں تو انھوں نے ہمیں کافی غور سے دیکھا۔ انھوں نے ایسا کیوں کیا؟ اس کی جو وجہ انھوں نے بتائی اسے بیان کرنا بہت مشکل ہے لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ انھوں نے بتایا کہ آپ سے متعلق ہماری رائے

بہت اچھی نہیں ہے۔ ہم نے کہا ہمارا بھی یہی خیال ہے، آپ کے بارے میں بھی ہماری رائے بہت اچھی نہیں ہے۔ کافی دیر بات چیت کرنے کے بعد انھوں نے کہا کہ ہمیں غلط پڑھایا گیا تھا۔ آپ کی باتیں سننے کے بعد ہمارا خیال ہے کہ جو بتایا جاتا ہے وہ حقیقت سے بہت مختلف ہوتا ہے۔
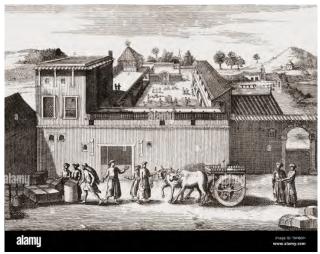
Bullock cart at trading post established by British East India Company at Surat, Gujarat, India, Asia, old vintage 1800s picture

400 years ago, England's first ambassador to India

Photo Credit: https://scroll.in

بنوں سے دلی اور دلی سے بنوں اور پھر واپس دلی: ایک لٹے پٹے ہندو خاندان کی نقل مکانی کی داستان

جب ہماری گاڑی سورت سے روانہ ہوئی اس وقت رات کے آٹھ بج رہے تھے۔ گاڑی میں موجود خدمت پر مامور صاحب نے کچھ دیر پہلے ہی ہم سے ہمارے کھانے سے متعلق پوچھ لیا تھا۔ سب نے اپنی پسند بتائی۔ ہم دوستوں نے احتیاط کے تحت سبزی پر ہی اکتفا کرنے کا فیصلہ کیا۔ باقی لوگ بھی سبزی خور ہی تھے اس لیے ہمیں کوئی اجنبیت محسوس نہیں ہوئی۔ میرے ایک ہندو دوست نے مجھے بتایا کہ آپ پورے بھارت میں جو بھی گوشت کھائیں گے وہ حلال ہی ہوگا کیونکہ گوشت کا کاروبار صرف مسلمان ہی کرتے ہیں، ہندو، سکھ اور جین نہیں کرتے اور وہ حلال طریقے سے ہی جانور ذبح کرتے ہیں۔ اس کے باوجود سفر میں ہم نے احتیاط ہی کی۔ اگر کہیں کوئی ایسا ریسٹورانٹ ملا جو کسی مسلمان کی ملکیت لگتا تو صرف وہاں ضرور گوشت کھانے کو ترجیح دیتے۔

کھانا کھاتے کھاتے تقریباً رات کے نو بج گئے تھے۔ ساتھ بیٹھے باقی لوگوں سے بھی ہماری گپ شپ شروع ہو گئی تھی۔ یہ بات بھی آپ کے لیے حیران کن ہوگی کہ ان میں سے اکثر پہلی مرتبہ کسی پاکستانی کے ساتھ سفر کر رہے تھے۔ ہمارے ساتھ بیٹھے ہوئے ایک صاحب کا چہرہ مجھے اب تک اچھی طرح یاد ہے،ان کی عمر پینتیس سال کے قریب ہوگی اور وہ شکل وصورت اور وضع قطع سے ایک خوشحال آدمی لگ رہے تھے۔ان کا نام سنیل تھا۔ مجھے ان کے لہجے سے لگا کہ یہ خالصتاً مقامی لہجہ نہیں ہے۔ان کے لہجے سے مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کبھی کبھی ہندکو کا کوئی لفظ بول رہے ہیں۔

کچھ دیر میں ان کی باتیں سنتا رہا،وہ ایک بہت بڑی کاروباری برادری سے تعلق رکھتے تھے۔ کچھ تعارف ہو جانے کے بعد میں نے ان سے پوچھا کہ آپ کے آباؤ اجداد کا موجودہ پاکستان کے کس علاقے سے تعلق تھا کیونکہ آپ کا لہجہ یہ بتا رہا ہے کہ آپ

ہند کو یا سرائیکی بولتے ہیں۔ جب میں نے یہ بات کہی تو وہ کچھ دیر میری طرف دیکھتے رہے اور پھر انھوں نے کھڑکی سے باہر کی طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ مجھے محسوس ہوا جیسے میں نے ان کے کسی بہت ہی حساس معاملے پر بات کی ہے۔ میں خاموش رہا وہ بالکل میرے ساتھ بیٹھے تھے اس لیے باقی لوگوں کو معلوم نہ ہو سکا کہ ہم کیا بات کر رہے ہیں۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد سنیل صاحب نے بتایا کہ میرے والد بنوں سے بھارت آئے تھے۔ اس سے میرے اس اندازے کی تصدیق ہو گئی جس کی بنیاد پر میں نے یہ سوچا تھا کہ ان کے آباؤاجداد کا تعلق ہند کو یا سرائیکی لوگوں سے لگتا ہے۔

سنیل نے جب یہ بتایا کہ اس کے آباؤاجداد کا تعلق بنوں سے تھا تو مجھے لگا کہ میں ان سے بہت کچھ جان سکوں گا۔ میں نے ان سے گزارش کی اگر آپ مناسب سمجھیں تو مجھے اپنے آباؤاجداد اور ان کی نقل مکانی کے بارے میں بتائیں۔ میری بات کے جواب میں انھوں نے کہا کہ یہ کوئی بہت خوشگوار بات نہیں ہے اور میں اسے دہرانا بھی نہیں چاہتا۔ میں نے کہا جیسا آپ مناسب سمجھیں۔ میں بھی ایک ایسے والد کی اولاد ہوں جس کا تعلق موجودہ بھارتی پنجاب سے تھا اور وہ بھی لٹ لٹا کر پاکستان گیا تھا۔ اس لیے اس طرح کے موضوع پر بات کرتے ہوئے میں بھی کبھی خوشی محسوس نہیں کرتا لیکن اسے بیان ضرور کرتا ہوں تاکہ لوگوں کو پتہ چلے اور آنے والی نسلوں کو بھی خبر ہو کہ وہ سب کیا تھا، کس نے کیا، دکھ کیا ہوتا ہے اور اس کا فائدہ کسے پہنچا؟

جب سنیل صاحب کو یہ پتہ لگا کہ میں بھی ایک مہاجر کی اولاد ہوں تو انھوں نے کہا پھر آپ کو تو اس بات کا اندازہ ہو گا کہ جن لوگوں نے یہاں سے وہاں یا وہاں سے یہاں نقل مکانی کی ان کے ساتھ کیا بیتی؟ میں نے جواب میں کہا میں اسے اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ اس طرح کے چند جملوں کے تبادلے کے بعد انھوں نے مجھے جو کچھ بتایا وہ میں آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔ اس سے قبل کہ میں آپ کو سنیل کے خاندان

کی نقل مکانی کی تفصیل بتاؤں میں چاہوں گا کہ تقسیم ہند سے قبل بنوں میں رہنے والے ہندوؤں سے متعلق کچھ معلومات آپ کی خدمت میں پیش کی جائیں۔ ایسا کرنے سے میں سنیل صاحب کی باتوں کو زیادہ اچھے طریقے سے بیان کر سکوں گا۔

Septimus Smet Thorburn کی کتاب **Bannú**: Or Our Afghan Frontier مجھے دیکھنے کا موقع ملا۔ اس کتاب میں ایک دلچسپ بات لکھی ہوئی ہے جو پہلے میرے علم میں نہیں تھی۔ وہ لکھتے ہیں (صفحہ 4) کہ انگریزوں نے پنجاب کو بتیس اضلاع میں تقسیم کیا تھا۔ اس فہرست میں بنوں کا نمبر دسواں تھا۔ وہ مزید لکھتے ہیں کہ بنوں شہر کی بنیاد ایک انگریز نے 1848ء میں رکھی تھی۔ یاد رہے یہ وہی دور ہے جب انگریز پشاور اور ملتان میں سکھوں کا قلعہ قمع کر رہے تھے۔ انھوں نے اسی سال بنوں پر قبضہ کیا۔ میرے اندازے کے مطابق بنوں فتح کرنے کے لیے وہ ملتان کی طرف سے آئے اس طرح سے انھوں نے موجودہ کے پی کے کے علاقے کو دونوں اطراف سے فتح کرنا شروع کیا۔

بیسویں صدی کے آغاز کی ایک رپورٹ کے مطابق اُس وقت شہر کی آبادی 15 ہزار تھی۔ میں نے ابھی حال ہی میں کوہاٹ کے بارے میں ایک سفر نامہ لکھا ہے جس میں یہ بتایا ہے کہ موجودہ کے پی کے کے جن علاقوں میں انگریز گئے وہاں انھوں نے ہزارہ اور دیگر علاقوں سے ہندکو بولنے والے کئی لوگوں کو اپنے ہاں بلوایا۔ ان میں ہندو، سکھ اور مسلمانوں کے ساتھ ساتھ عیسائی بھی شامل تھے۔ انگریزوں نے دوسرا کام یہ کیا کہ وہ جس بھی علاقے میں گئے وہاں انھوں نے عیسائیت کو پروان چڑھانے کے لیے چرچ بھی بنائے بنوں میں پہلا چرچ 1865ء میں بنایا گیا۔

انگریزوں کے دور میں شائع ہونے والے Gazetteer of the Bannu District: 1883 میں لکھا ہوا ہے کہ 1856ء میں پہلی مرتبہ انگریزوں نے بنوں شہر میں ایک ڈسپینسری قائم کی۔

بیسویں صدی کے آغاز میں بنوں اور وزیرستان کے مختلف علاقوں میں تیس ہزار کے قریب ہندو اور سکھ رہتے تھے۔ جن کی اکثریت براہمن، کھتری اور کراڑ تھی۔ تقسیم ہند کے وقت یہ تعداد 60 ہزار کے قریب تھی۔ ان میں سے قریباً پچاس ہزار لوگوں نے ہندوستان نقل مکانی کی۔ اب ہندوؤں اور سکھوں کی بہت تھوڑی تعداد ان علاقوں میں رہتی ہے۔ ان کے آباؤاجداد ہندکو بولنے والے علاقوں سے گئے تھے، اس لیے ان میں سے اکثر اب بھی پشاور، کوہاٹ اور بنوں میں ہندکو ہی بولتے ہیں۔ ہندو بنوں شہر کی آبادی کا 60 فیصد تھے۔ بعد ازاں انھوں نے مختلف دیہاتوں میں زمینیں خرید لیں۔ صاحبزادہ عبدالقیوم خان جو تقسیم کے بعد موجودہ کے پی کے کے وزیر اعلیٰ تھے نے ہندو بنئیے پر زمین خریدنے کی پابندی لگا دی تھی۔ ایسا ہی پنجاب میں بھی ہوا۔ تقسیم ہند کے وقت ہندوؤں اور سکھوں کی بڑی تعداد میں بنوں سے چلی گئی۔ بہت سے لوگوں نے اس بات کا اعتراف کیا کہ بنوں سے نقل مکانی کرنے والے ہندوؤں اور سکھوں کو بہت عزت سے بھارت پہنچایا گیا تھا۔ بڑی تعداد میں یہ لوگ جب بھارت پہنچے تو انھوں نے یہاں پر بنوں برادری کے نام سے اپنی ایک تنظیم بنائی۔ یہ لوگ کاروباری تھے۔ بھارت آنے کے بعد انھوں نے بہت جلد کاروبار شروع کیے اور جلد ہی خوشحال زندگی گزارنے لگے۔ اس وقت بنوں برادری کے نام سے ایک تنظیم قائم ہے جس کی تفصیلات انٹرنیٹ پر موجود ہیں انھوں نے کئی ٹرسٹ بھی بنائے ہوئے ہیں۔

میں نے سنیل سے پوچھا کہ آپ کے آباؤاجداد نے کیسے نقل مکانی کی۔ اب وہ کچھ حوصلے میں تھے لیکن ان کی آواز بتا رہی تھی کہ وہ ایک جذباتی کیفیت سے گزر رہے

ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ بنوں میں ان کے والد ایک بڑے خاندان کے ساتھ رہ رہے تھے۔ خاندان کے سربراہ ان کے دادا تھے۔ بنوں شہر میں ان کا بہت اچھا کاروبار تھا۔ انگریزوں کی آمد کے بعد ہی وہ لوگ بنوں گئے تھے۔ بنوں شہر میں اکثر کاروبار ہندوؤں کے پاس ہی تھے۔ اس سے قبل ہم راولپنڈی کے قرب و جوار میں کہیں رہتے تھے، شاید موجودہ اٹک میں۔ انھیں اس بات کا صحیح علم نہ تھا۔ جب تقسیم کا وقت آیا تو میرے دادا کو اس کی پہلے سے خبر ہو گئی تھی کہ ہندوستان کی تقسیم ہو گی اور بنوں پاکستان کا حصہ ہو گا۔ لوگوں نے مشورہ دیا کہ آپ پہلے ہی دہلی چلے جائیں تاکہ تقسیم ہند کے وقت آپ کو کوئی مشکل پیش نہ آئے۔ ہمارا خاندان دادا کی رہنمائی میں دہلی آ گیا۔ جب دہلی آئے تو دیکھا کہ انھیں مختلف کیمپس میں رکھا جا رہا تھا اور کسی طرح کی بھی کوئی سہولت میسر نہ تھی۔ جب کہ ہم بنوں میں ایک انتہائی خوش حال زندگی گزار رہے تھے۔

Bannu Foundation In India Photo Credit:
https://bannu.org/home

ہم کئی ماہ دہلی کے کیمپوں میں رہے۔ پھر ایک دن میرے دادا جان نے یہ فیصلہ کیا کہ ہم تو بہت کچھ چھوڑ کر آئے ہیں اور یہاں تو ہمیں کچھ بھی نہیں مل رہا تو انھوں نے واپس جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس طرح میرے دادا جان اپنے خاندان کے اٹھارہ افراد کو لے کر بنوں کی طرف واپس چل پڑے۔ جب وہ لوگ بنوں پہنچے تو انھوں نے دیکھا کہ ان کے گھر بار کو لوٹا جا چکا ہے۔ بہت سارے ہندو اور سکھ نقل مکانی کر کے جا چکے ہیں۔ ان کی جائیدادوں پر مقامی لوگ قبضہ کر چکے ہیں۔ یہ سب کچھ دیکھ کر انھیں بہت دکھ ہوا۔ پہلے جب میرے دادا جان بنوں سے نکلے تھے تو ہم بہت پرامن طریقے سے دہلی آئے تھے۔ اس وقت مشرقی پنجاب میں ہنگامے شروع نہیں ہوئے تھے لیکن جب ہم وہاں پہنچے تو پاکستان اور بھارت میں فسادات شروع ہو چکے تھے۔ بنوں کے لوگوں کو بھی اطلاع مل چکی تھی کہ بھارتی پنجاب اور اس سے ملحقہ علاقوں میں مسلمانوں کا قتل عام کیا جا رہا ہے۔ مقامی لوگوں میں ہندوؤں اور سکھوں کے خلاف سخت اشتعال پایا جا رہا تھا۔ جب میرے دادا جان اپنے چھوڑے ہوئے گھروں میں گئے تو انھیں سخت مایوسی ہوئی۔

پھر انھوں نے فیصلہ کیا کہ ہمیں واپس دہلی چلے جانا چاہیے لیکن اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ وہ عارضی طور پر ایک مکان میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ ایک دن کچھ لوگوں نے اس مکان پر حملہ کر دیا۔ اتفاق سے میرے والد صاحب جن کی عمر دس برس کے قریب ہو گی وہاں نہیں تھے۔ وہ محلے میں واقع ایک مسلمان کے گھر میں اپنے ہم عمر بچوں کے ساتھ کھیل رہے تھے۔ حملے کے نتیجے میں ہمارے خاندان کے سترہ لوگ مارے گئے۔ جن میں میرے دادا، میری دادی، میری والدہ اور دیگر لوگ شامل تھے۔ جب یہ خبر ان گھر والوں کو ملی جہاں میرے والد صاحب موجود تھے تو انھوں نے میرے والد کو گھر سے باہر نہ نکلنے دیا اور کئی روز تک اپنے گھر میں چھپائے رکھا۔ میرے والد صاحب کو پتہ چل چکا تھا کہ ان کا سارا خاندان قتل کر دیا گیا ہے۔

مسلمان خاندان کے لیے یہ مسئلہ تھا کہ وہ کب تک میرے والد کو اپنے پاس رکھیں اور اگر انھیں بھارت بھیجنا ہو تو کیسے بھیجیں۔ بعدازاں جب امن وامان ہو گیا تو عام لوگوں نے قتل و غارت کرنے والے لوگوں کی بہت مذمت کی۔ یہ کام عام لوگوں کا نہیں تھا کچھ مخصوص قسم کے غنڈے تھے جو یہ کام کرتے تھے۔ امن امان ہونے کے بعد پتہ چلا کہ راولپنڈی سے ایک ٹرین دہلی کے لیے چلتی ہے جو ہندوؤں اور سکھوں کو لے کر جاتی ہے۔ جنھوں نے میرے والد کو پناہ دی تھی وہ انھیں لے کر راولپنڈی آ گئے۔ کئی دن ٹھہرنے کے بعد انھیں ہمارے دور پار کے کسی رشتہ دار کا پتہ چلا اور انھوں نے میرے والد صاحب کو ان کے حوالے کر دیا۔ میرے والد صاحب اس خاندان کے ساتھ دہلی آ گئے۔ کافی عرصہ کیمپوں میں رہنے کے بعد نقل مکانی کر کے آنے والوں کو حکومت نے یہاں سے جانے والے لوگوں کے گھر الاٹ کرنا شروع کر دیے۔

اس وقت قانون یہ بنایا گیا کہ نقل مکانی کر کے جانے والے کسی کی کوئی جائیداد کوئی بھی مقامی شخص نہ خرید سکتا ہے نہ اس پر قبضہ کر سکتا ہے۔ سنیل نے کہا مجھے پتہ لگا تھا کہ پاکستان میں بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ میرے والد صاحب نے اپنی تعلیم دوبارہ سے شروع کی۔ ہمارے رشتہ داروں نے ہمارا بہت خیال رکھا۔ ہر روز میرے والد اپنے خاندان کو یاد کرتے ہیں اور بنوں میں اپنے بچپن کے دوستوں سے رابطے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔

سنیل نے مجھ سے پوچھا کہ بھارت سے جو لوگ نقل مکانی کر کے گئے تھے ان کی جائیداد یا تو نقل مکانی کر کے آنے والوں کو دی گئی یا حکومت نے خود اسے اپنے قبضے میں لے لیا۔ میں نے انھیں بتایا کہ میرا خاندان ٹوبہ ٹیک سنگھ میں جس مکان میں آ کر آباد ہوا تھا، اسی مکان میں میری پیدائش بھی ہوئی تھی۔ وہ گھر تقسیم ہند سے دس سال قبل ایک امیر ہندو نے بنایا تھا۔

سنیل مجھ سے پوچھنے لگا کہ کیا آپ کبھی بنوں گئے ہیں؟ میں نے کہا کہ مجھے ابھی تک جانے کا موقع نہیں ملا۔ سنیل کے پوچھنے کا مقصد یہ تھا کہ جو گھر ہم چھوڑ کر آئے تھے وہ کس حالت میں ہے؟ کیا ان مکانوں میں یہاں سے جانے والے بس رہے ہیں یا کوئی اور؟ میں نے کہا کہ میرے علم کے مطابق بہت بڑی تعداد میں ہندو اور سکھ موجودہ کے پی کے کے علاقوں سے جسے پہلے صوبہ سرحد کہتے تھے بھارت نقل مکانی کر گئے تھے۔ ان میں اکثر بہت امیر اور بڑی جائیدادوں کے مالک تھے لیکن بھارت سے ہجرت کر کے جانے والے اکثر لوگ پنجاب اور سندھ میں آباد ہوئے۔ ان میں سے شاید ہی کوئی کے پی کے کے علاقوں میں آباد ہوا ہو۔ اس لیے ان کی چھوڑی ہوئی ساری جائیدادیں مقامی لوگوں کے ہی استعمال میں ہیں۔

سنیل یہ سب کچھ بڑے حوصلے سے مجھے سناتے رہے لیکن وہ بھی اپنے خاندان کو یاد کر کے آبدیدہ ہو گئے۔ میں نے انھیں کہا کہ میرے والد بھی اپنی جائے پیدائش کو دوبارہ نہ دیکھ سکے اور آپ کے والد بھی اپنی جائے پیدائش کو دوبارہ نہ دیکھ سکے۔ میرے والد تو اس دنیا سے چلے گئے ہیں اس لیے ان کا کوئی امکان نہیں لیکن آپ کے والد حیات ہیں تو کوشش کریں کہ کبھی انھیں بنوں لے جائیں۔ یقیناً یہ ان کی بہت بڑی خواہش ہو گی اور وہ بہت خوش ہوں گے۔

ہمیں باتیں کرتے کرتے کافی وقت گزر گیا۔ سب لوگ سونے کی تیاری کر رہے تھے۔ ہمیں بھی سونا ہی تھا لیکن سونے سے پہلے ہم دونوں نے گاڑی کی کھڑکی سے باہر اندھیرے میں دیکھا، بظاہر تو کچھ نظر نہیں آ رہا تھا لیکن ہمیں ایک دوسرے کی آنکھوں میں بہتے آنسو ضرور نظر آ رہے تھے۔

ہم دونوں اپنوں کو یاد کر کے آنکھیں نم کر رہے تھے۔۔۔

آنسو صاف کرنے کے بعد میں نے سنیل سے کہا کہ کتنی بڑی نقل مکانی ہوئی، لاکھوں کی تعداد میں قتل و غارت، ہندوؤں، سکھوں اور مسلمانوں سب نے کی، اس کا ذمہ دار کون ہے؟ اس سے کس کو فائدہ پہنچا؟ کبھی تو معلوم ہوگا، ہم نہیں ہوں گے لیکن ہماری اولاد تو جان سکے گی۔

آج مجھے سفر نامہ لکھتے ہوئے سنیل کا چہرہ پھر سے یاد آیا۔ میں پچھلے چند سالوں میں کئی مرتبہ بنوں گیا ہوں۔۔۔ میں تصور ہی میں وہ سارے مناظر دیکھتا ہوں جو مجھے سنیل نے بتائے تھے۔ میں نے اس خاندان کا پتہ پوچھنے کی کوشش کی جس نے سنیل کے والد کی حفاظت کی تھی۔ سنیل نے بتایا کہ والد کو بھی معلوم نہیں کہ وہ لوگ کون تھے۔

رات گہری ہو رہی تھی ہمارا سفر بھی کٹ رہا تھا۔۔۔ کیا تھا، کیا ہوا کیوں ہوا۔۔۔ یہی سوچتے سوچتے نیند کی دیوی نے آلیا۔

گجرات اسٹیٹ علاؤالدین خلجی سے نریندر مودی تک

اب ہم دہلی سے چل کر ہریانہ، یوپی، سی پی، آندھرا پردیش، تلنگانہ، کرناٹکا اور مہاراشٹرا سے ہوتے ہوئے گجرات سے گزر رہے تھے، اس طرح یہ ساتویں اسٹیٹ تھی۔ سورت گجرات کا پہلا شہر تھا۔ آگے بڑھنے سے پہلے میں آپ کو گجرات کے ایک ایسے شہر کے بارے میں بتاؤں گا جہاں سینکڑوں کی تعداد میں مختلف کیمیکلز بنانے کے پلانٹ لگائے گئے۔ میرے علم کے مطابق کسی ایسے شہر میں جو بہت بڑا بھی نہ ہو اور جہاں آبادی بھی دو لاکھ سے کم ہو، اتنی بڑی تعداد میں کیمیکلز کے پلانٹ، بہت ہی انوکھی بات ہے۔

بھارت کے مغربی ساحل پر واقع گجرات اسٹیٹ کا ساحل سولہ سو کلومیٹر لمبا ہے۔ یاد رہے پاکستان کا ساحل سمندر تقریباً 1000 کلومیٹر ہے۔ کاٹھیاوار بھی اسی علاقے

میں شامل ہے۔ گجرات کی آبادی چھ کروڑ سے زائد ہے اور یہ بھارت کی پانچویں بڑی ریاست ہے۔ اگر آپ نقشے میں دیکھیں تو آپ جان جائیں گے کہ اس کے شمال میں راجستھان، جنوب میں مہاراشٹرا، مشرق میں مدھیہ پردیش، مغرب میں صوبہ سندھ اور بحیرہ عرب واقع ہے۔ اس کا صدر مقام گاندھی نگر ہے اور اس کا سب سے بڑا شہر احمد آباد ہے۔ اس اسٹیٹ میں گجراتی زبان بولی جاتی ہے اور وہی اس کی سرکاری زبان بھی ہے۔ یہاں پر گجراتی لوگوں کی اکثریت ہے۔ پاکستان میں بسنے والے میمن حضرات کی اکثریت کا تعلق گجرات سے ہی ہے۔ گجرات کا جی ڈی پی 210 بلین ڈالر کے قریب ہے۔ (پاکستان کا جی ڈی پی 280 بلین ڈالر ہے)۔ معاشی لحاظ سے یہ بھارت کی تیسری مضبوط ریاست ہے۔ اس علاقے میں رہنے والے لوگوں کی فی کس آمدنی تین ہزار ڈالر کے قریب ہے جبکہ پاکستان میں فی کس آمدنی بارہ سو ڈالر کے قریب ہے۔

مورٹیمر ویلر اور سر مورٹیمر ویلر کی کتاب The Indus Civilization کے مطابق گجرات بھی وادیٔ سندھ کی تہذیب سے منسلک رہا ہے اور اسے وادیٔ سندھ کی تہذیب کا حصہ ہی سمجھا جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ دنیا کی پہلی بندرگاہ جس کا نام لوتھل تھا بھی، وہ بھی اسی علاقے میں واقع ہے۔ یہاں پر ایسی کئی بندرگاہیں واقع ہیں جنہیں دنیا کی قدیم ترین بندرگاہوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ ایک خوبصورت بات یہ ہے کہ گجرات ان چار ریاستوں میں شامل ہے جہاں پر شراب بیچنے پر پابندی ہے۔ یہاں پر شیروں کی افزائش نسل کے لیے ایک پارک بھی موجود ہے۔ گجرات کا نام گجر سے مصدق ہے، جو یہاں پر ساتویں اور آٹھویں صدی میں حکومت کرتے رہے ہیں۔ پاکستان میں بھی ایک گجرات ہے لیکن یہ ایک شہر کا نام ہے جبکہ بھارت میں یہ ایک بہت بڑے علاقے کا نام ہے۔

مورٹیمر ویلر اور سر مورٹیمر ویلر نے یہ بھی لکھا ہے کہ مدراس کبھی سندھ تہذیب کا حصہ تھا۔ اب گجرات سے متعلق بھی یہی کہا جاتا ہے کہ یہ بھی سندھ تہذیب کا

حصہ رہا ہے اور آثارِ قدیمہ سے ملنے والی چیزیں اس بات کا ثبوت ہیں ۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ زمانہ قدیم میں لوگ اس علاقہ سے مصر، بحرین، ایران اور افریقی ممالک تک آتے جاتے تھے۔ یہاں پر زیادہ تر ہندو اور بدھ مت کے لوگ ہی حاکم رہے۔ چندر گپت موریا، آشوک اور اس طرح کے بہت سے مشہور حکمران خاندانوں کی باقیات اس علاقے میں پائی جاتی ہیں۔ آٹھویں صدی میں جب بنو امیہ کی حکومت تھی اور اسکی سلطنت بہت دور تک پھیلی ہوئی تھی تو اسی دور میں محمد بن قاسم نے سندھ پر حملہ کیا۔ اس کے ساتھ عرب مسلمانوں نے گجرات کے علاقوں پر بھی حملے کیے لیکن وہ یہاں پر اپنی حکومت قائم نہ کر سکے۔ یہ بات میرے لیے بلکل نئی تھی۔ مقامی ہندوؤں نے مل کر ان کا مقابلہ کیا اور عربوں کو اپنے علاقے میں آنے سے روکا۔ اس ہندو راجہ کو تاریخ میں بہت بڑے خطاب سے نوازا جاتا ہے جس نے ہندوؤں اور عربوں کے درمیان جنگ میں ہندوؤں کی قیادت کی تھی۔ نواساری (Navasari) کے مقام پر ایک تاریخی جنگ ہوئی، جس میں عربوں کو بہت نقصان ہوا۔

جب مسلمانوں نے ایران کو فتح کیا تو بہت سے آتش پرست ایران سے جان بچا کر گجرات کے علاقے میں آ گئے۔ یہاں انھیں پارسی کہا جانے لگا۔ پارسی کا لفظ فارس سے نکلا ہے۔ علاؤالدین خلجی نے جب مختلف علاقوں کو فتح کرنا شروع کیا تو اس نے 1297ء میں اس علاقہ کے راجہ کو بھی شکست دی اور اس کے بعد یہ علاقہ سلاطین دلی کے زیرِ تسلط آ گیا۔ سلاطین دلی کے خاتمے کے بعد مغل حکمرانوں نے اسے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا اور ان کا یہ دور یورپین اقوام کے حملوں اور قبضے تک برقرار رہا۔ ساتیش مشرا کی کتاب The Rise of Muslim Power in Gujarat: A History of Gujarat from 1298 to 1442 میں لکھا ہے کہ 1197ء میں قطب الدین ایبک نے بھی اس علاقے پر حملہ کیا لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکا۔ اس دوران مختلف مسلمان گجرات کے علاقے میں عرب اور ایران سے آ کر رہنے لگے۔ اس طرح مسلمانوں کی آبادی بڑھتی گئی

لیکن اس وقت بھی حکومت ہندو راجاؤں کی تھی۔ علاؤالدین خلجی نے تین سال مسلسل کوشش کی اور 1300 ء میں مقامی ہندو راجہ کو شکست دے کر علاقے پر قبضہ کر لیا۔ اس دوران امیر تیمور نے دلی پر قبضہ کر لیا جس سے سلاطین دلی کمزور ہو گئے۔ جیسے ہی مرکز کمزور ہوا تو دور دراز کے علاقوں کے حکمرانوں نے بھی اعلانِ آزادی کر دیا۔ گجرات میں بھی ایسا ہی ہوا۔

یہاں کے ایک راجپوت حکمران جس کا نام سلطان احمد شاہ تھا نے اپنی ایک مقامی ریاست کا اعلان کر دیا اور احمد آباد کو اپنا دارالخلافہ بنایا۔ ایک طرح سے وہ اس علاقے کا راجہ بن بیٹھا۔ جیسا کہ میں نے پہلے بتایا کہ یہاں پر عرب اور ایران کے مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد پہلے سے رہ رہی تھی اس وجہ سے نئی ریاست کو کوئی مشکل پیش نہ آئی۔ اس ریاست کے دور میں دلی کی بجائے عربوں، ترکوں، ایرانیوں اور مصر کے لوگوں کے ساتھ ساتھ یورپیوں سے بھی تعلقات قائم ہو گئے۔اسی ریاست نے مغلوں کے خوف سے پرتگیزیوں کو رہنے کی جگہ دی تھی۔ یہ اس علاقے میں کسی بھی غیر ملکی کالونی کا نقطۂ آغاز تھا۔

مجھے اس بات کا زیادہ علم نہیں تھا کہ گجرات اور بھارت کے دیگر جنوبی علاقوں میں بھی بہت سارے صوفیاء پہنچے۔ ان میں ایک بہت ہی مشہور صوفی جن کا تعلق چشتی سلسلے سے تھا کا نام شاہ عالم تھا اور وہ مخدوم جہانیاں کے شاگرد تھے۔ کئی اور صوفیاء یہاں پر آئے اور یہی وجہ ہے کہ ان علاقوں کے بہت سارے شہروں میں بیس سے چالیس فیصد تک مسلمانوں کی آبادی ہے ۔ ان علاقوں کو اسلام سے روشناس کروانے میں صوفیاء کا بہت بڑا کردار ہے۔ان صوفیاء کا تعلق ایران اور وسطی ایشیاء کے ساتھ ساتھ عرب ممالک سے بھی تھا۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ اس وقت گجرات کے مسلمان حکمرانوں کے ترکی کی سلطنتِ عثمانیہ کے ساتھ بھی بڑے گہرے تعلقات تھے اور وہ مل کر یورپی لوگوں کا مقابلہ بھی کرتے تھے۔

Gujrat Richest State of India Photo Credit:
https://www.pngwing.com/en/free-png-btpvd

ساتیش مشرا کی بیان کردہ تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ تھوڑے عرصے کے لیے ہمایوں نے بھی اس علاقے پر قبضہ کیا تھا۔ سلاطینِ گجرات نے طویل عرصے تک اپنی ایک الگ سلطنت قائم رکھی لیکن ان کی یہ ریاست اکبر کے دور میں آکر ختم ہو گئی۔ اکبر نے اس علاقے کو فتح کیا اور اسے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ اس کے بعد عالمگیر نے اس سے بھی آگے جنوب میں دکن کے علاقوں کو فتح کیا اور اپنی حکومت میں شامل کیا۔ اس طرح یہ علاقہ جو ایبک کی کوشش سے فتح ہونا شروع ہوا، خلجی نے اس پر قبضہ کرلیا۔ سلاطین دلی کی حکومت کمزور ہونے کے بعد مقامی راجپوت خاندان نے اپنی سلطنت کا اعلان کر دیا اور پھر اکبر نے اسے مغل حکومت کا حصہ بنا دیا۔ اکبر کے دور میں یہاں پر ایک شیعہ عالم آئے جن کا نام محمد غوث تھا اور انھوں نے یہاں پر شیعہ مسلک کی تبلیغ کی اس دور میں انھوں نے یہاں ایک مسجد بھی بنائی، جس کا نام ٹبہ والی مسجد ہے۔

یہ ایک بڑی دلچسپ داستان ہے کہ کس طرح اس علاقے میں جنگ و جدل کے بغیر مختلف ممالک سے آکر مسلمان آباد ہوئے اور انھوں نے اپنے مسلک کی تبلیغ کی۔

ان کے ساتھ ساتھ پارسی بھی بہت بڑی تعداد میں یہاں آئے۔ یوں لگتا تھا کہ پوری دنیا جنگ کی لپیٹ میں تھی اور یہ ایک امن کا خطہ تھا جہاں لوگ آ کر بس گئے۔

جب یورپ میں یہودیوں پر مشکل وقت آیا تو ان میں سے بھی بہت سے یہودیوں نے ہندوستان کی طرف نقل مکانی کی۔ اس وقت زیادہ تر آمد و رفت سمندر کے ذریعے ہوتی تھی اور گجرات کی بندرگاہیں اس کام کے لیے دنیا بھر میں مشہور تھیں اس لیے بہت سے یہودی اس علاقے میں آ کر بس گئے۔ غالباً اس کی بھی یہی وجہ تھی کہ اس علاقے میں دیگر یورپی اقوام بھی آ رہی تھیں۔ اس کے ساتھ ساتھ یہاں پر امن بھی تھا اور تجارت کے مواقع بھی زیادہ تھے۔

چودہویں صدی میں ابن بطوطہ نے بھی اس علاقے کا دورہ کیا۔ انھوں نے یہاں کے شہروں کے بارے میں لکھا کہ انھیں خوبصورت طریقے سے بنایا ہوا تھا۔ جب میں نے اس علاقے کی تاریخ جاننے کی کوشش کی تو پتہ چلا کہ اس علاقے میں ریاست گجرات کے علاوہ بھی ایک مسلمان ریاست بنی تھی جس نے سلاطینِ دلی کی کمزوری بھانپتے ہوئے آزادی کا اعلان کر دیا تھا۔ بعد ازاں اس ریاست کو انگریزوں نے فتح کر لیا۔ ایک وقت آیا کہ یہ انگریزوں کی اتحادی ریاست بن گئی اور اس کے آخری حکمران نے تقسیم ہند کے بعد ہندوستان میں شمولیت کا اعلان کر دیا۔ ریاست گجرات اور سلطنت عثمانیہ نے مل کر ایک بحری بیڑا بھی بنایا اور ایک جنگ میں پرتگیزیوں کو شکست بھی دی تھی۔ یہ تاریخ میں پرتگیزیوں کی کسی بھی جگہ پر پہلی سمندری شکست تھی۔ اس بارے میں مزید جاننے کے لیے ساتیش مشرا کی کتاب بے حد مفید ہے۔

گجرات کی تاریخ انتہائی دلچسپ ہے جو زیادہ تر ہماری نظروں سے اوجھل رہی ہے لیکن اگر اسے پڑھا جائے تو اس میں بہت ہی حیران کن چیزیں پائی جاتی ہیں۔

میں بہت زیادہ تو نہیں لکھ سکتا لیکن اتنا ضرور کہوں گا۔ کہ گجرات اکبر کے دور میں ایک صوبہ بن چکا تھا اور اس کا صدر مقام احمد آباد تھا۔ یہ ایک طرف سے ٹھٹھہ سندھ اور دوسری طرف اجمیر اور مالواہ تک پھیلا ہوا تھا۔ یہ اپنے دور کا ایک انتہائی امیر علاقہ تھا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ اس کا ساحل اور یہاں کی بندرگاہیں تھیں۔ اورنگزیب کی پیدائش کے وقت اس کا والد شاہ جہاں گجرات کا گورنر تھا اور گجرات کے ہی ایک علاقے میں اورنگزیب کی پیدائش ہوئی تھی۔ جب شاہ جہاں کی وفات ہوئی تو اس وقت اورنگزیب گجرات کا گورنر تھا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اس نے اسی علاقے میں دفن ہونا پسند کیا۔ سترہویں صدی میں مراٹھوں نے ریاست گجرات پر حملہ کیا اور کئی حملوں کے بعد ریاست گجرات کے علاوہ مہاراشٹرا کے بہت سے علاقوں پر بھی قبضہ کرلیا۔

تقسیم ہند کی تحریک میں بھی اس علاقے کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ تقسیم ہند کے بعد گجرات کو الگ اسٹیٹ بنادیا گیا جہاں زیادہ تر گجراتی بولنے والے لوگ ہی رہتے ہیں۔ اب تک بھارت میں جتنی بھی نئی اسٹیٹس بنائی گئیں ہیں وہ زیادہ تر زبان اور نسل کی بنیاد پر ہی بنائی گئیں ہیں۔ ان میں کوئی بھی مذہب کی بنیاد پر نہیں بنی کیونکہ بھارت میں ہر جگہ پر ہندوؤں کی اکثریت ہے۔ گجرات کا پہلا صدر مقام احمد آباد تھا۔ 1970ء میں اسے گاندھی نگر میں منتقل کردیا گیا۔

گجرات میں ہونے والا ایک ناقابلِ فراموش واقعہ 2002ء میں گودھڑا میں ٹرین میں لگائی جانے والی آگ ہے۔ جس میں ایک ہزار سے زیادہ لوگ مارے گئے تھے اور ان میں تقریباً آٹھ سو مسلمان تھے۔ تعداد کے معاملے میں بہت اختلاف پایا جاتا ہے۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ تعداد اس سے کہیں زیادہ تھی۔ گجرات میں مختلف اوقات میں ہندو مسلم فسادات بھی ہوتے رہے ہیں۔ جب ٹرین جلانے کا واقعہ پیش آیا تو اس وقت موجودہ ہندوستان کا وزیرِاعظم نریندر مودی گجرات کا وزیرِاعلیٰ تھا۔ ٹرین جلائے جانے

کے واقعے کے بعد مسلمانوں پر انتہائی سخت وقت آیا اور طویل مدت تک کشیدہ صورتحال برقرار رہی۔ اکثر لوگ ان تمام واقعات کا ذمہ دار مودی کو ہی ٹھہراتے ہیں لیکن حکومتی رپورٹوں میں انھیں اس الزام سے بری کر دیا گیا۔ بہرحال یہ ایک بہت ہی افسوس ناک واقعہ تھا جس میں کئی ہزار بے گناہوں کی جانیں چلی گئیں۔

کون قصوروار ہے اور کون نہیں ۔۔۔ جس پر یہ قیامت آئی اس کی دنیا تو برباد ہو گئی۔ جو بھی اس کا ذمہ دار ہے وہ یقیناً اس کی سزا پائے گا۔

میں نے اب تک جتنا جانا ہے اس کے مطابق گجرات جہاں معاشی طور پر ایک بہت معروف علاقہ ہے وہیں پر یہ سیاسی طور پر بھی بہت ہی متحرک صوبہ ہے۔ گجرات میں دس فیصد کے قریب مسلمان ، دو فیصد جین ، سکھ اور بدھ مت جبکہ 88 فیصد کے قریب ہندو رہتے ہیں۔ یہ وہ علاقہ ہے جہاں مسلمانوں نے بارہویں صدی میں حکومت کرنا شروع کی تھی۔ اگر انھوں نے طاقت کے زور پر لوگوں کو مسلمان کرنا ہوتا تو آج اس علاقے میں مسلمانوں کی تعداد دس فیصد سے یقیناً زیادہ ہوتی لیکن ایسا نہیں ہوا۔

نواساری : جہاں اکبر کی دی ہوئی زمین پر ایک قدیم لائبریری قائم ہے

سورت کے ساتھ ہی ایک اور شہر بھی ہے جسے سورت کا جڑواں شہر بھی کہتے ہیں۔ اس کا نام نواساری ہے۔ جب میں نے اس علاقے کی تاریخ پڑھی تو مجھے معلوم ہوا کہ یہاں دو اہم ترین واقعات رونما ہوئے جن کی وجہ سے نواساری ایک اہم شہر گردانا جاتا ہے۔ میں نے سوچا کہ ان واقعات کو آپ تک پہنچانا بھی ضروری ہے۔

پہلا واقعہ یہ ہوا کہ ایک بندرگاہ ہونے کی وجہ سے بہت سے پارسی یہاں پر آکر رہنے لگے۔ مجھے اصفہان میں پارسیوں کا ایک پرانا آتشکدہ دیکھنے کا بھی اتفاق ہوا اور اس کے ساتھ ہی مجھے یہ علم بھی ہوا کہ اب ایران میں پارسی بہت کم رہتے ہیں۔ میں جب

1982ء میں آئی سی آئی میں کام کرتا تھا تو میرے ساتھ ایک پارسی بھی کام کرتے تھے جن کا نام ڈنشا جان وکیل تھا۔ایک منفرد نام ہونے کی وجہ سے یہ نام مجھے ابھی تک یاد ہے۔ کراچی شہر میں اب بھی بہت سے پارسی رہتے ہیں۔ اردو شیر کاؤس جی ایک معروف انگلش کالم نگار تھے، وہ بھی کراچی سے ہی تعلق رکھتے تھے۔ یہ لوگ ایران پر مسلمانوں کے قبضہ کے بعد وہاں سے نکل کر مختلف علاقوں میں چلے گئے۔ وہ زیادہ تر ان علاقوں میں گئے جہاں بندرگاہیں تھیں جیسا کہ کراچی، ممبئی، سورت وغیرہ۔

اکبر ایک ان پڑھ آدمی تھا لیکن وہ مختلف علماء کو بلاتا اور ان کے درمیان بیٹھ کر ان کی باتیں سنتا تھا۔ایک دفعہ اس نے مختلف مذاہب کے لوگوں کو بلوایا اور ان سے کہا کہ وہ اپنے اپنے مذہب کے بارے میں بتائیں۔اس میں مسلمان، جین، عیسائی، بدھ اور ہندوؤں کے ساتھ ساتھ پارسی بھی تھے۔ سب نے اپنی اپنی باتیں کیں۔ ہر کسی نے یہ ثابت کیا کہ اس کا مذہب سب سے اچھا ہے۔آخر میں پارسی مذہب کے نمائندے جن کا نام دستور مہر جی رانا (Dasture Meherjirana) تھا، نے کہا کہ ان کے نزدیک تمام مذاہب اپنی طاقت، نظریے اور اصولوں کے تحت ایک جیسے ہی ہیں اور ہم ان میں کوئی فرق نہیں کرتے۔اکبر یہ سن کر بے حد خوش ہوا اور دستور صاحب کی شخصیت سے بے حد متاثر ہوا۔ اس نے انعام کے طور پر دستور صاحب کو نواساری میں ایک بڑی جگہ الاٹ کر دی اور اس کے لیے ایک شاہی فرمان بھی جاری کر دیا۔ پارسی لوگوں نے اس جگہ پر کوئی پارک یا کوئی ذاتی مکانات نہیں بنائے بلکہ انھوں نے اس جگہ پر ایک لائبریری تعمیر کی۔ وہ یہ جانتے تھے کہ ترقی کا راز علم حاصل کرنے میں پنہاں ہے۔ اس لائبریری کا نام مہر جی رانا لائبریری ہے۔اس کے متعلق تمام تر معلومات میں نے اس کی ویب سائٹ سے لی ہیں[39]۔

[39] http://www.meherjiranalibrary.com/home/history

اس بات کو تقریباً پانچ سو سال ہونے والے ہیں ۔ اب یہ ایک بہت بڑی لائبریری بن چکی ہے۔ اس لائبریری میں اکبر کا شاہی فرمان اب تک آویزاں ہے۔ میں نے جب اس لائبریری سے متعلق پڑھا تو پتہ چلا کہ یہ جنوبی ہندوستان کی سب سے پرانی لائبریری ہے۔ اس کی تصاویر سے بھی یہی محسوس ہوتا ہے کہ یہ ایک قدیم طرز تعمیر کا شاہکار ہے۔ جنہوں نے اسے دیکھا انھوں نے بھی اس کے بارے میں یہی لکھا ہے کہ یہ بہت ہی خوبصورت طریقے سے بنائی گئی ہے۔ بلاشبہ یہ ایک بہت بڑی اور خوبصورت جگہ ہے جہاں پر لوگ جا کر آرام بھی کر سکتے ہیں اور پڑھ بھی سکتے ہیں۔ اگر مجھے کبھی دوبارہ اس شہر میں جانے کا موقع ملا تو میں اس لائبریری کو ضرور دیکھنے جاؤں گا۔

The reading room of the First Dastoor Meherjirana Library Photo Credit: https://www.livemint.com

اس شہر کی دوسری اہم بات یہ ہے کہ 1930ء میں مہاتما گاندھی نے انگریزوں کی طرف سے نمک پر لگائے گئے مختلف ٹیکسز کے خلاف ایک طویل پیدل مارچ کا اختتام یہاں کیا تھا۔ یہ مارچ احمد آباد سے شروع ہوا اور چوبیس دن تک جاری

رہا۔ مہا تما گاندھی نے اس مارچ کا خاتمہ نواساری شہر کے قریب ایک گاؤں ڈانڈی (Dandi) میں کیا۔

اس مارچ میں اسی کے قریب لوگوں نے گاندھی کے ساتھ ان کے مارچ میں شرکت کی۔ ان میں سے بیشتر کی عمریں 20 سے 30 سال کے درمیان تھیں۔ ان کا تعلق ہندوستان کے کئی علاقوں سے تھا۔ میں نے شرکاء کے نام پڑھے ہیں۔ دو ناموں سے لگتا ہے کہ وہ مسلمان تھے۔ ایک نام پنجابی شاہ بھی ہے۔ میں تو اس سے یہی مراد لیتا ہوں کہ یہ صاحب پنجاب سے گئے ہوں گے۔

انڈین ایکپریس نے 9 فروری 2014ء کو ایک مضمون شائع کیا ہے جس کا عنوان ہے: Remembering the 80 unsung heroes of Mahatma Gandhi's Dandi March اس میں لکھا ہے کہ اُن افراد کے مجسمے ایک پارک میں تیار کیے جا رہے ہیں جنھوں نے گاندھی کے ساتھ مارچ میں حصہ لیا تھا۔ یاد رہے کہ اس مارچ میں 338 کلومیٹر فاصلہ طے کیا گیا تھا۔

یہاں کی ایک اور اہم بات ٹاٹا خاندان سے متعلق بھی ہے۔ ہم سب نے ٹاٹا خاندان کا نام تو سنا ہوا ہے۔ اس خاندان کے بانی کا نام جمشید جی ٹاٹا تھا۔ ان کا تعلق بھی اسی شہر سے تھا۔ مہاتما گاندھی کے چوبیس روزہ مارچ کی یاد میں شہر میں ایک چوراہا بنایا گیا ہے جسے چار راستہ کہتے ہیں۔ اس چوراہے پر مہاتما گاندھی کے مجسمے نے پیدل مارچ والا لباس پہنا ہوا ہے۔

عام سے شہروں میں بھی اگر کوئی خاص بات ہو جائے تو وہ انھیں بھی خاص کر دیتی ہے۔

Britishes from **East India Company in Mughal Court**
Photo Credit: https://www.ft.com

اورنگ آباد : جہاں عالمگیرؒ نے دفن ہونا پسند کیا اور مولانا مودودیؒ کی جائے پیدائش

بھارت کے وہ چند شہر جو میں خواہش کے باوجود نہ دیکھ سکا، ان میں اورنگ آباد بھی شامل ہے۔ ہم سورت سے گزر رہے تھے اور اس وقت سب لوگ سونے کی تیاری کر رہے تھے لیکن میں جو کتاب پڑھ رہا تھا اس میں لکھا ہوا تھا کہ گجرات کا علاقہ بہت دور تک پھیلا ہوا تھا اور گجرات سلاطینِ دلی اور مغل حکمرانوں کو بہت ہی پسند تھا۔ خاص طور پر اورنگزیب عالمگیر نے اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ یہاں پر گزارا۔ اورنگزیب عالمگیر سے پہلے اس کا والد شاہجہاں بھی اسی علاقے میں جہانگیر کا گورنر تھا۔ اورنگزیب کی پیدائش بھی یہیں ہوئی اور شاہجہاں کے دور میں اورنگزیب اس علاقے کا گورنر بھی بنا۔ آخری عمر میں بھی وہ اس علاقے میں اپنے مخالفین سے جنگ میں مصروف تھا۔ اسی علاقے میں اس کی وفات ہوئی اور اسے یہیں پر دفن کیا گیا۔

یہ شہر مولانا مودودیؒ کی جائے پیدائش بھی ہے اور ان کا بچپن بھی اسی شہر میں گزرا۔ یہ جان کر اس شہر سے میری عقیدت میں مزید اضافہ ہو گیا ہے۔ میں شدید خواہش رکھتا تھا کہ اورنگ آباد دیکھوں لیکن ایسا ممکن نہ تھا کیونکہ اورنگ آباد کا علاقہ سورت سے تین سو کلومیٹر کے فاصلے پر تھا اور ہم بذریعہ ٹرین جا رہے تھے اس لیے اورنگ آباد دیکھنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ البتہ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں چند دلچسپ باتیں آپ کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں جن کا تعلق اورنگ آباد سے ہے۔

یہ ہندوستان کی تاریخ کا وہ حصہ ہے جس سے ہم پاکستانی زیادہ واقف نہیں ہیں۔ اسی علاقے میں ایک افریقی غلام، ملک امبر نے بھی اپنی ریاست بنائی۔ اسی شہر میں اورنگزیب کے بیٹے نے اپنی ماں کے مقبرہ کی تعمیر مکمل کی جس کا آغاز اورنگزیب نے کیا تھا۔ جو ہو بہو تاج محل کی نقل ہے۔ تصویر میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا لیکن اس کی شان و شوکت میں یقینی طور پر بے حد فرق ہے۔ یہ بھارت کا دوسرا تاج محل ہے جسے دکنی تاج محل کہتے ہیں

میں نے آج تک جتنے بھی شہروں سے متعلق پڑھا ہے ان میں کسی کے پانچ دروازے ، کسی کے بارہ دروازے جیسے لاہور میں بارہ دروازے ہیں۔ اورنگ آباد کے باون دروازے تھے اسی وجہ سے اسے دروازوں کا شہر بھی کہا جاتا ہے۔ یہ ایک ایسا شہر ہے جس کا نام تین مرتبہ بدلا گیا۔ موجودہ دور میں بھی اس شہر نے اپنی انفرادیت برقرار رکھی اور اسے بھارت کا سمارٹ سٹی ہونے کا اعزاز ملا۔

میرے سب ساتھی سو رہے تھے اور میری نیند مجھ سے ابھی تھوڑی دور تھی لہٰذا میں تصور ہی تصور میں صدیوں پیچھے چلا گیا۔ تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ علاقہ دوسری صدی عیسوی سے ہی آباد ہے۔ اُس وقت یہاں پر ہندو راجاؤں کی حکومت تھی۔ دولت آباد اور دیواگری بھی جدید اورنگ آباد کی حدود میں واقع ہیں۔ چودھویں صدی کے آغاز میں سلطان علاؤالدین خلجی کے دور حکومت میں یہ علاقہ سلاطینِ دلی کے ماتحت

آ گیا۔ بعدازاں سلطان محمد بن تغلق نے بھی اس علاقے پر حکمرانی کی۔ اس نے بڑے پیمانے پر دلی کی آبادی کو دولت آباد منتقل کرنے کا حکم دیا تاہم بعد میں دارالحکومت واپس دلی منتقل کر دیا گیا۔

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ اس علاقے میں پانچ مسلمان ریاستیں قائم تھیں، جن میں سے ایک احمد نگر بھی تھی اس کی بنیاد ملک احمد نظام شاہ اول نے رکھی جو نظام الملک کا بیٹا تھا۔ وہ بہمنی ریاست کی طرف سے اس علاقے کا گورنر تھا۔ اس نے اپنے ایک جرنیل جہانگیر خان کی زیرِ قیادت میں بہمنی فوج کو شکست دینے کے بعد آزادی کا اعلان کیا اور ریاست احمد نگر کی بنیاد رکھی۔ احمد نگر شہر اسی دور میں بسایا گیا اور اسے دارالحکومت کا درجہ دیا گیا۔

اورنگزیب نے اس ریاست کو ختم کرکے مغل سلطنت کا حصہ بنایا۔ یہ کیسے ہوا؟ وہ ایک دلچسپ کہانی ہے جس میں ایک حبشی غلام ملک امبر کا کردار نہایت ہی اہم ہے۔ یہ سب کچھ یقیناً آپ کے لیے بھی بے حد دلچسپی کا باعث ہو گا۔ میں کوشش کرتا ہوں کہ چند اہم باتیں آپ کے سامنے پیش کروں لیکن آپ سے یہ گزارش ضرور کروں گا کہ آپ اس علاقے کی تاریخ کا مطالعہ ضرور کریں۔

سلطانہ چاند بی بی: ہندوستان میں پہلی مسلمان خاتون حکمران

سولویں صدی کے آغاز میں ملک احمد شاہ کی موت کے بعد، ان کے بیٹے برہان جس کی عمر صرف سات سال تھی کو تخت پر بٹھایا گیا۔ اس کے بعد تخت کے لیے کئی جنگیں ہوئیں ۔ اس دوران بیجاپور سلطنت کے ساتھ بھی لڑائی ہوئی۔ ان جنگوں میں مغل حکمرانوں نے بھی اس علاقے کو فتح کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ مغلوں کے حملوں کو روکنے میں چاند بی بی نام کی ایک خاتون کا ذکر ملتا ہے جو ریاست احمد نگر کے شاہی خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔

Chand Sultana Bibi Photo Credit:
https://artsandculture.google.co

جب تک چاند بی بی زندہ رہی مغل اس علاقے پر اپنے قدم نہ جما سکے۔ میرے علم کے مطابق سلطانہ چاند بی بی پہلی ہندوستانی مسلمان حکمران اور جنگجو تھیں۔ انھوں نے سلطنت بیجاپور اور احمد نگر کی حفاظت کے لیے مغلوں سے کئی لڑائیاں لڑیں۔ اس علاقے کی تاریخ میں انھیں ایک اہم مقام حاصل ہے۔ وہ سلطانہ کا خطاب حاصل کرنے والی پہلی مسلمان خاتون ہیں۔ 1595ء میں شہنشاہ اکبر کی مغل افواج کے خلاف احمد نگر کا دفاع کرنا بھی ان کا ایک اہم کارنامہ ہے۔

ملک امبر: ایک حبشی غلام جس نے ہندوستان میں پہلی افریقی ریاست قائم کی

چاند بی بی کی موت 1600ء میں ہوتی ہے جس کے بعد مغلوں نے احمد نگر فتح کر کے راجہ کو قید کر لیا لیکن ملک امبر اور احمد نگر کے دیگر عہدیداروں نے مغلوں کے

خلاف اپنی جنگ جاری رکھی ۔انھوں نے ایک اور شہر کو اپنا ہیڈ کوارٹر بنایا اور ملک امبر اسکا وزیر اعظم بنا۔ اس نے ایک نئے شہر کھڈ کی بعد میں اورنگ آباد کی بنیاد رکھی اور اپنا صدر مقام اس نئے شہر میں منتقل کر دیا۔ یہ ملک امبر کون تھا اور کہاں سے آیا تھا؟ یہ بھی ایک دلچسپ داستان ہے کہ کس طرح ایک حبشی غلام ہندوستان میں ایک ریاست کا حکمران بنا؟

ملک امبر کے بارے عمر حامد علی نے ایک کتاب **Malik Ambar:** Power and Slavery Across the Indian Oceanکے نام سے لکھی ہے۔ عمر حامد علی لکھتے کہ ملک امبر ایک افریقی غلام تھا جسے بغداد کے ایک تاجر نے خریدا تو اس نے اسلام قبول کر لیا۔ اس کی اعلیٰ فکری اور جسمانی صلاحیتوں کو پہچاننے کے بعد اس کا نام امبر رکھا گیا۔ اسے کئی مرتبہ بیچا گیا اور اس کی وجہ اسکی اعلیٰ جسمانی اور دماغی صلاحیتیں تھیں۔ اس کا عرب مالک اسے ہندوستان لے آیا جہاں اسے ایک سابقہ حبشی غلام چنگیز خان نے خرید لیا جو احمد نگر سلطنت کے وزیر اعلیٰ کی حیثیت سے خدمات سر انجام دے رہا تھا۔ آقا کے انتقال کے بعد ملک امبر کو اس کے آقا کی اہلیہ نے رہا کر دیا۔ آزاد ہونے کے بعد اس نے بیجاپور کے سلطان کی ریاست میں ملازمت شروع کر دی۔ اس کی قابلِ داد خدمات کے بدلے سلطان نے اسے "ملک" کا خطاب دیا۔ اس نے علاقے میں مغلوں کے بڑھتے ہوئے قدم روکنے میں بے حد اہم کردار ادا کیا۔ اس دوران اس نے ایک گھڑ سوار دستہ تیار کر لیا جس کی تعداد سات ہزار کے قریب تھی۔ ایک وقت آیا کہ اس کی فوج میں دس ہزار حبشی اور دکن کے چالیس ہزار لوگ شامل تھے۔ میرے لیے اتنی بڑی تعداد میں حبشی لوگوں کا ہندوستان میں موجود ہونا ایک اچنبھے کی بات ہے۔

ملک امبر نے اپنا دارالحکومت جنڈار سے کھڈ کی منتقل کیا جس کی بنیاد اس نے خود رکھی۔ ملک امبر کی وفات کے بعد اس کے بیٹے نے اپنے نام پر اس شہر کا نام فتح پور رکھا

جسے بعد میں شہنشاہ اورنگزیب نے اورنگ آباد میں تبدیل کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ ملک امبر دکن کے خطے میں گوریلا جنگ کا بانی ہے جس کی وجہ سے اس کی زندگی میں مغل اس علاقے پر قبضہ نہ کر سکے۔ اس کی موت کے بعد خلد آباد میں اس کا مقبرہ بنایا گیا۔

میرے علم کے مطابق ہندوستان میں کسی بھی مغل بادشاہ کے نام پر یہ واحد بڑا شہر ہے۔ اورنگ آباد اس شہر کا تیسرا نام تھا جو اب تک برقرار ہے۔ مغل سلطنت کے کمزور ہونے کے بعد اس علاقے پر ریاست حیدر آباد کے حکمرانوں نے قبضہ کر لیا۔ 1960ء میں یہ مہاراشٹرا کا حصہ بن گیا۔ اس شہر میں تیس فیصد سے زائد مسلمان آباد ہیں۔

Malik Amber of Ahmadnager, 1605-1627
Photo Credit: Public domain art, Courtesy Victoria and Albert Museum

دکن کا تاج محل: جسے اورنگزیب نے اپنی بیوی کی یاد میں بنوایا

بی بی کا مقبرہ اورنگ آباد، مہاراشٹرا میں واقع ہے۔ مغل بادشاہ اورنگزیب نے اسے 1660ء میں اپنی بیوی بانو بیگم کی یاد میں شروع کیا۔ یہ مقبرہ اورنگزیب کی والدہ ممتاز محل کے مقبرے تاج محل سے گہری مماثلت رکھتا ہے۔ اسی مماثلت کی وجہ سے اسے دکن کا تاج محل بھی کہا جاتا ہے۔ اس مقبرے کو عطااللہ معمار اور ہنسپت رائے انجینئر نے مل کر بنایا تھا۔ عطاء اللہ، تاج محل کے پرنسپل ڈیزائنر استاد احمد لاہوری کے بیٹے تھے۔ اورنگزیب کے بیٹے اعظم شاہ نے بعد میں اسے مکمل کیا۔

رات کافی بیت چکی تھی اور میں تصور ہی تصور میں اپنے آپ کو اس علاقے میں محسوس کر رہا تھا۔ جیسے جیسے میں کتاب میں اس علاقے کی تفصیلات پڑھتا جا رہا تھا ویسے ویسے میرا اورنگ آباد دیکھنے کا شوق بھی زیادہ ہو رہا تھا لیکن ایسا کوئی موقع میسر نہیں آیا تھا۔ میرے تمام ساتھی گہری نیند سو رہے تھے۔ مجھ پر بھی نیند غالب آ رہی تھی۔ میرے احساسات اور جذبات کے ساتھ ساتھ مجھ پر یہ حقیقت بھی واضح ہو رہی تھی کہ ہندوستان کے جن علاقوں میں مسلمان بزور طاقت داخل ہوئے ان کے اکثر شہروں میں مسلمانوں کی آبادی دس سے بیس فیصد کے درمیان ہے جب کہ جنوبی ہندوستان کے کئی شہر ایسے ہیں جہاں تیس سے چالیس فیصد مسلمان رہتے ہیں۔ یہ سب جان کر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ جن لوگوں نے بھی اسلام کی تبلیغ کا کام اپنے اخلاق اور کردار کی مدد سے کیا ان علاقوں میں بہت سے مقامی لوگ مسلمان ہوئے۔

Bibi Ka Maqbara mausoleum complex, near Aurangabad, Maharashtra, India.
Frederick M. Asher

انکلیشور: جس کے متعلق ایک خیال یہ بھی ہے کہ اسے ترکوں نے آباد کیا

انکلیشور، بھروچ سے دس کلومیٹر دور واقع ہے جو ہندوؤں اور جین مندروں کے لیے مشہور ہے۔ اس شہر میں کیمیکل بنانیوالے پانچ ہزار سے زائد کارخانے ہیں جس کی وجہ سے اسے ایشیاء کا سب سے بڑا انڈسٹریل سٹی ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ یہاں پر ایک گاؤں میں کچھ ایسے لوگ آباد ہیں جن کی وضع قطع سے اس بات کا قیاس کیا جاسکتا ہے کہ نسلی طور پر وہ ترک ہیں۔ محمود غزنوی نے 1025ء میں انکلیشور پر فتح حاصل کی تھی۔ مقامی زبان میں اس شہر کو ترک سور (ترکوں کے ذریعہ فتح کیا گیا) بولا جاتا ہے۔ یہ وہی دور ہے جب محمود غزنوی نے سومنات کے مندر پر حملہ کیا تھا۔ (جس کا تفصیلی ذکر آگے آئے گا) ۔ان شواہد کی بنیاد پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اُس دور میں چند ترک اس علاقے میں آباد ہو گئے تھے اور اب انکی نسل کے بہت سے لوگ یہاں آباد ہیں۔ ایک دلچسپ بات یہ سامنے آئی کہ زمانہ قدیم میں یونانیوں نے بھی اس علاقے پر قبضہ کرنا چاہا تھا۔ ان سب

سے لگتا ہے کہ یہ علاقے قدیم زمانوں سے ہی فاتحین کے لیے بے حد کشش رکھتے تھے۔اس علاقے میں موجود مسلم آبادی سے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ لوگ اسلام قبول کرنے سے پہلے اعلی ہندو براہمن ذات سے تعلق رکھتے تھے۔ (یہ سب قیاس آرائیاں ہی ہیں کیونکہ تاریخ کے اوراق میں ایسی کوئی مصدقہ چیز نہیں ملتی لیکن اکثر لوگوں کا خیال کچھ ایسا ہی ہے)۔

رات کے نو بج رہے تھے اور سب لوگ سونے کی تیاری کر رہے تھے۔ میں اس انتظار میں تھا کہ بھروچ (Bharuch) شہر دیکھ سکوں۔ یہاں ہماری گاڑی کا سٹاپ نہ ہونے کا مجھے بے حد افسوس تھا۔ بھروچ آٹھ ہزار سال پرانا شہر ہے۔ یہ ہندوستان کا دوسرا قدیم شہر ہے۔اس پر یونانی بھی قابض رہے ہیں۔یہی وہ شہر ہے جس کے راستے عرب، افریقی اور یورپی لوگ ہندوستان میں داخل ہوئے تھے۔ یہاں آٹھویں صدی عیسوی میں چوہدری نام کی ایک ریاست بھی کئی صدیوں تک قائم رہی۔اس سے مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ چوہدری صرف پنجابی کا لفظ نہیں ہے بلکہ یہ لفظ اور بھی کئی زبانوں میں استعمال ہوتا رہا ہے ۔

افریقی خاتون جس نے بھارت سے پی ایچ ڈی کی

اس سے پہلے کہ میں آپ کو بھارت کے ایک قدیم شہر، جہاں پر نہ صرف ہندوؤں کا ایک متبرک دریا بہتا ہے بلکہ اسے بھارت کا کیمیکلز کیپیٹل بھی کہا جاتا ہے کے بارے میں کچھ بتاؤں میں ایک چھوٹے سے واقعے کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔

جب ہم نے شام کے وقت ممبئی سے اپنے سفر کا آغاز کیا تو سب لوگوں کے پاس بیٹھنے کی جگہ تھی جن پر ہم بیٹھے ہوئے تھے۔ میرے سامنے والی سیٹوں پر ایک بھاری بھر کم افریقی خاتون جس کی عمر چالیس کے لگ بھگ ہوگی اپنے بہت زیادہ سازو سامان کے ساتھ تشریف فرما تھی۔جب تک ہم بیٹھے رہے ہمیں کوئی دقت نہ ہوئی لیکن جیسے ہی ہم

سونے کی تیاری کرنے لگے تو محسوس ہوا کہ اس خاتون کے سامان کی وجہ سے جگہ کم پڑ رہی ہے۔ ہم خاموش کھڑے سوچ رہے تھے کہ کیا کیا جائے؟ کچھ لوگوں نے اس خاتون سے کہا کہ آپ اپنے سامان کو تھوڑا سا سمیٹ لیں تاکہ ہم سونے کے لیے اپنی جگہ بنا سکیں۔ ہم ان سے انگلش میں بات کر رہے تھے۔ اتنی دیر میں ہمارے ساتھ کھڑے دو مقامی لوگوں نے ہندی میں ایک دوسرے سے بات کی اور اس افریقی عورت سے متعلق کچھ نازیبا الفاظ بھی کہے۔ یقیناً ان کا یہ خیال ہوگا کہ یہ خاتون ہندی زبان نہیں سمجھتی لیکن ان کا خیال غلط ثابت ہوا۔ جیسے ہی انھوں نے ہندی میں بات کی افریقی خاتون نے بھی ہندی زبان میں ان کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ ہمارے ہاں بھی جب کوئی کسی خاتون سے نامناسب سلوک کرے تو عام طور پر خواتین یہ کہتی ہیں کہ آپ کے گھر میں کوئی ماں بہن نہیں ہے؟ میں حیران ہوا کہ جب اس افریقی خاتون نے بھی یہی الفاظ کہے۔ جس سے لگا کہ بھارت اور پاکستان میں یہ قدر مشترک ہے۔ اب مقامی لوگوں کے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ خاموش رہتے۔

میں نے اس خاتون سے بات شروع کی تو مجھے معلوم ہوا کہ وہ افریقہ کے ایک بہت ہی پسماندہ ملک سے تعلق رکھتی ہیں۔ وہ بھارت میں پی ایچ ڈی کے لیے آئی تھیں اور اب پی ایچ ڈی مکمل کر کے واپس افریقہ جا رہی ہیں۔ اس کے سامان میں کتابوں کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ میں ان کے ساتھ کافی دیر تک باتیں کرتا رہا۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ ہم لوگوں کا ہندوستان اور افریقہ کے درمیان صدیوں سے آنا جانا ہے۔ خاص طور پر وہ ممالک جو انگریزوں کے ماتحت تھے وہاں ہندوستانی بہت بڑی تعداد میں رہتے تھے۔ انھی ہندوستانی لوگوں کے لیے مہاتما گاندھی نے ایک تحریک بھی چلائی تھی۔

خاتون نے مزید بتایا کہ بھارت کی حکومت ہمارے بہت سے طالب علموں کو اپنے ہاں یونیورسٹیوں میں داخلہ دیتی ہے اس وجہ سے افریقی ممالک میں ایک بڑی تعداد

بھارت سے تعلیم حاصل کر کے گئی ہے۔ مجھے یاد ہے کہ جب میں نے انھیں اپنا ای میل ایڈریس دیا تو انھوں نے کہا کہ ان کے ملک میں ابھی یہ سہولت موجود نہیں ہے۔ یہ بیس سال پرانی بات ہے اور امید ہے اب ایسا نہیں ہوگا۔

اس خاتون سے ملنے کے بعد مجھے یہ احساس ہو گیا تھا کہ اب افریقہ کے لوگ مزید پسماندہ نہیں رہنا چاہتے اور جلد از جلد اس پسماندگی سے نکلنا چاہتے ہیں اور اس کا واحد ذریعہ بنیادی تعلیم کے ساتھ ساتھ اعلیٰ تعلیم بھی ہے جس کے لیے اس خاتون نے تن تنہا بھارت کا سفر کیا اور کئی سال یہاں رہ کر تعلیم حاصل کی اور اب واپس جا رہی ہے۔

علم کے لیے سفر تو کرنا ہی پڑتا ہے یہ صدیوں پرانی روایت ہے،

اور یہی پائیدار ترقی کی ضمانت ہے۔۔۔ لیکن جسے سمجھ آ جائے۔۔۔

بھروچ: بھارت کا دوسرا قدیم شہر

بھروچ شہر اور اس کے گردونواح کے علاقے قدیم زمانے سے آباد ہیں۔ نیشنل انفرمیشن سنٹر انڈیا (nic.in) کے مطابق سمندر کے کنارے واقع ہونے کی وجہ سے اس شہر میں بحری جہاز بنائے جاتے تھے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ فرعونوں کے دور میں بھی یہ علاقہ آباد تھا اور یہاں مصر سے بھی لوگ آتے تھے۔ یہ شہر صدیوں تک مصالحہ جات اور ریشم کی تجارت کا مرکز رہا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی اہم ہے کہ یہ شہر بھارت کے ان علاقوں میں شمار ہوتا ہے جہاں یونانیوں، ایرانیوں ، رومیوں، سلاطین دلی اور مغل حکمرانوں کے علاوہ یورپی لوگوں نے بھی حکومت کی ہے۔ یہ سب کچھ اس علاقے کا ایک اہم تجارتی مقام ہونے کے ساتھ ساتھ ساحل سمندر پر واقع ہونے کی وجہ سے تھا۔ اسلام سے قبل بھی عرب اس علاقے میں تجارت کی غرض سے آتے تھے۔

یہ تیسری صدی کی بات ہے۔ تاریخ سے یہ ثابت ہے کہ عرب تاجر بھروچ کے راستے گجرات میں داخل ہوئے تھے۔ تجارت کے لیے ایک موزوں علاقہ ہونے کی وجہ سے انگریزوں اور ڈچ نے بھی یہاں اپنے کاروباری مراکز قائم کیے۔

ایس گجرانی کی کتاب **History, Religion and Culture of India** میں یہ لکھا ہوا ہے (صفحہ 166) کی یہ شہر دوہزار سال سے بھی زیادہ پرانا ہے۔ وہ مزید لکھتے ہیں کہ (صفحہ 192) کہ ایک وقت تھا جب گجرات میں پچاس سے زائد بندرگاہیں تھیں اور بھروچ ان میں سب سے اہم تھی۔ یہاں سالانہ چار ہزار تجارتی جہاز آتے تھے۔

ہم پنجابی زبان میں چوہدری کا لفظ کسی کو عزت دینے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ میرے خیال میں یہ ایک پنجابی کا لفظ تھا لیکن تاریخ سے معلوم ہوا کہ آٹھویں صدی میں بھروچ قصبے پر میوور نام کا ایک راجہ حکومت کرتا تھا جس کی ریاست کا نام چوہدری تھا۔ اس بادشاہ نے پچاس سال تک اس شہر پر حکمرانی کی اسے بھروچ کا نہایت ہی قابل اور رحمدل حکمران مانا جاتا تھا۔ علاقے کے لوگ اب بھی اس کا نام بے حد احترام سے لیتے ہیں۔

چارو چوہدری نے Bharuch: A Heritage Tour of One of Gujarat's Most Ancient Cities With a 2000-year-old history, every nook and corner of Bharuch tells a story. کے نام سے ایک مضمون لکھا ہے۔ اس مضمون کا خلاصہ پیش خدمت ہے[40]۔

[40] https://www.india.com/travel/articles/bharuch-a-heritage-tour-of-one-of-gujarats-most-ancient-cities-3665345/

چوہدری کا لفظ سنسکرت کے کٹور دھارا سے نکلا ہوا ہے۔ جس کا مطلب وہ شخص ہے جس کے پاس چار اختیارات ہوں، جیسے دولت، زمین، طاقت اور کسی کنبے کی سربراہی۔ عام طور پر یہ لفظ کسی طبقے یا ذات کے سربراہ کے لیے بولا جاتا ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ مغلیہ دور میں ممتاز افراد جن میں مسلمان اور ہندو دونوں شامل تھے کو یہ لقب دیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ فوجی کمانڈر کے لیے بھی اس نام کو استعمال کیا جاتا تھا جیسے گھڑ سوار، بحریہ، پیادہ اور ہاتھی مہاوت وغیرہ۔ ہندوستان میں بہت کم ایسے شہر ہیں جن کے ایک سے زیادہ نام ہیں۔ بھروچ ایک ایسا شہر ہے جس کے آٹھ مختلف نام ہیں۔ جس نے بھی اس علاقے پر حکمرانی کی اس نے اس کا نام بدل دیا۔

قبل مسیح میں یہ شہر دیوی لکشمی کی رہائش گاہ کے طور پر جانا جاتا تھا۔ یونانیوں نے اس کا نام اپنی زبان میں رکھا جس کا مطلب "گہرا خزانہ" تھا۔ بعدازاں مسلم حکمرانی کے تحت 'بھروچ'، مراٹھا حکمرانی کے تحت 'بھڑوچ'، اور برطانوی حکمرانی کے تحت 'بروچ' کے نام سے جانا جاتا تھا۔ البتہ اب اس کا نام بھروچ ہی لکھا جاتا ہے۔ ہندو روایات کے مطابق بھروچ دیوی لکشمی کی رہائش گاہ تھی۔ ہندوؤں کے نزدیک یہ شہر ایک خاص مذہبی مقام رکھتا ہے۔ اس علاقے میں بہنے والا دریائے نرمد ہندوؤں کے سات مقدس دریاؤں میں سے ایک ہے۔ ہندو یہ سمجھتے ہیں کہ ان سات دریاؤں میں سے کسی میں بھی نہانا ان کے

گناہوں کو دھو ڈالتا ہے۔ کچھ لوگوں کے نزدیک دریائے نرمدا دریائے گنگا سے بھی پرانا ہے۔
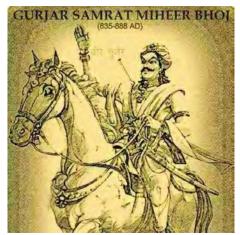
Photo Credit: https://www.google.com/imgres

An old building in Bhauch Photo Credit:
https://en.wikipedia.org/wiki/Bharuch

جین اور بھروچ

چارو چوہدری مزید لکھتے ہیں کہ بھروچ جینوں کیلیے بھی ایک مقدس مقام کی حیثیت رکھتا ہے۔اس شہر میں تیرتھا (جینوں کا مقدس مقام) واقع ہے۔ یہ شہر جین مذہب کی تاریخ اور قدیم ہونے کے ساتھ ساتھ متعدد نقطۂ نظر سے اہم ہے۔ان کے گرو گوتما سوامی نے بھی اس شہر کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ بھروچ میں قدیم زمانے کے مندروں کے آثار بھی پائے جاتے ہیں۔ یہاں پر موجود ایک بڑی جامع مسجد سے متعلق مقامی ہندوؤں اور جین کا دعویٰ ہے کہ یہاں بھی کبھی مندر تھا لیکن بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ یہ بات درست نہیں ہے۔اس کے علاوہ بدھ مت کے مذہبی مقامات کے آثار بھی یہاں موجود ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بھروچ ساتویں صدی میں بدھ مت کا ایک اہم مرکز رہا ہے۔

بھروچ تاریخ کے آئینے میں

بھروچ گجرات کا قدیم ترین شہر ہے۔ ہندوستان کا قدیم ترین شہر بنارس ہے جس کے بعد بھروچ کا نام آتا ہے۔ بھروچ میں بہت سارے بادشاہوں کا راج رہا ہے۔ چندر گپت موریا خاندان، چنگیز خان اور مغل بادشاہ ہمایوں نے بھی اس شہر پر حکومت کی۔آخر میں اس علاقے پر انگریزوں نے اپنی اجارہ داری قائم کی۔

چارو چوہدری کے مطابق بھروچ میں واقع گولڈن برج انگریزوں نے 1881ء میں تعمیر کروایا تاکہ دریائے نرمدا کے پار بمبئی تک تاجروں اور انتظامیہ کی رسائی کو بہتر بنایا جاسکے۔ یہ پل ایک خاص لوہے سے تعمیر کیا گیا۔اس لیے اس کی تعمیر میں بہت زیادہ لاگت آئی۔اسی وجہ سے اسے گولڈن برج بھی کہا جاتا ہے۔ یہاں پر ایک "سنہری محل" نام کی عمارت بھی ہے جو ایک ہزار سال پرانی ہے۔ اس شہر میں ایک

گردوارہ بھی موجود ہے جو پندرہویں صدی میں پہلے سکھ گرو، گرو نانک دیو کی بھروچ آمد کی یاد میں بنایا گیا تھا۔اس کے بارے میں ایک دلچسپ بات مشہور ہے کہ جب کوئی کشتی والا مسافروں کو نرمدا دریا کے پار لے جانے سے انکار کرتا تو وہ کپڑے کی چادر پر سوار ہوتا اور دریا پار کر جاتا۔اسی وجہ سے اس گردوارے کا نام گرودوارہ چادر صاحب ہے۔

بھروچ میں مسلمانوں کے دور کی بھی کئی عمارتیں موجود ہیں جن میں عیدگاہ، جامع مسجد اور مدرسہ، مسجد کٹپوور بازار قابلِ ذکر ہیں۔ بھروچ میں گجرات کی ایک قدیم ترین لائبریری بھی ہے جو 1858ء میں تعمیر کی گئی۔ میں نے یہاں پر واقع جامع مسجد جسے پتھروں والی مسجد بھی کہا جاتا ہے کی ایک ویڈیو دیکھی تو مجھے معلوم ہوا کہ یہ مسجد ایک شاہکار سے کم نہیں ہے۔ میں تاریخ میں دلچسپی رکھنے والوں سے یہ ضرور کہوں گا کہ وہ اس شہر کی تاریخ کا مطالعہ ضرور کریں۔

ایک دلچسپ بات یہ بھی ہے کہ اندرا گاندھی کے خاوند فیروز گاندھی جو کہ ایک پارسی تھا کا تعلق بھی اسی شہر سے تھا۔ اس طرح یہ شہر اندرا گاندھی کا سسرال بھی شمار ہوتا ہے۔ گجرات اسٹیٹ کا جی ڈی پی دو سو بلین ڈالر ہے جس میں بھروچ کا حصہ قابلِ ذکر ہے۔اس شہر کی آبادی تقریباً دو لاکھ ہے۔ کوشش کے باوجود مجھے مسلمانوں کی تعداد کا علم نہ ہو سکا۔

اٹھارویں صدی میں یہاں مسلمانوں کی حکومت تھی۔ انگریزوں نے اس ریاست پر قبضہ کر لیا اور 1772ء میں اسے برٹش انڈیا کا حصہ بنا لیا۔

جب ہم بھروچ سے گزر رہے تھے تو ٹرین میں شام کا کھانا دیا جا رہا تھا۔ حسب معمول سب لوگوں نے اپنی پسند کا کھانا کھایا۔ افریقی خاتون نے بھی تعاون کیا اور یوں سب کے سونے کی جگہ کا انتظام ہو گیا۔ میں ہندوستان کی تاریخ والی کتاب میں پڑھ چکا تھا کہ آگے ایک اور اہم شہر بھی آ رہا ہے وادودارا (Vadwdara) جس کا پرانا نام بڑودا ہے

بھی ہے، آرہا ہے اور وہاں ہماری گاڑی کا سٹاپ بھی ہے۔ وہاں مجھے سومنات کے مندر میں پوجا کرکے آنے والے لوگوں سے ملنے کا اتفاق ہوگا اور میں ان سے سومنات کے بارے میں بھی جان سکوں گا۔

بروڈترا جس کا پرانا نام بڑودا بھی ہے

رات نو بجے کے قریب ہماری ٹرین بروڈترا ریلوے سٹیشن پر پہنچی۔ سب لوگ سونے کی تیاری کر رہے تھے لیکن میں اس شہر کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے پلیٹ فارم پر اترا۔ میں نے دیکھا کہ وہاں ایک خاص وضع قطع والے بہت سے لوگ موجود تھے۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ یہ سب لوگ کسی مندر میں پوجا کرکے آئے ہیں۔ مجھے ایک دلچسپ منظر اب بھی یاد ہے۔ میں نے دیکھا کہ ایک بیس بائیس سال کا نوجوان ایک دکاندار سے بحث کر رہا تھا۔ اتنے میں ایک بڑی عمر کے صاحب بھی آ گئے جو اس نوجوان کے ساتھی تھے اور وہ بھی بحث میں شریک ہو گئے۔ جب بات آگے بڑھنے لگی تو بڑی عمر کے صاحب نے دکان دار سے کہا کہ دیکھو ہم فلاں مندر میں بھگوان کے درشن کرکے آئے ہیں اسی لیے ہم آپ سے غلط بیانی نہیں کر رہے اور نہ ہی آپ سے کوئی جھگڑا کرنا چاہتے ہیں۔ اتنا سن کر دکان دار نے معذرت کی اور معاملہ رفع دفع ہو گیا۔

اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ یہ اسی طرح کی بات ہے جیسے ہمارے ہاں کوئی کہے کہ میں حج کرکے آیا ہوں اور غلط بات نہیں کروں گا۔ کوئی بھی ہو ہندو یا مسلمان مذہب ہم سب کی زندگی میں ایک اہم کردار ادا کرتا ہے۔

بروڈترا ریلوے سٹیشن گجرات کا مرکزی سٹیشن ہے۔ ٹرینوں کی تعداد کے لحاظ سے یہ ہندوستان کا نواں مصروف ترین ریلوے سٹیشن ہے۔ یہ سٹیشن 1861ء میں بنایا گیا جس کی تعمیر کا سہرا اس وقت کے گائیکواڈ حکمران مہاراجہ کھنڈراؤ کے سر ہے۔ اب تک میں نے جو بھی سٹیشن دیکھے ہیں ان میں یہ واحد سٹیشن ہے جس سے متعلق یہ کہا جاتا ہے

کہ اسے مقامی راجہ نے بنوایا تھا۔ ہم آئندہ صفحات میں مزید جان سکیں گے کہ کس طرح راؤ خاندان نے علاقے کی تعلیمی اور معاشی ترقی کے لیے کام لیے۔

انیرودھ سیٹھی نے اپنی کتاب Royal Family of Baroda: Gaekwad's میں لکھا ہے (باب اول) کہ دوسری صدی عیسویں میں یہاں کے راجپوت راجہ چندن کے نام پر اس شہر کا نام چندن وتی بھی تھا۔ وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ بارہویں صدی میں یہ شہر تجارت کا مرکز تھا۔ ان کی لکھی ہوئی تحریر کا خلاصہ پیش خدمت ہے۔

بروڈترا جسے پہلے بڑودا کے نام سے بھی جانا جاتا تھا، ریاست گجرات کا تیسرا سب سے بڑا شہر ہے۔ یہ بروڈترا ضلع کا انتظامی صدر مقام بھی ہے، یہ ریاست گاندھی نگر سے 141 کلومیٹر دور دریائے وشامیتری کے کنارے واقع ہے۔ اس شہر میں بوہڑ (برگد) کا درخت کثیر تعداد میں پایا جاتا ہے جس کی وجہ سے اس شہر کا نام بروڈترا ہے۔ اس شہر کو بھارت کا آرٹ کا شہر بھی کہا جاتا ہے۔ اس شہر میں واقع لکشمی محل اپنی مثال آپ ہے۔

پیلاجی راؤ گائیکواڈ ایک مراٹھا جنرل تھا جسے مراٹھا سلطنت کے گائیکواڈ خاندان کا بانی سمجھا جاتا ہے۔ یہ خاندان بعد میں بڑودا کا مہاراجہ بن گیا۔ پیلاجی راؤ کا ایک بھائی جو مغل فوج میں جرنیل تھا اور وہ اس علاقے میں مغلوں کا نامزد گورنر بھی تھا وہ ایک جنگ میں مارا گیا۔ بعد ازاں اس کے بیٹے نے دوبارہ اقتدار حاصل کر لیا اور پیشوا بالاجی راؤ کے ساتھ ایک زبردست جنگ لڑی جس میں اسے شکست ہوئی۔ یہ بھی ایک عجیب بات ہے کہ جنگ جیتنے کے باوجود پیشوا نے اسے گجرات میں مراٹھا ریاست کا چیف مقرر کیا۔ اس خاندان نے بڑودا پر اٹھارہویں صدی کے اوائل سے 1947ء تک حکومت کی۔ انھیں بڑودا کے مہاراجہ گائیکواڈ کے نام سے جانا جاتا تھا۔ بعد ازاں اس ریاست نے انگریزوں کے

ساتھ الحاق کر لیا اور یوں یہ ریاست انگریزوں کی ایک طفیلی ریاست بن گئی۔ برطانوی دورِ حکومت میں اس ریاست کا انتظام بڑودا ریذیڈنسی کے پاس تھا۔

ایک تاریخی حقیقت ہے کہ یہ ریاست ہندوستان کی سب سے بڑی اور دولت مند ریاستوں میں سے ایک تھی۔ اس علاقے میں کپاس کے ساتھ ساتھ چاول، گندم اور گنا بھی بڑی مقدار میں پیدا ہوتا تھا۔ اس علاقے کے راؤ خاندان کے حکمرانوں نے کئی مراٹھا سرداروں کے ساتھ مل کر پہلی اینگلو مراٹھا جنگ میں انگریزوں کا مقابلہ کیا، آخر کار اس ریاست کے راجہ نے انگریزوں سے ایک معاہدہ کیا اور اپنی ریاست بچانے میں کامیاب ہوئے۔

ایک اور بات کا ذکر بھی ہمیں کتابوں میں ملتا ہے جس کے اثرات آج تک اس علاقے میں پائے جاتے ہیں۔ وہ مہاراجہ سیاجی راؤ سوئم کے دور میں بڑودا کو جدید بنانے کا کام ہے۔ میرے علم کے مطابق ہندوستان کا یہ واحد راجہ ہے جس نے سب کے لیے لازمی پرائمری تعلیم کا حکم دیا۔ وسیع پیمانے پر لائبریری کا نظام بنایا اور مہاراجہ سیاجی راؤ یونیورسٹی آف بڑودا کی بنیاد رکھی۔ ریاست کو معاشی طور پر مضبوط بنانے کے لیے انھوں نے ٹیکسٹائل فیکٹریوں کے قیام کی بھی حوصلہ افزائی کی۔ اسی وجہ سے آج یہ علاقہ ٹیکسٹائل انڈسٹری کا گڑھ سمجھا جاتا ہے۔ اس وجہ سے علاقے کی معاشی ترقی میں بے حد اضافہ ہوا۔

اس ریاست نے بھارت کے ایک مشہور سیاسی و سماجی رہنما بی آر امبیڈکر کو کولمبیا یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرنے کیلیے مالی امداد بھی دی تھی۔ بروڈترا میں واقع یونیورسٹی کی ابتداء 1881ء میں بڑودا کالج سے ہوئی اس وقت کے بڑودا ریاست کے راجہ نے اسے قائم کیا تھا۔ اس کی تعمیر میں مقامی طرزِ تعمیر کو اہمیت دی گئی ہے۔ بڑودا کے پرتاپ سنگھ گائیکواڈ جو بڑودا ریاست کے آخری مہاراجہ تھے نے اپنے دادا، مہاراجہ

سیاجی راؤ گائیکواڑ کی خواہش پر 1949ء میں یونیورسٹی کی بنیاد رکھی۔ یہ اس ریاست کے راؤ خاندان کی علم دوستی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

ہندوستان کو آزادی ملنے پر بڑودا کے آخری حکمران مہاراجہ پرتاپ سنہا راؤ نے ہندوستان کے ساتھ الحاق کر لیا۔ بعدازاں اسے بمبئی اسٹیٹ میں ضم کر دیا گیا۔ 1960ء کی دہائی میں بمبئی اسٹیٹ کو لسانی بنیادوں پر تقسیم کیا گیا۔ اس طرح گجرات اور مہاراشٹرا کی ریاستوں کا وجود عمل میں آیا اور یہ علاقے گجرات کا حصہ بنا دیے گئے۔ گائیکواڑ کا لفظ عام طور پر مراٹھا لوگوں کی کنیت کے طور پر بولا جاتا ہے۔ یہ لوگ زیادہ تر بھارت کی ریاست مہاراشٹرا میں پائے جاتے ہیں۔

انیرودھ سیٹھی نے لکھا ہے کہ سلطان محمود نے 1511ء میں اس شہر کی چار دیواری بنوائی تھی اور اس شہر کا نام دولت آباد رکھا تھا۔ سلطان محمود شاہ عرف بیگاڈا کے ذکر کے بغیر گجرات کے علاقے کی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی۔

سلطان محمود شاہ پندرھویں صدی کے آخر میں گجرات سلطنت کے سب سے ممتاز سلطان تھے۔ اسے کم عمری میں ہی تخت پر بٹھا دیا گیا۔ اس نے اپنے دور میں پاواگڑھ اور جوناگڑھ کے قلعوں کو کامیابی سے فتح کیا جو کہ ایک بڑا کارنامہ تھا۔ اس نے چمپانیر کو دارالحکومت بنایا۔ ہندو اسے دوارکا میں واقع درکدھیش مندر کی تباہی کا ذمہ دار ہی سمجھتے ہیں۔ ان کی ماں کا نام مغلی بی بی تھا۔ میں نے ان سے متعلق جتنا پڑھا اس سے مجھے یوں محسوس ہوا کہ اس علاقے کی سیاست پر سندھ کے لوگوں کا بے حد عمل دخل ہے۔ محمود شاہ کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ بہت ہی خوش خوراک تھا۔

سلطان محمود کے متعلق سلیندرا ناتھ شاہ نے اپنی کتاب A Textbook of Medieval Indian History میں لکھا ہے کہ سلطان محمود کو پرتگالیوں کے خلاف بحری جنگ کی قیادت کرنے کے اعتبار سے بھی جانا جاتا ہے۔ پرتگیزیوں کے ساتھ بحری

جنگ سلطان محمود شاہ کے دور کا اہم ترین واقعہ ہے۔ پرتگالی اور واسکو ڈے گاما 1498ء میں پہلی مرتبہ ہندوستان کی طرف گئے۔ انھوں نے 1505ء میں وہاں اپنی نوآبادیات قائم کیں۔ ان کے سربراہ کو بھی وائسرائے آف انڈیا ہی کہا جاتا تھا۔ جو بھی آیا وائسرائے یا شہنشاہ بن کر ہی ہندوستان آیا۔

پرتگیزی اپنے مفتوحہ علاقوں کو گجرات تک بڑھانا چاہتے تھے۔ ان کے نزدیک ایسا کرنا ہندوستان اور مغرب کے مابین تجارت کیلیے بہت اہم تھا۔ اس کام کے لیے وہ دیو بندرگاہ کو فتح کرنا چاہتے تھے جو سلطان محمود شاہ کے کنٹرول میں تھی۔ سلطان نے ایشیاء، افریقہ اور یورپ کے مسلمان سربراہوں کو مدد کیلیے بلایا۔ اس کام کے لیے انھوں نے سلطنت عثمانیہ اور مصر کے سلطان سے بھی رابطہ کیا لیکن کوئی بھی ان کی مدد کو نہ پہنچا۔ ایسا ہی سلطان ٹیپو نے بھی کیا تھا لیکن کچھ حاصل نہ ہوا۔ اس کے مقابلے میں پرتگیزیوں کے لیے کئی ملکوں سے امداد پہنچ گئی۔ ایک سخت جنگ ہوئی۔ جنگ کے نتیجے میں سلطان محمود شاہ کو شکست ہوئی۔ اور یوں ایک اہم بندرگاہ پر غیر ملکیوں کا قبضہ ہو گیا۔ اس جنگ میں مقامی ہندو اور مسلمان ریاستوں کے والیان نے باہمی اختلافات کو فراموش نہ کیا اور سلطان نے تن تنہا جنگ کی اور شکست سے دوچار ہوا۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت کے مسلمان حکمرانوں کے پاس بھی بحری فوج موجود تھی۔

تحریک آزادی ہند میں یہاں کے ایک قبیلہ جس کا نام کولی تھا نے بغاوت میں حصہ لیا۔ اس کا ذکر گجرات گزٹ میں کیا گیا ہے[41]۔ اس کی قیادت مقامی دو بھائیوں ناتھاجی اور یاماجی نے کی تھی۔ جنہیں مارنے کے لیے گائیکواڑ آف بڑودہ نے اپنی گھڑسوار فوج کو بھیجا تھا۔ گائیکواڈ کے گھڑسواروں کو کولیوں نے مار دیا اور خود کولیس پہاڑیوں میں چلے گئے۔

Gujarat (India) (1975). Gujarat State Gazetteers: Mehsana. Directorate of Government Print., Stationery and Publications, Gujarat State. [41]

پھر وہی ہوا جو ہر راجہ نے کیا۔ گائیکواڑ آف بڑودہ نے انگریزوں کی مدد لے کر اس تحریک کو کچل دیا اور ان کولیوں کے گاؤں کو جلا کر راکھ دیا اور بے شمار آزدی کے متوالوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔

کولی مر تو گئے لیکن امر ہو گئے۔۔۔ اب بھی ان کی بہادری کے قصے عام ہیں اور عام رہیں گے !

گجرات کی تاریخ پڑھنے کے لیے ایک کتاب جو جیمز مکنیب کیمپبل نے 1896ء میں Title: History of Gujarát Gazetteer of the Bombay Presidency, Volume I, Part I. کے نام سے لکھی تھی۔ اب یہ کتاب نیٹ پر موجود ہے بے حد مفید ہے۔ اس کتاب سے مجھے یہ پتہ چلا کہ گجرات پر حملہ شاہجہاں سے بھی پہلے 1535ء ہمایوں نے کیا تھا۔ اس نے یہاں کے راجہ بہادر کو شکشت دے کر اس علاقہ پر قبضہ کیا لیکن یہ قبضہ زیادہ دیر تک برقرار نہ رہ سکا۔ بعد میں اکبر نے 1573ء میں گجرات کے پیشتر علاقے اپنے قبضہ میں لے لیے۔

Baroda University Photo Credit:
https://previews.agefotostock.com

The Lukshmi Villas Palace in Vadodara is four times the size of the Buckingham Palace.
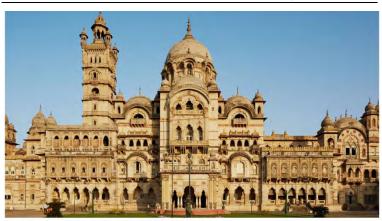
Biggest Personal Residence in the World Photo Credit: https://www.architecturaldigest.in

اس علاقے میں ایک نئے نظریہ نے جنم لیا جس کے مطابق مذہب کی کوئی اہمیت نہیں اور اصل چیز صرف روحانیت ہے۔ اس تحریک کا نام اکرم ویگنان تحریک ہے ۔ یہ تحریک 1960ء کی دہائی میں گجرات سے شروع ہوئی۔ بروڈترا شہر میں ان کا ایک مندر بھی موجود ہے جسے وہ غیر مذہبی مندر کہتے ہیں۔ اس تحریک کی بنیاد دادا بھگوان نے رکھی جو بعد میں مہاراشٹر ا اور گجرات کے کئی علاقوں تک پھیل گئی۔

میں نے ان کے بارے میں جو پڑھا اسکے مطابق دادا بھگوان 1908ء میں بروڈترا میں پیدا ہوئے اور 1988ء میں ان کی موت ہوتی ہے۔ انھیں داداشری بھی کہا جاتا ہے۔ میں نے ان کی گفتگو سنی ہے۔ بے حد متاثر کرنے والی گفتگو ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ کئی کتابوں کے مصنف بھی ہیں۔ ان کی کتابیں انفرادی اصلاح کے لیے کافی مفید سمجھی جاتی ہیں۔

بروڈترا کے ریلوے سٹیشن سے بہت سے لوگ سوار ہوئے جو سومناتھ کے مندر میں پوجا کر کے آئے تھے۔ میں نے ایک دو لوگوں سے سومناتھ کے مندر کے

بارے میں چند معلومات حاصل کرنا چاہیں جس کے لیے وہ تیار ہو گئے۔ پاکستان میں ہم محمود غزنوی کی وجہ سے سومناتھ کے مندر سے واقف ہوئے ۔ تاریخ میں غزنوی کو سومناتھ کے مندر میں بتوں کو توڑنے والے بت شکن اور ہیرو کے طور پر متعارف کروایا گیا ہے۔اس لیے میں اس مندر کے بارے میں بہت کچھ جاننا چاہتا تھااور مجھے لگ رہا تھا کہ میری یہ خواہش پوری ہونے جارہی ہے۔

سومناتھ اور محمود غزنوی

ہماری تاریخی کتابوں میں اس مندر کا نام سومنات لکھا ہوا ہے جبکہ اس کا صحیح نام سومناتھ ہے۔ اس کی تاریخ سے پہلے میں آپ کو محمود غزنوی کے بارے میں کچھ بتانا چاہتا ہوں۔ یاد رہے یہ ایک ہزار سال پرانا واقعہ ہے۔ اس واقعہ سے متعلق اتنی متضاد باتیں پائی جاتی ہیں کہ درست بات جاننا نہایت مشکل کام ہے لیکن اس کے باوجود کچھ ایسی باتیں ہیں جن پر عمومی اتفاق پایا جاتا ہے میں ان کا تذکرہ کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔

برٹانیکا انسائکلوپیڈیا کے مطابق[42] محمود غزنوی 2 نومبر 971ء کو موجودہ افغانستان کے علاقے غزنی میں پیدا ہوا تھا۔اس کے والد سبکتگین ایک ترک غلام کمانڈر تھے جنہوں نے 977ء میں غزنی میں سلطنت غزنوی کی بنیاد رکھی ۔ محمود کی ابتدائی زندگی کے بارے میں تاریخی کتب میں زیادہ معلومات موجود نہیں ہیں۔ محمود غزنوی اپنے والد کی وفات کے بعد موجودہ افغانستان اور اس کے ارد گرد واقع علاقوں میں قائم غزنی سلطنت کا حکمران بنا۔ اسوقت یہ ریاست بہت ہی مختصر تھی ۔ محمود غزنوی نے ریاست کو بے حد وسعت دی۔اس نے 999ء سے 1030ء تک حکومت کی۔اس کی

[42] https://www.britannica.com/biography/Mahmud-king-of-Ghazna

سلطنت ہندوستان کے شمالی علاقہ جات، شمال مغربی ایران، وسط ایشیاء اور مکران تک پھیلی ہوئی تھی جس کا دارالحکومت غزنی تھا جو اسلامی دنیا میں ایک اہم ثقافتی، تجارتی اور فکری مرکز کی حیثیت رکھتا تھا۔ اُس وقت یہ شہر بغداد کا ہم پلہ مانا جاتا تھا۔ محمود غزنوی کے دربار سے البیرونی اور فردوسی جیسی شخصیات بھی وابستہ تھیں۔

محمد ناظم نے اپنی کتاب The Life and Times of Sultan Mahmud of Ghazna جو پہلی مرتبہ 1931ء میں شائع ہوئی جس کا دیباچہ سر تھامس آرنلڈ نے لکھا ہے میں محمود غزنوی کے حالات کافی تفصیل سے لکھے ہیں۔ میں نے اس کتاب میں جو پڑھا اس کا خلاصہ پیش خدمت ہے۔

محمد ناظم کے مطابق وہ ایک چھوٹے علاقے کا حکمران تھا لیکن اس نے خود کے لیے سلطان کا لقب پسند کیا۔ اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے سترہ بار ہندوستان پر حملہ کیا اور امیر شہروں اور مندروں سے بہت سی دولت اکٹھی کر کے غزنی لے کر آیا۔ اس کا سب سے مشہور حملہ سومناتھ کے مندر پر تھا۔ یاد رہے اس نے اکتیس سال حکومت کی جس میں اس نے سترہ بار صرف ہندوستان پر حملہ کیا اور اس کے علاوہ ایران اور وسطی ایشیاء پر بھی متعدد حملے کیے۔ محمود غزنوی کی سندھ کے جاٹوں کے ساتھ جنگ بھی ایک اہم واقعہ ہے جس میں پہلے جاٹوں نے اسے بے حد نقصان پہنچایا لیکن دوسری جنگ میں اس نے جاٹوں کو شکست دی۔

تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ محمود غزنوی اکثر پشاور کے راستے ہندوستان آتا تھا۔ اس طرح غزنی سے سومناتھ تک کا سفر کرنا دو ہزار کلومیٹر سے بھی زیادہ بنتا ہے۔ یاد رہے غزنی سے ہندوستان آنے کے کئی راستے تھے۔ ایک راستہ، غزنی سے کابل اور جلال آباد سے ہوتے ہوئے پشاور، راولپنڈی، گجرات، لاہور اور پھر دلی۔ دوسرا راستہ غزنی سے گردیز، ہنگو، کوہاٹ، پنڈی گیپ، کلر کہار، بھیرہ اور پھر لاہور۔ تیسرا راستہ، غزنی سے ڈیرہ

اسماعیل خان، بھکر، لیہ، ملتان اور پاکپتن سے ہوتا ہوا دلی۔ افغانستان سے آنے والے لوگوں نے یہ تینوں راستے اختیار کیے۔ کچھ نے تو بنوں، کالا باغ، میانوالی اور خوشاب کا راستہ بھی اختیار کیا۔

اگر آپ بھارت کا نقشہ دیکھیں تو آپ کو معلوم ہو گا کہ سومناتھ کا مندر جوناگڑھ میں واقع ہے اور یہ علاقہ پاکستان میں تھر کے علاقے کے پاس ہے۔ تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ محمود غزنوی سومناتھ کے مندر سے کثیر مقدار میں مال و دولت سمیٹ کر اسی راستے سے ملتان آیا تھا۔ دریائے سندھ کے آس پاس جاٹ قوم آباد تھی۔ جاٹوں نے محمود غزنوی پر حملہ کیا اور اسے کافی نقصان پہنچایا۔ بعدازاں محمود غزنوی نے جاٹوں پر دوبارہ حملہ کیا اور انھیں سندھ کے زیریں علاقوں سے شمال کی طرف جانے پر مجبور کر دیا۔

میرے علم کے مطابق یہ وہی دور ہے جب جاٹ قبیلے کے لوگ سندھ سے شمالی ہندوستان آئے۔ اگرچہ جاٹوں کے پاس محمود سے بڑا بیڑا تھا لیکن محمود غزنوی کے پاس آگ لگانے والا کیمیکل تھا جس کی مدد سے اس نے جاٹوں کے بیڑے کو دھماکے سے اڑا دیا۔

اس کے علاوہ محمود غزنوی نے ناگر کوٹ، تھانیسر، قنوج اور گوالیار کی ہندوستانی ریاستوں کو بھی فتح کیا۔ محمود غزنوی نے ایک اہم کام یہ سر انجام دیا کہ اس نے مقامی لوگوں کو اپنی فوج میں شامل کرنے کو ترجیح دی۔ محمود غزنوی کبھی بھی شمال مغربی برصغیر میں مستقل طور پر موجود نہیں رہا۔ اس کی کیا وجہ تھی؟ شاید یہ اس کی اپنی اصل ریاست کو بچانے کی حکمت عملی کا ایک حصہ تھا۔ اس کی توجہ ہندوؤں کے مندروں اور یادگاروں کو ختم کرنے پر مرکوز رہی۔

ہندوؤں کے نزدیک وہ ایک بہت ہی ظالم شخص تھا جس نے ان کے بے شمار مندر تباہ کیے۔ میرے علم کے مطابق اسلام کسی بھی قوم کی عبادت گاہ کو تباہ کرنے کی

اجازت نہیں دیتا۔ یہ سب جان کر میں یہ ضرور کہوں گا کہ یہ سب لوگ، غزنوی، غوری، مغل، ابدالی، ترک یا کوئی اور مسلمان حملہ آور اسلام کی ترویج کے لیے ہندوستان نہیں آئے۔ یہ سب لوگ اپنی ریاست کو وسیع کرنے، مال و دولت سمیٹنے اوراپنی طاقت کے اظہار کے لیے ہندوستان آئے۔ ان کا مقصد کبھی بھی اسلام کی اشاعت نہیں تھا۔ یہ بھی بات اہم ہے کہ ان میں سے کچھ لوگ اپنے اچھے اخلاق کی بناء پر اسلام کی اشاعت میں معاون ضرور ثابت ہوئے ہیں۔ دین کے پھیلاؤ میں صوفیاء کا کردار سب سے اہم ہے۔ یہ میری رائے ہیں۔ اختلاف کا حق سب کو ہے۔

سومناتھ : ہندوؤں کاایک مقدس اور قدیمی مندر

سومناتھ کا مندر گجرات کے مغربی ساحل پر سوراشٹر میں ویراول کے قریب وا قع ہے۔ یہ علاقہ کبھی ریاست جوناگڑھ کا حصہ تھا۔ اس مندر کے بارے میں یہ خیال کیا جاتا ہے کہ شیو کے بارہ مندروں میں سے پہلا مندر ہے۔ یہ گجرات کاایک اہم سیاحتی و مذہبی مقام ہے۔ متعدد حملہ آوروں اور حکمرانوں کے اسے بار بار تباہ کرنے کے باوجود ماضی میں متعدد باراس کی تعمیرِ نو کی گئی۔ موجودہ مندر کی تعمیر 1951 ء میں کی گئی۔ اس وقت کے بھارت کے وزیر داخلہ ولبھ بھائی پٹیل کے حکم کے تحت تعمیر نو کاآغاز کیا گیا اوران کی موت کے بعد اسے مکمل کیا گیا تھا۔

سومناتھ کا علاقہ تین دریاؤں کے سنگم پر واقع ہے۔ یہ مقام صدیوں سے ہندوستان کے علاوہ دیگر علاقوں کے لوگوں کے لیے بھی ایک اہم مذہبی مقام رہا ہے۔ ہندوؤں کی کتابوں میں بھی اس سے متعلق بہت سی کہانیاں مشہور ہیں۔ اس شہر کے کئی نام مشہور ہیں، جن میں ایک پربھاس بھی ہے، جس کا مطلب چمک ہے، اسی طرح ایک اور نام سومیشور بھی ہے لیکن اب سب اسے سومناتھ ہی کہتے ہیں جس کا مطلب چاند کا مالک " یا "چاند دیوتا" ہے۔

سومناتھ کی تاریخ جاننے کے لیے رومیلہ تھاپر کی کتاب Somanatha: The Many Voices of a History میں بہت کچھ لکھا ہوا ہے۔ ایک دلچسپ بات انھوں نے یہ لکھی ہے (صفحہ 50) کہ محمود نے جب ملتان پر حملہ کیا تو اس وقت وہاں اسماعیلی فرقہ کی مسجد تھی جسے محمود نے تباہ تو نہ کیا لیکن اسے بند کر دیا اور ایک سنی مسجد کی تعمیر کی۔ رومیلہ تھاپر نے یہ بھی لکھا ہے کہ سومناتھ میں پہلے شیو مندر کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ زمانہ قدیم میں یہاں پر مندر تعمیر کیا گیا تھا جس کی تاریخ کا کوئی اندازہ نہیں ہے۔ دوسری مرتبہ اسی جگہ پر ولبھی کے "یادو بادشاہ" نے 649ء کے قریب مندر تعمیر کیا۔ 725ء میں، عرب کے گورنر الجنید نے گجرات اور راجستھان پر حملہ کیا اور اس مندر کو بھی تباہ کر دیا تھا۔ سومناتھ مندر کی اپنی ویب سائٹ پر لکھا ہوا ہے کہ یہ مندر کئی لاکھ سال پرانا ہے۔

تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ کئی بادشاہوں نے بھی اس کی تعمیر میں حصہ لیا۔ یہ ایک طویل اور غیر مطبوعہ تاریخ ہے جس کی صداقت ہمیشہ سے ہی مشکوک رہی ہے لیکن یہ بات طے ہے کہ یہ مندر کئی مرتبہ تباہ ہوا اور کئی مرتبہ اسے دوبارہ تعمیر کیا گیا۔ ہندوؤں کا یہ کہنا ہے کہ اسے کم از کم پانچ مرتبہ مختلف مسلمان بادشاہوں، جن میں محمود غزنوی، اورنگزیب اور خلجی بھی شامل ہیں، نے تباہ کیا۔ یہ بات کہاں تک سچ ہے؟ کچھ کہنا مشکل ہے۔

آزادی سے قبل ویروال جس میں سومناتھ واقع ہے جونا گڑھ ریاست کا ایک حصہ تھا جس کے حکمران مسلمان تھے جبکہ لوگوں کی اکثریت ہندو مذہب سے تعلق رکھتی تھی۔ مسلمان حکمرانوں نے پاکستان سے الحاق کی کوشش کی جو پوری نہ ہو سکی۔ بھارت کی جانب سے ان کے فیصلے کو قبول کرنے سے انکار کے بعد ریاست کو ہندوستان کا حصہ بنا دیا گیا اور نائب وزیر اعظم پٹیل 12 نومبر 1947ء کو اس کام کے لیے بنفس نفیس

جو ناگڑھ آئے تھے۔ انھوں نے یہ سارا کام ہندوستانی فوج کے ذریعے کیا۔ انھوں نے اسی وقت سومناتھ کے مندر کی تعمیر نو کا حکم دے دیا۔ اس موقع پر ایک دلچسپ واقعہ بھی پیش آیا۔

جب مندر کی تعمیر نو کی تجویز مہاتما گاندھی کے سامنے پیش کی گئ تو انھوں نے اس کام کی تائید کی لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ اس کام کے لیے قومی خزانے سے رقم خرچ کرنے کی بجائے عوام سے فنڈز لیے جائیں۔ لوگوں کا یہ کہنا تھا کہ گاندھی نے یہ اس لیے کیا کیونکہ وہ چاہتے تھے کہ بھارت ایک مکمل غیر جانبدار سیکولر ریاست بنے اور سرکاری طور پر کسی بھی مذہب کی ترویج کے لیے کوئی رقم استعمال نہ کی جائے۔

میں نے ابھی حال ہی میں ایک ٹی وی رپورٹ دیکھی جس میں یہ بتایا گیا کہ مندر کی دوبارہ تعمیر کی گئ ہے اور اس میں ایک سو پچاس کلو گرام سونا استعمال کیا گیا ہے۔ ٹائمز آف انڈیا نے اپنی انیس جنوری 2021ء کی رپورٹ میں بتایا ہے کہ نریندر مودی کو سومناتھ مندر ٹرسٹ کا چئیرمین منتخب کر لیا گیا ہے۔

سومناتھ اور مسجد

1950ء میں سومناتھ کے مقام پر موجود کھنڈرات کے نیچے سے ایک مسجد کے آثار ملے۔ مسجد کو گرانے کی بجائے اس کی پوری عمارت کو کھینچ کر کچھ کلومیٹر دور منتقل کر دیا گیا۔ جمہوریہ ہند کے پہلے صدر راجندر پرساد نے مندر کی تعمیر نو کی بنیاد رکھی۔ انھوں نے اپنے خطاب میں کہا کہ میرا خیال ہے کہ سومناتھ مندر کی تعمیر نو اس دن مکمل ہو گی جب ہندوستان میں اس طرح کی خوشحالی ہو گی جیسی خوشحالی کی علامت سومناتھ کا قدیم مندر تھا۔ انھوں نے مزید کہا کہ "سومناتھ مندر اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ تعمیر نو کی طاقت ہمیشہ تباہی کی طاقت سے زیادہ ہوتی ہے۔ "ان کا یہ فقرہ بہت مشہور ہوا ۔

میں نے سومناتھ مندر کی یاترا کے بعد آنے والے لوگوں سے بات چیت شروع کی تو مجھے ایک خوف محسوس ہوا۔ میں یہ سوچ کر پریشان ہو رہا تھا کہ یہ لوگ ابھی ابھی مندر سے آئے ہیں اور اگر میں غلطی سے بھی کوئی ایسی بات پوچھ بیٹھا جس سے ان کے مذہبی جذبات مجروح ہونے کا امکان ہوا تو مشکل ہو جائے گی۔ اس لیے میں نے نہایت ہی احتیاط سے بات شروع کی۔ ہم کل چار لوگ تھے، تین ہندو یاتری اور ایک میں۔

انھوں نے بتایا کہ ان کا تعلق راجستھان کے ایک چھوٹے قصبے سے ہے اور وہ پہلی مرتبہ سومناتھ کے مندر میں پوجا کے لیے آئے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ ان کا یہاں آنے کا کیا مقصد ہے؟ ان میں سے ایک نے بتایا کہ یہ مندر ان بارہ مندروں میں سے ایک ہے جو بھگوان شیو کیلیے وقف ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ ایک نہایت ہی قدیم مندر بھی ہے۔ ہمارا ماننا ہے کہ جو بھی اس مندر میں آکر پوجا کرتا ہے اسے شانتی ملتی ہے اور اس کے دکھ درد دور ہو جاتے ہیں۔ انھوں نے مزید بتایا کہ مندر میں کسی بھی طرح کے بجلی سے چلنے والے آلات، چمڑے کی بنی ہوئی اشیاء جیسے بٹوے، پٹی وغیرہ ممنوع ہیں۔ لوگوں کی سہولت کے لیے مندر کے پاس ہی مفت لاکر دستیاب ہیں۔

میں نے پوچھا کہ کیا ہر کوئی مندر میں داخل ہو سکتا ہے؟ انھوں نے جواب میں کہا کہ صرف ہندو لوگ ہی اس مندر میں داخل ہو سکتے ہیں۔ کچھ ایسے مقامات بھی ہیں جہاں صرف پروہت ہی جا سکتے ہیں۔ میں نے یہ بھی جاننا چاہا کہ کیا بڑے بت کے درشن کے کوئی مخصوص اوقات بھی ہیں؟ انھوں نے بتایا کہ دن میں تین مرتبہ؛ صبح، دوپہر اور شام کے اوقات میں درشن کروایا جاتا ہے جسے وہ آرتھی بولتے ہیں۔ میں نے ان سے کئی سوالات کیے جن کے انھوں نے نہایت ہی خوبصورت انداز میں جوابات دیے جن کا خلاصہ درج ذیل ہے۔

انھوں نے بتایا کہ جسمانی طور پر معذور اور بوڑھوں کے لیے خصوصی سہولیات موجود ہیں۔ یہ اس لیے کیا گیا ہے تاکہ کوئی پوجا سے محروم نہ رہے۔ مزید یہ کہ ارد گرد کے دوسرے مندر دیکھنے کے لیے معقول فیس پر ایک بس کی سہولت بھی دستیاب ہے۔ مندر میں داخل ہونے کی کوئی فیس نہیں ہے۔ مندر میں داخل ہونے سے پہلے آپ کو اپنے جوتے اتارنے ہونگے۔ جوتا گھر دروازے کے پاس ہے اور یہ سروس بھی مفت ہے۔ تمام بجلی کے آلات یعنی موبائل ڈیوائسز، کیمرے، لیپ ٹاپ، ٹیبلٹ اور کیلکولیٹر وغیرہ پر سختی سے پابندی عائد ہے۔ میں نے لباس کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے بتایا کہ انڈین ساڑھیوں، دھوتی، پینٹ، ٹی شرٹ اور اسکرٹس کی اجازت ہے۔ منی اسکرٹس اور شارٹ وغیرہ کی اجازت نہیں ہے۔ مندر کے اندر سگریٹ پینا منع ہے۔ سومناتھ مندر کے اندر فوٹو گرافی کی بھی ممانعت ہے۔

عطیات کے بارے میں پوچھنے پر انھوں نے بتایا کہ کسی بھی طرح کے عطیات؛ چیک، کیش یا آن لائن ٹرانسفر کے ذریعے قبول کیے جاتے ہیں۔ متبادل کے طور پر، آپ مندر میں رکھے ڈونیشن باکس میں رقم ڈال سکتے ہیں۔ انھوں نے مزید بتایا کہ کئی ہزار گاؤں کی آمدنی بھی اس مندر کے لیے وقف ہے۔ رہائش اور کھانے پینے کے بارے میں پوچھنے پر انھوں نے بتایا کہ وہاں ہر طرح کا انتظام موجود ہے۔ کسی کو کوئی دقت محسوس نہیں ہوتی۔

میرا آخری سوال اس مندر پر محمود غزنوی کے حملے کے بارے میں تھا۔ اس پر وہ پہلے تو خاموش رہے پھر بولے کہ وہ ایسا زخم ہے جسے کسی بھی ہندو کے لیے بھلانا ناممکن ہے۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔ اس نے مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان نفرت میں بے حد اضافہ کیا ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ مشتاق جی، اس علاقے میں سومناتھ کے علاوہ بھی بے شمار مندر موجود تھے جنہیں مسلمان بادشاہوں نے تباہ نہیں کیا۔ جب

بھی کیا سومناتھ ہی کو تباہ کیا۔ جس کی وجہ سوائے اس مندر میں بے بہا مال و دولت کے کچھ نہ تھی۔

ان یاتریوں میں ایک بڑی عمر کے صاحب جو اب تک خاموش بیٹھے تھے ، نے کہا کہ میں آپ کو ایک اور بات بتانا چاہتا ہوں، میں نے کہا جی بتایئے۔ انھوں نے کہا کہ یہ راجہ، بادشاہ، سلطان سب مال و دولت اور جاہ کے پجاری ہوتے ہیں۔ ان کے نزدیک دھرم ایک ضرورت کی چیز ہوتا ہے۔ ان کا اصل مقصد دنیا ہوتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ میرے علم کے مطابق مسلمان بادشاہوں نے صرف ہندوؤں کو ہی نقصان نہیں پہنچایا بلکہ انھوں نے بے شمار مسلمان ریاستوں اور مسلمانوں کو بھی نیست و نابود کیا۔ اس لیے میں یہ سمجھتا ہوں کہ سومناتھ مندر پر حملہ کسی مسلمان کا نہیں بلکہ ایک بادشاہ کا تھا، جو مسلمان بھی تھا۔ اسی ہندوستان میں بے شمار ایسے مسلمان بادشاہ بھی گزرے ہیں جنھوں نے مندروں کی تعمیر میں بھی حصہ لیا اور بے شمار ایسے بھی گزرے جو مندروں کو تباہ کرنے والے تھے۔ ہمارا مسئلہ مسلمان نہیں ہیں بلکہ ہم ان مسلمان بادشاہوں کو ناپسند کرتے ہیں جنھوں نے ہندوستان میں ہندوؤں کی عبادت گاہوں کو نقصان پہنچایا اور اس کے لیے اسلام کا نام استعمال کیا۔

Somnath Templ in 1869 and Now, Photo Credit: https://indianexpress.com/

انھوں نے مزید کہا کہ البتہ ہمیں اس بات کا دکھ ہوتا ہے جب آج کا مسلمان اُن ظالم بادشاہوں کو اپنا ہیرو بناتا ہے۔ وہ جنہوں نے اسلام کا نام لیا اور باہر سے آکر یہاں صدیوں سے آباد ہندوؤں کا قتل عام کیا، ان کی عبادت گاہوں کو تباہ کیا، مندروں سے سامان اٹھا کر مساجد بنائیں، ہماری عورتوں کو تاوان کے طور پر لے کر گئے۔ ہم انھیں یہ کہتے ہیں کہ آپ کو ان ظالمانہ کاموں کی مذمت ضرور کرنی چاہیے اور جب وہ ایسا نہیں کرتے تو ہمیں تکلیف ہوتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ بھارتی معاشرے میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان فاصلے کم نہیں ہو رہے۔

اس ساری گفتگو میں کافی وقت گزر گیا۔ رات بھی خاصی بیت چکی تھی اور نیند کا غلبہ بھی محسوس ہو رہا تھا۔ ان یاتریوں کی گفتگو نے مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا۔ میں یہ سب کچھ جان کر اس نتیجے پر پہنچا کہ ہم سب ماضی کو اپنی ایک خاص نظر سے دیکھتے ہیں اور اپنی اس سوچ کو پکڑ کر رکھتے ہیں پھر ہمارے تمام اعمال کا دارومدار اسی سوچ پر ہوتا ہے۔ تاریخ بھی یہی بتاتی ہے کہ صدیوں سے ایسا ہی ہوتا آیا ہے اور شاید ایسا ہی ہوتا رہے گا۔

احمد آباد: ایک شہر جو ایک تاریخ رکھتا ہے

جب ہم بڑودا سے گزر رہے تھے تو اس وقت رات کے نو بج چکے تھے اور اکثر لوگ سونے کے لیے جا چکے تھے۔ میں نے بھارت کے نقشے میں دیکھا کہ بڑودا سے احمد آباد سو کلو میٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ ہمارے لیے اس شہر کو دیکھنا ممکن نہ تھا لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس کا ذکر اور اس کی تاریخ آپ کے سامنے رکھنا بے حد مفید ہے۔

احمد آباد بھارت کے ان چند شہروں میں گنا جاتا ہے جن کی بنیاد مسلمان حکمرانوں نے رکھی اور ان کا نام بھی وہ رکھا جو ایک مسلم شناخت رکھتا ہے۔ یہ شہر مجھے اپنے نام کی وجہ سے بھی بے حد پیارا لگتا ہے۔

دلی سے ممبئی جانے والی مین ریل لائن پر واقع نہ ہونے کی وجہ سے میں احمد آباد کو نہ دیکھ پایا۔ پچھلے چند سال سے ہم نے بھارت سے اپنی فیکٹری کے لیے رنگ منگوانے شروع کیے تو احمد آباد کے رہنے والے ایک صاحب درشن شاہ جو وہ جین مذہب سے تعلق رکھتے ہیں سے ہمارا رابطہ ہوا جو اب تک برقرار ہے۔ درشن صاحب کی وجہ سے احمد آباد کا ذکر بار بار ہوتا ہے۔ ایک مرتبہ میں نے احمد آباد جانے کا پروگرام بھی بنایا لیکن بھارتی سرکار نے ویزہ نہ دیا جس کی وجہ سے میری یہ خواہش پوری نہ ہو سکی۔ اب جب کہ میں اس عظیم شہر سے سو کلو میٹر کے فاصلے سے گزر رہا تھا تو میں نے سوچا کہ اس کے بارے میں چند معلومات آپ کے سامنے رکھوں۔ اس شہر سے متعلق کچھ معلومات مجھے درشن شاہ صاحب سے بھی ملیں۔ مجھے احمد آباد کے متعلق پینو شاہ کی لکھی ہوئی کتاب Ahmedabad: Glimpses Of India's First World Heritage City جس میں بے شمار تصاویر بھی ہیں دیکھنے کا موقع ملا۔ اسکے ساتھ ساتھ احمد آباد میونسپل کارپوریشن کی ویب پر بھی کافی معلومات دی گئیں ہیں۔ جو میں جان سکا وہ پیش خدمت ہے۔

احمد آباد ریاست گجرات کا سب سے بڑا شہر اور سابقہ دارالحکومت بھی ہے۔ اس وقت احمد آباد کی آبادی ستر لاکھ سے زائد ہے اور یہ بھارت کا پانچواں سب سے زیادہ آبادی والا شہر ہے۔ احمد آباد، گاندھی نگر جو گجرات کا صدر مقام ہے سے تئیس کلومیٹر دور دریائے سبارمتی کے کنارے واقع ہے۔

احمد آباد بھارت میں ایک اہم معاشی اور صنعتی مرکز بن کر ابھرا ہے۔ یہ علاقہ کپاس کی پیداوار اور ٹیکسٹائل کے حوالے سے بے حد مشہور ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ یہاں کی اسٹاک ایکسچینج پورے بھارت میں دوسری قدیم ترین اسٹاک ایکسچینج ہے۔ حال ہی میں سردار پٹیل اسٹیڈیم بنایا گیا ہے جس میں ایک لاکھ سے زائد لوگوں کے بیٹھنے کی جگہ ہے۔

احمد آباد بھی ان شہروں میں شامل ہے جنہیں بھارتی حکومت نے سمارٹ سٹی بنانے کا پروگرام بنایا تھا۔ یہ وہ شہر ہے جسے بھارت کے پہلے یونیسکو عالمی ثقافتی ورثے کا اعزاز ملا۔

تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ گیارہویں صدی سے ہی لوگ اس علاقے میں آباد ہیں۔ اُس وقت اِس علاقے کو اشوال کے نام سے جانا جاتا تھا۔ ایک ہندو حکمران کرنا نے دریائے سبرمتی کے کنارے پر کارناوتی نامی ایک شہر آباد کیا۔ باقی علاقوں کی مانند یہ شہر بھی سلاطین دلی کے قبضے میں آگیا۔ جب اس علاقے میں سلاطین دلی کا کنٹرول کمزور پڑا تو ایک مقامی مسلمان راجپوت گورنر ظفر خان مظفر نے دلی سے بغاوت کا اعلان کر دیا اور مظفر شاہ اول کے نام سے خود کو گجرات کا سلطان نامزد کر دیا۔ اس علاقے کے اکثر گورنروں نے یہی کام کیا۔ پندرہویں صدی کے آغاز میں اس کا پوتا سلطان احمد شاہ اس ریاست کا حکمران بنا۔ ایک دفعہ شکار کرتے ہوئے اس نے ایک وسیع علاقہ دیکھا جہاں ڈاکوؤں کا راج تھا۔ یہ سب کچھ دیکھتے ہوئے اور علاقے میں امن قائم کرنے کے لیے اس نے سبارمتی ندی کے کنارے ایک نیا شہر بسانے کا فیصلہ کیا۔ اس کے نام کی دو وجوہات تھیں۔

Sultan Ahmed Shah

Ahmad Shah I, born Ahmad Khan, was a ruler of the Muzaffarid dynasty. Hindu claims that he renamed to an old city Karnavati nagar as Ahmedabad city in 1411, which is not true.

پہلی یہ کہ اس کا خود کا نام احمد تھا اور دوسرا اس علاقے میں چار نیک بزرگ موجود تھے جن کے نام بھی احمد تھے۔ احمد شاہ نے 1411ء میں اس شہر کی بنیاد رکھی۔اس طرح ایک نیا شہر بسایا گیا جس کے لیے کسی سے بھی زبردستی زمین نہیں لی گئی اور نہ ہی یہاں کوئی مندر تھا۔اس لیے آج تک کسی کو اسکا نام بدلنے کی خواہش بھی پیدا نہیں ہوئی۔

اگر کوئی کام نیک نیتی سے کیا جائے اور کسی سے کوئی زیادتی بھی نہ کی جائے۔ توایسا کام زوال پذیر نہیں ہوتا ہے۔

بعد ازاں احمد شاہ کے پوتے محمود نے شہر کے چاروں طرف حفاظتی نقطۂ نظر سے دس کلو میٹر طویل دیوار بنوائی۔اس دیوار میں بارہ دروازے تھے۔ایک وقت آیا جب مغل حکمران اس علاقے پر قابض ہو رہے تھے تو اس دوران ہمایوں نے احمد آباد پر کچھ دیر اپنا قبضہ رکھا لیکن بعد میں مظفر خاندان نے دوبارہ قبضہ کر لیا۔ مغل، مراٹھے اور راجپوت ،ان علاقوں میں مدتوں آپس میں دست و گریبان رہے۔

مغل دور میں احمد آباد ایک بڑے تجارتی مرکز کے طور پر جانا جاتا تھا۔ یہاں کپڑوں کی صنعت نہایت ترقی یافتہ تھی۔ اُس وقت اِس شہر سے ٹیکسٹائل کی مصنوعات یورپ برآمد کی جاتی تھیں۔ایک روایت یہ بھی ہے کہ شاہجہاں نے یہاں کے شاہی باغ میں موتی شاہی محل کی تعمیر کی اور اپنی زندگی کا ایک بڑا وقت اسی باغ میں گزارا۔

مراٹھوں اور بڑودا کے حکمرانوں نے بھی اس شہر پر قبضہ کرنے کے لیے جنگیں لڑی۔ایک وقت آیا کہ برطانوی فوج نے احمد آباد پر حملہ کیا اور اس پر قبضہ کر لیا لیکن جنگ کے اختتام پر انھوں نے ایک معاہدہ کے تحت اس شہر کو مراٹھوں کے حوالے کر دیا ۔انگریز اس علاقے پر ہر صورت قبضہ کرنا چاہتے تھے۔برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی نے تیسری اینگلو مراٹھا جنگ کے نتیجہ میں اس شہر کا اقتدار سنبھال لیا۔انھوں نے یہاں پر ایک فوجی

چھاؤنی بھی قائم کی اور میونسپل کمیٹی کا قیام بھی عمل میں لایا گیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ شہر ٹیکسٹائل کی صنعت کا گڑھ بن گیا جس کی بنیاد پر اسے "مانچسٹر آف دی ایسٹ" کے نام سے جانا جانے لگا۔ بلکل ایسے ہی جیسے فیصل آباد کو پاکستان کا مانچسٹر کہا جاتا ہے۔

Jamia Masjad Ahmed Abad Photo Credit: https://www.gujarattourism.com

ہندوستان کی تحریک آزادی میں بھی اس شہر کا ایک اہم کردار ہے۔ مہاتما گاندھی نے بھی اس شہر میں خاصا وقت گزارا۔ انھوں نے یہاں پر کئی آشرم بھی بنائے۔ اس شہر کا ایک اہم واقعہ روولٹ ایکٹ کے خلاف بڑے پیمانے پر مظاہرے ہیں۔ مزدوروں سے متعلق برطانوی حکمرانوں کے فیصلے کے خلاف ایک تاریخی احتجاج کیا گیا جس کے نتیجے میں شہر بھر کی بے شمار سرکاری عمارتوں کو آگ لگائی گئی ۔ اس شہر کے افسوس ناک واقعات میں تقسیم ہند کے بعد ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین ہونے والے شدید فرقہ وارانہ فسادات بھی شامل ہیں۔ یہ شہر پاکستان سے جانے والے ہندو تارکین وطن کی آبادکاری کا مرکز بھی بنا۔ جس کی وجہ اس شہر میں ٹیکسٹائل ملز کا ہونا تھا۔ ریاست بمبئی کی تقسیم کے بعد اسے ریاست گجرات کا دارالحکومت بنادیا گیا۔ اسی کی دہائی میں گجرات کا صدر مقام نئے تعمیر شدہ شہر، گاندھی نگر منتقل ہوگیا۔ ایک بار پھر ریاست گجرات میں

مذہبی فسادات ہوئے جنہیں گجرات فسادات کے نام سے جانا جاتا ہے۔ ان فسادات کے نتیجے میں بہت زیادہ جانی اور مالی نقصان ہوا۔

احمد شاہ اور اس کے بعد والے ادوار میں شہر میں بہت سی مساجد بالکل نئے انداز میں بنائی گئیں۔ ان میں سب سے منفرد سیدی مسجد ہے جو ریاست گجرات کے آخری سال میں تعمیر ہوئی۔ یہ مکمل طور پر محراب دار ہے۔ اس کے علاوہ اس شہر میں لا گارڈن اور وکٹوریہ گارڈن بھی موجود ہیں۔ یہاں ملکہ وکٹوریہ کا مجسمہ بھی ہے۔ کانکریا جھیل، احمد آباد کا ایک اہم تفریحی مقام ہے۔ یہ جھیل پندرہویں صدی میں تعمیر ہوئی یہ احمد آباد کی سب سے بڑی جھیلوں میں سے ایک ہے۔ آغاز میں اسے حوض قطب کے نام سے جانا جاتا تھا۔ احمد آباد مغربی بھارت کا دوسرا سب سے بڑا صنعتی مرکز ہے۔ احمد آباد کا جی ڈی پی ستر بلین ڈالر سے بھی زائد ہے۔ یہ شہر ٹیکسٹائل کے ساتھ ساتھ جواہرات اور زیورات کا بھی سب سے بڑا برآمد کنندہ ہے۔

1861ء کو رنچھوڑال چھوٹولال نے پہلی ہندوستانی ٹیکسٹائل دلچسپ بات یہ ہے کہ مل کی بنیاد رکھی جس کا نام احمد آباد اسپننگ اور ویونگ کمپنی لمیٹڈ تھا، بعد ازاں اسے شاہ پور مل کے نام سے جانا جاتا تھا۔ اس کے بعد اس علاقے میں بے شمار ٹیکسٹائل مل بنائی گئیں۔ بھدرہ فورٹ اندرون احمد آباد میں واقع ہے۔ اسے احمد شاہ اول نے 1411ء میں تعمیر کیا تھا۔ اس کے شاہی محلات، مساجد اور دروازے نہایت قابلِ دید ہیں۔ احمد آباد بھی ان شہروں میں سے ایک ہے جسے دیکھنے کی حسرت کبھی ختم نہیں ہو گی۔

اس شہر کی تاریخ پڑھتے ہوئے مجھے اس بات کی سب سے زیادہ خوشی ہوئی کہ یہ ایک ایسا شہر ہے جسے ایک راجپوت حکمران نے بنایا اور خوب بنایا۔

پینو شاہ نے اس شہر میں واقع کئی مساجد کا بھی ذکر کیا ہے۔ ان میں ایک اہم مسجد سیدی سعید کے نام سے ہے (صفحہ 46)۔ یہ بھی ایک افریقی غلام تھے اور حکومت میں ایک اعلیٰ عہدہ رکھتے تھے۔ اب تک میرے علم کے مطابق یہ تیسرے افریقی غلام میں جنہوں نے اس علاقے کی تاریخ میں ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔ باقی دو کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں۔

جیسا کہ میں نے پہلے بھی اس بات کا ذکر کیا ہے کہ بھارت میں ہر سال شہروں کے درمیان اس بات کا مقابلہ ہوتا ہے کہ کونسا شہر رہائش کے بہترن ہے۔ دی ٹائمنر آف انڈیا نے 11 دسمبر 2011 ء کی اشاعت میں لکھا ہے کہ احمد آباد اس فہرست میں اول نمبر پر ہے۔ اس کے بعد پونا کا نام آتا ہے۔ اب تک میں نے جو جانا ہے اس کے مطابق اس طرح کے مقابلوں میں وسطی اور جنوبی شہر ہی کوئی اہم مقام حاصل کر پاتے ہیں۔ شمال کے شہر کم ہی نظر آتے ہیں۔

احمد آباد کے بارے میں ایک اور بات بھی دلچسپ ہے۔ اسے عام طور پر Ahmed Aabd لکھا جاتا ہے۔ لیکن اسے Amdavad بھی لکھا جاتا ہے۔ اس شہر کی ویب پر دونوں طرح سے لکھا ہوا ہے۔

AMDAVAD MUNICIPAL CORPORATION[43]

اس کی کیا وجہ ہے۔ معلوم نہیں۔

[43]https://web.archive.org/web/20160223012426/http://egovamc.com/AhmCity/history.aspx

دوارکا : جہاں ایک اڑھائی ہزار سال پرانا مندر، سمندر میں ڈوبا ہوا نو ہزار سال پرانا شہر

میرے پاس موجود کتاب میں بھارت کے بارے لکھا تھا کہ بھارت کے مغرب میں دوارکا نامی ایک شہر ہے جو احمد آباد سے کئی سو کلو میٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ اس شہر کی دو اہم خصوصیات ہیں۔ ایک یہ کہ یہاں پر لارڈ کرشنا کا بنایا ہوا اڑھائی ہزار سال پرانا مندر ہے۔ جہاں ہر سال لاکھوں ہندو اس کی یاترا کے لیے آتے ہیں دوسری خصوصیت اس شہر کا سمندر میں ڈوبا ہوا ہونا ہے۔ان دو باتوں کی وجہ سے میں نے ضروری سمجھا کہ اس شہر کے بارے میں کچھ معلومات آپکی خدمت میں پیش کروں۔

ہماری ٹرین میں کچھ ایسے ہندو بھی تھے جو پہلے سے دوارکا جا چکے تھے۔ میں نے ان سے دوارکا کے بارے بہت سی معلومات حاصل کیں جو نہایت ہی دلچسپ تھیں۔ ان کا مختصر احوال حاضر خدمت ہے۔

دوارکا: ہندوؤں کا ایک متبرک مقام

دوارکا شمال مغربی بھارت میں گجرات کا ایک صدیوں پرانا شہر ہے۔ یہ شہر دریائے گومتی کے دائیں کنارے پر او کھمنڈل جزیرے کے مغربی کنارے پر واقع ہے۔آبادی کے لحاظ سے یہ ایک چھوٹا شہر ہے۔ ہندوؤں کے مذہبی نقطۂ نظر سے یہ شہر ایک اہم مقام رکھتا ہے۔ دوارکا کا ایک تعارف قدیم دور میں لارڈ کرشنا کی وجہ سے بھی ہے۔ تاریخی حوالوں کے مطابق اسے گجرات کا پہلا دارالحکومت مانا جاتا ہے۔اس شہر کے نام کا لفظی مطلب گیٹ وے ہے۔ تاریخ میں اس کے کئی نام ملتے ہیں۔ اس کا تذکرہ مہابھارت کی قدیم زمانوں کی کہانیوں میں بھی ملتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ لارڈ کرشنا ماتھورہ سے دوارکا آئے تھے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ لارڈ کرشنا نے دوارکا بنانے کے لیے سمندر سے

ایک بڑا علاقہ حاصل کیا تھا۔ اس شہر کو بنانے کا سہرا لارڈ کرشنا کے سر جاتا ہے۔ پندرہویں صدی میں گجرات کے ایک مسلمان حکمران محمود بیگڑا نے بھی دوارکا پر حملہ کیا۔ اس کے بعد سولہویں صدی میں اسے دوبارہ تعمیر کیا گیا تھا۔ اس وقت دوارکا ہندوؤں کا ایک اہم یاترا مرکز مانا جاتا ہے۔ ہندوؤں کی کتابوں میں دوارکا شہر سے متعلق بے شمار داستانیں موجود ہیں جو دلچسپ بھی ہیں اور حیرت انگیز بھی۔

اس شہر کے متعلق شکاریپور رنگانتھ راؤ کی کتاب The Lost City of Dvārakā جو 1999ء میں شائع ہوئی میں تفصیل سے اس شہر کے بارے میں لکھا ہوا ہے۔ میں نے جو کچھ اس بارے میں جانا اس کا خلاصہ پیش خدمت ہے۔

دوارکا بھارت میں بارہ تاریخی اور قدیم شہروں میں سے ایک ہے۔ دوارکا میں واقع ڈیسہ مندر جسے جگت مندر بھی کہا جاتا ہے بھارت کا ایک اہم مندر مانا جاتا ہے۔ اسے راجہ جگت سنگھ راٹھور نے تعمیر کروایا تھا اسی لیے اسے جگت مندر کہا جاتا ہے۔ یہ مندر سطح سمندر سے چالیس فٹ بلندی پر بنایا گیا ہے۔ یہ پانچ منزلہ عمارت پر مشتمل ہے جو بہتر ستونوں پر تعمیر کی گئیں ہے۔ اس مندر پر سورج اور چاند کی نشانیوں والا ایک بہت بڑا جھنڈا لہرایا جاتا ہے۔ دوارکا میں ایک لائٹ ہاؤس بھی واقع ہے جو اس شہر کی ایک پہچان ہے۔ ایک مینار کی شکل کا یہ لائٹ ہاؤس سطح سمندر سے ستر فٹ بلندی پر واقع ہے۔ اس کی روشنی سولہ کلومیٹر کے فاصلے سے بھی دکھائی دیتی ہے۔

اس علاقے کا سب سے مشہور تہوار لارڈ کرشنا کی پیدائش کی یاد میں منایا جاتا ہے۔ ہندوؤں کے نزدیک یہ علاقہ بھگوان کرشن کی رہائش تھا۔ یہ تہوار کئی دنوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس موقع پر مقامی لڑکے ایک بڑا ٹیلہ تیار کرتے ہیں اور کرشنا کے لباس میں ایک چھوٹا لڑکا اس ٹیلے پر چڑھتا ہے۔ اس سارے عمل کو "دھی ہانڈی" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

ایک مرتبہ محمد شاہ نے بھی دوارکا پر حملہ کیا اور مندر کو نقصان پہنچایا۔ اس جنگ کے دوران ، پانچ براہمنوں جن کے نام کچھ یوں تھے؛ وراجی ٹھاکر ، ناتھو ٹھاکر ، کرسن ٹھاکر ، والجی ٹھاکر ، اور دیوسی ٹھاکر۔ انھوں نے مل کر محمد شاہ کا مقابلہ کیا لیکن کامیاب نہ ہوسکے۔ اور سارے کے سارے مارے گئے۔ اس علاقے کے ہندوؤں کے نزدیک وہ ان کے ہیرو تھے۔ان کی یاد میں مندر کے پاس ہی ایک عمارت بھی تعمیر کی گئی جسے "پنج پیر "کے نام سے جانا جاتا ہے۔ پیر اصل میں مسلمان صوفیہ کے لیے استعمال ہوتا ہے لیکن اس علاقے میں ہندو جنگجو اسے بہادر لوگوں کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ ایک وقت وہ بھی آیا جب گجرات کے سلطان محمود بیگڑا نے اس شہر پر حملہ کرکے مندر کو تباہ کر دیا۔ اس جنگ کے دوران ولبھاآچاریہ نے اس مندر سے ایک نہایت ہی مقدس بت نکال کر اسے ایک گمنام گاؤں میں منتقل کر دیا لیکن یہاں بھی ایک ترک جرنیل نے اس پر حملہ کر دیا اور یوں ہندوؤں کیلیے اپنا بت بچانا مشکل ہو گیا۔

سمندر میں ڈوبا ہوا نو ہزار سال پرانا شہر

چند سال پہلے اس علاقے کے سمندر سے کچھ آثارِ قدیمہ ملے جن کے بارے میں یہ خیال کیا جاتا ہے کہ یہاں پر کبھی ایک عظیم شہر ہوا کرتا تھا۔ اس کا نام کیا تھا، وہ لوگ کون تھے، یہ ابھی تک کسی کو معلوم نہیں ہو سکا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ان آثار میں کوئی بھی ایسی چیز نہیں ملی جس سے یہ معلوم ہوسکے کہ ان لوگوں کا مذہب کیا تھا؟

آثار قدیمہ کے ماہرین کا خیال ہے کہ اس ڈوبے ہوئے شہر کی تاریخ چھ سے نو ہزار سال پرانی ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اس کی تاریخ پندرہ ہزار سال سے بھی زیادہ پرانی ہے۔ یہ ڈوبا ہوا شہر دنیا بھر کے سمندری آثار قدیمہ کے ماہرین کے لیے ایک پراسرار معمہ ہے۔ ہندوؤں کا خیال ہے کہ اس ڈوبے ہوئے شہر کے ملنے کے بعد مہابھارت کی

داستان کی تصدیق ہوتی ہے۔ زیر سمندر پائے جانے والے کھنڈرات سے پتہ چلتا ہے کہ یہ شہر نو ہزار سال پرانا ہے۔

Sunken City Of Dwarka Photo Credit: Sunken City Of Dwarka

بھارتی آثار قدیمہ کے سروے آف انڈیا نے 1963ء میں بحیرہ عرب میں دوارکا کے ساحل اور سمندر کے کنارے، آثار قدیمہ کی تحقیقات کیں اور ابتدائی تحقیقات میں بہت ساری نئی چیزیں سامنے آئیں۔ سمندر کے کنارے پر کی جانے والی کھدائی کے بعد معلوم ہوا کہ وہاں ایک بڑی بستی پانی میں ڈوبی ہوئی ہے۔ یہ بستیاں بیرونی اور اندرونی دیواروں اور قلعے کی شکل میں ہیں۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ شہر کسی زمانے میں ہندوستان کے مشرقی علاقوں بندرگاہ کے طور پر جانا جاتا تھا۔ کچھ ماہرین کے مطابق اس شہر کا تعلق ہڑپہ دور سے ہے لیکن کوئی نہیں جانتا کہ یہ شہر کب تعمیر کیا گیا؟ ماہرین اپنی سی کوشش کر رہے ہیں جو تا حال جاری ہیں۔

آپریشن دوارکا

بھارت اور پاکستان کے درمیان ستمبر 1965ء میں ایک جنگ ہوئی۔ اس جنگ کے دوران پاک بحریہ نے 7اور 8 ستمبر 1965ء کو دوارکا پر کامیاب حملہ کیا اور بھارت کی دفاعی تنصیبات کو بے حد نقصان پہنچایا۔ اسے دوارکا آپریشن کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس وجہ سے بھی دوارکا اہلِ پاکستان کے لیے ایک خاص اہمیت کا حامل ہے۔

گودھرا: جہاں سے ایک ٹرین میں مسلمانوں کو جلایا گیا

جب ہماری ٹرین گودھرا سے گزری تو اس وقت یہ شہر میرے لیے خاص اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ بعد میں 2002ء میں ایک تاریخی واقعہ کی وجہ سے یہ دنیا بھر میں مشہور ہوا۔ میں نے یہ مناسب جانا کہ آپکو اس شہر میں ہونے والے ایک اندوہناک واقعے کے بارے میں کچھ بتاؤں اور ساتھ ہی اس شہر کی تاریخ بھی آپ کے سامنے رکھوں۔ گودھرا اپنی زراعت کی وجہ سے جانا جاتا ہے۔ دراصل یہ نام گو سے آیا ہے جس کا مطلب ہے "گائے" اور دھڑا کے معنی زمین کے ہیں، یعنی گائے کی سرزمین۔

گودھرا، ہندوستان اور بین الاقوامی سطح پر 2002ء کے گجرات فسادات کے نقطۂ آغاز کے طور پر بھی جانا جاتا ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین ریاست بھر میں مذہبی فسادات کا آغاز 27فروری 2002ء کو گودھرا ریلوے سٹیشن کے قریب گودھرا ٹرین جلانے کے واقعے کے بعد ہوا تھا۔ ایک اندازے کے مطابق وہاں ساٹھ مسلمان مسافروں کو زندہ جلایا گیا۔ ایسا کیوں ہوا، کس نے کیا، اس کا فائدہ کس کو ہوا، اس کا ذمہ دار کون تھا؟ ان تمام سوالوں کی جوابات اب تک نہیں ملے۔

اس واقعہ پر میری نظر سے درج ذیل تین کتابیں گزری ہیں۔

دیش پانڈے کی کتاب Gujarat Riots: The True Story مانجو متا کی کتاب Modi and Godhra: The Fiction of Fact Finding ایم ڈی دیش پانڈے کی کتاب Gujarat Riots: the True Story: The Truth of the 2002 Riots

اس واقعہ کے بارے میں ایم ڈی دیش پانڈے نے جو لکھا ہے اس کا خلاصہ پیش خدمت ہے۔ اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ یہ واقعہ کتنا دہشت ناک تھا۔

ہندو مسلم فسادات ہندوستان میں کہیں نا کہیں ہوتے ہی رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ہندو سکھ فسادات بھی ہوئے ہیں۔ حتیٰ کہ ہندوؤں کی عیسائیوں کے ساتھ فسادات کی خبریں بھی ملتی ہیں لیکن جس پیمانے پر گجرات میں 2002ء میں قتل عام ہوا ہے اس کی مثال نہیں ملتی۔ ان فسادات میں ایک ہزار سے زائد افراد، جن میں زیادہ تر مسلمان تھے، ہلاک ہوئے۔ اس پر مزید یہ ظلم ہوا کیا کہ حقائق کو چھپانے کی بھرپور کوشش کی گئی ہے۔ بظاہر سرکاری رپورٹوں میں اسوقت کے وزیر اعلی نریندر مودی کو کلین چٹ دے دی تھی لیکن عام۔ لوگوں جس مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ہندو بھی شامل ہیں ان رپورٹس پر اطمینان نہیں ہے۔ اس کتاب میں ایک اہم سوال یہ اٹھایا گیا ہے کہ مودی نے احمد آباد میں فساد سے متاثرہ علاقوں کا دورہ واقعہ کے پانچ دن بعد کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے مہاجر کیمپ میں مسلمان متاثرین سے ملنے میں ایک ماہ تک کیوں انتظار کیا۔

میں یہ سب دیکھ کر اس واقعہ اور دہلی میں سکھوں کے قتلِ عام میں بے حد مماثلت پاتا ہوں۔ آپ کیا سوچتے ہیں؟ معلوم نہیں!

اس شہر سے ایک ہزار سال پرانا لارڈ رشبھناتھ کا ایک مجسمہ ملا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ اس جگہ جین راہبوں کے لیے ایک سکول واقع تھا۔ اہم بات یہ ہے کہ ایک

نہایت ہی مشہور ہندو مفکر، ولبھ اچاریہ بھی آج سے پانچ سو سال پہلے اس شہر میں رہتے تھے۔ انھوں نے اس شہر سے متعلق ایک تقریر کرتے ہوئے کہا کہ میری بیٹی نے ایک شہر کا خواب دیکھا اور پھر ایک مسلمان خاندان نے اپنا گھر اس کے حوالے کر دیا جس پر اس شہر کی بنیاد رکھی گئی۔ یہ بات کئی جگہوں پر لکھی ہوئی ہے لیکن مجھے اس کا کوئی مستند حوالہ نہیں مل سکا۔

ولبھ اچاریہ جسے ولبھا کے نام سے بھی جانا جاتا ہے ایک ہندوستانی تیلگو فلسفی تھا۔ انھوں نے ایک نئے دھرم کی بنیاد رکھی جسے وشنو ازم کہا جاتا ہے۔ میں نے ان کی کچھ تحریریں پڑھیں جو بہت ہی دلچسپ ہیں۔ انھیں پڑھتے ہوئے مجھے یوں لگا جیسے میں کسی پنجابی مسلمان صوفی کی تحریر پڑھ رہا ہوں۔

ان کے بارے میں کئی کتابیں لکھی گئیں ہیں۔ اب تک میں نے جتنے بھی ہندو فلاسفروں کو پڑھا ہے ان میں سے ولبھ اچاریا کا مقام سب سے نمایاں نظر آتا ہے۔ ان کے بارے میں ایک مختصر کتاب Shrimad Vallabhacharya and His Doctrine جسے براجنا تھ آر شاشتری نے لکھا جو 1984ء میں شائع ہوئی میں بہت کچھ لکھا ہے۔ جس سے ان کے بارے میں جاننے میں کافی مدد ملتی ہے۔

اس شہر کی آبادی قریباً دو لاکھ اور شرح خواندگی 75 فیصد ہے۔ میں نے پچھلے صفحات میں لکھا تھا کہ جیسے جیسے آپ شمالی بھارت سے جنوبی بھارت کی طرف جاتے ہیں شرح خواندگی میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ اب ہم شمال کی طرف جا رہے ہیں اور شرح خواندگی میں جنوب کی نسبت کمی واقع ہو رہی ہے۔ اس شہر میں مسلمانوں کی آبادی ہندوؤں سے زیادہ ہونا میرے لیے حیران کن تھا۔ یہاں مسلمان آبادی پچاس فیصد سے بھی زائد ہے۔ میرے علم کے مطابق یہ شرح پورے بھارت کے کسی اور علاقے میں نہیں ہے۔ اسی وجہ سے یہ شہر ایک منفرد اہمیت کا حامل ہے۔

گودھرا ایک خاص مندر کی وجہ سے ہندوؤں کے نزدیک نہایت اہمیت رکھتا ہے۔اس کے علاوہ چار مشہور بیٹھکوں میں سے تین کا تعلق بھی اس علاقے سے ہی ہے۔ ہر مذہب اس کے ماننے والوں کے لیے ایک مقدس چیز ہوتا ہے اور ہمیں ان کے مذہب اور مذہبی مقامات کا احترام کرنا سکھایا گیا ہے۔ ہندو دھرم سے متعلق میرا علم نہایت ناقص ہے اس لیے میں اس بارے میں لکھتے ہوئے نہایت احتیاط سے کام لیتا ہوں۔ پھر بھی اگر کوئی غلطی ہو جائے تو آپ سے گزارش ہے کہ اس کی نشاندہی کر دیں تاکہ اسے درست کیا جاسکے۔

گودھرا میں موجود تین خوبصورت جین مندر بھی دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہاں ایک ایسا مندر بھی ہے جس کی بنیاد دادا بھگوان نے رکھی اسے غیر فرقہ وارانہ مندر بھی کہتے ہیں۔اس مندر کا نام تری مندر ہے۔اس شہر میں شیخ ماجھوار کی قبر بھی ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ قبر پورے بھارت کی سب سے بڑی قبر ہے۔ کوشش کے باوجود میں اس کا کوئی حوالہ یا تصویر نہ ڈھونڈ سکا۔

میں جب گودھرا کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا تو مجھے معلوم ہوا کہ گودھرا سے تعلق رکھنے والے لوگ ایک بڑی تعداد کراچی میں بھی آباد ہے۔ تقسیم ہند کے وقت لوگوں کی کثیر تعداد کھوکھراپار کے راستے پاکستان آئی ، جنہوں نے سندھ کے مختلف شہروں میں سکونت اختیار کی۔ سب سے زیادہ مہاجرین کراچی میں موجود ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ان کی تعداد کئی لاکھ ہے اور یہ لوگ فلاحی کاموں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔انھوں نے کراچی میں گودھرا میڈیکل سینٹر کے نام سے بھی ایک بہت بڑا ہسپتال بنا رکھا ہے۔ کئی لوگ اس ہسپتال کو آغا خان ہسپتال کا ہم پلہ بھی قرار دیتے ہیں۔

رات کافی بیت چکی تھی اور مجھے بھی نیند نے آ گھیرا تھا لیکن عمر بھائی اور دیگر ہم سفروں کے خراٹوں نے ایک آرام دہ نیند سے محروم کرنے کی کوشش کی۔ نیند تو نیند ہی ہوتی ہے۔۔۔کہتے ہیں کہ وہ تو سولی پر بھی آ جاتی ہے۔۔۔ یہاں تو صرف خراٹے تھے۔

موڈاسا: جہاں ایک لاہوری صوفی کے ہاتھوں ایک ہندو راجہ مسلمان ہوا

اس پورے سفر میں مجھے جس بات کا مسلسل احساس ہو رہا تھا وہ یہ تھی کہ اب شاید ہی کبھی دوبارہ ان علاقوں کا دورہ کرنے کا موقع ملے۔ اس لیے میں کوشش کرتا تھا کہ زیادہ سے زیادہ علاقے دیکھوں۔ میں سونے کی ناکام کوشش کرنے کے بعد دوبارہ ریل کے دروازے کے پاس کھڑا ہو کر کھڑکی سے باہر دیکھنے میں مصروف ہو گیا۔ اس دوران ایک صاحب جن کی عمر پچاس سال سے زائد ہو گی بھی میرے پاس آ گئے۔ ان کے لباس اور سر پر ٹوپی سے لگتا تھا کہ وہ مسلمان ہیں۔ میں نے سلام کیا تو انھوں نے بڑی محبت سے جواب دیا۔ ہم نے آپس میں گفتگو شروع کر دی۔

جب میں نے انھیں بتایا کہ میرا تعلق لاہور سے ہے تو بے حد خوش ہوئے۔ میں نے انکی غیر معمولی خوشی کا سبب جاننا چاہا تو انھوں نے بتایا کہ ان کا تعلق اس علاقے سے دور ایک قصبے موڈاسا سے ہے۔انھوں نے پرجوش انداز سے بتایا کہ ہمارے علاقے میں کئی صدیوں پہلے ایک بزرگ تشریف لائے تھے جن کا نام مخدوم شاہ لاہوری ہے۔ ان کی کوششوں سے اس علاقے میں اسلام کی اشاعت ہوئی۔

ایک اہم واقعہ یہ ہوا کہ انھوں نے اس وقت کے ہندو راجہ پرمار جو موڈاسا کے حکمران تھے کو بھی مسلمان کیا۔ موڈاسا کے بارے میں یہ بات سن کر میری دلچسپی میں بے حد اضافہ ہو گیا۔ میں نے مزید جاننے کے لیے ان سے باتیں شروع کر دیں۔ جو ہندو راجہ مسلمان ہوا اس نے مخدوم صاحب کے قدموں کی جانب دفن ہونا پسند کیا۔ یہ اس کی عقیدت کا ایک انداز تھا۔ میں نے اب تک ہندوستان کے بارے میں جو کچھ پڑھا اس کے

مطابق یہ ہندوستان کے واحد ہندو راجہ ہیں جنہوں نے ایک صوفی کے ہاتھوں اسلام قبول کیا۔ مخدوم صاحب کا مزار بہت مشہور ہے اور علاقے کے لوگ انھیں شہنشاہ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

Mazar Hazrat Makhdoom Shah Bukahri, Photo Credit:
https://mobile.facebook.com/Ahmadshahmastan/posts

ہندوستان میں تبلیغ اسلام کا یہ پہلو اب تک میری نظر سے پوشیدہ تھا۔ ان تمام معلومات کے لیے میں نے ان صاحب کا شکریہ ادا کیا اور ان سے آخری سوال کیا کہ انھیں لاہوری کیوں کہتے تھے؟ اس پر انھوں نے بتایا کہ صحیح بات تو معلوم نہیں لیکن ہم سب کا یہ اندازہ تھا کہ وہ حضرت علی ہجویریؒ عرف داتا صاحب کے مرید تھے اور لاہور سے یہاں آئے تھے اس لیے انھیں لاہوری کہا جاتا ہے۔ یہ جان کر میرے دل سے داتا صاحب کے لیے بے حد دعائیں نکلی جن کی تبلیغ کے اثرات اتنی دور تک پھیلے ہوئے ہیں۔

انھوں نے ایک دلچسپ بات بتائی کہ پرانے وقتوں میں جب لوگ حج کے لیے پیدل جاتے تھے تو موڈاسا وہ شہر تھا جہاں شمالی ہندوستان سے مکہ مکرمہ کے لیے سورت

بندرگاہ جانے والے مسافر آتے تھے اور پھر یہاں سے آگے جاتے تھے۔ اس طرح اس شہر کو حاجیوں کی خدمت کا موقع ملتا تھا۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ یہ شہر دو ہزار سال پرانا ہے۔ جس کا ثبوت یہاں سے ملنے والے آثار قدیمہ ہیں۔ جب میں نے اس شہر کے بارے میں مزید جاننا چاہا تو مجھے پتہ چلا کہ یہ راجستھان کے جنوب میں واقع ہے اور اس علاقے پر راجستھانی تہذیب کے اثرات بھی پائے جاتے ہیں۔ اس علاقے پر سلاطین دلی کے ساتھ ساتھ مغلوں نے بھی حکومت کی۔ اس شہر کی اہم بات یہ ہے کہ یہ ان چند شہروں میں سے ہے جس پر انگریزوں کا براہِ راست کنٹرول تھا۔ اس لیے یہاں دوسرے علاقوں کی نسبت تعلیم کا معیار بہت بہتر ہے۔ مہاتما گاندھی کی جنگِ آزادی کی تحریک میں اس شہر نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ انگریزوں کو بھی یہ شہر بے حد پسند تھا اور ان کے ایک مسافر بردار جہاز کا نام بھی موڈاسا تھا۔ موڈاسا کے بارے میں یہ سب جان کر مجھے بے حد خوشی ہوئی۔ یہاں ایک علاقہ ایسا بھی ہے جس کا نام درگاہ سید رانا ہے۔ مجھے رانا اور سید کا اشتراک کچھ عجیب سا لگا۔ اس درگاہ کے بارے میں مجھے ایک وڈیو دیکھنے کا موقع ملا جس کی وجہ سے مجھے اس بارے میں جاننے میں سہولت ہوئی[44]۔

داہود: مغل شہنشاہ اورنگزیب کی جائے پیدائش

ہماری گاڑی رات گئے داہود سے گزری۔ اس کے بارے میں میں نے پڑھا تھا کہ یہ شہر مغل شہنشاہ اورنگزیب کی جائے پیدائش ہے۔ اس وجہ سے اس شہر کی مغل تاریخ میں ایک خاص اہمیت ہے۔

اورنگزیب کے متعلق تاریخ میں بہت کچھ لکھا ہوا ہے۔ ایک مضمون جسے مولانا خالد سیف اللہ رحمانی نے "اورنگ زیب عالمگیرؒ، تاریخ کا مظلوم حکمران" کے نام

[44] https://www.youtube.com/watch?v=GUXkt1MrfTM

سے لکھا ہے اور یہ جامعہ العلوم اسلامیہ کراچی کے رسالہ بینات میں اکتوبر 2017ء میں شائع ہوا ہے۔ مولانا خالد سیف اللہ رحمانی لکھتے ہیں کہ اورنگزیب ایک متقی آدمی تھا اورا س نے عام لوگوں کی فلاح و بہبود کے بہت کام کیے۔ وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ اگر اس نے کوئی مندر گرائے یا سکھوں کے ساتھ زیادتی کی یہ اس کا ایک سیاسی کردار تو ہو سکتا ہے کیونکہ وہ ایک بادشاہ تھا اور یہ سب کچھ اپنی ریاست کو بچانے کے لیا۔ اسے مذہب سے جوڑنا مناسب نہیں[45]۔

داہود گجرات اسٹیٹ میں واقع ایک شہر ہے۔ اس کا نام ایک ہندو پروہت کے نام پر رکھا گیا۔ احمد آباد سے اس کا فاصلہ دوسو کلومیٹر سے زائد ہے۔ اس شہر کو دوحد کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ جس کی وجہ اس شہر کا راجستھان اور مدھیہ پردیش کے درمیان واقع ہونا ہے۔ اس کے دونوں اطراف ان اسٹیٹس کی سرحدیں لگتی ہیں۔ مغل شہنشاہ اورنگزیب نے اس شہر کی بہتری کے لیے خصوصی احکامات جاری کیے ہوئے تھے۔ داہود کی ریلوے کالونی کو انگریزوں نے تعمیر کیا جو فن تعمیر کا شاہکار ہے۔ بھارت فلیگ شپ اسمارٹ اسٹیشن مشن کے تحت داہود کو سمارٹ شہروں کی فہرست میں شامل کیا گیا ہے۔

اس شہر کی ایک پہچان یہاں سے تعلق رکھنے والے جنگ آزادی کے ایک جنگجو سے بھی ہے۔ اُن کے کئی نام ہیں لیکن وہ زیادہ تر انتیا ٹوپے اور تانتہ ٹوپی کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ 1857ء کے جنگ آزادی کے دوران انھیں ایک جنرل کی حیثیت حاصل تھی۔

---

[45] https://www.banuri.edu.pk/bayyinat-detail/اورنگ-زیب-عالمگیر-تاریخ-کا-مظلوم-حکمراں

بھارت میں ان کی زندگی کے متعلق کئی کتابیں لکھی گئیں ہیں۔ مجھے سید جعفر محمود کی کتاب Pillars of Modern India, 1757-1947 کتاب دیکھنے کا موقع ملا۔ اس کتاب میں کئی اور لوگوں کا ذکر بھی ہے جن میں نمایاں نام رانی جھانسی کا بھی ہے۔ اس کتاب کے مطابق (صفحہ 14) انھوں نے کوئی فوجی تربیت حاصل نہیں کی تھی لیکن اس کے باوجود انھیں ایک بہترین اور مؤثر جنگجو سمجھا جاتا تھا۔ جنگ آزادی میں ان کے کارناموں کی وجہ سے انھیں اس علاقے میں ایک ہیرو کے طور پر جانا جاتا ہے۔

جنگ آزای کے ہیروز کی قدر ہر علاقے میں کی جاتی ہے۔۔۔ یہ میں نے بھارت اور پاکستان ،ہر جگہ دیکھا ہے۔۔۔ایسا کیوں نہ ہو۔۔۔ یہ سب عظیم لوگ تھے جنہوں نے ہمیں غلامی سے نجات دلائی۔
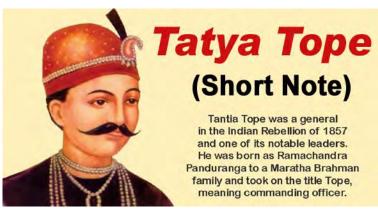
Photo Credit: https://www.allexamgurublog.com

رتلم: شاہجہاں کے قابلِ اعتماد راجپوت رتن سنگھ کا شہر

میں نے اپنے زیرِ مطالعہ کتاب میں پڑھا کہ رتلم جو کہ وسطی بھارت کا ایک قصبہ ہے کے رہنے والے ایک بہادر راجپوت رتن سنگھ نے شاہجہاں اور اسکے درباریوں کو ایک مست ہاتھی کے ہاتھوں مرنے سے بچایا تھا۔ اس کی بہادری سے خوش ہو کر شاہجہاں نے اسے رتلم میں ایک بڑی جاگیر دے دی۔ اس کے علاوہ رتن سنگھ شاہجہاں کی طرف سے خراسان تک جنگ بھی کرتا رہا۔ شاہجہاں کی زندگی میں ہی اس کے بچوں کے درمیان تخت کی جنگ ہوئی۔ جس میں رتن سنگھ نے دارا شکوہ کا ساتھ دیا اس کی پاداش میں عالمگیر نے اس کی ساری جائیداد چھین لی۔ رتن سنگھ عالمگیر کے ساتھ جنگ کرتے ہوئے مارا گیا لیکن اس نے دارا شکوہ سے کی ہوئی وفاداری پر حرف نہ آنے دیا۔

جب ہماری گاڑی رتلم پہنچی تو اس وقت رات کے بارہ بج چکے تھے۔ نیند میری آنکھوں سے ابھی کوسوں دور تھی۔ یہاں ہماری گاڑی کا سٹاپ بھی تھا۔ اس لیے مجھے پلیٹ فارم پر اترنے کا موقع بھی مل گیا۔ یہ شہر بھی اپنی ایک منفرد تاریخ رکھتا ہے جو وفاداری اور بہادری سے مزّین ہے۔ جس کا ایک مختصر احوال آپکی خدمت میں پیش ہے۔

رتن سنگھ اور رتلم کے بارے میں باربرا این راموسیک کی کتاب The Indian Princes and their States جسے کیمبرج یونیورسٹی نے 2004ء میں شائع کیا ہے، میں بہت تفصیل سے لکھا ہے۔ جو میں نے اس کتاب میں پڑھا اس کے مطابق رتلم بھارت کی ریاست مدھیہ پردیش میں مالوا خطے کے شمال مغربی حصے میں واقع ہے۔ یہ شہر سطح سمندر سے پندرہ سو فٹ بلندی پر واقع ہے۔ (لاہور چھ سو فٹ بلندی پر واقع ہے)۔ یہ شہر چٹ پٹے کھانوں اور قدیم مندروں کی وجہ سے بھی خاصی شہرت رکھتا ہے۔ رتلم ریاست کی بنیاد سولہویں صدی کے وسط میں جودھ پور کے راجہ ادائی سنگھ کے پوتے راجہ رتن سنگھ راٹھور نے رکھی۔

بار برا این راموسیک نے (صفحہ 16) میں ایک واقعہ کا تذکرہ کیا ہے جس میں ایک مست ہاتھی کے ہاتھوں شاہجہاں بادشاہ کی جان جا سکتی تھی۔ اس موقع پر رتن سنگھ جس کی عمر صرف تئیس سال تھی نے بادشاہ کی جان بچائی تھی۔ اس پر خوش ہو کر شاہجہاں نے یہ علاقہ اسے دیا تھا۔ راجہ رتن سنگھ راٹھور اوراس کے والد نے افغانستان میں ایرانیوں اور ازبک کے خلاف کام یاب جنگیں لڑیں جس سے شاہ جہاں کی حکومت کو استحکام اور سلطنت کو وسعت ملی۔ میرے لیے بھی یہ ایک نئی بات تھی کہ ہندو بھی مغل حکمرانوں کی خاطر اتنے دور دراز علاقوں میں جاتے تھے۔ جس سے اس بات کی بھی نفی ہوتی ہے کہ ہندو ہندوستان سے باہر جانا پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ لوگ جنگ کے لیے ہندوستان سے باہر نکلے اوراپنی بہادری کے جوہر دکھائے جس کا اعتراف مغل حکمران بھی کرتے تھے۔ رتن سنگھ کی فوجی خدمات کے صلے اور ان کے بہادری کے عظیم کارناموں کے انعام کے طور پرانھیں راجپوتانہ اور شمالی مالوامیں ایک بڑی جاگیر سے نوازا گیا۔ رتن سنگھ نے اپنا دارالحکومت ایک نئے شہر میں بنایا جس کا نام اپنے پہلے بیٹے رام سنگھ کے نام سے "رترم" رکھا جو بعد میں رتلم میں بدل گیا۔

Painting of Ratan Singh Photo Credit:
https://www.indianrajputs.com

رتن سنگھ اس فوج میں شامل تھا جو جودھ پور کے مہاراجہ جسونت سنگھ کی کمان میں راجپوتوں اور مسلمانوں کی مشترکہ فوج تھی اور اس نے داراشکوہ کی حمایت میں عالمگیر کے خلاف ایک اہم جنگ لڑی تھی۔ راٹھور قبیلے کے سربراہ کی حیثیت سے رتن سنگھ فوج کا سربراہ تھا۔ کہتے ہیں کہ اس جنگ کی ناکامی میں مسلمان فوجیوں کے عدم تعاون کا بہت زیادہ عمل دخل تھا۔ اس جنگ میں رتن سنگھ بھی مارا گیا۔ موت کے وقت اس کے جسم پر تلوار کے اسی کے قریب زخم تھے۔ میرے علم کے مطابق رتن سنگھ ان چند راجاؤں میں سے ہے جو میدان جنگ میں لڑتے ہوئے مارے گئے۔

رتلم شہر کی ترقی میں ایک انگریز کیپٹن بورتھوک کا بھی بڑا ہاتھ ہے۔ انگریزوں کے دور میں رتلم وسطی ہندوستان کا ایک اہم کاروباری شہر تھا۔ رتن سنگھ کے دور میں رتلم ایک بہت بڑی ریاست تھی۔ انگریزوں نے جب اس علاقے کو فتح کیا جس کے لیے رتن سنگھ کے وفاداروں نے انگریزوں کی ہر طرح سے مدد کی تھی تو انھوں نے ریاست کو بحال کیا جس کے نتیجے میں مہاراجہ سجن سنگھ اس ریاست کا راجہ بنا اور راجہ کا وہ لقب بحال کر دیا گیا جسے عالمگیر نے ختم کر دیا تھا۔ برطانوی حکمرانی کے دوران اس ریاست کا رقبہ 1795 مربع کلومیٹر تھا (ضلع لاہور کا رقبہ 1772 مربع کلومیٹر ہے)۔ یہ شہر افیون کی تجارت کے لیے بہت مشہور تھا۔ تقسیم ہند کے بعد اس ریاست نے بھارت سے الحاق کر لیا۔ رتلم جنکشن ایک بہت بڑا جنکشن ہے۔ اس ریلوے سٹیشن پر روزانہ ڈیڑھ سو سے زائد ٹرینیں رکتی ہیں۔ اس سٹیشن کو پورے بھارت کا پہلا صاف ستھرا ٹرین سٹیشن ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ یہ سٹیشن ہندوستان کے مصروف ترین ریلوے سٹیشنوں میں سے ایک ہے۔ رومانٹک مزاحیہ فلم "جب وی میٹ" میں بھی اس شہر کا ذکر ہے۔

اندور: جس کی حکمران مہارانی ہلیا بائی ہلوک تھی

جب ہماری گاڑی رتلم سے نکلی تو میں نے نقشے میں دیکھا کہ ہم مدھیہ پردیش میں داخل ہو رہے ہیں۔ یاد رہے کہ ہم دلی سے چنائی جاتے ہوئے مدھیہ پردیش کے مشرق سے گزرے تھے اوراب ہم اس کے مغرب سے گزر رہے تھے۔ ہمارے بائیں طرف راجستھان جب کہ دائیں طرف مدھیہ پردیش تھا۔ میں نے کتاب میں اندور شہر اوراندور ریاست سے متعلق بہت ہی دلچسپ باتیں پڑھیں جس سے مجھے اس علاقے کے بارے میں مزید جاننے کا شوق پیدا ہوا۔ رتلم سے ایک صاحب ہماری ٹرین میں سوار ہوئے جن کا تعلق اندور سے تھا۔ میں نے ان سے اس شہر کے بارے میں کافی معلومات حاصل کیں۔ جن کا خلاصہ پیش خدمت ہے۔ اس علاقے کے بارے میں جان کر مجھے یہ احساس ہوا کہ ہمیں تو ہندوستان کے بارے میں بہت ہی کم علم ہے۔

این کے حرکاوات کی کتاب The Indore State Hand Book: The Postal History of Indore State from 1829-1950 جو 1974ء میں شائع ہوئی میں تفصیل سے اس ریاست کے بارے میں لکھا ہوا ہے۔ ان کے مطابق اندور کی تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ علاقہ مالوا کے حکمرانوں کے ماتحت تھا۔ وہ بہت ہی خوشحال اور مؤثر لوگ تھے۔ انھیں ہمیشہ مغل حکمرانوں کی سرپرستی حاصل رہی۔ یہ علاقہ مدھیہ پردیش کے مغرب میں واقع ہے اور مدھیہ پردیش کا سب سے اہم تجارتی مرکز بھی ہے۔ اس شہر کو منی ممبئی بھی کہا جاتا ہے۔

تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ مئی 1724ء میں نظام اور مراٹھا پیشوا باجی راؤ کے درمیان ایک معاہدے کی رو سے پیشوا نے مالوا پر مکمل کنٹرول سنبھال لیا اور اپنے کمانڈر ملہار راؤ ہولکر کو صوبے کا صوبیدار (گورنر) مقرر کیا۔ بعد ازاں ملہار راؤ ہولکر کو ایک وسیع علاقہ دے کر ریاست ہولکر کی بنیاد رکھی اور اس کا دارالحکومت مہیشور منتقل

کر دیا۔ اس کے باوجود اندور کی اہم تجارتی اور فوجی مرکز کی حیثیت قائم رہی۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ ہولکر قبیلے کے سردار ملہار راؤ ہولکر نے ایک جنگ میں فتح حاصل کی اور اندور کا شہر بطور مالِ غنیمت اس کے ہاتھ لگا۔

اس ریاست نے مراٹھوں کے ساتھ مل کر انگریزوں سے کئی جنگیں لڑیں مگر کامیاب نہ ہوسکے۔ اس کے بعد اس ریاست کے جانشینوں نے انگریزوں کے ساتھ صلح کر لی اور ان کی ایک طفیلی ریاست کے طور پر رہنے لگے۔ اب تک میں نے جو پڑھا اس کے مطابق ہندوستان کی اکثر ریاستوں نے انگریزوں کے ساتھ مل کر کسی نہ کسی مقامی ریاست کے خلاف جنگ کی اور اس طرح اپنی ریاست بچانے میں کامیاب ہوئے لیکن جب انگریزوں نے ان کی ریاست پر حملہ کیا تو وہ اپنی ریاست کو بھی نہ بچاسکے۔ اس کی بے شمار مثالیں موجود ہیں جن میں سے ایک مراٹھا اور اس کی ذیلی ریاستیں بھی ہیں۔ اندور بھی انھی میں شامل ہے۔

تیسری اینگلو مراٹھا جنگ میں ہولکر حکمرانوں کو شکست ہوئی جس کے نتیجے میں 1818ء کو انگریزوں کے ساتھ ایک معاہدہ ہوا ریاست اندور کے دیوان تنتیہ جوگ نے انگریزوں اور ریاست کے حکمرانوں کے درمیان ایک معاہدہ کروایا جس میں ہولکر خاندان کی ریاست پر حکمرانی قائم رہی۔

ابتدائی دور میں جنگی حالات کی وجہ سے تیس سال تک اس ریاست کی حکمرانی ایک عورت کے ہاتھ رہی۔ ان کا نام ہلیا بائی ہولکر تھا جو 1725ء کو مہاراشٹرا، احمد نگر، جام کھیڈ کے چونڈی گاؤں میں ایک راؤ سردار کے ہاں پیدا ہوئی۔ کہتے ہیں کہ اندور ریاست کا حکمران ملہار راؤ ہولکر ایک گاؤں کے پاس سے گزر رہا تھا تو اس نے اسے دیکھا اور اسے اپنے بیٹے کی بیوی بنانے کا فیصلہ کیا۔ اس طرح یہ خاتون ایک عام سے قصبے سے

محل میں آ گئی۔ اس وقت ہلیا بائی کی عمر صرف آٹھ سال تھی۔ گاؤں میں سکول نہ ہونے کی وجہ سے ہلیا بائی کے والد نے انھیں گھر پر ہی لکھنا پڑھنا سکھایا۔

جاٹوں نے 1754ء میں ایک جاٹ مہاراجہ سورج مل کی قیادت میں دلی پر چڑھائی کی تو مغل حکمران عماد الملک کے کہنے پر ہلیا بائی کے شوہر کھنڈ راؤ ہولکر نے جاٹوں کے خلاف ایک زبردست جنگ کی۔ کشمیر میں ایک لڑائی کے دوران کھنڈ راؤ ہولکر اپنی فوج کا معائنہ کر رہے تھے کہ جاٹ فوج نے اس پر حملہ کر دیا جس کے نتیجہ میں وہ مارا گیا۔ رواج کے مطابق ہلیا بائی کو بھی ستی ہونا تھا لیکن ملہار راؤ نے ہلیا بائی کو ستی کرنے سے منع کر دیا۔ ملہار راؤ ہولکر حکومت کرتا رہا۔ اس کی وفات کے بعد اس کا پوتا حکمران بنا لیکن وہ بھی جلد ہی فوت گیا۔ کسی مرد کے نہ ہونے کی وجہ سے ہلیا بائی اندور کی حکمران بن گئیں اور تیس سال تک ریاست کی حکمران رہیں۔۔ یہ اس علاقے میں اپنی نوعیت کا ایک انوکھا واقع تھا۔

آروند جاولیکر نے ہلیا بھائی کے متعلق ایک کتاب Lokmata Ahilyabai کے نام سے لکھی ہے۔ اس کتاب کے مطابق ہلیا بائی نے اس علاقے میں بے شمار ترقیاتی کام کیے اور اس دور میں ہونے والی تمام جنگوں کی قیادت بھی خود ہی کی۔ وہ ایک مذہبی خاتون تھی۔ اس نے ہندوؤں کے لیے بے شمار مندر، گھاٹ، کنویں اور سرائیں تعمیر کروائیں۔ اس نے ایک نادار بچے کی کفالت کا انتظام کیا جس کی یاد میں اندور کے شہریوں نے 1996ء میں ان کے نام پر ایک ایوارڈ ترتیب دیا جو ہر سال کسی نہ کسی اہم شخصیت کو دیا جاتا ہے۔ بھارت کے ایک وزیر اعظم نانا جی دیش مکھ کو پہلا ایوارڈ دیا گیا۔ ہلیا بائی سے متعلق بہت سے لوگوں نے بے حد خوبصورت باتیں لکھی ہیں۔ پنڈت نہرو نے جو کہا وہ کچھ یوں ہے۔
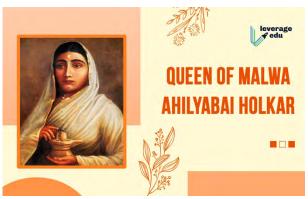
Queen Ahilyabai Holkar, Photo Credit: https://leverageedu.com

وسطی ہندوستان میں اندور کی ہلیا بائی کا دور تیس سال تک رہا۔ جو ایک افسانہ لگتا ہے۔ اس دور میں بہترین نظام اور اچھی حکومت غالب رہی اور لوگ خوشحال ہوئے۔ وہ ایک بہت ہی قابل حکمران اور منتظم تھیں جو اپنی زندگی کے دوران انتہائی خدا ترس اور نیک خاتون جانی جاتیں تھیں اور بے شمار لوگ اس کی بے حد عزت کرتے تھے۔ بھارتی حکومت نے ان کے نام کی ایک ڈاک ٹکٹ بھی جاری کیا ہے۔

انگریزوں کے عمل دخل، ریاستی حکمرانوں کی علم دوستی اور عوام الناس کے جذبہ خیر خواہی کی وجہ سے 1906ء میں شہر بھر میں بجلی کی فراہمی کا کام شروع ہوا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس شہر میں 1909ء فائر بریگیڈ کا عملہ بھی تعینات تھا۔ اس شہر میں 1918ء پہلا ماسٹر پلان ایک انگریز آرکیٹیکٹ اور ٹاؤن پلانر، پیٹرک گیڈیز سے تیار کروایا گیا۔

بعد ازاں آنے والے ہولکر خاندان کے حکمرانوں نے بھی ریاست کی ترقی میں بے حد اہم کارنامے سرانجام دیے۔ اس دوران ایک اہم واقعہ پیش آیا جو اس ریاست کے حکمرانوں کی انصاف پسندی کی اہم نشانی کے طور پر یاد کیا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مہاراجہ

توکوجی راؤ کے دور میں ایک رقاصہ قتل ہو گئ جس کا الزام راجہ پر لگا۔ اس الزام کی وجہ سے راجہ کو تخت سے علیحدہ کر دیا گیا۔ یشونت راؤ ہولکر دوم، اندور ریاست کے آخری حکمران تھے جنہوں نے 1950ء میں بھارت کے ساتھ الحاق کی دستاویز پر دستخط کیے۔ اب یہ علاقہ مدھیہ پردیش کا حصہ ہے۔

اندور شہر میں ایک تاریخی محل ہے جس کا نام راجوادہ ہے۔اسے دو صدیاں قبل مراٹھا سلطنت کے ہولکر خاندان کے بانی ملہار راؤ ہولکر نے 1747ء میں تعمیر کروایا تھا۔ یہ ایک سات منزلہ عمارت ہے جو اپنی مثال آپ ہے۔اسے ہولکر محل کے نام سے بھی جانا جاتا ہے اور اس وقت یہ اندور کے مشہور سیاحتی مقامات میں سے ایک ہے۔ یہاں ملکہ ہلیا بائی کا مجسمہ ایک چشمہ اور مصنوعی آبشار بھی موجود ہے۔

تاریخی کتابوں سے پتہ چلتا ہے کہ یہ شہر دو ہزار سال پرانا ہے۔ ماضی میں اس کا نام اندراپورہ تھا لیکن اب اسے اندور ہی کہا جاتا ہے۔ اس شہر میں واقع سورج مندر بھی ہندوؤں کے نزدیک خاص اہمیت رکھتا ہے۔

اندور مدھیہ پردیش کا سب سے زیادہ آبادی والا شہر ہے۔ اس شہر کی آبادی بیس لاکھ سے بھی زائد ہے۔ یہ مالوا پلوٹو کے جنوبی کنارے پر واقع ہے۔اونچائی پر ہونے کی وجہ سے اس علاقے میں گرمی نسبتاً کم ہوتی ہے۔ یہ شہر ریاست کے دارالحکومت بھوپال سے 190 کلومیٹر مغرب میں واقع ہے۔ پرانے وقتوں میں یہ شہر دکن اور دلی کے مابین تجارتی قافلوں کی گزرگاہ تھا۔ اس وجہ سے یہ شہر تجارتی نقطۂ نظر سے بھی بے حد اہم تھا۔

اسمارٹ سٹیش، مشن کے تحت اسمارٹ سٹی کے طور پر تیار کیے جانے والے سو ہندوستانی شہروں میں سے اندور کو بھی ایک خاص مقام حاصل ہے۔ یہ شہر مسلسل چار سال تک پورے بھارت میں صفائی کے لحاظ سے اول نمبر پر رہا ہے۔ گاڑیوں کی پیداوار کی

وجہ سے اسے بھارت کا ڈیٹر وئیٹ بھی کہتے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ یہاں سے سومیترا مہاجن، مسلسل پچیس سال سے بی جے پی طرف سے الیکشن جیتتی آرہی ہیں۔

ریاست جاورہ (Joara) ہندو مسلم دوستی کے لیے مشہور پختون نواب کی ریاست

ہماری ٹرین رتلم سے روانہ ہوئی تو اس وقت رات کے بارہ بج چکے تھے۔ میرے سوا سب لوگ سو رہے تھے۔ میں بھی کتاب پڑھنے میں مصروف تھا۔ میں نے پڑھا کہ اس علاقہ میں ایک ریاست ایسی بھی تھی جس کے حکمران افغان تھے۔ اسکے ساتھ ساتھ یہاں پر ایک بہت ہی قدیمی امام بارگاہ بھی ہے جہاں دو سو سال پرانا تعزیہ بھی نکالا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ شہر ہندو مسلم اتحاد کے حوالے سے بھی بے حد مشہور ہے۔ اس مسلمان ریاست کا ایک مختصر احوال پیش خدمت ہے۔

ہندوستان میں ریاستیں کیسے بنتی تھیں؟ یہ ایک ایسا سوال تھا جس کے جواب کی تلاش میں مجھے ایک عرصہ لگ گیا۔ مختلف ریاستوں سے متعلق جاننے کے بعد مجھے اس کا جواب ملا۔ ہندوستان میں ایک مغل سلطنت تھی۔ جب یہ سلطنت کمزور ہوئی تو اسی کے مختلف علاقوں میں متعین گورنروں نے اپنے علاقے میں خود مختاری کا اعلان کر دیا اور یوں ایک نئی ریاست کی بنیاد رکھی گئی۔ ریاست حیدرآباد اسی کی ایک مثال ہے۔ جب یہ ریاست بھی کمزور ہوئی تو اس میں سے بھی ایک نئی ریاست نے جنم لیا۔ انگریزوں کے دور میں انھوں نے یہ کام شروع کیا کہ وہ ایک بڑی ریاست بناتے اور بعد میں کسی سے خوش ہو کر اس ریاست کا کچھ حصہ اسے دے دیتے۔ اس کی ایک مثال ریاست جاورہ ہے۔ اس ریاست کا راجہ اندور کے راجہ کا ایک ماتحت تھا۔ انگریزوں نے انھیں پندرہ سو مربع کلومیٹر کا ایک علاقہ دے کر نئی ریاست بنا دی۔ اندور کا راجہ مراٹھوں کا ایک جرنیل تھا اسے مراٹھوں سے الگ کر کے ایک ریاست بنا کر دی گئی۔ مراٹھوں اور نظام کے درمیان

ایک معاہدہ کروا کر مراٹھا ریاست کی بنیاد رکھی گئی۔ اس طرح ہندوستان میں پانچ سو سے زائد ریاستیں وجود میں آئیں جو سب انگریزوں کی طفیلی ریاستیں تھیں۔ انھیں کسی حد تک داخلی خود مختاری تو تھی لیکن خارجی معاملات کے لیے وہ انگریزوں کی ہر بات ماننے کے پابند تھے اور جنگ کی صورت میں انگریزوں کی مالی اور جانی امداد کرنا بھی ان کی ذمہ داری تھی۔

ہندوستان کی تاریخ جاننے کے لیے ایک بہت ہی مفید سلسلہ The Imperial Gazetteer of India کے نام سے انگریزوں نے شروع کیا اور اسے آکسفورڈ پریس سے چھاپا۔ اس کے کئی مجموعے ہیں۔ ان مجموعوں میں مختلف علاقوں اور ریاستوں کے بارے میں تفصیل سے لکھا گیا ہے۔ اس کے ایک مجموعہ جس کا پورا نام کچھ یوں ہے The Imperial Gazetteer of India Jaisalmer to Kara Volume: XIV جو 1908ء میں شائع ہوا میں بڑی تفصیل سے ریاست جاورہ کے متعلق لکھا ہوا ہے۔ اس کے مطابق ریاست جاورہ کی بنیاد عبد الغفور محمد خان نے رکھی ۔ عبدالغفور محمد خان ایک مقامی سردار کی فوج میں کیولری افسر تھے۔ کسی دور میں وہ ہولکر مہاراجہ کی ملازمت بھی کرتے تھے۔ ان کی وفاداری سے خوش ہو کر برطانوی حکومت نے 1818ء میں ایک معاہدے کے تحت نواب کو مالوا کے کچھ علاقے دے دیے اور ان علاقوں سے خراج وصول کرنے کا اختیار بھی دے دیا۔ اس ریاست کے نواب کی یہ ذمہ داری تھی کہ جب بھی انگریزوں کو ضرورت ہو گی یہ ریاست پانچ سو گھوڑوں، پانچ سو پیادہ سپاہی اور چار توپ خانے مہیا کرے گی۔ ایک وقت آیا جب نواب محمد اسماعیل خود ہی فوج میں بطور اعزازی میجر بھرتی ہو گیا۔ انگریزوں نے ایک مرتبہ پھر اس ریاست کی تقسیم کی اور 1924ء میں ایک علیحدہ ریاست بنا دی لیکن جلد ہی انگریزوں نے اس نئی ریاست کی حیثیت ختم کر کے اسے برٹش انڈیا میں شامل کر لیا۔ نواب محمد عثمان علی خان تقسیم ہند کے وقت اس ریاست کے آخری حکمران تھے۔

یہ خاندان بنیادی طور پر تاجک خیل قبیلے سے تعلق رکھتا تھا۔ انھوں نے یوسف زئی قبیلے میں شادیاں کیں اور ایک مدت تک وادی سوات میں آباد رہے۔ بہتر مستقبل کی خاطر اس قبیلے کا سردار عبد الماجد خان، محمد شاہ کے دور حکومت میں ہندوستان آگیا۔ اس نے نواب زبیتا خان (جس کا تعلق یوسف زئی قبیلے سے تھا) کے ہاں ملازمت کر لی اور وہ اس کا معتمد اور مشیر بن گیا۔ یہ لوگ بہادر بھی تھے اور سمجھدار بھی۔ انھوں نے علاقے میں موجود مختلف نوابوں اور راجاؤں کی ملازمتیں کیں۔ کچھ لوگ رام پور کے نوابوں کے دربار سے منسلک ہو گئے۔ قسمت نے ساتھ دیا اور عبد المجید خان کے پوتے نواب عبد الغفور خان، ٹونک کے روہیلہ نواب امیر خان کے کیولری کمانڈر بن گئے۔ اس طرح ترقی کے دروازے کھلنا شروع ہو گئے۔ ان کی بہادری کی وجہ سے انھیں اعلیٰ القابات سے بھی نوازا گیا۔ آخر کار یہ خود نواب بن گئے۔ اس طرح وہ اِفغانستان سے آ کر اپنی بہادری، عقلمندی اور وفاداری کی بنیاد پے ہندوستان میں ایک ریاست حکمران بن گئے۔ انھوں نے پہلے مغل حکمرانوں کی وفاداری کا دم بھرا، پھر انگریزوں کا۔

Photo Credit: https://www.facebook.com/jaoraratlammp

محرم کے دنوں میں اس شہر میں ایک بہت بڑا جلوس نکالا جاتا ہے اور لاتعداد مجالس کا اہتمام بھی کیا جاتا ہے جن میں شرکت کے لیے دنیا بھر سے ہزاروں افراد یہاں

کے ایک مشہور بزرگ حسین ٹیکری کے مزار پر حاضری دیتے ہیں۔اس شہر میں جین مت کے ماننے والوں کی ایک اہم مذہبی عمارت بھی ہے۔اس علاقے میں سب سے مشہور مقام حسین ٹیکری کا مزار ہے جو ڈیڑھ سو سال قبل جاورہ کے نواب محمد افتخار علی خان نے تعمیر کروایا۔ نواب محمد افتخار علی خان نے بھی اسی قبرستان میں دفن ہونے کی وصیت کی تھی۔ ماہِ محرم کے دوران ، ہزاروں افراد یہاں امام حسین کے مزارات (جو عراق میں ہیں) کی طرز پر بنائے گئے مزارات پر آتے ہیں۔ یہ مزار ذہنی بیماریوں کے علاج کے حوالے سے بے حد مشہور ہیں۔

یہاں پر ایک کہانی مشہور ہے کہ گھوڑوں پر کچھ لوگ اس علاقے میں آئے جن سے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ لوگ کربلا میں شہید ہونے والے افراد کی روحیں تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہاں پر راتوں رات ان روحوں نے ایک تالاب بھی بنایا، جو پہلے کبھی موجود نہ تھا۔اس مزار کی خاص بات یہ ہے کہ یہاں بریلوی، شیعہ ، سنی، حتیٰ کہ ہندو بھی جنات ، بھوتوں اور بدروحوں سے نجات حاصل کرنے کے لیے آتے ہیں۔ زائرین کا ایمان ہے کہ جنات اور بدروحیں مزار کے سامنے ہتھیار ڈال دیتی ہیں اور مقبوضہ شخص کو چھوڑ دیتی ہیں۔

یہ ریاست بھی ان ریاستوں میں شامل ہے جہاں حکمران تو مسلمان تھے لیکن عوم کی اکثریت غیر مسلم تھی۔ اپنی جغرافیائی صورتِ حال کے سبب اس ریاست کے حکمران پاکستان کے ساتھ تو نہیں مل سکتے تھے لیکن آزاد ضرور رہنا چاہتے تھے۔ مگر وہ ایسا نہ کرسکے اور انھیں پاکستان کی بجائے اپنی مرضی کے خلاف چلتے ہوئے بھارت میں شامل ہونے پر مجبور کیا گیا۔

یہ ایک دلچسپ بات ہے کہ اس ریاست کا پرچم پاکستان کے پرچم سے بہت حد تک ملتا ہے۔

Nawab Iftikhar Ali Khan of Joara
Photo Credit:
https://www.flickr.com/photos/rashid_ashraf

مینڈسور: دو ہزار سال سے بھی پرانا شہر ہے: سلاطین دلی سے مغل حکمرانوں تک

مختلف کتابوں سے مجھے معلوم ہوا کہ اس علاقے میں ایک ایسا شہر بھی ہے جو آثارِ قدیمہ کے ماہرین کے مطابق دو ہزار سال پرانا ہے۔ دو سو سال پہلے اس علاقے سے ایک بڑے پتھر کے ستون ملے جن پر سنسکرت میں بے حد دلچسپ تحریریں لکھی ہوئی تھیں۔ اس کے علاوہ اس شہر میں ہندوؤں کا ایک انتہائی مقدس مندر بھی موجود ہے۔ یہاں پر ایک قلعہ بھی ہے جس پر قبضے کے لیے بے شمار جنگیں ہوئیں۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ کسی دور میں یہ علاقہ ریاست گوالیار کا حصہ بھی رہا ہے۔ اس علاقے میں موجود ایک

بڑے ڈیم نے میری اس علاقے میں دلچسپی کو مزید بڑھایا۔ یہ سب جان کر میں نے مینڈ سور کی تاریخ کو مزید کریدا جس سے حاصل ہونے والی معلومات پیش خدمت ہے۔

اس خطہ کی تاریخ جاننے لے لیے میں نے دو کتابوں سے استفادہ کیا ہے۔ ایک کتاب رادے شیام چوریسیا نے History of Ancient India: Earliest Times to 1000 A.D. کے نام سے لکھی ہے اور دوسری کتاب Studies in the History of Malwa, Volume 6Malava Itihas P arishad., 1981 - Malwa (Madhya Pradesh and Rajasthan, India) ہے جسے مالوہ کی تاریخ لکھنے والے ایک ادارہ نے چھاپا ہے۔

یہ شہر رتلم سے نوّے کلومیٹر شمال مغرب کی طرف راجستھان کی سرحد کے پاس ممبئ سے دلی جانے والی ریل لائن سے ہٹ کر موجود ہے۔ اگر آپ بھارت کے نقشے کو دیکھیں تو آپ جان سکیں گے کہ یہ علاقہ ایک طرح سے دلی سے گجرات اور راجستھان جانے والے راستہ پر واقع ہے۔ اس وجہ سے مجھے یوں لگتا ہے کہ جسے بھی گجرات اور راجستھان کو فتح کرنا ہوتا اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ پہلے اس علاقہ پر کنٹرول حاصل کرے۔ یہاں پر موجود دو دیہاتوں کے ناموں کو ملا کر اس علاقے کا نام رکھا گیا۔ ایک روایت یہ بھی کہ اس جگہ کا پرانا نام دش پورہ، اس علاقے میں دس دیہات ہونے کی وجہ سے پڑا تھا۔ ہندوؤں کے نزدیک راون کا تعلق بھی اس شہر سے ہے، اسی لیے اس شہر میں اس کا پینتیس فٹ اونچا مجسمہ بھی بنایا گیا ہے۔ راون کی وجہ سے بھی یہ ہندوؤں کا ایک مقدس شہر ہے۔

آثار قدیمہ سے پتہ چلتا ہے کہ اس علاقے میں آج سے دو ہزار سال قبل ایک ریاست قائم تھی جس نے کئ سو سال حکومت کی اور اس کے بعد بھی کئ راجے اس علاقے پر قابض رہے۔ ایک وقت آیا کہ سلاطین دلی نے یہاں قبضہ کر لیا۔ اس شہر کے

قریب پتھروں کے دو بڑے ستون بھی ملے، جن کے متعلق یہ خیال کیا جاتا ہے کہ انھیں چھٹی صدی عیسوی میں تعمیر کیا گیا اور ان پر اس وقت کے بادشاہ نے ایک جنگ میں فتح کے بعد اپنے کارناموں کو تحریر کیا۔ ان ستونوں کو پہلی مرتبہ ایک انگریز نے 1875ء میں دریافت کیا۔ یہ ستون چالیس فٹ اونچے ہیں اور ان کا وزن دو سو ٹن سے بھی زیادہ ہے۔ میں یہ جان کر حیران رہ گیا کہ یہ پتھر کا ایک مکمل ٹکڑا ہے، یعنی اس میں کوئی جوڑ نہیں ہے۔ اتنا بھاری پتھر کیسے لایا گیا اور اسے کیسے کھڑا کیا گیا ہوگا۔۔۔ یہ بات حیران کر دینے والی ہے!

تیمور کے حملے کے بعد جب دلی سلطنت کمزور پڑی تو حسب روایت دلاور خان غوری جو دلی سلطنت کے زوال کے وقت صوبہ مالوا کا گورنر تھا نے آزادی کا اعلان کر دیا اور مالوا کا حکمران بن بیٹھا۔ اس کی وفات کے بعد اس کا بیٹا ہوشنگ شاہ حکمران بنا۔ اس طرح یہ علاقہ ایک الگ ریاست کے طور پر جانا جانے لگا۔ اس نے ایک پرانی روایت کو جاری رکھتے ہوئے اس شہر کا صدیوں پرانا نام بدل کر اپنی پسند کا نام شادی آباد کر دیا لوگوں نے اسے اس وقت تک قبول کیا جب تک وہ کمزور تھے لیکن جیسے ہی انھیں موقع ملا انھوں نے اس کا قدیم نام دوبارہ رائج کر دیا۔ ہوشنگ شاہ غوری نے اس شہر میں ایک زبردست قلعہ تعمیر کروایا جس پر ایک خونریز جنگ کے بعد رانا سانگا نے قبضہ کیا اور اشو کمل راجپوت کو قلعے کا نگران مقرر کیا۔

ہمایوں بھی اپنی مالوا مہم کے دنوں میں کچھ وقت یہاں رہا۔ شیر شاہ سوری بھی کسی سے پیچھے نہ رہا اور اس نے بھی اس علاقے کو فتح کر کے صدر خان نامی کمانڈر کو یہاں کی نگرانی سپرد کر دی۔ اکبر کے دور میں یہ علاقہ ایک دفعہ پھر مغل سلطنت کا باقاعدہ حصہ بن گیا۔ مغلوں کے دور میں مالوا کے صوبیدار سوائے جے سنگھ اور مراٹھوں کے درمیان ایک جنگ کے نتیجے میں یہ قلعہ مغلوں کے ہاتھ سے نکل گیا۔ انگریزوں اور ہولکر خاندان

کے درمیان وہ تاریخی معاہدہ بھی اسی قلعے میں ہوا جس کے نتیجے میں مالوا پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔

اس شہر کی خاص بات یہاں کی شرح خواندگی ہے۔ جو مردوں میں بانوے فیصد اور عورتوں میں پچاسی فیصد ہے۔ یہ بات نہایت ہی قابل ستائش ہے۔ اس علاقے کے چنبل دریا پر چونسٹھ میٹر اونچا بند بنایا گیا ہے جس میں سات ہزار ملین مکعب میٹر پانی ذخیرہ کرنے کی گنجائش ہے۔

جھالاور ریاست: جہاں ایک قدیم اور عجیب و غریب قلعہ موجود ہے

میں نے ہندوستان کی تاریخ پڑھتے ہوئے کئی جگہ یہ پڑھا کہ جب ہندوؤں کو جنگ میں شکست ہو جاتی تو انکی عورتیں خاص طور پر راجپوت عورتیں خود کو آگ میں جلا کر خودکشی کر لیتی تھیں۔ یہ سب اس لیے کیا جاتا تاکہ ان کی عزت اور ناموس محفوظ رہے۔ فتح حاصل کرنے والے لوگ عام طور پر عورتوں کو مالِ غنیمت کے طور پر قبضے میں لے لیتے تھے۔ بعض اوقات انھیں تاوان کے طور پر بھی استعمال کیا جاتا تھا۔

ہوتا کچھ یوں تھا کہ مرد حضرات میدان جنگ کی طرف چلے جاتے اور پیچھے رہ جانے والی عورتوں کو ایک بڑی جگہ پر اکٹھا کر کے کچھ لوگ ان کی نگرانی پر بٹھا دیے جاتے تھے۔ اگر فتح ہوتی تو ان عورتوں کو ان کے گھروں میں واپس بھیج دیا جاتا اور اگر شکست ہو جاتی تو انھیں جلا کر مار دیا جاتا تھا، اسے ایک انتہائی ظالمانہ اقدام کہا جا سکتا ہے۔ اس عمل کے لیے ہندو دھرم میں جوہر کی اصطلاح استعمال کی جاتی تھی۔ اس رسم کے بارے میں سوچ کر میرے رونگھٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

۔ اس ریاست کے بارے میں میں نے درج ذیل دو کتابوں سے استفادہ کیا ہے۔

ایک کتاب سی ایس بائلے نے Chiefs and Leading Families in Rajputana کے نام سے لکھی ہے اور دوسری کتاب ایک ادارہ جس کا نام راجپوتانہ ایجنسی ہے نے شائع کی ہے۔ اس کا عنوان ہے **List of Ruling Princes, Chiefs and Leading Personages**, Issues 2-13 ان کتابوں کے مطابق جھالاور رتلم کے شمال مشرق میں راجستھان کا ایک قصبہ ہے۔ کسی وقت میں یہ بھی ایک ریاست تھی جس کا ایک مختصر حال میں آئندہ صفحات میں آپ کے سامنے پیش کروں گا لیکن اس قصبے سے جڑے ہوئے ایک بہت ہی حیرت انگیز واقعے کا تذکرہ یہاں ضروری ہے جس میں ایک جنگ میں شکست کے بعد مقامی راجپوتوں نے سینکڑوں کی تعداد میں اپنی عورتوں کو خود ہی اپنے ہاتھوں جلا کر مار دیا تھا تا کہ وہ دشمنوں کے ہاتھ نہ لگ سکیں۔ اس علاقے میں ایسا دو مرتبہ ہوا۔ میں نے اس طرح کے کئی واقعات کتابوں میں پڑھے تھے لیکن مجھے کسی ایسے علاقے سے گزرنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا جہاں پر ایسا واقعہ رونما ہوا ہو۔

جھالاور قصبہ ریلوے لائن سے کچھ دور تھا اس لیے میں اسے نہ دیکھ سکا لیکن مجھے اس علاقے سے گزرنے کا موقع ضرور ملا جہاں پر جوہر کا تاریخی واقعہ پیش آیا تھا۔ میں تصور ہی تصور میں اس واقعے کو ہوتا دیکھ رہا تھا۔ ایسے منظر کا تو تصور بھی بے حد تکلیف دہ ہے کہ کس طرح اپنی ہی خواتین کو اپنے ہی ہاتھوں جلا دیا جاتا تھا۔ یہ روایت کب سے تھی کب تک رہی۔ مجھے اس بارے میں زیادہ معلومات تو نہیں لیکن یہ درست ہے کہ اب دنیا میں ایسا نہیں ہوتا۔

میدان جنگ میں شکست کی صورت میں ہندو خواتین کی اجتماعی خودکشی

ہندو دھرم میں ایسی اجتماعی خودکشی کو جوہر کہتے ہیں۔ یہ ستی کی طرح ایک رسم ہے۔ تاریخی کتب میں اس بارے میں مختلف روایات ملتی ہیں۔ کچھ لوگوں نے لکھا

ہے کہ یہ رسم اس وقت شروع ہوئی جب یونانیوں نے ہندوستان پر حملہ کیا تھا۔ کچھ نے یہ لکھا کہ یہ رسم صرف اس صورت میں ادا کی جاتی تھی جب مسلمان اور ہندو راجپوتوں کی لڑائی ہوتی تھی۔ ایک مؤرخ یہ بھی لکھتا ہے کہ یہ رسم اس وقت ادا کی جاتی رہی جب ہندوستان میں راجپوتوں کی آپسی لڑائیاں ہوتی تھیں۔ ان تینوں میں کون سی بات سچ ہے وہ جاننا کافی مشکل ہے لیکن یہ بات واضح ہے کہ یہ رسم صرف شمالی ہندوستان کے اُن علاقوں میں ہوتی تھی جہاں راجپوتوں کی حکومت تھی یا راجپوت بہت بڑی تعداد میں آباد تھے۔

جھالاوار کے علاقے گوگرون (Gargron) کے قلعے پر قبضے کے دوران دو مرتبہ ایسا موقع آیا کہ جب اس رسم کو ادا کیا گیا۔ اس کے علاوہ بھی ہندوستان کے مختلف علاقوں میں اس رسم کو ادا کیا گیا۔ جب میں اس علاقے سے گزر رہا تھا تو مجھے معلوم ہوا کہ یہ ان علاقوں میں سے ایک ہے جہاں پر سینکڑوں کی تعداد میں خواتین نے اپنے آپ کو ہلاک کیا یا ان کے مردوں نے ان کی مرضی کے خلاف انھیں جلایا تھا۔

Jhalawar Fort:Located in the heart of the city, called Garh Palace by locals Photo Credit: https://www.quora.com

اب تو اس بات کا تصور بھی نہیں کیا جاتا لیکن کسی دور میں یہ عام سی بات تھی۔ اور اس کے ساتھ ساتھ ستی کی رسم بھی عام تھی جس میں خاوند کے انتقال کی صورت میں بیوی کا جل جانا بھی ایک مذہبی معاملہ سمجھا جاتا تھا۔

تاریخ میں آتا ہے کہ رنجیت سنگھ کی میت کے ساتھ چودہ خواتین نے بھی موت کو گلے لگایا تھا۔ تاریخ میں یہ بھی ملتا ہے کہ جتنا بڑا آدمی ہوتا اتنی بڑی تعداد میں خواتین اپنے آپ کو جلاتی تھیں بیویوں کے علاوہ اس تعداد میں لونڈیاں بھی شامل ہوتی تھیں۔

میرے لیے یہ سمجھنا بہت مشکل ہے کہ ہندو دھرم میں جو ہمیشہ امن و آشتی کی بات کرتا ہے اس بات کو کیسے قبول کیا گیا ہے کہ خاوند فوت ہو جائے تو اس کی بیوی کو بھی باقاعدہ تیار کر کے شمشان گھاٹ پر لے جا کہ زندہ جلایا جاتا تھا۔ جو خاتون ایسا کرتی تھی اسے عزت دی جاتی تھی۔ اسے دیوی کے نام سے جانا جاتا تھا۔

جیسا کہ میں نے پچھلے صفحات میں لکھا کہ جب ایک ریاست کے راجہ کا بیٹا رتن سنگھ ایک جنگ میں مارا گیا تو اس کے باپ نے اپنی بہو کو ستی ہونے سے منع کیا اور بعد میں وہ خاتون اس علاقے میں تیس سال تک حکمران رہی۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اگر کوئی چاہے کہ ان کے ہاں کوئی خاتون ستی نہ ہو تو یہ بھی ممکن تھا۔ اس سب کے باوجود میرے لیے یہ سمجھنا مشکل ہے کہ ہندو دھرم نے اتنے تکلیف دہ عمل جس میں ایک زندہ خاتون کو جلایا جاتا تھا کو کس طرح سے برداشت کیا اور کس طرح سے اپنے ہاں پروان چڑھایا۔ کس بے دردی سے ان کے بچوں کو یتیم اور بے آسرا کیا جاتا تھا۔ بہر حال یہ تاریخ کا واقعہ ہے جو ہوتا رہا ہے لیکن اللہ کا شکر ہے کہ اب یہ ایسا کچھ نہیں ہوتا۔

Brave queen padmini of india recognized for jauhar over debase Photo Credit: https://www.maharajatrails.com

اس موقع پر میں یہ بات بھی آپ کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں جس کی گواہی میرے اپنے خاندان سے بھی میرے پاس موجود ہے کہ جب تقسیم ہند کے وقت فسادات ہوئے تب بھی بہت سے مسلمان خواتین نے کنوؤں میں چھلانگ لگا کر موت کو گلے لگالیا تھا تاکہ وہ ہندوؤں اور سکھوں کے ہاتھ نہ لگ سکیں۔ ہمارے خاندان کی خواتین نے بھی ایسا کیا۔ میری ایک رشتے کی خالہ جس کی تین بچیاں تھیں نے ایک کنوئیں میں چھلانگ لگائی ان کی دو بچیاں بچ گئیں اور ایک بچی ان کے ساتھ ہی اللہ کو پیاری ہو گئی۔ جو ایک بچی بچ گئی اس کی شادی میرے چچا کے ساتھ ہوئی۔

تقسیم ہند کے وقت کسی خاندان کی ہجرت کا واقعہ پڑھتے ہوئے مجھے پتہ چلا کہ فسادات کے وقت جب ان کے گاؤں پر حملہ ہوا تو وہ اپنے گاؤں کی تمام خواتین کو قریب سے گزرنے والی ندی کے کنارے لے گئے اور انھیں وہاں کھڑا کرکے کہا کہ اگر ہندو اور سکھ فسادیوں نے ہم پر غلبہ حاصل کر لیا اور ہم مارے گئے تو آپ آگے آنے کی بجائے ندی میں چلی جائیں گی تاکہ آپ اپنے آپ کو ان لوگوں کے ہاتھ لگنے سے بچا سکیں۔ فسادی جیت گئے اور پھر وہی ہوا جس کا تصور بھی مشکل ہے۔ وہ بھی ایک اجتماعی خودکشی تھی۔

اللہ رُب العزت سے دعا ہے اللہ تعالیٰ انسانوں کو ایسی صورت حال سے محفوظ رکھے۔ آمین

جھالاور ریاست اور راجپوت حکمران

جھالا ور ریاست کا بانی ایک راجپوت سردار، جھالہ زلیم سنگھ تھا۔ جھالہ زلیم سنگھ اس وقت کی ایک بڑی ریاست کوٹا میں دیوان کے طور پر کام کرتا تھا۔اس علاقے میں ایک فوجی چھاؤنی تھی جس کا نام امید پورہ تھا۔ جھالہ زلیم سنگھ نے اس علاقے کو مراٹھوں کا راستہ روکنے کے اعتبار سے موزوں جانتے ہوئے اسے ایک فوجی چھاؤنی کی حیثیت سے ترقی دینے کا فیصلہ کیا۔ یہ ریاست کوٹا کو بچانے کا ایک منصوبہ تھا۔ پھر ایک وقت آیا جب انگریزوں نے جھالہ زلیم سنگھ کی خدمات کے اعتراف میں ایک بڑے علاقے کو ریاست کوٹا سے الگ کرکے زلیم سنگھ کے پوتے جھالہ مدن سنگھ کو اس کا حکمران بنا دیا۔ اس طرح وہ ریاست جھالاور کے پہلے حکمران بنے اور انھوں نے جھالاور کی تاریخ میں نمایاں مقام بھی حاصل کیا۔

سی ایس بائلے نے (صفحہ 85) پر لکھا ہے کہ اس ریاست کے حکمرانوں کا تعلق کوتاہ سے تھا اور وہ جھالا قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ کاٹھیاواڑ سے اس علاقے میں آئے تھے۔ جھالاور کے مرکزی قصبے کو پٹن یا جھلراپٹن بھی کہا جاتا ہے۔اس شہر سے چار میل کے فاصلہ پر ایک محل کی باقیات موجود ہیں جن سے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہاں کسی دور میں چندراوتی نام کا ایک شہر تھا جسے اورنگزیب کے دور میں تباہ کیا گیا۔ اس علاقے میں ایک مندر کی باقیات بھی پائی جاتی ہیں۔ کوٹہ ریاست کے اندرونی اختلافات کی وجہ سے جھالا زلیم سنگھ کو اپنی الگ سلطنت قائم کرنے کا موقع ملا، جس کے لیے اسے انگریزوں کی مکمل حمایت حاصل تھی۔ اس نے انگریزوں سے ایک معاہدہ کیا جس میں اس نے انگریزوں کی بالادستی کو تسلیم کیا اور سالانہ خراج کے طور پر ایک بڑی رقم سے کسی بھی مشکل صورت میں انگریزوں کی امداد کو یقینی بنایا۔ اس سب کے بدلے انگریزوں نے مدن سنگھ کو مہاراجہ رانا کا خطاب دیا۔

جھالاوار ضلع میں واقع یہ قلعہ چاروں طرف سے پانی سے گھرا ہوا ہے۔ یہ قلعہ اس لحاظ سے بھی منفرد ہے کہ آج تک کوئی اس کی بنیادوں کے بارے میں نہیں جان سکا۔ اس قلعے میں کئی منزلیں ہیں۔ اپنے طرزِ تعمیر کی وجہ سے اسے ایک بھارت بھر میں اسے ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔

اس علاقے میں دو تھرمل پاور یونٹ بھی کام کر رہے ہیں۔ جن کی استطاعت بارہ سو میگا واٹ ہے۔ یہاں دنیا کی سب سے اونچی چمنی بھی لگائی گئی ہے جس کی اونچائی نو سو فٹ ہے۔ جھاوار پٹن کے علاقے میں ہزار سال سے بھی پرانے مندر موجود ہیں۔ جن میں سے اب چند ہی اپنی اصل حالت میں ہیں۔ یہاں موجود سن مندر یا سوریا مندر ہی وہ قدیم مندر ہے جو اپنے طرزِ تعمیر کی وجہ سے زیادہ مشہور ہے۔

گوگرون (Gagron) رانا سانگا اور سلاطین دلی کی لڑائی کا میدان جنگ اور تاریخی ایک قلعہ

دہلی سے پہلے ہم ایک ایسے علاقے سے گزر رہے تھے جس کا تاریخ میں بارہا ذکر آیا ہے۔ موجودہ دور میں بھی اس کی اہمیت میں بے حد اضافہ ہوا ہے۔ میرے ایک انتہائی پیارے دوست یاسین خان صاحب کے آباؤاجداد کا تعلق بھی اسی علاقے سے تھا۔

اس علاقے کے بارے میں جاننے کے لیے میں نے درج ذیل تین کتابوں سے استفادہ کیا۔

شائل میرام کی کتاب Against History, Against State

ڈاکٹر اعجاز احمد کی کتاب History of Mewat

بخشیش سنگھ نیجار کی کتاب Origins and History of Jats and Other Allied Nomadic Tribes of India: 900 B ...

جو جانا اس کا ایک مختصر ذکر پیشِ خدمت ہے۔

گو گرون جھاوار پتن کے پاس ہی ہے جہاں گجرات اور مالوا کے مسلمان حکمرانوں کی مشترکہ افواج اور میواڑ کے رانا سانگا کی سربراہی میں راجپوتوں کی ایک بڑی فوج کے درمیان ایک فیصلہ کن جنگ لڑی گئی جس میں راجپوتوں کو فتح حاصل ہوئی۔ اس کے بعد رانا سانگا کے لیے مالوا کی فتح بے حد آسان ہو گئی۔

رانا سانگا نے سلطان کے ساتھ بڑا اچھا سلوک کیا لیکن رانا نے سلطان سے پانچ ہزار گھوڑوں کا بھاری جرمانہ بھی وصول کیا۔ اس لڑائی کے بعد رانا سانگا نے ایک اور جنگ میں ابراہیم لودھی کو بھی شکست دی۔ رانا سانگا سے متعلق تاریخ میں بے حد مواد موجود ہے۔ اس نے سلاطین دلی کا مقابلہ بھی کیا اور انھیں شکست دی۔ جب بابر نے ابراہیم لودھی کو شکست دی تو بابر نے سوچا کہ اس کی حکومت اس وقت تک مستحکم نہیں ہو سکتی جب تک وہ رانا سانگا کو زیر نہ کرلے۔ رانا سانگا نے بھی اس کا مقابلہ کرنے کا فیصلہ کر لیا اور پہلی جنگ میں بابر کو شکست دی۔ ایک سال بعد دوبارہ جنگ ہوئی، جس میں رانا سانگا کی فوج اسے زخمی حالت میں میدان جنگ سے باہر لے گئی۔ جب اسے پتہ چلا کہ فوج میدان جنگ سے باہر چلی گئی ہے تو اس نے دوبارہ جنگ کرنے کا فیصلہ کیا لیکن اس کے سردار ہمت ہار چکے تھے اور وہ میدان جنگ سے باہر ہی موت کی آغوش میں چلا گیا۔

Photo Credit: https://www.dnpindia.in

میں اس سفر نامے میں رانا سانگا کے بارے میں کچھ زیادہ تو نہیں لکھ سکتا لیکن اس کی زندگی کی دو باتیں نہایت قابلِ ذکر ہیں۔ ایک یہ کہ وہ بہت بڑا جنگجو تھا اور اس نے بیسیوں جنگیں لڑیں اور ان جنگوں میں اس کی آنکھ، ہاتھ اور پاؤں کو نقصان بھی پہنچا لیکن اس کے باوجود بھی سوائے آخری جنگ کے وہ اکثر جنگوں میں فتح یاب ہوا۔ فتح حاصل کرنے کے بعد اس نے دشمن کو قید بھی کیا لیکن ان کے ساتھ اچھا سلوک بھی کیا۔ اس نے افغانیوں، مغلوں اور سلاطین دلی کے ساتھ باری باری جنگ کی اور ان سب کو شکست دی۔ میرے علم کے مطابق وہ ہندوستان کا واحد سردار تھا جس نے تینوں غیر ملکی حملہ آوروں کا مقابلہ کیا۔

دوسری بات مجھے یہ معلوم ہوئی کہ وہ باکمال سیاسی شعور بھی رکھتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ اکیلا غیر ملکی حملہ آوروں کا مقابلہ نہیں کر سکتا اس لیے اس نے اپنے قرب وجوار اور دور دراز میں واقع مختلف ہندو ریاستوں سے اپنے تعلقات استوار کیے اور انھیں اپنے ساتھ جنگ میں لے کر گیا۔ ایسا صرف اچھی سیاسی سوچ کے ساتھ ہی ہو سکتا ہے۔ اس نے تمام ریاستوں کے راجاؤں کو یہ بات باور کروائی کہ اگر سلاطین دلی اور اس کے بعد افغان لودھی اور اس کے بعد بابر کا راستہ نہ روکا گیا تو یہ تمام ریاستوں کو ختم کر دیں گے۔ اس لیے ضروری تھا کہ وہ سب مل کر ان کا مقابلہ کریں۔ اس میں وہ بہت حد تک کامیاب بھی ہوا۔ اسے ہندو دھرم میں ایک بڑا مقام حاصل ہے۔ ان کے نزدیک رانا سانگا کی بابر کو دی گئی شکست نے ہندوستان کی تاریخ کا فیصلہ کر دیا اگر وہ شکست نہ ہوتی تو کبھی بھی مغلوں کو ہندوستان میں حکومت کا موقع نہ ملتا۔ تاریخ سے بھی یہی پتہ چلتا ہے کہ مغلوں نے رانا سانگا کو شکست دی اور اس طرح انھوں نے ان تمام علاقوں پر قبضہ کیا جہاں پر رانا سانگا حکمرانی کرتا تھا۔

گوگرون قلعے: اپنی نوعیت کا واحد قلعہ

راجستھان میں بے شمار قلعے موجود ہیں۔ ان میں ایک قلعے گوگرون بھی ہے جو جھالاور ریاست میں واقع ہے۔ یہ قلعہ یونیسکو کی اس فہرست میں ہے جسے تاریخی طور پر محفوظ کرنے کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ ایسا اس کے غیر معمولی فن تعمیر کی وجہ سے ہے۔ کہتے ہیں کہ اس قلعے کی تعمیر ساتویں صدی میں ہوئی لیکن اسے سب سے زیادہ ترقی چودھویں صدی میں اس وقت کے راجہ نے دی۔

اس قلعے کے پاس ایک دریا بہتا ہے یہ قلعہ چاروں طرف سے پانی میں گھرا ہوا ہے۔ اس قلعے میں بے شمار مندر ہیں۔ اس کے علاوہ اس قلعے میں صوفی بزرگ میتھ شاہ کا مقبرہ بھی ہے جہاں ہر سال محرم میں ایک بڑا میلہ لگتا ہے جس میں ہندو اور مسلمان دونوں ہی بڑے شوق سے شریک ہوتے ہیں۔ بھارت بھر میں مسلمان صوفیا کرام کے ایسے بے شمار مزار ہیں جو ہندوؤں کے نزدیک بھی قابلِ احترام ہیں۔۔ تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ اس قلعے پر تین سو سال تک ایک ہندو خاندان کی حکومت رہی۔ کہا جاتا ہے کہ اس قلعے پر قبضے کی خاطر چودہ جنگیں لڑی گئیں اور دو جوہر کے واقعات بھی ہوئے۔

تاریخی کتب کے مطابق اچلد اس قلعے کا آخری حکمران تھا۔ اس کے دور میں سلطان ہوشنگ شاہ نے اپنی بڑی فوج کے ساتھ اس قلعے کا محاصرہ کیا۔ بہت جلد اسے اپنی شکست کا یقین ہو چکا تھا لیکن پھر بھی اس نے لڑنے کو ترجیح دی اور ایک بہادر حکمران کی طرح بہادری سے لڑتے ہوئے میدان جنگ میں موت کو گلے لگایا۔ یہ بات بھی دلچسپ ہے کہ ہوشنگ شاہ نے فتح حاصل کرنے کے بعد اچلد اس کی بہادری سے متاثر ہو کر اس کے ذاتی کمرے اور بستر کو اسی حالت میں رہنے دیا، جو 1950ء تک اسی جگہ پر رہا۔

کسی بہادر کا بہادر کی قدر کرنے کا یہ بھی ایک انداز ہے!

چاند باؤلی: جہاں ایک ہزار سال پرانا کنواں اب بھی موجود ہے

اس علاقے کی تاریخ پڑھتے ہوئے یہ جانا کہ یہاں ایک ایسا قصبہ بھی موجود ہے جو کوٹہ سے زیادہ دور نہیں ہے وہاں پر ایک ہزار سال پرانا ایک کنواں پایا جاتا ہے۔اس قصبے کا نام چاند باؤلی ہے۔انگریزی میں اسے Baori لکھا جاتا ہے۔ لیکن عام بول چال میں اسے باؤلی ہی لکھتے ہیں۔اس طرح کے کئی کنویں پاکستان کے مختلف علاقوں میں بھی پائے جاتے ہیں۔ زیادہ تر ایسا ان علاقوں میں کیا جاتا ہے جہاں پانی کی شدید قلّت ہوتی ہے۔

میں نے چاند باؤلی کے بارے میں تمام تر معلومات ادیتی سنگھ اور سوما اے مشرا کے لکھے ہوئے ایک مضمون Study of Ancient Stepwells in India سے حاصل کی ہیں[46]۔

چاند باؤلی نام اس وقت کے ایک مقامی حکمران راجہ چندا کے نام پر رکھا گیا تھا۔ اس علاقے کی مصّدقہ تاریخ کا علم تو نہیں لیکن یہاں پر موجود چھتوں والے مندروں کے طرزِ تعمیر اور نقش و نگار کو دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ یہ علاقہ بارہ سو سال پرانا ہے۔ ہندوستان بھر میں ایسے بے شمار کنویں پائے جاتے ہیں جو بہت ہی گہرے ہیں۔ ان کی گہرائی کئی سو فٹ تک ہوتی ہے۔ پرانے وقتوں میں ان کی گہرائی تک جانے کے لیے سیڑھیاں بنائی جاتی تھیں۔ سیڑھیوں کی تعداد پانی کی گہرائی پر منحصر ہوتی ہے۔ چاند باوری ان چند کنوؤں میں سے ایک ہے جن میں پانی تک جانے کے لیے سیڑھیاں موجود ہیں۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ کنواں اور اس کے ارد گرد موجود محل آٹھویں

---

[46] International Journal of Research in Engineering, Science and Management Volume-2, Issue-10, October-2019 www.ijresm.com | ISSN (Online): 2581-5792

صدی میں بنایا گیا۔ یہ جگہ چوہان حکمرانوں کے ساتھ ساتھ مغل حکمران بھی استعمال کرتے رہے ہیں۔ یہ صرف ایک کنواں نہیں ہے اس کے ارد گرد بے شمار عمارتیں بھی موجود ہیں۔اس کی تصویروں سے محسوس ہوتا ہے کہ یہ نہایت خوبصورت عمارت ہے۔ یہاں درمیان میں کنواں، چاروں اطراف اترتی سیڑھیاں اورارد گرد بہت خوبصورت رہائش گاہیں اور اس کے ساتھ ایک مندر بھی موجود ہے۔

مختلف کتابوں میں مغلوں سے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے بہت سے مندروں کو تباہ کیا، وہیں پر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ انھوں نے مختلف مندروں کی تعمیر وترقی کے لیے بھی بے شمار کام کیے لیکن میں ایسے کسی مندر کو نہیں جانتا جس کی تعمیر وترقی میں مغلوں نے کوئی کردار ادا کیا ہو۔جب میں نے چاند باؤلی کے بارے پڑھا تو پتہ چلا کہ اٹھارہویں صدی میں مغل حکمران اس علاقے میں آئے یہاں رہائش اختیار کی اور اس کنویں کے ارد گرد کئی منزلیں تعمیر کیں،جس سے اسکی خوبصورتی میں بے حد اضافہ ہوا یہ کہا جاتا ہے اس وقت یہ کنواں خستہ حال ہو چکا تھا لیکن مغلوں نے اسے دوبارہ سے آباد کیا۔

اگر آپ کو بھی اس کی تصاویر دیکھنے کا اتفاق ہو تو آپ یہ دیکھ کر دنگ رہ جائیں گے کہ کس طرح کئی سو سیڑھیاں اتر کر پانی تک پہنچ جاتا ہے۔ میں نے کچھ ایسی ویڈیوز بھی دیکھی ہیں جن میں کچھ لوگ اوپر سے چھلانگ لگا کر پانی میں جا گرتے ہیں۔ایسا کرنے کے لیے بہت حوصلہ چاہیے۔ ہندوستان بھر کا یہ سب سے زیادہ گہرا کنواں ہے۔ چاند باؤلی تیرہ منزلوں پر مشتمل کنواں ہے جس کی چھ منزلیں زمین کے اندر ایک سو فٹ تک گہری ہیں۔ یاد رہے راجستھان جیسے انتہائی خشک علاقے میں ایسا کنواں بنانے کا مقصد زیادہ سے زیادہ پانی کو محفوظ کرنا تھا۔ گہرائی زیادہ ہونے کی وجہ سے کنویں کے نچلے حصے میں خاصی ٹھنڈک ہوتی ہے۔ لوگ گرمیوں میں نچلے حصے میں جا کر آرام کرتے تھے۔

اس کے نچلے حصے میں کچھ کمرے بھی ہیں جن سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اُس وقت کے حکمران گرمی سے بچنے کے لیے وہاں پر آرام کرتے تھے۔

Chand Baori is a stepwell : Photo Credit: https://monomousumi.co

چاند باؤلی کے منفرد طرزِ تعمیر کی وجہ سے یہاں پر کئی ہندی اور انگریزی فلمیں بھی فلمائی گئیں ہیں جن میں بھومی، دی فال، بھول بھولیاں، پہیلی اور دی ڈارک نائٹ رائزز وغیرہ شامل ہیں۔ اس کنویں کے عجیب و غریب طرزِ تعمیر کے تصور نے مجھے نیند سے کوسوں دور رکھا۔

راوت بھاٹا: جہاں بھارت کے کئی ایٹمی بجلی گھر واقع ہیں

راوت بھاٹا، کوٹا سے پچاس کلومیٹر دوری پر واقع ہے۔ اس شہر کی خاص بات یہ ہے کہ یہاں پر آٹھ ایٹمی بجلی گھر موجود ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ ایک ایٹمی فیول کمپلیکس بھی زیر تعمیر ہے۔ راوت بھاٹا میں رانا پرتاپ ساگر ڈیم بھی ہے جو راجستھان کا سب سے بڑا ڈیم ہے۔ اس ڈیم سے قریباً دو سو میگاواٹ قریب بجلی پیدا کی جاتی ہے۔ اس

علاقے میں ہندوؤں کا ایک انتہائی مقدس مندر بارولی بھی موجود ہے۔ یہ مندر دسویں صدی عیسوی میں تعمیر کیا گیا۔ اس علاقے میں ایک قدرتی آبشار بھی پائی جاتی ہے۔ یہ آبشار بھی سیاحوں کے لیے بے حد کشش رکھتی ہے۔

قلعہ منڈل گڑھ

اس علاقے میں منڈل گڑھ نام کا ایک قصبہ بھی موجود ہے جس پر کبھی برہما بادشاہوں کا راج تھا۔ اس کا آخری برہما بادشاہ منڈیا برہما تھا۔ اسی وجہ سے اسے منڈل گڑھ کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ اس علاقے پر قبضے کے لیے مسلمان بادشاہوں اور ہندو راجاؤں کے درمیان کئی بار جنگیں ہوئی۔ تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ پندرہویں صدی کے وسط میں سلطان محمود خلجی نے اس علاقے پر دو دفعہ چڑھائی کی۔ اس علاقے پر سلاطین دلی اور مقامی راجپوتوں نے باری باری حکمرانی کی۔ اس طرح یہ علاقہ کئی صدیوں تک میدانِ جنگ بنا رہا۔

اس علاقے اور یہاں کے قلعے کی تاریخ پر تاب سنگھ مہتا نے اپنی کتاب Guns and Glories: Rajputana Chronicles میں تفصیل سے لکھی ہے۔

مغل بھی کسی سے پیچھے نہ رہے۔ سترہویں صدی کے وسط میں شاہ جہاں نے کشن گڑھ کے راجہ روپ سنگھ کو ایک بڑی جاگیر عطا کی۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مغل حکمرانوں نے راجپوتوں کے ساتھ ہمیشہ سے ہی دوستی رکھی اور یہ بات صرف اکبر تک ہی محدود نہیں ہے۔ روپ سنگھ نے یہاں ایک محل بھی تعمیر کیا۔ جسے پر رانا راج سنگھ نے قبضہ کر لیا اور نگزیب نے یہ قبضہ واپس لیا اور یوں ایک مرتبہ پھر یہ علاقہ مغل حکمرانوں کے زیرِ تحت آ گیا۔ مغل سلطنت کے زوال کے بعد بھی یہ علاقہ مقامی رانا خاندان کے ماتحت ہی رہا۔ میں نے اس بات کی کھوج لگانے کی کوشش کی کہ اس علاقے میں انگریزوں نے کب عمل دخل شروع کیا لیکن مجھے ایسی کوئی معلومات حاصل نہ ہو سکیں

جس سے مجھے یہ پتہ چلے کہ تقسیم ہند تک یہ لوگ آزاد ہی رہے اور کسی بھی طرح انگریزوں کی غلامی میں نہ آئے۔ یہ میرا علم ہے ممکن ہے کہ درست نہ ہو۔

پرتاب سنگھ مہتا کی کتاب (صفحہ 74) پر لکھتے ہیں کہ 1761ء میں مہتا اگر چند جو مہتا پرتھوی راج کا بیٹا اور مہاراجہ رانا اری سنگھ کا مشیر تھا کو منڈل گڑھ قلعے کا پہلا قلعہ دار مقرر کیا گیا۔ مہاراجہ رانا اری سنگھ نے مہتا اگر چند کو ایک خط لکھا جو اس علاقے کی تاریخ سمجھنے کے لیے بے حد مفید ہے۔ اس خط میں یہ لکھا گیا کہ ضلع منڈل گڑھ باغی ہو گیا ہے اور اس ضلع کو بہتر حالت میں لانے کے لیے آپ لوگوں کی رہائش کے لیے مکانات بنائیں اور کسانوں کو مراعات دیں۔۔ مہتا اگر چند نے اس علاقے کی بہتری کے لیے کئی کام کیے جو آج بھی یاد کیے جاتے ہیں۔

ہماری گاڑی کو تقریباً ساڑھے تین بجے کے قریب کوٹہ پہنچنا تھا۔ یہاں ہماری گاڑی کا سٹاپ بھی تھا۔ مجھے اب تک راجستھان کے کسی سٹیشن پر اترنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ ہم کافی دیر سے راجستھان کے علاقے میں سفر کر رہے تھے۔ رات کا وقت ہونے کی وجہ سے میں زیادہ علاقے نہ دیکھ سکا۔ کوٹہ کے بارے میں مجھے علم تھا کہ وہ راجستھان میں ہمارا آخری سٹاپ ہوگا۔ راجستھان کا ذکر کیے بغیر ہندوستان کی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی اور یہاں سے گزرتے ہوئے یہ نہیں چاہتا تھا کہ مجھے اس کی سرزمین پر قدم رکھنے کا موقع نہ ملے۔ اس لیے میں نے کوشش کی کہ کسی طرح اپنی نیند کی قربانی دے کر چند منٹ کے لیے راجستھان کی دھرتی پر اتروں۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ میں کوٹہ کے مشرق میں مدھیہ پردیش کی اسٹیٹ میں واقع ایک انتہائی اہم شہر اشوک نگر سے متعلق کچھ دلچسپ معلومات آپ کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔

اشوک نگر مدھیہ پردیش کا ایک اہم شہر ہے۔ اس علاقے میں پیدا ہونے والی گندم کی ایک خاص قسم "شربتی گیہوں" کے نام سے جانا جاتا ہے جو ایک منفرد نوعیت کی گندم ہے۔ یہ بات بھی مجھے پہلی مرتبہ معلوم ہوئی کہ اس علاقے میں ایک چھوٹا دریا بہتا

ہے اور اس کا نام بھی دریائے سندھ ہے۔ دریائے سندھ بعد میں یمنا دریا میں جا گرتا ہے۔

اشوک نگر : عظیم شہنشاہ اشوکا کی یاد میں بسایا گیا شہر

اشوک نگر دریائے سندھ (سندھ نام کا ایک چھوٹا سا تھ دریا اس علاقے میں بھی ہے) اور بٹوا کے درمیان، مدھیہ پردیش کے شمال میں واقع ہے۔ یہ علاقہ سطح مرتفع مالوا کا بھی ایک حصہ ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ عظیم شہنشاہ اشوکا یوجین فتح کرنے کے سفر کے دوران ایک رات کے لیے اس جگہ ٹھہرا تھا اس وجہ سے اس علاقے کا نام اشوک نگر رکھا گیا۔ اس بات میں کہاں تک صداقت ہے۔ معلوم نہیں لیکن ایک بات درست ہے کہ اس شہر کی تاریخ بہت پرانی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ یہ شہر مہابھارت کی تاریخ جتنا پرانا ہے۔ انیسویں اور بیسویں صدی کے آغاز میں یہ علاقہ گوالیار کے حکمرانوں کے ماتحت بھی رہا۔ اس وقت اسے ایشگڑھ کہتے تھے، بعد میں اس کا نام اشوک نگر رکھا گیا۔ یہ شہر بندیل کھنڈ کے علاقے میں واقع ہے جو بھارتی ثقافت کا گڑھ سمجھا جاتا ہے۔ اس علاقے میں کئی جین مندر بھی پائے جاتے ہیں ۔ جین مذہب میں بارہا اس علاقے کا ذکر آتا ہے ۔ اس شہر کے قریب "چندری " نامی ایک چھوٹا شہر بھی واقع ہے جو پرانے وقتوں میں چنڈی کہلاتا تھا۔ محکمہ آثار قدیمہ نے یہاں سے قدیم بت بھی حاصل کیے جن کی بنیاد پر یہ کہا جاتا ہے کہ یہ شہر بھی کئی ہزار سال پرانا ہے۔ اس بارے میں مزید تحقیق جاری ہے۔

اشوک نگر کے بارے میں National Informatics Centre | Govt. of India میں جو لکھا ہے اس کا خلاصہ پیش خدمت ہے[47]۔

---

[47] https://ashoknagar.nic.in/en/history/

قبل مسیح دور میں موجودہ اشوک نگر ضلع کا علاقہ شیشو پال کی چیڈی بادشاہت کا ایک اہم حصہ تھا۔ چھٹی صدی قبل مسیح میں بھی یہاں کے علاقے چیڈی جنپادس کے ماتحت تھے۔ کسی وقت میں یہ علاقہ نندا، موریہ، سنگا اور مگدھ بادشاہت کا بھی حصہ تھا۔ یہ بات کئی جگہ لکھی ہے کہ عظیم شہنشاہ اشوکا، جب کہ اجین کو فتح کرنے کے سفر میں تھا، ایک رات اشوک نگر میں گزاری تھی، اس لیے اس علاقے کا نام اشوک نگر رکھا گیا۔ اس کا کوئی حوالہ نہیں ہے۔ آٹھویں اور نویں صدی عیسوی میں اس علاقے پر پرتھارا راجپوت خاندان نے حکومت کی۔ انھی کی اولاد نے دسویں صدی عیسوی میں چندری شہر کی بنیاد رکھی اور اسے اپنا صدر مقام بنایا۔ محمود غزنوی نے اس علاقے پر حملے کیے جس سے مقامی ریاست کمزور ہو گئی۔ بعد میں سلاطین دہلی، افغانوں اور مغلوں نے اس علاقے پر حکومت کی۔ یہاں کے ایک راجہ مردن سنگھ کا ذکر تاریخ میں بارہا کیا جاتا ہے۔ یہ وہ شخص تھا جس نے رانی جھانسی کا ساتھ دیا اور انگریزوں سے جنگ لڑی۔ انھوں نے یہاں پر ایک قلعہ بھی بنوایا۔

میرے علم کے مطابق راجہ مردن سنگھ ان چند حکمرانوں میں شامل ہے جس نے اپنی ریاست کی پرواہ نہیں کی بلکہ ہندوستان کی آزادی کو ترجیح دی۔ ایسے لوگوں کی عظمت کو سلام۔ ان کا نام اب بھی علاقے میں احترام سے لیا جاتا ہے۔ کیوں نہ لیا جائے؟ یہی لوگ تو ہیں جو آزدی ہند کی بنیاد رکھنے والے ہیں۔

اس بارے میں اے یو صدیقی کی کتاب Indian Freedom Movement in Princely States of Vindhya Pradesh پڑھنے کے قابل ہے۔ اس میں تفصیل سے لکھا ہے کہ کس طرح راجہ مردن سنگھ اور رانی جھانسی نے ملکر انگریزوں کا مقابلہ کیا۔ وہ جیت تو نہ سکے البتہ انھوں نے ایک حوصلہ تو ضرور دیا جو بعد میں جنگ آزادی میں لوگوں کے کام آیا۔

اشوک نگر سے کچھ فاصلہ پر ایک مشہور ماتا مندر بھی ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہاں رام اور سیتا ماتا کے بیٹے پیدا ہوئے تھے۔ اس وجہ سے یہ مقام ہندوؤں کے لیے نہایت ہی اہم ہے۔ یہاں ہر سال ایک بڑا میلہ بھی لگایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ بھی یہاں بے شمار مذہبی مقامات موجود ہیں۔ میں نے بھارت کے سفر میں یہ جانا کہ کوئی شہر جتنا پرانا ہے اتنے ہی وہاں پر مذہبی مقامات بھی ہیں جس سے یہ لگتا ہے کہ ہندوستان کے لوگوں کی زندگی میں مذہب کبھی بھی کم اہم نہیں رہا۔

چندیری قلعہ جس کا ذکر البیرونی نے بھی کیا

اس علاقے میں واقع قصبہ چندیری میں ایک قلعہ موجود ہے جس کا ذکر البیرونی نے بھی کیا ہے۔ اپرانا کباڈیا نے ایک مضمون What the story of Medini Rai, the man who once took on Babur, tells us about biography and history کے نام سے لکھا ہے جو سکرول انڈیا کی ویب پر موجود ہے[48]۔ جو 18 نومبر 2019ء کو شائع ہوا۔ اس مضمون میں اس علاقے کی تاریخ تفصیل سے لکھی ہوئی ہے۔ اس کا خلاصہ پیش خدمت ہے۔

اس مضمون سے پتہ چلتا ہے کہ غیاث الدین بلبن نے دلی کے سلطان ناصر الدین محمود کی طرف سے ایک جنگ کی جس کے نتیجے میں اس نے اس شہر پر قبضہ کیا۔ بعد ازاں سلطان محمود خلجی نے کئی مہینوں کے محاصرے کے بعد اس شہر پر قبضہ کر لیا۔ یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ایک مرتبہ یہ شہر رانا سانگا کے ماتحت بھی رہا۔ مغل شہنشاہ بابر نے بھی اس شہر پر حملہ کیا اور اسے مقامی راجپوت حکمران سے چھین لیا۔ شیر شاہ سوری بھی

[48] https://scroll.in/article/943610/what-the-story-of-medini-rai-the-man-who-once-took-on-babur-tells-us-about-biography-and-history

کسی سے پیچھے نہ رہا اور وہ بھی یہاں قابض رہا۔ مغل شہنشاہ اکبر بھی اس شہر کا دیوانہ تھا اور اس نے بھی اسے اپنی سلطنت میں شامل رکھا۔ مغلیہ سلطنت کے خاتمے کے نتیجے میں بنڈیلہ راجپوتوں نے اس شہر پر قبضہ کر لیا۔ اس شہر پر قبضے کے لیے مراٹھوں نے بھی کئی لڑائیاں لڑیں۔ آخر کار 1844ء میں انگریزوں نے اس شہر پر قبضہ کر لیا۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ شہر ان شہروں میں شامل ہے جہاں 1857ء کی بغاوت کے دوران انگریزوں کا کنٹرول ختم ہو گیا تھا لیکن زیادہ دیر تک ایسا نہ رہ سکا اور جلد ہی انگریزوں نے دوبارہ قبضہ کر لیا۔ ایک معاہدے کے مطابق اسے ریاست گوالیار کا حصہ بنا دیا گیا۔

چندیری فورٹ کی تعمیر، سلاطین دلی اور مغل حکمرانوں کا مشترکہ کارنامہ ہے۔ یہ ایک وسیع قلعہ ہے۔ قلعے کے مرکزی دروازے کو خونی دروازہ کہا جاتا ہے۔ یہ قلعہ فن تعمیر کا ایک شاہکار ہے۔ اونچائی پر ہونے کی وجہ سے یہاں موسم بہت خوشگوار ہوتا تھا۔ میرے خیال میں اس کی یہی خوبی مغلوں کو بہت پسند تھی جس کی وجہ سے انھوں نے اس کی تعمیر میں دلچسپی لی۔ اس شہر میں ایک محل بھی موجود ہے جسے کوشک محل کہا جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ 1445ء میں مالوا کے محمود شاہ خلجی اس علاقے سے گزر رہے تھے کہ یہ جگہ اپنے موسم کی وجہ سے پسند آ گئی اور اس نے یہاں ایک محل تعمیر کروانے کا حکم دیا۔ اس کے حکم پر ایک سات منزلہ محل تعمیر کیا گیا۔ یہ محل بھی اپنی مثال آپ ہے۔

اس علاقے کی تاریخ سے بھی پتہ چلتا ہے کہ دسویں صدی میں یہاں پر ایک راجپوت خاندان حکمرانی کرتا تھا۔ چنڈیلا راجپوت حکمرانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ اپنے دور میں انھوں نے یہاں پر بے شمار عمارتیں تعمیر کروائیں۔ ان کے ان کارناموں کی وجہ سے انھیں عظیم معمار سمجھا جاتا تھا۔ یہاں کے حکمرانوں کی ایک طویل فہرست ہے جو بہت دلچسپ ہے۔ ان کی تاریخ پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ وہ علم و ہنر کے دلدادہ تھے۔ اس کی

وجہ یہ تھی کہ ان کے دور میں جنگیں بہت کم ہوئیں تھیں۔ اس علاقے میں تیس سے زائد مندر ہیں۔ حال ہی میں بنائے گئے ایک عجائب گھر میں ایک بارہ فٹ اونچا بت یہ بات ظاہر کرتا ہے کہ یہ لوگ بت تراشنے میں بھی انتہائی مہارت رکھتے تھے۔

تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ یہ وہ علاقہ ہے جہاں دسویں صدی کے آخر میں غزنوی خاندان سے تعلق رکھنے حملہ آوروں نے حملہ کیا اوراس پر عارضی طور پر قابض بھی ہوئے لیکن بعد میں مقامی لوگوں کی مخالفت کی وجہ سے وہ اس علاقے سے چلے گئے۔ یاد رہے محمود غزنوی نے ہندوستان پر بے شمار حملے کیے لیکن اس نے ہندوستان میں کبھی اپنی سلطنت قائم نہیں کی۔ البتہ غوری نے جب ہندوستان پر حملے کیے تو اس کے ایک جرنیل، قطب الدین ایبک نے اس علاقے پر ایک سخت حملہ کیا اور یہاں کی مقامی راجپوت ریاست جو داخلی اختلافات کی بنا پر کمزور پڑ گئی تھی پر قبضہ کر لیا اوراسے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ اس طرح صدیوں سے قائم ایک راجپوت ریاست کا غوری کے ہاتھوں خاتمہ ہوا۔

چتوڑ جسے چٹور گڑھ بھی کہا جاتا ہے: جہاں ایشیاء کا سب سے بڑا قلعہ موجود ہے

میری معلومات کے مطابق اس علاقے میں چتوڑ نامی ایک قلعہ بھی موجود ہے جو اپنی وسعت کی بنیاد پر ایک خاص اہمیت کا حامل ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہاں پیار اور محبت کی ایک لوک داستان بھی مشہور ہے. حال ہی میں اس موضوع پر پدماوت نامی ایک فلم بھی بنی ہے۔ یہ قلعہ کوٹا سے دو سو کلومیٹر مغرب میں واقع ہے۔ اس علاقے کی تاریخ انتہائی دلچسپ ہے اوراپنے اندر بے پناہ کشش رکھتی ہے ۔ اگر آپکو تاریخ سے دلچسپی ہو تو آپ اسے ضرور پڑھیں۔ میں اس کا مختصر احوال یہاں پیش کرنا ضروری سمجھتا ہوں جو یقیناً آپ کو پسند آئے گا۔

چتوڑ اور اس کے ارد گرد کے علاقے کے بارے میں جاننے کے لیے میں نے دو کتابوں سے مدد لی۔ پہلی کتاب

ابجیت سنگھ جھالا دھرمندر کنور کی لکھی ہوئی ہے جس کا نام ہے Chittorgarh The Braveheart of Rajputana دوسری کتاب بھون سنگھ رانا کی کتاب Maharana Pratap ہے۔ ان دونوں کتابوں سے جو میں جان سکا وہ پیش خدمت ہے۔

چتوڑ، راجستھان کا ایک بڑا شہر ہے۔ اس کی تاریخ جاننے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ یہاں آٹھویں سے سولہویں صدی تک اس وقت کی ایک راجپوت ریاست قائم تھی جس کا نام میڈا پاٹا تھا اور اس کا دارالحکومت چتوڑ تھا۔ یہ علاقہ اب میواڑ میں واقع ہے۔ یہاں پر تاریخی چتوڑ قلعہ بھی موجود ہے جسے ہندوستان ہی نہیں بلکہ ایشیاء کا سب سے بڑا قلعہ ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ اس پر مسلمان حکمرانوں نے تین بار حملہ کیا۔ پہلی مرتبہ 1303ء میں علاؤالدین خلجی، پھر 1535ء میں گجرات کے بہادر شاہ اور آخر میں مغل بادشاہ اکبر نے 1568ء میں اس پر قبضہ کیا۔ شکست کی صورت میں یہاں کی خواتین نے دشمن کے ہاتھ لگنے سے بچنے کے لیے جوہر یعنی بڑے پیمانے پر خودسوزی کے ذریعہ خودکشی کرنا پسند کیا۔

چتوڑ قلعہ کی تاریخ سے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس کی اصل تاریخ کا کسی کو اندازہ نہیں ہے البتہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسے موریہ قبیلے کے بادشاہ چترنگا نے بنایا تھا۔ ایک اور بات جاننے کو ملتی ہے کہ اس وقت کی ایک ریاست گوہلا کے حکمرانوں نے آٹھویں صدی میں اس قلعے پر قبضہ کر لیا تھا۔ یہ سب زمانہ قدیم کی باتیں ہیں۔ ماضی قریب میں ہونے والے واقعات کے مطابق چودھویں صدی کی پہلی دہائی میں دلی کے حکمران علاؤالدین خلجی نے گویلا بادشاہ رتنا سنگھ کو شکست دے کر قلعے پر قبضہ کیا۔ مسلمان

حکمرانوں کی اس علاقے میں یہ پہلی پیش قدمی تھی لیکن یہ قبضہ زیادہ دیر برقرار نہ رہ سکا۔ جلد ہی مقامی راجپوت سرداروں نے یہ قلعہ واپس لے لیا۔ کسی دور میں اس قلعے پر رانا کمبھا اور رانا سانگا بھی قابض رہے۔ مغل حکومت کے مضبوط ہونے کے بعد یہ علاقے بھی مغلیہ سلطنت کا حصہ بن گئے۔ مغل شہنشاہ ہمایوں نے اس قلعے پر قبضہ کیا لیکن اس کا انتظام ایک مقامی راجپوت سردار کے حوالے کر دیا۔ مقامی راجپوتوں نے ایک مرتبہ پھر بغاوت کی اور اس دفعہ مغل بادشاہ اکبر نے اس قلعے کا محاصرہ کرکے اس پر قبضہ کرلیا۔ یہ قبضہ مغلیہ سلطنت کے خاتمے تک برقرار رہا۔ حتیٰ کہ اس قلعے کو انگریزی صورت میں ایک نیا غیر ملکی حکمران مل گیا اور وہ صدیوں پرانی ریاست جس پر مقامی لوگ حکمرانی کرتے تھے آہستہ آہستہ مکمل طور پر غیر ملکی لوگوں کے ہاتھوں میں چلی گئی۔ جو کل حکمران تھے آج وہ ان کے درباری بن گئے۔

ایک بلند پہاڑی پر واقع ہونے کی وجہ سے یہاں کا موسم خاصہ خوشگوار ہوتا ہے جو انگریزوں اور مغلوں کی پسندیدہ چیز تھی۔ یہاں مسلمان، آبادی کا پندرہ فیصد ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس علاقے میں سکھوں کی بھی بڑی تعداد آباد ہے اور اس کی وجہ اس علاقے کا پنجاب کے قریب ہونا ہے۔

Chittorgarh Fort with city in backdrop. It is one of the largest forts in India & listed in the UNESCO World Heritage Sites list as Hill Forts of Rajasthan Photo Credit: https://thumbs.dreamstime.com

قلعہ چتوڑ یونیسکو عالمی ثقافتی ورثے میں شامل ہے۔ اس کا رقبہ سات سو ایکڑ کے قریب ہے۔ یاد رہے لاہور کے شاہی قلعے کا رقبہ پچاس ایکڑ ہے اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہ قلعہ کتنا بڑا ہے۔ یعنی لاہور کے شاہی قلعے سے چودہ گنا بڑا۔ یہ بات بھی اہم ہے کہ یہ قلعہ ایک دریا میں گرنے والی ندی کی وادی میں ایک اونچی پہاڑی پر واقع ہے جو زمین سے چھ سو فٹ بلند ہے۔ اس سے یوں لگتا ہے کہ یہ قلعہ ہر لحاظ سے محفوظ تھا۔

اس قلعے کی تاریخ کے بارے میں کئی متضاد باتیں ملتی ہیں جن میں سب سے اہم علاؤالدین خلجی کی چتوڑ فتح کرنے کے لیے ایک فوج کی قیادت کرنا ہے۔ اس جنگ میں اس قلعے کا آٹھ ماہ طویل محاصرہ کیا گیا۔ کچھ لوگوں کے بقول فتح کے بعد یہاں پر کئی ہزار مقامی ہندوؤں کو قتل کیا گیا اور کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ بات درست نہیں ہے۔ تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ خلجی نے ایک راجپوت سردار کی خوبصورت ملکہ پدمنی جسے پدماوتی بھی لکھا جاتا ہے کو حاصل کرنے لیے چتوڑ پر حملہ کیا تھا اور اکثر مؤرخین نے اسے بھی افسانہ قرار دیا ہے۔

اس کہانی کے ساتھ یہ بات بھی جڑی ہوئی ہے کہ اس جنگ میں شکست کھانے کے بعد ہندو خواتین جن میں رانی پدمنی اور دیگر خواتین بھی شامل تھیں نے بڑے پیمانے جوہر کے ذریعے خودکشی کرلی تھی۔ اس واقعے کی صداقت پر بھی کئی لوگوں نے سوال اٹھائے ہیں۔ کیا سچ ہے کیا نہیں؟ لیکن ایک بات واضح ہے کہ یہ علاقہ صدیوں تک ہندوؤں کے ماتحت رہا اور جب دلی میں مسلمان حکمران آئے تو یہ علاقہ بھی ان کے ماتحت آگیا۔

ایک دیرینہ روایت یہاں بھی دہرائی گئی یعنی جس علاقے کو فتح کرنا اس کا نام بھی بدل دینا۔ علاؤالدین نے بھی اس علاقے کا نام اپنے چھوٹے بیٹے خضر خان کے نام پر ''خضر آباد'' رکھ دیا۔ اس کا بیٹا ابھی چھوٹی عمر کا تھا اس لیے اصل انتظام ملک شاہین نامی

ایک غلام کے ہاتھ میں دیا۔ اس قلعے کی تاریخ بہت طویل ہے جس میں جنگوں کے علاوہ کچھ اور نہیں ملتا لیکن میں یہاں آپ کو اس قلعے کی تعمیر سے متعلق کچھ ایسا بتانا چاہتا ہوں جو میری نظر میں نہایت ہی حیران کن تھا۔

اس قلعے کی شکل مچھلی جیسی ہے۔ اس کی بیرونی دیوار کی لمبائی 13 کلومیٹر ہے۔ ایک پُل کے بعد ایک میدان اور ایک کلومیٹر سے بھی طویل دشوار گزار زِگ زیگ راستے سے گزرنے کے بعد یہ قلعہ واقع ہے۔ اس تک پہنچنے کے لیے ایک مشکل ترین راستے سے ہو کر جانا پڑتا تھا۔ دفاعی نقطۂ نظر سے یہ قلعہ انتہائی محفوظ تصور کیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ اس کے ارد گرد بے شمار مندر بھی موجود تھے جو اسے ناقابل تسخیر بنانے میں اہم کردار کرتے تھے۔ رانا کمبھا نے یہاں سات بڑے گیٹ بھی تعمیر کروائے، جنہوں نے اسے مزید مضبوط بنایا۔

اس قلعے کو ایک کمپلیکس کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ یہاں ستر کے قریب تاریخی عمارتیں موجود ہیں جن میں محلات، مندر، یادگاریں اور تالاب وغیرہ شامل ہیں۔ کہتے ہیں کہ پہلا پہاڑی قلعہ پانچویں صدی میں بنایا گیا تھا اور بعد میں کچھ تعمیرات بارہویں صدی میں بھی کی گئیں۔ سب سے اہم تعمیر پندرہویں صدی میں سیسودیا راجپوتوں نے کی۔ ان سب سے یہ پتہ چلتا ہے کہ جہاں راجپوت میدان جنگ میں بہادری دکھاتے تھے وہیں تعمیرات میں بھی وہ کسی سے کم نہ تھے۔

میں یہ بات بھارت میں قائم مختلف عمارتوں کے بارے میں پڑھنے کے بعد کہہ رہا ہوں۔ اس قلعے کا سب سے مشہور مندر کالی ماتا کا مندر ہے جو آٹھویں صدی میں بنایا گیا۔ اس کے علاوہ بھی کئی ایسے مندر ہیں جو ہزار سال سے بھی زیادہ پرانے ہیں۔ ان سب کے ساتھ دو اونچے ٹاور بھی موجود ہیں جن کی اونچائی چوبیس میٹر اور سینتیس میٹر

ہے۔ ان سب کی تعمیر ٹیکنالوجی کا ایک ایسا شاہکار ہے جو ظاہر کرتا ہے کہ صدیوں قبل بھی لوگ اتنی اونچی عمارتیں بنانے کے فن سے بخوبی آگاہ تھے۔

پدمنی کا محل

پدمنی کا محل جسے رانی پدمنی کا محل بھی کہا جاتا ہے تین منزلہ سفید عمارت پر مشتمل ہے جو قلعے کے جنوبی حصے میں واقع ہے۔ اس محل کے ارد گرد موجود تالاب اس کی خوبصورتی میں بے حد اضافہ کرتے ہیں۔ کچھ لوگوں کے مطابق یہ وہی محل ہے جہاں علاؤالدین نے مہارانا رتن سنگھ کی اہلیہ رانی پدمنی کو آئینے میں دیکھا تھا جس کے بعد اس نے اس قلعے کو حاصل یا تباہ کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ جنگ کے نتیجے میں جب مہارانا رتن سنگھ مارا گیا تو اسکی رانی پدمنی نے جوہر یعنی اجتماعی خود کشی کی۔

Padmini Palace is a place where historical monument related to the self-sacrifice of Rani Padmini after Chittorgarh was attacked by the Sultan of Delhi, Alauddin Khilji Photo Credit: https://in.pinterest.com/pin/647111040183891626/

پدماوت نام کی ایک کہانی جو شاعرانہ انداز میں لکھی یا لکھوائی گئی بھی اس علاقے سے جڑی ہوئی ایک دلچسپ لوک داستان ہے جسے 1540ء میں ایک صوفی شاعر ملک محمد جائسی نے لکھا۔ یہ پیار اور محبت کی ایک لوک داستان ہے جیسے ہماری ہیر رانجھا وغیرہ۔ اس موضوع پر بننے والی فلم سے متعلق بھی یہی کہا جاتا ہے کہ یہ فکشن اور تاریخ کا ایک مجموعہ ہے جس میں راجپوت غرور کو ایک نمایاں حیثیت حاصل ہے۔

جب کوئی شخص کسی بھی واقعے کو شاعرانہ انداز میں لکھتا ہے تو اس میں حقیقت سے زیادہ افسانے کا زیادہ نمایاں ہوتا ہے۔

چتوڑ قلعے کے ایک خوبصورت لان میں تین نشانیاں ہیں۔ ایک نشانی ان عورتوں کی یاد میں ہے جو اپنے خاوندوں کے ساتھ ستی ہو گئیں۔ دوسری ان عورتوں اور بچوں کی یاد میں ہے جنہوں نے قید ہونے کی بجائے جل مرنے کو ترجیح دی اور تیسرے ان سپاہیوں کے متعلق ہے جو اپنے قلعہ کی حفاظت کرتے ہوئے مارے گئے۔ ان جگہوں کے متعلق کہا جاتا ہے: Chittorgarh: Where silence speaks a thousand words میں نے کچھ ہندوؤں سے جوہر کے بارے جاننا چاہا۔ ان کے بقول یہ عزت اور ذلت سے زیادہ مذہبی معاملہ تھا۔ ہندوؤں کا خیال تھا کہ مسلمان قیدی بنا کر مذہب کی تبدیلی پر زور دیتے ہیں۔ اس لیے ہندو مذہب کی تبدیلی سے بچنے کے لیے موت کو گلے لگا لیتے تھے۔ میرے خیال میں ایسا بھی ہو گا لیکن کئی بار ایسا بھی ہوا ہے کہ ہندوؤں کی آپس کی لڑائیوں کے بعد میں شکشت کھانے والوں کی خواتین نے جوہر کی رسم ادا کی ہے۔ اس سے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ دونوں باتیں ہی ہو سکتی ہیں۔

بہر حال اس رسم کا سوچ کر ہی میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ لیکن یہ سوچ کے بھی نیند نہیں آتی کہ جن لوگوں نے میرے خاندان کی خواتین کو اغوا کیا تھا ان

کے ساتھ کیا سلوک کیا گیا ہو گا۔ میرے خیال میں جنگ میں سب سے زیادہ ظلم عورتوں اور بچوں پر ہوتا ہے۔
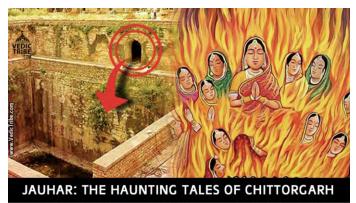
Chitor Fort Credit: (https://www.tripoto.com

راجستھان: جس کے بغیر ہندوستان کی تاریخ نامکمل ہے

راجستھان شمالی بھارت کی ایک اسٹیٹ ہے جس کا رقبہ ساڑھے تین لاکھ مربع کلومیٹر ہے۔ پاکستان کے صوبہ پنجاب کا رقبہ دو لاکھ مربع کلومیٹر کے قریب ہے۔ اس لحاظ سے یہ اسٹیٹ بھارت کے کل جغرافیائی رقبے کا دس فیصد ہے اور یوں رقبے کے لحاظ سے بھارت کی سب سے بڑی ریاست بھی ہے لیکن آبادی کے اعتبار سے اس کا ساتواں نمبر ہے۔ اس کا ایک بڑا حصہ غیر آباد اور صحرائی علاقوں پر مشتمل ہے۔اسی وجہ سے اسے عظیم ہندوستانی صحرا بھی کہا جاتا ہے۔ اسکی مغربی اور شمالی سرحد پاکستان کے صوبوں پنجاب اور سندھ سے ملتی ہے۔ دوسری جانب اس کی سرحدیں بھارت کی پانچ اسٹیٹس سے ملتی ہیں۔ اس کے شمال میں پنجاب، شمال مشرق میں ہریانہ اور اترپردیش، جنوب مشرق میں مدھیہ پردیش اور جنوب مغرب میں گجرات واقع ہے۔ اس ریاست کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس علاقے میں وادئ سندھ کی تہذیب کے ساتھ ساتھ ویدک اور دیگر کئی قدیم تہذیبوں کے کھنڈرات بھی ملتے ہیں۔ یہاں پرندوں کی بقا

ءکے لیے ایک نیشنل پارک بھی بنایا گیا ہے۔ یہاں شیروں کی نسل کی حفاظت کے لیے بھی تین علاقے مختص ہیں۔

انگریزوں کے دور میں یہاں اٹھارہ ریاستیں موجود تھیں جن میں دو جاٹ اور سولہ راجپوت ریاستیں شامل تھیں۔اُس وقت اسے راجپوتانہ کہا جاتا تھا۔ تقسیم ہند کے بعد اس علاقے کو ایک اسٹیٹ کا درجہ دے دیا گیا اوراس کا نام راجستھان رکھا گیا۔ اس کا دارالحکومت اور سب سے بڑا شہر جے پور ہے جبکہ دوسرے اہم شہروں میں جودھ پور، کوٹا، بیکانیر، اجمیر، بھرت پور اور اودے پور قابل ذکر ہیں۔ معیشت کے اعتبار سے اس کا جی ڈی پی ایک سو چالیس بلین امریکی ڈالر ہے جو پاکستان سے نصف ہے۔ معیشت کی فہرست میں یہ بھارت میں ساتویں نمبر پر ہے۔انسانی ترقیاتی انڈیکس میں اس کا 29واں نمبر ہے جو کافی کم ہے۔

راجستھان کی تاریخ جاننے کے لیے میں نے درج ذیل کتب سے استفادہ کیا ہے۔ جو میں جان سکا حاضر خدمت ہے۔

Rima Hooja کی کتاب A History of Rajasthan رادھے شیام چوریسیا کی کتاب History of Ancient India: Earliest Times to 1000 A.D. جان کیی کی کتاب India: A History آر کے گپتا کی کتاب Studies In Indian History Rajasthan Through The Ages The Heritage Of Rajputs Set Of 5 Vols.

علاقے کی تاریخ کتنی قدیم ہے،اس بارے میں متضاد باتیں سننے کو ملتی ہیں۔ اس سے متعلق پہلا حوالہ ساتویں صدی عیسوی میں ایک پتھر پر لکھی تحریر سے ملتا ہے۔ اس کا نام راجپوتانہ کب پڑا، یہ جاننا بے حد مشکل ہے۔ راجپوت کا مطلب راجہ کا بیٹا ہے۔ اس علاقے کے راجاؤں نے اپنے بچوں کو شہزادہ کہلوانے کی بجائے اپنے منصب کی

مناسبت سے راجہ کا پوت کہلوانا پسند کیا۔ ان کا خیال تھا کہ ایسا کرنے سے ان کے بچوں میں ایک احساس تفاخر پیدا ہوگا جو ان کی شخصیت کا ایک لازمی حصہ ہونا چاہیے۔ اب سب راجپوت کہلاتے ہیں۔ جو یہ ظاہر کرتا ہے کہ یہ لوگ راجہ کی اولاد میں سے ہیں اور اس طرح وہ اپنے آپ کو حکمران خاندان سے جوڑتے ہیں۔

ان کا دعویٰ ہے کہ وہ پچھلے پانچ ہزار سال سے ہندوستان کے حکمران ہیں۔ ایک انگریز مؤرخ کے مطابق انگریزوں نے اس علاقے کو فتح کرنے کے بعد ایک بڑے حصے کا نام راجپوتانہ رکھا۔ اس سے پہلے کسی نے بھی اس نام کو استعمال نہیں کیا تھا۔ اس وقت یہاں قائم مختلف ریاستیں ہی اس کی اصل پہچان تھیں۔ راجستھان کے علاقے پر کئی خاندانوں نے صدیوں حکمرانی کی۔ ماضی قریب کی تاریخ کا مختصر ذکر پیش خدمت ہے۔

ہندوستان میں آنے والے غیر ملکیوں میں عرب وہ پہلے لوگ ہیں جو تجارت کی غرض سے جنوبی ہندوستان کے ساحلوں پر آئے اور زمینی حملوں کے لیے سندھ کا راستہ اختیار کیا۔ اس کی ایک مثال سندھ میں محمد بن قاسم کا حملہ ہے۔ تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اس سے قبل بھی عرب، ہندوستان کے مغربی علاقوں پر حملے کرتے رہے لیکن انھیں محمد بن قاسم کے دور میں ہی کامیابی ملی۔ سندھ کے بعد انھوں نے بارہا یہ کوشش کی کہ وہ سندھ سے منسلک علاقے جسے اب ہم راجستھان کہتے ہیں پر بھی اپنا قبضہ جمالیں۔ اس دور میں راجستھان کے علاقوں میں گجر ارا پر تیہار سلطنت موجود تھی، جو ایک طاقتور ریاست تھی۔ اس کی وجہ سے پوری دنیا میں فتوحات حاصل کرنے والے عرب اس علاقے میں کامیاب نہ ہوسکے۔ ان کی حکمرانی صرف سندھ تک ہی محدود رہی۔ اس لیے گجر ارا پر تیہار کو ہندوستان کا رکھوالہ بھی کہا جاتا ہے۔ انھوں نے کسی بھی غیر ملکی کو ہندوستان میں داخل نہ ہونے دیا۔ تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان کا یہ دور ایک سنہری دور مانا جاتا ہے۔

میں نے گجرارا پر تیہار سے متعلق جتنا بھی پڑھا اس کے مطابق وہ لوگ اپنے وقت کے انتہائی ترقی یافتہ لوگ تھے۔ پھر وہی ہوا جو ریاستوں کے ساتھ ہوتا ہے تقسیم ریاست، زوال ریاست۔ پھر ایک وقت آیا کہ محمود غزنوی نے اس علاقے پر حملہ کیا اور یہاں کے حکمرانوں کا خاتمہ کر دیا اور صدیوں سے قائم قنوج کی ریاست سمیت بے شمار دیگر ریاستوں کا بھی خاتمہ کر دیا۔

کیا ایسا اس لیے ہوا کہ محمود، عربوں سے زیادہ طاقتور تھا یا مقامی ریاست کمزور ہو گئی تھی؟ اس کا صحیح جواب تو شاید کسی کے پاس نہ ہو لیکن میرا گمان ہے کہ غزنوی عربوں سے طاقتور نہیں تھا۔ کیونکہ عربوں کی تو پہلے سے ہی سندھ میں حکومت قائم تھی اور انھیں اس علاقے میں بسنے والے دیگر حکمرانوں کی حمایت بھی حاصل تھی جبکہ غزنوی بہت دور سے آیا تھا اور اسے کوئی مقامی مدد بھی میّسر نہ تھی۔ اس بنیاد پر میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ غیر ملکی حملہ آوروں، عرب ہوں یا افغان، مغل یا ترک یا یورپین سب کو یہاں کامیابی صرف مقامی ریاستوں کی کمزوری کی وجہ سے ہی ملی۔

راجستھان میں راجپوتوں کے علاوہ بھی کئی قومیں آباد ہیں جن میں براہمن، گجر اور جاٹ وغیرہ شامل ہیں۔ خاص بات یہ بھی ہے کہ ان تمام لوگوں نے اپنی ثقافت اور زمین کی حفاظت کرتے ہوئے لاکھوں افراد کی قربانی دی۔ بارہویں صدی کے آخر میں موجودہ کرنال کے علاقہ میں پرتھوی راج چوہان نے ایک افغان حملہ آور محمد غوری کو شکست دی لیکن یہ کامیابی کی خوشی زیادہ دیر تک برقرار نہ رہ سکی۔ اگلے ہی سال محمد غوری نے ترائن کی دوسری لڑائی میں پرتھوی راج کو شکست دے دی۔ (اس کا تفصیلی ذکر آئندہ صفحات میں بیان ہو گا)۔ اس طرح راجستھان کا ایک بڑا حصہ غیر ملکی مسلمان حکمرانوں کے ماتحت آگیا۔ اس وقت ناگور اور اجمیر مسلمانوں کی طاقت کے گڑھ تھے۔ اس کے بعد تیرہویں صدی میں مقامی لوگوں نے غیر ملکی مسلمان حکمرانوں کا راستہ روکنے کی کوشش

کی لیکن کامیاب نہ ہوسکے۔ تیرہویں صدی کے آغاز میں راجستھان کی سب سے نمایاں اور طاقتور ریاست میواڑ تھی۔ متعدد راجپوت اور دیگر ریاستوں نے مزاحمت کی کوشش کی لیکن وہ کامیاب نہ ہوئے۔ ایک وقت آیا کہ سارا علاقہ وسطی ایشیاء اور افغان علاقوں سے آنے والے مسلمان حملہ آوروں کے زیرِ نگیں ہو گیا۔

تاریخ یہ بھی بتاتی ہے کہ ان علاقوں میں مقامی لوگ وقتاً فوقتاً بغاوت کرتے رہے مگر ناکام رہے۔ مثال کے طور پر میانہ کے رانا کی جنگیں، رانا ہمیر سنگھ کا تغلق حکمرانوں کو شکست دینا، رانا کمبھا کی مالوا کے خلاف چڑھائی، ناگور اور گجرات کے سلطانوں پر غلبہ حاصل کرنا، میواڑ کی ریاست کا قیام وغیرہ۔ رانا سانگا کا مختلف راجپوت قبیلوں کو متحد کرنا، دلی کی افغان لودھی، مالوا اور گجرات کے ترک سلطانوں کو شکست اور پہلے مغل بادشاہ بابر پر فتح حاصل کرنا۔ تاریخ میں ملتا ہے کہ رانا سانگا کی موت کے بعد ان غیر ملکی مسلمان حکمرانوں کا راستہ روکنے والا کوئی نہ تھا۔ ایک وقت آیا کہ وسطی ایشیاء سے آکر مغلوں کی قائم کردہ سلطنت بھی کمزور پڑ گئی اور پھر ایک غیر ملکی عیسائی طاقت نے یہاں پر اپنی اجارہ داری قائم کی۔ اُس وقت مقامی ریاستیں تقسیم در تقسیم کے عمل کے بعد بے حد کمزور ہو چکی تھیں اور ان کے پاس سوائے انگریزوں کی غلامی کے کوئی اور چارہ نہ تھا۔

یہاں ایک اور شخصیت ہیم چندر وکرمادتیہ کی جدوجہد کا تذکرہ کرنا بھی بے حد ضروری ہے جس نے مختصر عرصہ کے لیے اپنی ایک حکومت قائم کی۔ اسے ہندو، شہنشاہ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ یہ وہ واحد ہندو حکمران ہے جس نے افغانیوں کے خلاف بائیس جنگیں جیتیں اور اکبر کو بھی شکست دی۔ اس کے دور میں ہندوستان کے شمالی علاقوں میں مختصر مدت کے لیے ہندو راج کا چلن عام ہو گیا۔

Hemchandra Vikramaditya known as Hemo
Photo Credit: https://en.wikipedia.org/wiki/Hemu

ہیم چندر ا پانی پت کی دوسری لڑائی میں مغلوں کے خلاف لڑتے ہوئے میدان جنگ میں مارا گیا۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ راجستھان سے تعلق رکھنے والے راجپوت دو حصوں میں تقسیم ہو گئے تھے۔ ایک وہ جنھوں نے مغل اور افغانیوں کے خلاف جنگ کرنے کا فیصلہ کیا اور دوسرے وہ جنھوں نے ان کا ساتھ نہ دینے کا فیصلہ کیا۔ کئی جنگوں میں یہ ایک دوسرے کے سامنے بھی آئے۔ دونوں طرف راجپوت خون تھا۔ تخت پر ایک غیر ملکی مسلمان حکمران براجمان تھا۔ انکار کرنے والوں میں میواڑ کے رانا اڈائی سنگھ اور راؤ چندرسن راٹھور سر فہرست تھے۔ایسے لوگوں کے ساتھ بے حد سخت سلوک کیا گیا اور اس وقت تک ان کے خلاف جنگ جاری رکھی گئی جب تک ان کا مکمل طور پر قلع قمع نہ ہو گیا۔ اس دور میں عام شہریوں کے قتل عام سے بھی دریغ نہ کیا گیا۔ ایسا ایک واقع چتوڑ میں بھی پیش آیا جہاں عام لوگوں کو اس لیے قتل کیا گیا کہ انھوں نے مزاحمت

کی اور جنگ میں مخالفین کا ساتھ دیا۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ ایسا نہیں ہوا۔ کیا سچ ہے، جاننا بے حد مشکل ہے۔

چتوڑ کے واقعے سے متاثر ہو کر مہارانا پرتاپ نے بدلہ لینے کا فیصلہ کیا۔ اس نے اپنی موت تک مغل سلطنت کے ساتھ جنگیں کیں۔ وہ کسی حد تک کامیاب بھی ہوا۔ اس کی بہادری کی مثالیں ہر جگہ مشہور ہوئیں۔ وہ کامیاب تو نہ ہو سکا لیکن مزاحمت کے استعارے کے طور پر ہندوستان کی تاریخ میں آج بھی جانا جاتا ہے۔ راجپوت اسے اپنا ہیرو مانتے ہوئے اس کی پوجا کرتے ہیں۔

Maharana Pratap Won The Battle Of Haldighati against Akbar Photo Credit: https://thelogicalindian.com

میرے علم کے مطابق بیشتر مقامات پر اس کا مقابلہ ان راجپوتوں سے ہی ہوا جو مغل حکمرانوں کے حمایتی تھے۔ اس وجہ سے بھی یہ شخص کامیاب نہ ہو سکا۔ شاید اس کی تلوار ایک غیر ملکی حکمران کا دفاع کرنے والے مقامی راجپوت کے خلاف اس زور سے نہ چل سکی جتنی اس میں طاقت تھی۔

میرے انتہائی عزیز دوست راؤ محمد ظفر صاحب نے مجھے بتایا کہ رانا پرتاب سنگھ کے خاندان نے اس مزاحمت کی بے حد سخت سزا پائی۔ وہ مغل دور میں کسی بھی جگہ پناہ حاصل نہ کر سکے اور نسل در نسل جنگلوں اور ویرانوں میں بھٹکتے رہے۔

آزادی کی جنگ لڑنے والوں کے ساتھ ایسا تو ہوتا ہے۔ یہ تاریخ سے واضح ہے!

اورنگزیب کے دور میں بھی یہ مزاحمتی تحریک جاری رہی۔ اس کام میں رانا راج سنگھ اور ویر درگداس راٹھور پیش پیش تھے۔ انھوں نے اراولی پہاڑیوں میں مغل فوجوں کو بھاری نقصان پہنچایا۔ اورنگزیب کی وفات کے بعد مغل سلطنت کمزور پڑ گئی مقامی راجاؤں نے بھی موقع غنیمت جانا اور یہ بات ان کی سمجھ میں آ گئی کہ ان کی شکست کی اصل وجہ آپس کی نااتفاقی ہے۔ ان سب کو دیکھتے ہوئے تین ریاستوں، امبر، ادائی پور اور جودھ پور کے راجاؤں نے مغلوں کے خلاف مشترکہ محاذ بنالیا۔ ان کی مزاحمت بہت حد تک کامیاب رہی۔ انھوں نے اپنے علاقوں میں مغل گورنروں کو قتل کر کے ایک طرح سے آزادی کا اعلان کر دیا۔ ایسی صورت حال میں مغلوں نے مقامی راجپوت راجاؤں کے ساتھ معاہدہ کرنے کو ترجیح دی۔ ان راجاؤں نے اپنی ریاست پر حکمرانی کو ہی مقدم سمجھا اور دلی پر حملہ کرنے سے باز رہے۔ اس معاہدہ کی رو سے یہ لوگ مغلوں کے حلیف بن گئے۔ اس کے بعد جب بھی مغلوں پر برا وقت آیا جیسا کہ سورج مل کے ماتحت جاٹوں کا آگرہ پر حملہ تو ایسی صورت میں ان ہندو ریاستوں کے راجاؤں نے مغل حکومت بچانے میں اہم کردار ادا کیا۔ ایسا کرنے سے بھی راجستھان کی مقامی ریاستیں زیادہ دیر تک آزاد نہ رہ سکیں اور اٹھارہویں صدی کے آخر میں مراٹھا ان پر قابض ہو گئے۔ پھر ایک وقت آیا کہ 1818ء میں برطانوی سلطنت نے مراٹھوں کی برتری بھی ختم کر دی اور صدیوں سے قائم راجپوت بادشاہت کا مکمل خاتمہ ہو گیا۔ راجپوت بادشاہوں نے انگریزوں سے معاہدے کیے اور داخلی خود مختاری کے بدلے ان کی غلامی کو قبول کر لیا۔

اس نہج تک پہنچنے کی بڑی وجہ ان سب کے اتحاد اور مرکزی حکومت کی غیر موجودگی تھی۔

آج کا راجستھان ترقی کی راہوں پر گامزن ہے۔ میرے مشاہدے کے مطابق راجستھان میں اکثر عمارتیں ان علاقوں میں غیر ملکی حملہ آوروں کے آنے سے پہلے کی ہیں۔ تیرہویں صدی کے بعد سے انگریزوں کی حکومت تک یہ علاقہ مسلسل جنگ کی زد میں رہا، اس لیے اس دور میں کسی نئی شاندار عمارت کا تعمیر ہونا مشکل تھا۔

جنگ اور ترقی دونوں ساتھ ساتھ نہیں چل سکتے۔۔۔ یہ میرا یقین ہے۔

اس وقت راجستھان کے علاقے جیسلمیر میں ایک نیشنل پارک بنایا گیا ہے جس کا رقبہ تین ہزار مربع کلومیٹر سے بھی زائد ہے۔ راجستھان کی معیشت کا انحصار بنیادی طور پر زراعت اور جانوروں پر ہے۔ راجستھان، بھارت بھر میں خوردنی تیل پیدا کرنے والی سب سے بڑی اسٹیٹ ہے۔ اس کے علاوہ راجستھان میں پولیسٹر بنانے کے بھی کئی کارخانے لگے ہوئے ہیں۔ تاج محل میں لگا ہوا سفید سنگ مرمر بھی مکرانہ جو کہ راجستھان کا ایک قصبہ ہے سے ہی نکالا گیا تھا۔ اس علاقے میں بجلی کی سہولت سو فیصد لوگوں کو میّسر ہے۔ راجستھان کی آبادی سات کروڑ سے زائد ہے۔ جن میں اکثریت مقامی لوگوں کی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ تقسیم ہند کے وقت سندھ سے نقل مکانی کر کے جانے والے ہندو بھی کافی تعداد میں یہاں رہتے ہیں۔ مسلمان آبادی کا صرف دس فیصد ہیں۔ راجستھان میں ہیرے اور جواہرات کا کاروبار بھی بہت بڑے پیمانے پر ہوتا ہے۔

راجستھان میں پائے جانے والے بے شمار قلعے ایسے بھی ہیں جن کی مثال ملنا ممکن نہیں۔ میں راجستھان میں موجود کسی بھی قلعے کو نہ دیکھ سکا، جس کا بہت افسوس ہے۔ تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کو راجستھان کی تاریخ کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے۔ امریکہ کے سابق صدر کلنٹن بھی راجستھان کے کلچر کے مداح تھے۔

Rajasthan desert beauty Photo Credit:
https://www.volunteeringsolutions.com /

راجستھان کی تاریخ حضرت معین الدین چشتیؒ کے تذکرے کے بغیر نامکمل ہے۔خواجہ معین الدین چشتیؒ جنہیں خواجہ غریب نواز کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے کا مزار اجمیر شریف میں ہے۔اس علاقے میں جہاں مسلمان حملہ آور آئے وہیں پر بے شمار اللہ کے ولی بھی آئے جنہوں نے اسلام کی اشاعت کے لیے بے حد کام کیا۔ان میں خواجہ غریب نواز کا نام ایک خاص اہمیت کا حامل ہے۔یہاں کی خاص بات یہ ہے کہ ان کے مزار پر مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ہندو بھی بڑی تعداد میں آتے ہیں۔

Mazar Khawaja Mohuidin Choshti aleh rehmat Photo
Credit: https://mapio.net/

کوٹہ: ایک انوکھی وجہ شہرت کا حامل قدیم اور جدید شہر

پرانے وقتوں میں کوٹہ شہر کو کوٹاہ بھی کہا جاتا تھا۔ یہ راجستھان کے جنوب مشرق میں واقع ایک قدیم شہر ہے۔ دریائے چنبل کے کنارے جے پور سے اڑھائی سو کلومیٹر کے فاصلے پر جنوب میں واقع ہے۔ اس کی آبادی بارہ لاکھ سے زائد ہے۔ جے پور اور جودھ پور کے بعد یہ راجستھان کا تیسرا سب سے زیادہ آبادی والا شہر ہے کوٹہ کی وجہ شہرت اس شہر میں موجود اہم کوچنگ سنٹر ہے جہاں بھارت کی اعلیٰ درجے کی یونیورسٹیوں میں داخلے کے لیے امتحانات کی تیاری کروائی جاتی ہے۔ جس کی تفصیلات میں آئندہ صفحات میں بیان کروں گا۔

کوٹہ شہر کسی زمانے میں یہاں قائم بونڈی کی راجپوت ریاست کا ایک حصہ تھا۔ بعدازاں اس نے بونڈی سے علیحدگی حاصل کر لی اور یہ ایک آزاد ریاست بن گیا۔ کوٹہ میں موجود کئی شاندار عمارتیں بھی اس کی وجہ شہرت ہیں۔ یہاں سب سے زیادہ مشہور ایک ایسا باغ ہے جہاں دنیا کے ساتوں عجوبے بنائے گئے ہیں، جن میں تاج محل بھی شامل ہے۔ اس کی مختصر تاریخ آپ کی دلچسپی کا باعث ہو گی۔

یہ تمام تر معلومات میں نے Imperial Gazetteer of India, v. 15, p. 412 میں موجود کوٹاہ کے نام سے لکھے گئے ایک مضمون سے لی ہیں یہ مضمون نیٹ پر موجود ہے۔ اس کے علاوہ آر پی شاشتری کی کتاب **Jhala Zalim Singh (1730-1823), the De-facto Ruler of Kota:** Who Also Dominated Bundi and Udaipur, Shrewd Politician, Administrator, and Reformer سے بھی کافی معلومات ملی ہیں۔

ان کتابوں سے پتہ چلتا ہے کہ کہ بارہویں صدی عیسوی میں ایک چوہان راجپوت سردار راؤ دیو نے یہاں موجود پہلے سے قائم ریاست کو فتح کیا اور اپنی ریاست

جس کا نام بونڈی تھا کی بنیاد رکھی۔ اس علاقے میں مغل حکمرانوں کی آمد کے بعد یہ ریاست مغل سلطنت کی حلیف بن گئی۔ کہتے ہیں کہ مغل بادشاہ جہانگیر کے دور میں بونڈی کے ایک مقامی حکمران راؤ رتن سنگھ نے اپنے بیٹے جس کا نام مادھو سنگھ تھا کو کوٹہ کا علاقہ دے دیا۔ کوٹہ کا راجہ جوان بھی تھا اور عقل مند بھی۔ اس کے دور میں ریاست کوٹہ نے بے حد ترقی کی۔

اس علاقے میں کئی راجاؤں کے درمیان لڑائیاں ہوئی لیکن ایک لڑائی افسانوی رنگ کے لیے ہوئی ہے۔ یہ لڑائی تیرہویں صدی میں بنڈی کے جیٹ سنگھ اور کوٹیا بھیل کے درمیان ہوئی۔ جس میں کوٹیا کو شکست ہوئی۔ اس کی بہادری سے متاثر ہو کر جیٹ سنگھ نے اس علاقے کا نام کوٹہ رکھا۔ یہ بھی بہادروں کی قدر کا ایک طریقہ تھا۔ اس نے مزید یہ کیا کہ کوٹیا کا سر ایک مناسب جگہ پر دفن کروایا اور اس جگہ پر نشانی بھی بنائی جس پر لوگ آج بھی جاتے ہیں۔ خاص طور پر شاہی خاندان کے لوگ ہر سال یہاں حاضری دیتے ہیں۔

کوٹہ کا قلعہ ایک قابلِ ذکر عمارت ہے۔ اس کا ریمپ ایک سیدھی چڑھائی کی مانند ہے۔ ایسا بہت ہی کم ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے یہ ایک محفوظ قلعہ مانا جاتا تھا۔ یہاں پر کئی اور محل بھی موجود ہیں جو ان راجپوت راجاؤں کی یادگاریں ہیں۔ میں نے جو پڑھا اس کے مطابق ان میں سے اکثر عمارتیں اس دور کی ہیں جب اس ریاست کے والیان نے انگریزوں کے ساتھ صلح کر لی تھی اور امن کو جنگ پر ترجیح دی تھی۔ میرے لیے یہ بات بہت عجیب تھی کہ اس ریاست کے ایک والی کے نام کے ساتھ برگیڈیئر کا لاحقہ بھی لگا ہوا ہے۔ جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس ریاست کے راجپوت حکمران، انگریزوں کی فوج میں باقاعدہ شامل ہوتے تھے۔ بالکل اسی طرح جیسے وہ مغل فوج میں بھی عہدیدار ہوا کرتے تھے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں دونوں طرح کے راجپوت سردار موجود تھے۔ ایک وہ جنہوں نے اپنی دھرتی کی حفاظت کے لیے جان دینا پسند کیا اور دوسرے وہ جو دربار میں کرسی پر بیٹھنا پسند کرتے تھے۔

تاریخ نے دونوں کو یاد رکھا ہے۔

مجھے یاد ہے کہ میرے بچپن میں جب کبھی ہمارے بزرگ کسی کی دولت کی مثال دیتے تو وہ بھیم سنگھ کا نام استعمال کرتے تھے۔ میں جب اس علاقے کی تاریخ پڑھ رہا تھا تو میں نے مہاراؤ بھیم سنگھ کا نام بھی پڑھا۔ جس سے اس علاقے میں میری دلچسپی بڑھ گئی۔ میں نے مختلف لوگوں کی تحریروں میں پڑھا کہ بھیم سنگھ کے دور میں اس ریاست نے بے حد ترقی کی وہ پہلا شخص تھا جسے مہاراؤ کا لقب دیا گیا۔ یہ لقب یقینی طور پر اسے کسی دربار سے ہی ملا ہو گا۔

میں نے پچھلے صفحات میں ایک شخص زلیم سنگھ کا ذکر کیا تھا جو کوٹہ کی ریاست کا ایک جنرل تھا۔ کوٹہ کے راجہ کی وفات کے وقت اس کا بیٹا نا بالغ تھا، اس وجہ سے ریاست کا انتظام زلیم سنگھ کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے انگریزوں کے ساتھ ایک معاہدہ کیا جس کے نتیجے میں 1835ء میں جھالاور ریاست کا وجود عمل میں آیا۔ مغل دربار سے اس ریاست کے بہت قریبی تعلقات تھے۔ یاد رہے اس ریاست کی بنیاد ہی مغل بادشاہوں نے رکھی تھی۔ ایک وقت آیا جب شاہجہاں اپنے بیٹے اورنگزیب کے خلاف لڑ رہا تھا تو یہاں کے راجپوت راجہ راؤ مادھو سنگھ نے بوڑھے مغل بادشاہ شاہ جہاں کا ساتھ دیا اور اس جنگ میں شاہجہاں کی طرف سے لڑتے ہوئے اس کے پانچ بیٹے مارے گئے۔ زندہ بچ جانے والے چھٹے بیٹے کے جسم پر پچاس سے زائد زخموں کے نشان تھے۔

کئی جگہ بیٹوں کی بجائے بھائیوں کا ذکر ہے۔ صحیح کیا ہے؟ مجھے معلوم نہ ہو سکا۔

کوٹہ اور برطانوی راج

تاریخ میں لکھا ہے کہ زلیم سنگھ کی رہنمائی میں جس ریاست نے انگریزوں کے ساتھ معاہدے پر دستخط کیے اس کا نام کوٹہ تھا اور اس طرح یہ شمالی ہندوستان کی پہلی راجپوت ریاست تھی جس نے انگریزوں کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ سب زلیم سنگھ کے کہنے پر ہوا جس کے بدلے اسے ایک الگ علاقہ دے دیا گیا جہاں اس نے جھالاور نامی ریاست کی بنیاد رکھی۔ اس طرح اس نے انگریزوں کے قدم جمانے میں مدد کرنے کا صلہ پالیا۔ اس شہر میں کوٹہ حکمرانوں کے بنائے ہوئے محلات ابھی بھی موجود ہیں جو قابلِ دید ہیں۔

کوٹہ فیکٹری: ایک دلچسپ کہانی

اگر آپ کو مختصر دورانیے کی فلمیں دیکھنے کا شوق ہو تو ایک فلم "کوٹہ فیکٹری" بھی آپکی نظر سے گزری ہو گی۔ میں نے جب اس فلم کو دیکھا تو اس کا پلاٹ اس کے نام سے بہت مختلف تھا۔ اس فلم کا تعلق کوٹہ میں پڑھنے والے طالبعلموں سے تھا۔ وہ سب دیکھ کر جب میں نے کوٹہ کے بارے میں جانا تو پتہ چلا کہ 1981ء میں اس شہر میں ایک انجینئر نے اپنے فارغ وقت میں جماعت ہشتم کے طلباء کو ٹیوشن دینا شروع کی۔ اس کے بعد انھوں نے دسویں اور بارہویں جماعت کے طالب علموں کے لیے بھی ٹیوشن کا بندوبست کیا۔ اس کے علاوہ بچوں کو بھارت کے اعلیٰ تعلیمی اداروں میں داخلے کے لیے امتحان کی تیاری بھی کروانی شروع کر دی۔

https://www.youtube.com/watch

پھر ایک وقت آیا کہ یہاں کے ایک طالب علم نے IIT- JEE کا امتحان پاس کر لیا۔ جس سے ایک نئے دور کا آغاز ہو گیا۔ بنسل کلاسز کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا گیا۔اس وقت بنسل کلاسز کی ملک بھر کے سولہ شہروں میں شاخیں قائم ہو چکی ہیں۔اس کے بعد کئی لوگوں نے اس طرح کے ادارے قائم کرنا شروع کر دیے۔اب اس شہر میں سالانہ ڈیڑھ لاکھ سے زائد طالبعلم یونیورسٹی میں داخلے کے امتحان کی تیاری کے لیے آتے ہیں۔اب ان کوچنگ سنٹرز کو کوچنگ فیکٹریاں کہا جاتا ہے۔اسی وجہ سے اس شہر کا نام گنیز بک آف ریکارڈ میں بھی درج ہے۔

ریاست الور: جس کے راجہ نے چھ رولز رائس کاریں خرید کر صفائی پر لگادی تھیں

جب میں سوہن لال صاحب سے باتیں کر رہا تھا تو اس وقت ہم ایک مرتبہ پھر اترپردیش میں داخل ہو چکے تھے اور آگرہ کے مغرب سے گزر رہے تھے۔ ہمارے مشرق میں اترپردیش کا شہر آگرہ اور مغرب میں ایک امیر ریاست الور واقع تھی۔الور کو الوار بھی لکھا جاتا ہے۔ الور شہر، بھرت پور سے سو کلومیٹر سے زائد فاصلے پر واقع ہے۔الور شہر

کا ذکر بار ہا سنا تھا۔ ہمارے پاکستان میں ایک مشہور شاعر، تابش الوری بھی گزرے ہیں۔ انھوں نے اپنے شہر کا نام پاکستان بھر میں متعارف کروایا۔ اسی ریاست کے ایک والی کے بارے میں یہ بھی سننے کو ملا کہ ایک مرتبہ لندن میں رولز رائس کار کے شوروم پر گئے تو وہاں کے سیلز مین نے ان کی مناسب آو بھگت نہ کی جس پر وہ ناراض ہو گئے اور انھوں نے چھ رولز رائس خرید کر ہندوستان میں اپنے شہر کی صفائی کرنے پر لگا دیا (ایسا ہی بہاولپور ریاست کے والی نواب صادق عباسی نے بھی کیا تھا) مختلف راجاؤں کے ایسے بے شمار واقعات ملتے ہیں۔ کئی راجاؤں نے اپنی ذاتی پسند اور نا پسند کی وجہ سے عجیب و غریب حرکات کیں۔ اس شہر اور ریاست کی بھی ایک اپنی ہی تاریخ ہے، جس کا مختصر ذکر یقیناً آپ کو پسند آئے گا۔

الور شہر، دلی کے جنوب میں 150 کلومیٹر اور جے پور سے شمال کی طرف 150 کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ سیاحت کے نقطۂ نظر سے الور ایک اہم جگہ ہے۔ اس علاقے میں متعدد قلعے، جھیلیں اور ان کے علاوہ بھی کئی قابلِ ذکر مقامات موجود ہیں۔ تاریخ میں اس شہر کے نام کی کئی وجوہات ملتی ہیں۔ جن میں سے ایک تو یہ ہے کہ ہزار سال قبل یہاں سلوا قبیلہ آباد تھا۔ جس کی وجہ سے اسے سالوا پور کہتے تھے جو بگڑ کر الور بن گیا۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اس شہر کا نام علاوال خان میواتی جس نے راجپوتوں کو شکست دے کر اس علاقے پر قبضہ کیا تھا کی وجہ سے ہے۔ مجھے پہلی بات زیادہ درست لگتی ہے۔ حالیہ تحقیق کے مطابق گیارہویں صدی میں مہاراجہ الغراج جو امبر کے مہاراجہ کاکیل کا بیٹا تھا اس علاقے کا حاکم تھا۔

الور شہر کی دلچسپ بات اس علاقے سے وید تہذیب کا آغاز ہے۔ ہندوستان کی تاریخ پڑھتے ہوئے میں نے یہ جانا کہ ہندوستان کے شمال مغربی، مغربی اور جنوبی علاقوں جس میں موجودہ پاکستان کے علاقے بھی شامل تھے میں ایک قدیم ترین تہذیب جسے

وادیٔ سندھ کی تہذیب کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، موجود تھی۔ اب تک میں نے جو بھی لکھا ہے اس کے مطابق مدراس، مہاراشٹرا، گجرات، مدھیہ پردیش، راجستھان، سندھ اور جنوبی پنجاب کے ساتھ ساتھ بلوچستان میں بھی اس تہذیب کے آثار ملتے ہیں۔ جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ سب علاقے ایک ہی طرح کی تہذیب اپنائے ہوئے تھے۔ میں نے ان کا مختصر ذکر بھی کیا ہے۔ میں نے یہ بھی لکھا ہے کہ مختلف مقامات سے ملنے والی چیزوں سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ ان کا تعلق ہندومت، جین مت یا کسی اور مذہب سے تھا بلکہ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ان کے ہاں خدا کا تصور ہی نہیں تھا۔

تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ آج سے تقریباً چھ ہزار سال قبل ہندوستان کے شمال مغربی علاقوں میں وید تہذیب کا آغاز ہوا۔ اس تہذیب کا آغاز کرنے والے آریا نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ اسے ہندو تہذیب کا آغاز بھی کہا جاتا ہے۔ ابتداء میں سب زبانی باتیں تھیں لیکن بعد میں انھیں تحریر میں لایا گیا تو ایک زبان وجود میں آئی۔ ہندو کہتے ہیں کہ ان کی کتاب گیتا چھ ہزار سال پرانی ہے۔ اس کتاب کے علاوہ بھی بے شمار تحریریں ملتی ہیں۔ جنہیں ہم وید کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

اب تک جو میں سمجھا ہوں، اس کے مطابق وادیٔ سندھ کی تہذیب اور ویدک تہذیب کے درمیان کوئی رابطہ نظر نہیں آتا۔ وہ درمیانی عرصہ کتنا تھا اور اس میں کیا کچھ ہوتا رہا؟ اس بارے میں کسی کو کوئی علم نہیں۔

الور شہر کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ اس شہر کے رہنے والوں نے ویدک تہذیب کا آغاز کیا اور ہندومت کی بنیاد رکھی۔ اس وجہ سے الور شہر بہت ہی اہم علاقہ سمجھا جاتا ہے۔ اس بارے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے اور ممکن ہے کہ وہ بھی درست اور یہ بھی درست ہو۔ اس علاقے پر کئی ہندو راجاؤں نے حکومت کی۔ تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ کسی دور میں مہاراجہ سورج مل جاٹ کا خاندان بھی یہاں حکومت کرتا تھا۔ راجہ

پرتاپ سنگھ نے یہاں پر موجود الور قلعے پر قبضہ کیا جو جاٹوں کے قبضہ میں تھا اور جدید الور کی بنیاد رکھی۔ ایک اور شخص جو الور کے قریب ہی گاؤں کا رہنے والا تھا، جس کا نام ہیم چندر را وکرمادتیہ جسے عرف عام میں ہیمو کے نام سے یاد کیا جاتا تھا نے بھی اس علاقے کی شہرت میں بے حد اضافہ کیا۔

آپکے علم میں ہے کہ بابر نے 1526ء میں لودھی کو شکست دے کر دلی پر قبضہ کیا تھا اس کے ابتدائی دور میں ہیمو نے بھی دلی کے تغلق آباد علاقے میں مغل افواج کو شکست دینے کے بعد 1556ء میں دلی پر قبضہ کر لیا اور اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ اسے پانی پت کی دوسری جنگ میں مغلوں نے شکست دی اور پھانسی دے دی اور یوں شمالی ہندوستان میں بھی مغل حکومت مستحکم ہو گئی۔ یہ وہ آخری ہندو راجہ تھا جو دلی کی گدی پر بیٹھا تھا۔ اس طرح یہ تمام علاقے مغلیہ سلطنت کا حصہ بن گئے۔ اس واقعہ کے 391 سال بعد تقسیم ہند کے نتیجے میں پہلی مرتبہ دلی کا حکمران کوئی ہندو بنا۔

الور کے ہندوؤں نے مغلیہ سلطنت کے زوال میں انگریزوں کا بڑھ چڑھ کر ساتھ دیا جس کے نتیجہ میں جب انگریزوں کا اس علاقے پر قبضہ ہو گیا تو انھوں نے 1770ء میں مقامی راجپوتوں کو الور اسٹیٹ قائم کر کے دی اور پرواہ سنگھ کو اس کا راجہ بنا دیا۔ یہ انگریزوں کی سب سے زیادہ وفادار ریاستوں میں سے ایک تھی۔ اس کے والیان انگریز کی فوج میں باقاعدہ عہدہ دار بھی تھے۔ الور ریاست پونے دو سو سال تک قائم رہی۔ اس دوران کئی لوگ گدی پر بیٹھے۔ ان میں سے میں کچھ کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

مہاراجہ سر جیئے سنگھ وہی راجہ ہیں جنھوں نے رولز رائس خرید کر صفائی پر لگائی تھیں۔ ان کے دور میں پولیس کے محکمے کی تنظیم نو کی گئی۔ انھوں نے شہنشاہ ایڈورڈ ہشتم کے دربار میں بھی شرکت کی۔

When Maharaja Jai Singh in the 1920's, visited the Rolls-Royce showroom in London, he felt insulted when the salesmen implied that he couldn't afford to purchase the car. He purchased all the six which were available, shipped them to India, and ordered to use them for collecting and transporting the city's garbage.

Photo Credit: https://www.youtube.com/watch

1907ء امیں نھوں نے ریاست الور کی سرکاری زبان کو اردو سے ہندی میں تبدیل کر دیا۔ میرے لیے یہ ایک نئی بات تھی کہ اس ریاست کی سرکاری زبان اردو تھی ۔اس کی تصدیق یہاں کے سکوں پر اردو میں لکھی ہوئی تحریر سے بھی ہوتی ہے۔ میرے لیے یہ ایک دلچسپ بات تھی کہ اردو جسے مسلمانوں کی زبان سمجھا جاتا تھا ایک ایسی ریاست کی سرکاری زبان قرار پائی جہاں مسلمان اقلیت میں تھے۔

جنگ عظیم اوّل میں الور کے راجہ نے انگریزوں کی بے حد فوجی امداد کی۔ جس کے بدلے یکم جنوری 1915ء کو مہاراجہ کو برطانوی فوج میں اعزازی لیفٹیننٹ کرنل اور یکم جنوری 1921ء کو آنریری کرنل مقرر کیا گیا۔جنگ کے خاتمے پر انھیں کئ دوسرے القابات سے بھی نوازہ گیا۔ ان کی علمی قابلیت کی وجہ سے وہ ہندوستان کے نمائندے کے طور پر 1923ء میں لندن میں منعقدہ امپیریل کانفرنس میں بھی شریک ہوئے اور چیمبر آف پرنسز کی ایک گول میز کانفرنس میں بھی شرکت کی۔ جۓ سنگھ پولو کے بہترین کھلاڑی تھے۔اس کے ساتھ ساتھ وہ ہندو فلسفے کے عالم بھی سمجھے جاتے تھے ان کا انتقال 1937ء میں پیرس میں ہوا۔ مہاراجہ تیج سنگھ ریاست الور کے آخری حکمران تھے۔ان کے دور کی نمایاں خصوصیات میں سب سے پہلے ان کی تعلیم سے دلچسپی ہے۔ ان

کے دور میں کئی سکول کھولے گئے اور انھیں اپ گریڈ بھی کیا گیا۔ انھوں نے کئی ہاسٹل بھی بنوائے۔ ان کے دور میں سنسکرت کالج بھی بنایا گیا۔

میں نے ریاست الور کی تاریخ پڑھتے ہوئے کئی لوگوں کی تحریریں پڑھیں جن میں یہ لکھا گیا تھا کہ بھرت پور اور الور کے راجاؤں نے تقسیم ہند کے وقت ان لوگوں کی سرپرستی کی جو مسلمانوں کا قتل عام کرنے میں پیش پیش تھے۔ خاص طور پر الور میں موجود راجپوت مسلمانوں کے قتل کا الزام بھی ریاست کے حکمرانوں پر ہے۔ تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اس طرح کے واقعات اس سے قبل بھی ہوتے رہے ہیں۔ خاص طور پر راجہ بختاور سنگھ کے دور میں تو مساجد گرانے، نماز پر پابندی اور قبروں کی بے حرمتی بھی ہوتی رہی ہے۔ اس کی تفصیل Alwar's Long History of Hindutva Casts a Shadow Even Today کے عنوان سے کنان سرینیواسان نے ایک جرنل WIRE میں لکھی ہے۔

الور میں واقع قلعہ بالا بھی اپنی ایک انوکھی تاریخ رکھتا ہے۔ یہ وہ قلعہ تھا جہاں مسلمانوں کے قبضہ سے پہلے انسانی جانوں کی قربانی دی جاتی تھی۔ یہ الور قصبے کے قریب ایک پہاڑی پر واقع ہے۔ پندرہویں صدی کے آخر میں خانزادہ علاوال خان نے راجپوت راجہ کو شکست دے کر اسے حاصل کیا۔ مغلیہ سلطنت کے مرکز، دلی کے پاس ہونے کی وجہ سے بہت جلد یہ قلعہ بھی ان کے قبضے میں چلا گیا۔ پھر حسن خان میواتی نے اسے دوبارہ سے تعمیر کیا۔ اس دوران یہاں بسنے والے راجپوت، جنوبی ہند کی طرف نقل مکانی کر گئے۔ تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ یہ لوگ دربدر ہوتے ہوئے پٹنہ تک پہنچ گئے۔ اس دوران کچھ لوگ ان علاقوں میں بس بھی گئے جہاں پانی ملا یا زمین اچھی لگی۔ بہار اور مہاراشٹرا کے علاوہ جنوبی ہندوستان کے دور دراز علاقوں میں واقع کئی عمارتیں اور

مندر بھی اس بات کا ثبوت ہیں کہ یہ لوگ ان علاقوں تک بھی آئے تھے۔ انھوں نے مغلوں کی ماتحتی کی بجائے خود ساختہ ملک بدری کو ترجیح دی۔

مہاراجہ سورج مل جاٹ: بھرت پور ریاست کا مہاراجہ جو ناقابلِ شکست رہا

جب ہم کوٹہ سے گزرے تو اس وقت صبح کے چار بج رہے تھے۔ ریلوے کی طرف سے فراہم کی گئی معلومات کے مطابق بھرت پور ہمارے راستے میں تو آتا تھا لیکن وہاں ہمارا اسٹاپ نہیں تھا۔ یہ جان کر مجھے شوق پیدا ہوا کہ میں بھرت پور کو دیکھوں، بھلے چلتے چلتے ہی صحیح۔ بھرت پور اور بھرت پور کے مہاراجہ سورج مل جاٹ کا ذکر میں نے بے شمار دفعہ سن رکھا تھا۔ میرے پاس موجود کتاب میں بھی اس کا تذکرہ تھا۔ جب ہم بھرت پور سے گزر رہے تھے تو اس وقت صبح کا اجالا ہو رہا تھا۔ اس لیے اسے روشنی میں دیکھنا ممکن ہو سکا۔ میرے ساتھی ابھی تک سو رہے تھے۔ البتہ چائے والے کی دھیمی آواز ضرور سنائی دینے لگی۔ یہ آواز میرے جیسے چائے کے شوقین حضرات کے لیے کسی موسیقی سے کم نہیں ہوتی۔ اس سے پہلے کہ میں اپنے ایک ہندو ہمراہی جن کا تعلق ایک پبلشنگ ہاؤس سے تھا سے ایک طویل مکالمے کا ذکر کروں میں چاہوں گا کہ بھرت پور کے راجہ سورج مل جاٹ اور اس علاقے میں واقع چند اہم مقامات کا مختصر تعارف آپ کی خدمت میں پیش کروں۔

یہ تمام تر معلومات حاصل کرنے کے لیے میں نے درج ذیل تین کتابوں اور برٹانیکا انسائکلو پیڈیا سے استفادہ کیا ہے۔

بل کشن داس کی کتاب The Political and Social History of the Jats راج پال سنگھ کی کتاب- Rise of the Jat Power H. E. Drake

A Gazetteer of Eastern ایچ ای ڈریک بروکمین کی کتاب Brockman Rajputana Comprising the Native States of Bharatpur, Dholpur, & Karauli

اور اس کے ساتھ ساتھ **1911 Encyclopædia Britannica, Volume 3** 1911 Encyclopædia Britannica/ Bharatpur کو بھی دیکھا ہے۔

راجستھان میں ایک جاٹ ریاست بھرت پور بھی واقع تھی جس کا ایک والی مہاراجہ سورج مل جاٹ بھی تھا۔ وہ بیک وقت مغلوں، مراٹھوں اور راجپوتوں سے برسر پیکار بھی رہا، دلی اور آگرہ پر قبضہ بھی جمایا اور اس کے ساتھ ساتھ اسے جاٹ قوم کا افلاطون بھی کہا جاتا ہے۔ اس کی شہرت کی وجہ سے اس کے نام کی ایک یونیورسٹی کئی جگہوں پر اسکے مجسمے بھی قائم ہیں۔

میں نے اب تک جہاں بھی کوئی مجسمہ دیکھا، ان میں اکثر ہندوستان کی آزادی کی جنگ لڑنے والوں کے تھے اور کوئی بھی مجسمہ کسی غیر ملکی حملہ آور مغل، اِفغان، ترک، ڈچ، ایرانی، افریقی، عرب، انگریز یا کسی اور کا کوئی نہیں تھا۔ البتہ پاکستان میں ان مسلمان حملہ آوروں کے نام کے میزائل بھی ہیں، ادارے بھی اور کتابوں میں انھیں ایک مسلمان ہیرو کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔

بھارت بھر میں مسلمان یا غیر مسلم حملہ آوروں کو کہیں بھی اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔ یہ حملہ آور جب حکمران تھے اسوقت انھوں نے ضرور اپنے نام کی بہت سی عمارتیں، باغات کے علاوہ لوگوں کی فلاح کے کئی کارنامے سر انجام دیے جو اب تک بھی باقی ہیں۔ تقسیم ہند کے بعد غیر ملکی حملہ آوروں کی عزت افزائی کے لیے شاید ہی کوئی عمارت یا ادراہ بنایا گیا ہو۔ یہ بات میں اپنے علم کی بنیاد پر کہہ رہا ہوں۔ ممکن ہے درست

نہ ہو۔ دوسری طرف یہ بات بہت واضح ہے کہ غیر ملکی حملہ آوروں کے ساتھ جس نے بھی جنگ کی خواہ وہ کوئی مسلمان ہو یا غیر مسلم اس کے عزت آج بھی کی جاتی ہے۔ ٹیپو سلطان کے مثال ہمارے سامنے ہیں۔ انھیں بھارت بھر ایک دیوتا کا مقام حاصل ہے۔

بھارت کے لوگوں کے مہاراجہ سورج مل جاٹ اس وقت اس علاقے اور خاص طور پر جاٹ قوم کے نزدیک ایک افسانوی کردار کے نام سے جانا جاتا ہے۔ آپ اسے اس علاقے کا دُلا بھٹی یا احمد خان کھرل بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس کے بارے میں حاصل معلومات حاضرِ خدمت ہے۔

مہاراجہ سورج مل 1707ء کو پیدا ہوا اور 1763ء میں صرف پچپن سال کی عمر میں فوت ہو گیا۔ تاریخ دان اسے ہندوستان میں پیدا ہونے والا ایک عظیم ترین جنگجو اور قابل ترین حکمران مانتے ہیں۔ سورج مل، بدن سنگھ کا بیٹا تھا۔ انھوں نے اپنے والد کی زندگی سے ہی حکومتی معاملات میں اہم کردار کیا۔ اپنے والد کی وفات کے بعد وہ باقاعدہ طور پر ریاست کے راجہ بن گئے۔ ان کی حکومت صرف سات سال ہی رہی۔ اور وہ ایک جنگ کے دوران مارے گئے۔ ان کے نام سے کئی بڑے تعلیمی ادارے بھی موجود ہیں۔ بھرت پور میں انھیں ایک ہیرو کا درجہ حاصل ہے۔ ان کے نام کے گانے جوگی حضرات آج بھی گلی محلوں میں گاتے پھرتے ہیں۔ وہ واحد جنگجو تھے جو کسی بھی جنگ میں شکست سے دوچار نہ ہوئے اور انھوں نے دلی اور آگرہ، دونوں جگہ پر مغلوں کے قلعوں پر قبضہ کیا۔ ان کی بیویوں میں جاٹ خاندان کے ساتھ ساتھ ایک راجپوت عورت بھی شامل تھی۔

سورج مل کی داستان کے بغیر راجستھان کی کہانی نامکمل ہے۔ ان کے بارے میں ایک مختصر تحریر پیش خدمت ہے۔

بھرت پور کو راجستھان کا مشرقی دروازہ بھی کہا جاتا ہے۔ یہ دلی سے پونے دو سو کلومیٹر دور جنوب میں اور آگرہ کے مغرب میں پچاس کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ اس کے مغرب میں جے پور ہے جس کا فاصلہ پونے دو سو کلومیٹر ہے۔ گوالیار اس کے جنوب میں اسی کلومیٹر کے فاصلہ پر واقع ہے۔ اس طرح یہ ایک ایسی ریاست تھی جس کے چاروں طرف انتہائی طاقتور ریاستیں موجود تھیں۔ بھرت پور شہر اس ضلع کا صدر مقام ہے۔

یہاں موجود قلعے کی مناسبت سے اسے لوہا گڑھ کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ سترہویں صدی کے اوائل میں جب مغل مکمل طور پر ہندوستان کے طاقتور حاکم تھے تو انھوں نے آگرہ کے قریب بھرت پور کے کسانوں کو اپنے ظلم وستم کا نشانہ بنایا۔ اس وقت بھرت پور جو کہ جاٹوں کا ایک گاؤں تھا کے سربراہ چوریامانتھا جو اس علاقے کا ایک بڑا زمیندار تھا۔ وہ راجستھان میں بھرت پور جاٹ ریاست کا اصلی بانی بھی مانا جاتا ہے۔ اسی نے جاٹوں کو ہندوستان میں ایک سیاسی قوت کی شکل دی۔

چوریامان نے مغلوں کے خلاف جنگ کی لیکن طاقتور مغل حکمران اورنگزیب نے اسے شکست دے دی۔ اسکے باوجود جاٹ کسی نہ کسی طرح اپنے آپ کو بچانے میں کامیاب رہے۔ جیسے ہی مغلیہ سلطنت کو زوال آیا تو یہ لوگ بدن سنگھ کی سربراہی میں اکٹھے ہوئے اور ایک وسیع و عریض علاقے پر اپنی حکومت قائم کی۔ بھرت پور ریاست کا پہلا دارالحکومت دیگ شہر تھا۔ ماتھورا اور آگرہ کے قریب ہونے کی وجہ سے اس پر بار بار حملوں کا خطرہ رہتا تھا۔

چوریامان نے جاٹوں کی قیادت سنبھالنے کے بعد مٹی کا ایک قلعہ بنایا اور اس جگہ کا نام بھرت پور رکھا۔ اس نے اپنی ایک فوج بھی تیار کر لی۔ اس کی حکمت عملی میں ایک بڑی جنگ کی بجائے چھاپہ مار کاروائیاں زیادہ نظر آتی ہیں۔ سب سے پہلے اس نے

شاہی لشکروں اور کاروانوں کی نقل و حرکت پر پہرہ لگایا۔ عملی طور پر وہ اس علاقے کا مالک بن گیا اور مغلوں سے سنسنی کا قلعہ بھی چھین لیا۔ اس دوران اورنگزیب کی اولاد کے درمیان جنگ بھی جاری تھی۔

اس جنگ کو جیتنے والے بیٹے بہادر شاہ نے چوریامان سے صلح کی کوشش کی اور اسے کئی لالچ بھی دیے لیکن چوریامان نے آزاد رہنے کو ترجیح دی اور اس طرح وہ مغل سلطنت کا درباری نہ بن سکا۔ اس کے بر عکس اس نے مغل سلطنت کی گرتی ہوئی طاقت کو موقع غنیمت جانا اور اپنی ریاست کو وسعت دی۔ اب اس کی نگاہ ہمیشہ دلی کے تخت پر ہی رہتی تھی۔ اس کے لیے وہ ہمیشہ کوشاں رہتا تھا۔

ایک واقعے میں چوریامان نے ایک مغل سردار کے قافلے کو نقصان پہنچایا جس پر اس وقت کے مغل حکمران نے ناراضی کا اظہار کیا اور چوریامان سے ایک دربار میں ملاقات کے دوران اسے معافی مانگنے کا کہا۔ چوریامان جس کی پشت پر جاٹوں کی پوری قوت تھی نے معافی مانگنے سے انکار کر دیا۔ حالات کی سنگینی کا اندازہ لگاتے ہوئے بادشاہ نے اسے ایک بڑے علاقے میں لگان لینے کا اختیار دے دیا۔ اس واقعہ نے اسے اس علاقے کا ایک غیر متنازعہ حکمران بنا دیا۔ دوسری طرف راجپوتوں نے اس بات کا برا منایا۔ ان کا خیال تھا کہ انھوں نے بادشاہ کے لیے بے حد خدمات سرانجام دی ہیں لیکن اس نے جاٹ لوگوں کی حمایت کی۔ میرے مطابق یہ وہ واقعہ ہے جو آگے چل کر جاٹوں اور راجپوتوں کے درمیان ایک طویل دشمنی کا سبب بنا جو آج بھی بھارت اور پاکستان بھر میں ہمیں مقامی سطح کے علاوہ ملکی سطح پر خاص طور پر سیاست میں بھی نظر آتی ہے۔

تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ سترہویں صدی کے آخر میں جاٹوں اور چوہانوں کے درمیان ایک لڑائی میں جاٹوں کے سردار راجہ رام کی موت کے بعد اس کے بوڑھے والد، بھجا سنگھ جاٹوں کے سربراہ بن گئے۔ اس وقت یہ سب لوگ متحد نہیں

تھے۔ جاٹوں کی اس ابھرتی ہوئی طاقت کو کچلنے کے لیے اورنگزیب نے کئی لڑائیاں لڑیں۔ اس کام کے لیے ایک راجپوت سردار بشن سنگھ نے اورنگزیب کو سنسنی میں موجود قلعے کو ختم کرنے کا یقین دلایا۔ اس قلعے پر قبضے کے لیے 1690ء میں ایک بڑی جنگ ہوئی جس میں ایک طرف جاٹ اور دوسری طرف مغل اور راجپوت تھے۔ مغل اور راجپوت فوجوں نے مشترکہ طور پانچ ماہ تک اس قلعے کا محاصرہ کیا۔ بالآخر اس پر قبضہ کر لیا گیا۔ کہتے ہیں کہ اس لڑائی میں پندرہ سو جاٹ مارے گئے جب کہ دو سو مغل اور سات سو راجپوت بھی قتل ہوئے۔ یہ پہلی جنگ تھی جس میں ایک طرف غیر ملکی حکمران تھے اور ان کا ساتھ دینے والے ہندوستانی راجپوت موجود تھے۔

یاد رہے جب 1707ء میں دکن میں اورنگزیب عالمگیر کی وفات کے بعد دلی سلطنت کے وارثان آپس میں دست و گریبان تھے تو ایسے میں کئی گروہ مغلیہ سلطنت کے مختلف حصوں پر قبضے کے لیے بھی کوشاں تھے۔ جن میں ایک طرف انگریز دوسری طرف راجپوت تیسری طرف مراٹھےاور چوتھی طرف سکھ تھے۔ ایسے میں جاٹ بھی کسی سے پیچھے نہ رہے۔ مغلیہ خاندان کے وارثان نے اٹھارہ سو ستاون کی جنگ آزادی تک کسی نہ کسی طرح سے اپنی حکومت جاری رکھی۔ یہ تقریباً ڈیڑھ سو سال پر مشتمل عرصہ تھا۔ یہ سب مغل حکمرانوں کی عقل مندی کے باعث ہوا کیونکہ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ بہت کمزور ہو چکے تھے لیکن اس کے باوجود بھی دربار قائم رہا۔

یہ بات بھی دلچسپ ہے کہ بہادر شاہ ظفر تک یہ لوگ شہنشاہ ہی کہلاتے تھے اور پورے ہندوستان میں کوئی دوسرا بادشاہ بھی نہیں تھا۔ سب لوگ، راجے، مہاراجے، رانے، مہارانے، راؤ یا مہاراؤ، میر یا نواب کہلاتے تھے۔ کسی نے بھی بادشاہ کا لقب اختیار نہیں کیا۔ پھر ایک وقت آیا کہ سات سمندر پار بسنے والی ایک انگریز عورت جس کا

نام ملکہ وکٹوریہ تھا ہندوستان کی ملکہ بن گئی اور اس کے بعد آنے والے ہندوستان کے بادشاہ بن گئے۔

چوریامان کی موت کے بعد راجہ جئے سنگھ نے بھرت پور پر حملہ کیا اور قلعے پر قبضہ کرلیا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ اس قلعے کی فتح کے پیچھے چوریامان کے بھتیجے بدون سنگھ کا راجا جئے سنگھ کا ساتھ تھا۔ وہ کسی وجہ سے اپنے چچا چوریامان سے ناراض تھا۔ مہاراجہ سورج مل جاٹ بدون سنگھ کا بیٹا ہے۔ وہ اپنے والد کی موت کے بعد 1755ء میں اس ریاست کا والی بنا۔ اس کے والد نے اپنی زندگی میں ہی اسے کمہر کا علاقہ دے دیا تھا جہاں اس نے پہلے سے موجود ایک قلعے کو وسیع کیا۔ یہ مہاراجہ سورج مل جاٹ کی صلاحیتوں کا پہلا اظہار تھا جس نے اسے مقبول بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔

اس نے اپنی سلطنت میں متعدد قلعے اور محل تعمیر کیے جن میں سب سے اہم قلعہ لوہاگڑھ تھا۔ اس کے بارے میں سب کی متفقہ رائے ہے کہ یہ قلعہ ہمیشہ سے ہی ناقابل تسخیر رہا ہے۔ اس قلعے پر 1805ء میں انگریزوں نے چار بار حملہ کیا لیکن فتح حاصل نہ کرسکے۔ یہ مہاراجہ سورج مل جاٹ کی وفات کے پچاس سال بعد کا واقعہ ہے۔ اس قلعے سے متعلق جاننا یقیناً آپکے لیے بھی دلچسپ ہوگا کہ کس طرح ایک جاٹ قوم نے کسی بھی غیر ملکی مغل اور انگریز کی مدد کے بغیر ایک ایسا قلعہ بنایا جسے کوئی بھی کبھی بھی فتح نہ کرسکا۔

یہ قلعہ بھرت پور شہر کے وسط میں ایک مصنوعی جزیرے پر واقع ہے۔ مہاراجہ سورج مل نے اس قلعے کی تعمیر کا آغاز 1732ء میں کیا تھا۔ یہ قلعہ ساٹھ سال تک تعمیر ہوتا رہا۔ ہر نئے آنے والے جاٹ حکمران نے اس کی تعمیر جاری رکھی۔ یاد رہے مہاراجہ سورج مل 1763ء میں فوت ہوگیا تھا۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس قلعے کی مٹی سے بنی موٹی دیواریں سات کلومیٹر طویل ہیں۔ اس قلعے کے چاروں طرف بے حد

گہرے تالاب ہیں اس کی موٹی بیرونی دیواروں نے مغل اور برطانوی فوج کی طرف سے برسائے گئے توپ کے گولوں کو بھی ناکام بنادیا تھا۔ یہ گولے دیواروں میں جذب ہو جاتے تھے ۔ قلعے کے لوگ انھیں بعد میں اکٹھا کرکے حملہ آور فوجوں کے خلاف ہی استعمال کرتے تھے۔

جب ریاست بھرت پور کا خاتمہ ہوااور اس علاقے پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا تو انھوں نے ان تمام دیواروں کو ختم کردیا جو انکی شکست کا باعث بنی تھیں۔ یہ واقعہ 1826ء میں پیش آیا۔ ابھی بھی اندرونی دیواروں کے کچھ حصے موجود ہیں جو یہ بتانے کے لیے کافی ہیں کہ اہل ہند تعمیر میں کسی مغل یا انگریز سے کم نہ تھے۔ ان کی بنائی ہوئی عظیم عمارتیں ہندوستان کے طول و عرض میں آج بھی موجود ہیں اوران میں کئی عمارتوں کی عمریں ہزاروں سال سے بھی زائد ہیں۔

دلچسپ بات یہ بھی ہے کہ اس قلعے کا ایک دروزاہ قلعہ چتوڑ گڑھ سے لایا گیاہے۔ جسے سلطان علاؤالدین خلجی، اس علاقے کی فتح کے بعد دلی لے آیا تھا۔ بھرت پور کے جاٹوں نے 1764ء میں دلی پر حملہ کیااور فتح حاصل کرنے کے بعد اس دروازے کو بھرت پور لے آئے اور لوہاگڑھ قلعہ میں نصب کر دیا۔

مہاراجہ سورج مل جاٹ کی پہلی ایک بڑی جنگ

سورج مل نے اپنی پہلی بڑی لڑائی 1745ء میں چانڈوس میں لڑی۔ اس لڑائی کا پس منظر یہ تھا کہ مغل بادشاہ محمد شاہ، علی گڑھ کے نواب فتح علی خان سے کسی بات پر ناراض ہوگیا تو اس نے اسے سزا دینے کے لیے ایک افغان سردار اسد خان کو بھیجا۔ فتح علی خان کو محسوس ہوا کہ وہ ایک چھوٹا جاگیردار ہے اس لیے اسے کسی کی مدد کی ضرورت ہو گی تو اس نے مہاراجہ سورج مل جاٹ کو اپنی مدد کے لیے پکارا۔ سورج مل

نے فتح علی کو مدد کی یقین دہانی کروائی اور اپنے بیٹے کی کمان میں ایک بڑی فوج بھیج دی۔ بعدازاں حالات کی سنگینی کا اندازہ لگاتے ہوئے وہ خود بھی علی گڑھ چلا گیا۔

اس جنگ کے نتیجے میں افغان جرنیل اسد خان مارا گیا اور مغل فوج کو عبرت ناک شکست ہوئی۔ اس طرح فتح خان اپنی جاگیر کو بچانے میں کامیاب ہو گیا۔ اس جنگ میں فتح خان کا کوئی خاص کردار نہیں تھا۔ مہاراجہ سورج مل جاٹ کو اس کا یہ فائدہ ہوا کہ وہ اب اس علاقے میں ایک قوت کے طور پر جانا جانے لگا۔

بگور کی جنگ: ایک طرف مہاراجہ سورج مل جاٹ اور دوسری طرف سات قوموں پر مشتمل فوج

تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ مہاراجہ سورج مل جاٹ کے والد اور جے پور کے راجہ جے سنگھ کے آپس میں دوستانہ تعلقات تھے۔ مہاراجہ سورج مل جاٹ نے بھی ان تعلقات کو قائم رکھا۔ جے سنگھ کی وفات کے بعد ان کے بیٹوں ایشوری سنگھ اور مادھو سنگھ کے درمیان تخت کا جھگڑا شروع ہو گیا۔ اس جنگ میں مہاراجہ سورج مل جاٹ نے ایشوری سنگھ کا ساتھ دیا کیونکہ ان کا خیال تھا کہ ایشوری سنگھ بڑا تھا اور اس کا حق زیادہ تھا۔ 1748ء میں ان کے درمیان ایک بڑی جنگ ہوئی۔ اس کے مقابلے میں مراٹھوں، راٹھوروں، سیسودیا، ہڈا، کھیچی اور پنور حکمرانوں کے علاوہ مغلوں نے بھی مادھو سنگھ کی مدد کی۔ ایک طرف اکیلا ایشوری جبکہ دوسری طرف سات مختلف قوموں کی فوجیں تھیں۔ ایسے موقع پر ایشوری نے مہاراجہ سورج مل جاٹ کو مدد کے لیے بلایا۔

ایشوری کی اپنی فوج بہت کمزور تھی۔ یہ جنگ جاٹ فوج نے مہاراجہ سورج مل کی سربراہی میں مادھو سنگھ اور اس کے حمایتیوں کے خلاف لڑی۔ یہ جنگ بگرو میں لڑی گئی جو جے پور شہر کے بالکل پاس تھا جب کہ مہاراجہ سورج مل جاٹ کا علاقہ بہت

دور تھا۔ یہ جنگ ایک طرح سے مادھو سنگھ کے گھر میں لڑی گئی جس کی وجہ سے اسے کئی فوائد حاصل ہوئے لیکن نتیجہ مہاراجہ سورج مل جاٹ کے حق میں نکلا۔

جے پور فوج کے ہراوّل دستے کی قیادت ٹھاکر شیو سنگھ کر رہے تھے۔ ایک گھمسان کی جنگ ہوئی۔ کہتے ہیں کہ اس جنگ میں مہاراجہ سورج مل جاٹ جس کی عمر اسوقت اکتالیس سال تھی نے خود بھی حصہ لیااور اس کے ہاتھوں پچاس سے زائد لوگ بھی مارے گئے۔

آغاز میں فوج کی قیادت ایشوری سنگھ کر رہا تھا۔ ایک یقینی شکست کو دیکھتے ہوئے مہاراجہ سورج مل جاٹ نے تیسرے روز خود قیادت سنبھالی۔ سورج مل نے بڑی ہمت سے جنگ لڑی اور تقریباً یقینی شکست کو فتح میں تبدیل کر دیا۔ اس طرح اس نے 1749ء میں ایشوری سنگھ کو امبر کے تخت پر بٹھایا۔ اس جنگ کے نتیجے میں ہر طرف مہاراجہ سورج مل کی دھاک بیٹھ گئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ایسا پہلی مرتبہ ہوا کہ ایک بڑی فوج جو راٹھوروں، چوہانوں اور مراٹھوں، راجپوتوں اور مغلوں پر مشتمل تھی کو صرف ایک ہی شخص نے عبرت ناک شکست سے دوچار کر دیا۔ لگتا ہے کہ شاید ایسا کوئی بھی نہیں تھا جو مہاراجہ سورج مل جاٹ کے سامنے کھڑا ہو۔ وہ سب لوگ مہاراجہ سورج مل جاٹ کی ابھرتی ہوئی طاقت سے خوفزدہ تھے۔ جنگ میں شکست نے انھیں مزید خوف زدہ کر دیا۔

میر بخشی کا مہاراجہ سورج مل جاٹ سے ایک معاہدہ

بھرت پور کے جاٹوں کی بڑھتی ہوئی طاقت سے دلی کا بادشاہ کچھ زیادہ ہی پریشان ہو گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جاٹ مغل علاقوں پر قبضہ کر رہے تھے۔ فرید آباد جو کہ دلی کے بالکل پڑوس میں تھا پر قبضے نے مغل حکمرانوں کو ایک خوف میں مبتلا کر دیا۔ مغل بادشاہ احمد شاہ نے فرید آباد کی جاگیر صفدر جنگ کو دے دی اور اسے کہا کہ وہ

مہاراجہ سورج مل جاٹ کے خلاف کارروائی کرے۔ اس نے مہاراجہ سورج مل جاٹ کو یہ علاقے چھوڑنے کا مشورہ دیا۔ جاٹ مکمل طور پر طاقت کے نشے میں چور تھے انھوں نے اسے نظرانداز کر دیا، اس کا نتیجہ تو جنگ ہی ہونا چاہیے تھا لیکن ایسا نہ ہوا۔

نومبر 1749ء میں صفدر جنگ اور میر بخشی نے مہاراجہ سورج مل پر مختلف سمت سے حملہ کرنے کا منصوبہ بنایا اور اس کا انھوں نے مہاراجہ سورج مل جاٹ کو پیغام بھی پہنچایا کہ شاید اسی ڈر سے کام ہو جائے لیکن نتیجہ الٹ نکلا۔ مہاراجہ سورج مل جاٹ کی طاقت کا اندازہ لگاتے ہوئے صفدر جنگ نے جنگ کی بجائے صلح کو ترجیح دی۔ ان دونوں کے درمیان ایک معاہدہ ہوا جس کی رو سے مہاراجہ سورج مل جاٹ سے یہ درخواست کی گئی کہ وہ فرخ آباد میں موجود ایک پٹھان سردار کو مارنے میں ان کا ساتھ دیں۔ مہاراجہ سورج مل جاٹ ایک سیانا آدمی تھی۔ اس نے اس کے بدلے ماتھورا کی فوجداری حاصل کر لی اور یوں بھرت پور کی ریاست کی حدیں مزید علاقوں تک پھیل گئیں۔ صفدر جنگ کا مکمل نام کچھ یوں تھا "نواب آف اودھ، وزیر الملک، وزیر الہندوستان وصوبہ کشمیر، آگرہ اور اودھ خان بہادر میر آتش فردوس صفدر جنگ"۔ یہ شخص اس وقت مغل دربار میں سب زیادہ قابل اور بہادر وزیر تھا۔

میر بخشی بھی ایک مغل جرنیل تھا اسے مغلوں کے علاوہ بھی کئی لوگوں کی حمایت حاصل تھی جن میں اکثر مقامی راجپوت سردار تھے۔ میر بخشی نے سورج مل کے قلعے نمرانہ کو تباہ کرنے کے لیے میوات پر حملہ کیا اور 1749ء کو اس پر قابض ہو گیا۔ سورج مل کی فوج نے پانچ ہزار جاٹ فوجیوں کے ساتھ میر بخشی کی فوج کو قید کر لیا۔ یہ ایک انوکھا واقعہ تھا کہ مہاراجہ سورج مل جاٹ نے ایک بڑی مغل فوج کو اپنا قیدی بنا لیا ۔اس کے نتیجے میں حکیم خان اور رستم خان جو ایک نامی گرامی جرنیل تھے مارے گئے اور بے شمار مغل فوجی ہلاک ہو گئے۔ اس کے ساتھ ساتھ مہاراجہ سورج مل جاٹ نے پانی،

خوراک اور مواصلات کی فراہمی بند کر دی اور یوں میر بخشی مہاراجہ سورج مل کے ساتھ معاہدہ کرنے پر مجبور ہو گیا۔

اس معاہدے میں ایسی شرائط شامل تھیں جنہیں مغلوں نے کبھی بھی تسلیم نہیں کیا تھا لیکن اب انھیں کرنا پڑیں۔ جس میں سے سب سے اہم یہ تھی کہ آئندہ کسی مندر کی بے حرمتی نہیں کی جائے گی، ہندوؤں کے طرز عبادت پر کوئی تنقید نہیں ہو گی، علاقے میں موجود کسی بھی پیپل کے درخت کو کاٹا نہیں جائے گا۔ کیونکہ پیپل ہندوؤں کے نزدیک ایک مقدس درخت سمجھا جاتا ہے ۔ یہ سب جان کر مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ اب مہاراجہ سورج مل جاٹ یہ سارے کام بغیر لڑے صرف اپنی دھاک کے بل بوتے پر کر رہا تھا۔ اس کا نام ہی کافی تھا۔

گھیسرا قلعے کا قبضہ: مہاراجہ سورج مل جاٹ کا ایک عظیم کارنامہ

اس وقت کی تاریخ سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ سورج مل نے صفدر جنگ سے دوستی کا بے حد سیاسی اور فوجی فائدہ اٹھایا۔ اسے مغل دربار تک رسائی اسی دوستی کی وجہ سے ملی اور اسے ماتھورا کی فوجداری اور ایک بڑی شاہی جاگیر کا حاکم بنایا گیا۔ اس طرح پہلی مرتبہ سورج مل، صفدر جنگ کی حمایت کی وجہ سے مغلیہ سلطنت کے شاہی علاقوں پر قانونی طور پر قابض ہو گیا۔ اس کے بعد اس نے اپنے مفادات کی خاطر مغلوں کے ساتھ مل کر مقامی راجاؤں کے خلاف کئی جنگیں لڑیں جن میں سب سے اہم قلعہ گھیسرا کی جنگ ہے جو تین ماہ تک جاری رہی۔ اس کی ایک مختصر رُوداد پیشِ خدمت ہے۔

اٹھارویں صدی کے وسط میں صفدر جنگ نے کوئیل علی گڑھ کے فوجدار، راؤ بہادر سنگھ کے خلاف ایک جنگ کا فیصلہ کیا اور اس کے لیے اس نے مہاراجہ سورج مل جاٹ سے مدد کی درخواست کی جو منظور کر لی گئی۔ اس جنگ میں دونوں طرف بے حد

نقصان ہوا کیونکہ راؤ بہادر سنگھ بھی اپنے ہزاروں فوجیوں، مناسب خوراک اور ہتھیاروں کے ساتھ تیار تھا۔ اس جنگ کی تفصیلات بے حد دلچسپ ہیں۔

کئی ماہ کے محاصرے کے بعد حالات کا جائزہ لیتے ہوئے راؤ بہادر سنگھ نے اپنے لوگوں کے دباؤ میں آ کر اپنے ایک زخمی بھائی کو سورج مل سے مذاکرات کے لیے بھیجا۔ سورج مل بھی سیاسی فتح کو ترجیح دیتا تھا۔ اس نے دس لاکھ روپے ادا کرنے کی شرط اور تمام تر اسلحے سے دستبردار ہونے پر واپس جانا منظور کیا۔ اتنی شرمناک شرائط قبول نہ کی گئیں۔ اس پر سورج مل نے قلعے پر چاروں طرف سے شدید حملہ کیا۔ ایک ہی دن میں میر محمد پناہ سمیت پندرہ سو جاٹ فوجی مارے گئے لیکن وہ قلعے میں داخل ہو گئے۔ یہ سب دیکھ کر بہادر سنگھ نے جوہر یعنی اجتماعی خودکشی کا فیصلہ کیا۔ اس نے قلعے میں موجود تمام خواتین کو قتل کر دیا اور خود اپنے بیٹے اجیت سنگھ اور فوجیوں کے ساتھ ایک فیصلہ کن جنگ کے لیے میدان میں آ گیا۔ چشم دید گواہ لکھتے ہیں کہ راؤ بہادر سنگھ اپنے بیٹے اجیت سنگھ کے ساتھ آخری لمحے تک لڑا اور میدان جنگ میں ہی مارا گیا اور یوں سورج مل نے گھیسرا کے قلعے پر قبضہ کر لیا۔ یہ جنگ بھی مہاراجہ سورج مل جاٹ نے اپنے نام کر لی۔

یہ سب جان کر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اس جنگ کے بعد جاٹوں اور راجپوتوں کے درمیان موجود خلیج مزید گہری ہو گئی اور اس کا فائدہ کسی تیسری طاقت کو پہنچ رہا تھا۔ مہاراجہ سورج مل جاٹ نے یہ جنگ ایک غیر ملکی مسلمان حکمران کی خاطر لڑی۔ اس کے نتیجے میں اس کی سلطنت میں تو ضرور اضافہ ہوا لیکن صدیوں سے قائم ایک راجپوت ریاست کا خاتمہ ہو گیا۔ اس جنگ میں جوہر کی رسم بھی دہرائی گئی۔ اس وقت عورتوں کو کسی غیر ملکی مسلمان جنگجو سے تو خطرہ نہیں تھا لیکن ایک ہندوستانی ہندو جنگجو سے ضرور تھا جس کے ڈر سے ان کے مردوں نے اپنی عورتوں کا قتل عام کیا۔ سینکڑوں کی

تعداد میں اپنی بہنوں، بیٹیوں، ماؤں اور بیویوں کے قتل کا تصور اب بھی مجھے لرزا دیتا ہے۔

دلی: جاٹوں کے قبضہ میں

ایک وقت تھا جب مغلیہ سلطنت کا طوطی بولتا تھا اور بھرت پور کے جاٹ ان کے ظلم و ستم کا شکار تھے۔ پھر وقت نے پلٹا کھایا اور مہاراجہ سورج مل نے 1753ء کو دلی پر حملہ کر دیا اور وہ دلی کے نواب غازی الدین کو شکست دے کر دلی پر قابض ہو گیا۔ اب دلی اور اہلِ دلی ان کے رحم و کرم پر تھے۔ جاٹ اپنے پرانے قرضے چکا رہے تھے۔ اس سے قبل 1526ء سے اب تک یعنی پچھلے سوا دو سال تک کسی مقامی سردار کو دلی کو قدموں میں روندنے کا حوصلہ نہیں ہوا تھا۔ جو بھی مقامی سردار دلی آیا وہ مغلیہ سلطنت کا وفادار بن کر ہی آیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ مغلیہ سلطنت کے وارثان مہاراجہ سورج مل جاٹ کے رحم و کرم پر تھے۔

بادشاہ کی فوج اپنے آقاؤں کا تحفظ نہ کر سکی۔ بعدازاں فیروز شاہ کوٹلہ پر ان لوگوں کا قبضہ ہو گیا۔ ایسے میں ایک افغان سردار نجیب روحیلہ مغلوں کی مدد کے لیے آیا لیکن زخمی ہو گیا اور اس کے سینکڑوں فوجی بھی مارے گئے۔ مغلوں کی درخواست پر جنگجو مراٹھے مغلوں کی مدد کو آئے اور ایک غیر ملکی مغلیہ سلطنت کی حفاظت کے لیے اپنی جانیں قربان کرنے لگے۔ اب کی بار ان کے سامنے مہاراجہ سورج مل جاٹ تھا جس نے انھیں بھی عبرت ناک شکست دی۔

اس کشمکش میں راجپوت راجاؤں نے بھی نمک کا حق ادا کیا۔ جنگ کے دوران کھانڈے راؤ ہولکر کا اکلوتا بیٹا ملہار راؤ اپنی فوجوں کا معائنہ کر رہا تھا کہ ایک جاٹ نے اس پر حملہ کر کے اسے بھی مار دیا۔ ملہار راؤ کو بہت دکھ ہوا۔ کہتے ہیں کہ اس نے قسم کھائی کہ وہ مہاراجہ سورج مل کا سر کاٹ کر اسے جمنا میں پھینکے گا لیکن ایسا نہ ہو سکا۔

ایک طرف سے مراٹھوں کا دباؤ تھا۔ مراٹھے، مغل اور ہولکر راجپوت مل کر مہاراجہ سورج مل جاٹ کے خلاف جنگ کر رہے تھے۔ ایسی صورت حال میں کوئی بھی دوسرا حکمران مہاراجہ سورج مل جاٹ کی مدد کرنے کو تیار نہ تھا۔ وہ ان سب پر اکیلا ہی بھاری تھا۔ حالات کی سنگینی کا اندازہ لگاتے ہوئے ہولکر راجپوتوں اور مراٹھوں کے ساتھ ساتھ مغلوں نے بھی مہاراجہ سورج مل جاٹ کے ساتھ معاہدہ کرنے کو ترجیح دی۔ اور یوں مہاراجہ سورج مل جاٹ نے تاریخ میں اپنا نام ایک ایسے جنگجو کے طور پر لکھوایا جس نے اپنے وطن سے دور کسی کی راجدھانی میں اسے اس کے دوستوں سمیت شکست دی۔ اس جنگ کے بعد مراٹھوں اور راجپوتوں کی کافی سبکی ہوئی۔ یہ سب لوگ مغلیہ سلطنت کی حفاظت کرتے ہوئے اپنے بے شمار لوگ مروا بیٹھے اور انھوں نے اس کے ہاتھوں شکست کھائی جس کی ریاست بنے پچاس سال سے بھی کم عرصہ گزرا تھا اور کوئی مقامی ریاست بھی ان کی حلیف نہ تھی۔ یہ معاہدہ مہاراجہ سورج مل کے لیے بہت فائدہ مند ثابت ہوا۔ اب وہ ایک مانی ہوئی طاقت کے طور پر ابھر کر سامنے آیا۔

جاٹ اور ابدالی آمنے سامنے

وقت نے ایک بار پھر پلٹا کھایا۔ مراٹھوں کا مقابلہ کرنے کے لیے مغلیہ سلطنت میں دم خم باقی نہیں تھا۔ انھوں نے اپنے وقت کے نامی گرامی علماء اکرام کے توسط سے احمد شاہ ابدالی سے مدد طلب کی۔ اس کے نتیجہ میں پانی پت کی تیسری جنگ ہوئی جس میں افغان فوجوں نے مراٹھوں کو شکست دی۔ شکست کے بعد ایک لاکھ مراٹھے بھرت پور پہنچ گئے۔ اس موقع پر مہاراجہ سورج مل جاٹ نے تمام سابقہ دشمنیوں کو بھلا کر ان لوگوں کی خدمت کی۔ مہاراجہ سورج مل اور مہارانی کشوری نے ان کی گرم جوشی سے مہمان نوازی کی اور ہر طرح کا آرام پہنچانے کے لیے بے دریغ رقم بھی خرچ کی۔ یہ سب مراٹھوں کے لیے باعث حیرت تھا۔ یہ سب دیکھ کر احمد شاہ ابدالی نے

مہاراجہ سورج مل جاٹ کے خلاف جنگ کرنے کا فیصلہ کیا۔ جنگ سے پہلے اس نے مہاراجہ سورج مل جاٹ سے ایک بڑی رقم کا مطالبہ کیا اور مطالبہ پورا نہ ہونے کی صورت میں جنگ کی دھمکی دی۔ سورج مل نے مطالبہ تسلیم نہ کرتے ہوئے جنگ کرنے کا فیصلہ کیا۔ ابدالی نے سورج مل کے خلاف جنگ چھیڑ دی اور اسکے ایک قلعے ڈیگ پر قبضہ کرلیا۔ اس دوران سورج مل مراٹھوں کو اپنا گرویدہ بنا چکا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ ہولکر بھی سورج مل سے دوستی کر چکے تھے۔ مہاراجہ سورج مل جاٹ کی اسی سیاسی بصیرت کی بنا پر اسے جاٹوں کا افلاطون کہا جاتا ہے۔

اس کشمکش کے دوران ابدالی اور سورج مل کے درمیان خط وکتابت بھی ہوئی۔ یہ بھی ایک دلچسپ کہانی ہے۔ ابدالی نے سورج مل کو ایک دھمکی آمیز مراسلہ بھیجا جس میں لکھا تھا کہ اگر وہ اس کی اطاعت نہیں کرتا تو وہ اسے تباہ وبرباد کردے گا۔ اب جاٹ قوم کا امتحان تھا۔ ان کے سامنے ابدالی تھا جو چوتھی مرتبہ ہندوستان آیا تھا اور اس نے حال ہی میں مراٹھوں کی ایک طاقتور فوج کو بے مثال شکست سے بھی دوچار کیا تھا۔ جاٹوں نے اس کا مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ مہاراجہ سورج مل جاٹ نے ابدالی کو جوابی مراسلہ بھیجا جس کا لہجہ ڈھٹائی اور طنز پر مشتمل تھا۔ میں نے بھی یہ خط پڑھا ہے۔ اس خط کی صرف ایک لائن میں آپکی نظر کرتا ہوں۔

ہندوستان کی سلطنت میں میرا کوئی اہم مقام اور طاقت نہیں ہے۔ میں صحرا میں بسنے والے حکمرانوں میں سے ایک ہوں اور میری نالائقی کی وجہ سے اس دور کے کسی بھی شہنشاہ نے یہ مناسب نہیں سمجھا کہ وہ میرے معاملات میں مداخلت کرے۔ اب جب آپ جیسا طاقتور شہنشاہ، جنگ کے میدان میں میرے سامنے آئے گا تو آپکا یہ قدم یعنی مجھ جیسے معمولی شخص کے خلاف اپنی فوجیں میدان جنگ میں لانا آپ جیسے شہنشاہ کے وقار اور عظمت کے لیے باعث توہین ہوگا۔ کہاں میں اور کہاں آپ۔ البتہ اگر آپ

نے ایسا کیا تو یہ مجھ جیسے ایک عام آدمی کے لیے فخر کی بات ہو گی کہ میں ایک عظیم فاتح کے مد مقابل ہوں۔ میں نے آج تک کوئی جنگ نہیں ہاری یہ جنگ بھی نہیں ہاروں گا۔ آپ سے جنگ جتینا مجھے تاریخ میں امر کر دے گا اور میں امر ہونے کو ہر حال میں ترجیح دوں گا۔ آپ جہاں چاہیں میں وہیں پہنچ جاؤں گا۔ اب دیر نہیں ہونی چاہیے۔

اس خط و خطابت کے بعد حالات کچھ ایسے ہو گئے کہ ابدالی اور سورج مل کے درمیان صرف لفظی جنگ ہی ہوئی کوئی باقاعدہ جنگ نہ ہوئی۔ میرے خیال میں ایسا ہونے میں سورج مل کی معاملہ فہمی کا بے حد دخل ہے۔ اس نے جنگ کیے بغیر ہی بہت کچھ حاصل کر لیا۔

آگرہ قلعہ پر قبضہ کرنے والا پہلا جاٹ حکمران

بھرت پور، آگرہ سے پچاس کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ مغلیہ دور میں آگرہ سب سے امیر شہر تھا۔ مہاراجہ سورج مل نے اپنے اثر و رسوخ بڑھانے کے لیے آگرہ کے قلعے پر قبضہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے پہلے چار ہزار جاٹ فوجیوں پر مشتمل اپنی ایک فوج بھیجی اور بعد میں خود بھی میدان جنگ میں چلا گیا۔ اس نے نہایت آسانی سے 1761ء میں آگرہ کا قلعہ فتح کر لیا۔ اس کی وفات کے بعد 1774ء تک بھی یہ قلعہ بھرت پور حکمرانوں کے قبضے میں رہا۔ مہاراجہ سورج مل کے بعد، مہاراجہ جوہر سنگھ، مہاراجہ رتن سنگھ اور مہاراجہ نہال سنگھ یہاں مقیم رہے۔ آگرہ کے قلعے میں مہاراجہ نہال سنگھ کے نام سے ایک حویلی بھی موجود ہے۔ یہ حویلی میں نے اپنے قلعہ آگرہ کے دورے کے موقع پر بھی دیکھی تھی۔ اس کے علاوہ یہاں پر مہاراجہ جوہر سنگھ کی ایک چھتری بھی موجود ہے۔

فرخ نگر پر جاٹ حملہ

میرے لیے بھی ایک اچنبھے کی بات تھی جب میں نے یہ پڑھا کہ دلی کے جنوب مغرب میں پچاس کلو میٹر کے فاصلے پر فرخ نگر نامی ایک قصبے جو اب بھی موجود ہے پر ایک بلوچ، حکمرانی کرتا تھا جس کا نام موسوی خان تھا۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بلوچ بھی کسی سے پیچھے نہیں رہے۔ یہ بلوچ کہاں سے آئے تھے مجھے اس کا علم نہ ہو سکا۔ میرا اندازہ ہے کہ یہ ایرانی بلوچ تھے۔ مہاراجہ سورج مل جاٹ نے اسے بھی فتح کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے اس علاقے پر چڑھائی کی اور اسے بھی اطاعت پر مجبور کر لیا۔ موسوی خان نے معاہدے کے لیے ایک دلچسپ شرط عائد کی۔ اس نے کہا کہ وہ اس وقت ہتھیار ڈالے گا جب مہاراجہ سورج مل جاٹ گنگا کا پانی ہاتھ میں لے کر معاہدے کی پاسداری کا اعلان کرے گا۔ مہاراجہ سورج مل جاٹ نے ایسا ہی کیا۔ بلوچ سردار کو قیدی بنا کر بھرت پور روانہ کر دیا گیا۔

اس فتح کے نتیجے میں فرخ نگر کا قلعہ اور اس میں موجود بیش بہا مال و دولت جاٹ قوم کے ہاتھ لگا۔ گڑھی ہرسو، ریواڑی اور روہتک تک کے علاقے پہلے ہی سورج مل کے قبضے میں تھے۔ اس فتح کے بعد اس نے ایک اور طاقتور بلوچ سردار بہادر خان کے مضبوط گڑھ جو دلی کے مغرب میں بیس کلو میٹر کے فاصلہ پر واقع تھا پر بھی حملہ کر دیا۔ سردار بہادر خان نے نجیب الدولہ سے مدد کی اپیل کی جو انھوں نے رد کر دی۔

اٹھارویں صدی کی ساتویں دہائی میں ایک بڑے علاقے پر سورج مل کی حکومت تھی اور کوئی بھی ان کے مد مقابل نہ تھا۔ یہ جاٹوں کے انتہائی عروج کا زمانہ تھا جو اس سے پہلے شاید ہی کبھی جاٹوں کو میّسر ہوا تھا۔

سورج مل اور نجیب کے مابین لڑائی

بلوچ حکمرانوں کی شکست نے سورج مل اور نجیب الدولہ کے درمیان ایک جنگ کا سماں بنا دیا۔ نجیب اللہ جو مغلیہ سلطنت کے تخت کو بچانا چاہتا تھا کی پوری کوشش تھی کہ کسی طرح وہ مہاراجہ سورج مل جاٹ کو دلی پر حملہ کرنے سے باز رکھے لیکن مہاراجہ سورج مل جاٹ اپنے پچیس ہزار جاٹ فوجیوں کے ساتھ دلی کے دروازے پر کھڑا تھا۔ نجیب کی ہر کوشش ناکام ہوئی۔ اسنے ملتانی چادر کا تحفہ بھی بھیجا تاکہ صلح کی کوئی کوشش کامیاب ہوسکے۔ اسکا مطلب ہے کہ ملتان اسوقت بھی کڑھائی والی چادروں کے لیے مشہور تھا۔ یہ ایک اتفاق ہے کہ میں جب یہ سطور لکھ رہا ہوں تو اس وقت ملتان میں ہی موجود ہوں۔ آخر کار جنگ کا آغاز ہو گیا۔ مہاراجہ سورج مل جاٹ اپنی فوجوں کا معائنہ کر رہا تھا کہ گھات لگائے نجیب کے سپاہیوں نے اسے مار دیا۔ اس واقعے نے جاٹ فوج میں بھگدڑ مچادی اور جاٹ فوج واپس ہٹنے پر مجبور ہو گئی۔ مہاراجہ سورج اپنی موت کے وقت آگرہ، ڈھول پور، مین پوری، ہاتراس، علی گڑھ، اٹا، میرٹھ، روہتک، فاروق نگر، میوات، ریواڑی، گڑگاؤں اور متھورا تک پھیلی ہوئی ایک ریاست کا حکمران تھا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا مہاراجہ جواہر سنگھ تخت نشین ہوا۔

مہاراجہ سورج مل جاٹ کی سیاسی، ادبی، مذہبی رواداری فن تعمیر میں دلچسپی اور ریاست کا نظم و نسق چلانے کی اہلیت کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ لیکن کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ وہ اسلام کے سخت خلاف تھا۔ جو میں نے پڑھا وہ حیران کر دینے کے لیے کافی تھا۔ تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کو مہاراجہ سورج مل جاٹ کے بارے میں ضرور مطالعہ کرنا چاہیے۔

ریاست بھرت پور اور انگریز

میں نے اب تک جو کچھ بھی لکھا ہے وہ زیادہ تر مہاراجہ سورج مل جاٹ سے متعلق ہے۔ بھرت پور ریاست کا وجود کیسے ہوا، کون اس کا سبب بنا اور اس کا انجام کیا ہوا، یہ بھی ایک دلچسپ داستان ہے۔ اس کا ذکر بھی آپکے لیے یقیناً دلچسپی کا باعث بنے گا۔

تاریخ سے ملتا ہے کہ اسلام کے پھیلاؤ کے لیے سب سے زیادہ کام اورنگ زیب کے دور میں کیے گئے۔ اورنگ زیب عالمگیر کا ذکر ایک مذہبی مغل حکمران کے طور پر کیا جاتا ہے۔ ہندو اور سکھ اس کے سب سے زیادہ مخالف تھے۔ دلی اور آگرہ میں مسلمان دسویں صدی سے کسی نہ کسی حالت میں قابض تھے۔ غزنوی، سلاطین دلی اور پھر مغلیہ سلطنت سب ہی اس علاقے پر حکمرانی کی۔ لیکن آج بھی علاقے کی نوے فیصد سے بھی زیادہ آبادی ہندوؤں پر مشتمل تھی۔ بعد ازاں ان میں سے بہت سے لوگوں نے سکھ مذہب بھی اختیار کیا۔ عالمگیر نے اس علاقے کے ہندوؤں کو کنٹرول کرنے کے لیے ایک انتہائی مذہبی شخص، عبد النبی کو ماتھورا کا فوجدار بنا کے بھیجا۔ اس شخص نے علاقے کے لوگوں جن میں اکثریت جاٹوں کی تھی، جو ماتھورا اور آگرہ کے آس پاس والے دیہات میں زمیندار تھے پر لگان کی وصولی کے لیے سختی شروع کر دی۔ جس کے رد عمل کے طور پر جاٹوں نے کئی غیر منظّم لڑائیاں لڑیں۔ مغل فوجدار نے اپنی مدد کے لیے راجپوتوں کو اپنے ساتھ ملا رکھا تھا اور انھیں ٹیکس اکٹھا کرنے کا اختیار بھی دے رکھا تھا۔ اب صورت حال یہ تھی کہ جاٹ زمیندار تھا اور راجپوت ٹیکس وصول کرتا تھا۔ رفتہ رفتہ جاٹ اکٹھے ہوتے گئے اور انھوں نے 1669ء میں ایک جنگ میں عبد النبی کو ہلاک کر دیا۔ اس جنگ کی قیادت گوکولہ جاٹ نے کی جو مہاراجہ سورج مل جاٹ کا دادا تھا۔ گوکولہ اور اس کے ساتھی کسانوں نے مغل چھاؤنی کو تباہ کر دیا۔ اس پر عالمگیر نے ان کے خلاف ایک بڑی لڑائی کا آغاز کر دیا۔ یہ لڑائی پانچ ماہ تک جاری رہی۔ اس جنگ میں جاٹوں کو شکست

ہوئی اور ان کا سردار گوکولہ گرفتار کر لیا گیا جسے دربار میں پیش کیا گیا اور انتہائی بے دردی سے قتل کر دیا گیا جس کی مثال ملنا مشکل ہے۔

گوکولہ تو مارا گیا اور وقتی طور پر جاٹوں کو شکست بھی ہوئی لیکن انتقام کی آگ سلگتی رہی۔ جاٹ اپنے سردار کی تکلیف دہ موت کو کبھی بھی بھول نہ پائے۔ عالمگیر کا اس طرح کا سلوک سکھوں کے ساتھ بھی تھا۔ سکھوں کی اکثریت بھی جاٹ تھی۔ دونوں کا دکھ درد ایک ہی جیسا تھا۔ تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ مغل حکمرانوں کی اصل موت ہندو اور سکھ جاٹوں کے ہاتھوں ہوئی جبکہ راجپوتوں کی ایک کثیر تعداد آخر دم تک مغل حکمرانوں کی حفاظت میں لگی رہی۔

گوکولہ کی موت کے بعد ایک مرتبہ پھر بغاوت ہوئی اور اس دفعہ راجہ رام جاٹ اس کی قیادت کر رہا تھا۔ اس واقعے کا ایک اور دردناک پہلو یہ بھی ہے کہ اورنگزیب نے جاٹوں کی بغاوت کچلنے کے لیے کاچوہ کے حکمران بشن سنگھ کو ماتھورا کا فوجدار مقرر کیا اور بدلے میں اسے جاٹوں کا قلع قمع کرنے کا کہا جو اس راجپوت سردار نے بخوبی کیا۔ ایک طرف راجپوت اور دوسری طرف جاٹ، تخت پر ایک غیر ملکی مسلمان حکمران براجمان۔ بشن سنگھ بھی جاٹوں کو کچلنے میں ناکام رہا۔ تاریخ میں آتا ہے کہ راجہ رام جاٹ وہی شخص ہے جس نے اکبر کی باقیات کو بھی جلایا تھا۔ میں نے اس بات کی تصدیق کرنے کی کوشش کی لیکن نہ کر سکا۔ لیکن یہ بات کئی لوگوں نے لکھی ہے۔ مجھے ذاتی طور پر یہ بات درست لگتی ہے۔ انتقام تو اندھا ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ سب اس نے گوکولہ کے بہیمانہ قتل کا انتقام لینے کی غرض سے کیا تھا۔

ایک مؤرخ ستا تیش چندرا نے یہ بھی لکھا ہے کہ گوکولہ سنگھ اور اس کے دو ساتھیوں کو زندہ گرفتار کر کے انھیں دوسرے قیدیوں سمیت عالمگیر کے سامنے پیش کیا گیا۔ بادشاہ نے گوکولہ کو بے دردی سے قتل کروا دیا، اس کے ایک بیٹے نے اسلام قبول کر

لیا تو اسے معاف کر دیا گیا اور گو کولہ کی بیٹی کی شادی اورنگزیب کے ایک غلام سے کروا دی گئی۔ یہ بات کہاں تک سچ ہے؟ باوجود کوشش کے اس کی تائید میں کوئی تحریر نہ ڈھونڈ سکا۔ بعدازاں مہاراجہ سورج مل جاٹ کی قیادت میں بھرت پور ریاست نے بے حد ترقی کی۔ جس کا ذکر میں پچھلے صفحات میں کر آیا ہوں۔

مہاراجہ سورج مل جاٹ کی موت کے پچاس سال بعد 1806ء میں انگریزوں اور ہولکر راجپوتوں کے درمیان جنگ چھڑ گئی۔ اس موقع پر بھرت پور کے مہاراجہ رنجیت سنگھ نے ملکی مفاد اور اپنی سرزمین کو انگریزوں سے نجات دلانے کی غرض سے راجپوتوں سے اپنے تمام تر سابقہ اختلافات بھلا کر یہ جانتے ہوئے کہ انگریز بے حد طاقتور ہیں ہولکر کی مدد کی۔ دونوں راجاؤں نے بھرت پور قلعہ کو مرکز بنایا۔ انگریزوں نے قلعے کا محاصرہ کر لیا اور تین مہینوں بعد رنجیت سنگھ سے صلح کرنے کا فیصلہ کیا اور امن کو جنگ پر ترجیح دی۔

ایسے موقعوں پر دو ہی راستے ہوتے ہیں: ایک وہ جس پر رانی جھانسی، سراج الدّولہ، ٹیپو سلطان، پرتاب سنگھ، رانا سانگا اور کئی دوسرے چلے یعنی آخری دم تک جنگ اور میدان جنگ میں موت یا پھر ایک غیر ملکی قابض حکمران کی غلامی۔ مہاراجہ سورج مل جاٹ کی اولاد نے بھی اپنی ریاست اور گدی بچانے کی خاطر غلامی کو موت پر ترجیح دی اور وہ ایک آزاد ریاست کی بجائے انگریزوں کی طفیلی ریاست بن گئے۔ اسی بھرت پور ریاست کے والی مہاراجہ جسونت سنگھ نے 1857ء کے جنگ آزادی میں انگریزوں کی خاطر آزادی کی جنگ لڑنے والے ہندوستانیوں کو قتل کیا اور انگریز حکومت کے استحکام کا آلہ کار ثابت ہوئے۔ اس "وفاداری" کے صلے میں اس نوجوان مہاراجہ کو ایک اعلیٰ اعزاز جو برطانیہ کا بادشاہ یا ملکہ کی طرف سے دیا جاتا تھا کے ساتھ ساتھ کئی اور انعامات بھی دیئے گئے۔

اس طرح راجہ بھی بچ گیا اور اس کی گدی بھی اور ہندوستان کا غلامی کی طرف ایک قدم اور بڑھ گیا!

تقسیم ہند کے بعد یہ ریاست بھارت کا حصہ بن گئی اور اس کے سابقہ حکمرانوں کی اولاد پارلیمنٹ میں چلی گئی اور یوں راجہ کا نام اور مقام دونوں ہی بدل گئے۔ لیکن کام وہی ہے عام لوگوں پر حکمرانی۔۔۔

میں اسے یوں کہتا ہوں کہ "طرز حکمرانی تو بدل گیا لیکن حکمران نہیں بدلے"

۔

بھرت پور کی توپ اب لوہا گڑھ قلعے کی حفاظت کرنے کی بجائے آپ کو لندن میں ملے گی۔۔۔ ایسا تو ہر جیتنے والا کرتا ہے۔۔۔ یہ انوکھی بات نہیں ہے۔۔۔ کسی دور میں مہاراجہ سورج مل جاٹ جنگ جیت کر ہارے ہوئے لوگوں کی دولت اور سامانِ جنگ لے کر بھرت پور آیا کرتا تھا اور جب اس کی اولاد نے ہتھیار ڈالے تو ان کے ساتھ بھی وہی ہوا۔

Lohagarh Fort Photo Credit: https://www.travel-rajasthan.com

Maha Raja Surat Mal Photo Credit: https://ebnw.net

Baharat Pur canon in London Photo credit: https://www.facebook.co

اب صبح ہو رہی تھی۔ میں اس علاقے کو دیکھنے میں مگن تھا۔ میرے پاس موجود کتاب میں بھی اس علاقے کا ذکر تھا۔ کتاب سے مجھے معلوم ہوا کہ اس علاقے میں چند ایسے شہر اور قلعے بھی موجود ہیں جو ایک منفرد تاریخی پس منظر رکھتے ہیں۔ لاہور سے

دور ہوئے کئی دن گزر چکے تھے۔ ہم مسلسل سفر میں تھے۔ دو دن بعد لاہور واپسی تھی جس کا مجھے شدت سے انتظار تھا۔ اس علاقے میں موجود عالمگیر کی بنائی ہوئی لاہور جیسی بادشاہی مسجد نے اس علاقے میں میری دلچسپی مزید بڑھا دی۔ ان کی تفصیل نے مجھے چونکا دیا کیونکہ کئی باتیں میرے لیے بالکل نئی تھیں۔ جن کا مختصر ذکر آپ کی خدمت میں پیش ہے۔

Bharatpur Museum Photo Credit:
https://en.wikipedia.org/wiki/Bharatpur

رنتھمبور کا قلعہ، علاؤالدین خلجی کی فتح، مسلمان خواتین کی اجتماعی خودکشی

تاریخ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ 1301ء میں دلی سلطنت کے حکمران علاؤالدین خلجی نے رنتھمبور کو فتح کرکے مدت سے قائم ایک راجپوت ریاست کا خاتمہ کیا۔ اس حملے کی ایک خاص وجہ تھی، کہا جاتا ہے کہ اس علاقے کے ایک چوہان راجہ نے دلی سے بغاوت کرکے آنے والے کچھ مسلمان باغیوں کو پناہ دی تھی۔ خلجی نے راجہ سے کہا کہ یا تو وہ ان

باغیوں کو مار ڈالے یا انھیں ان کے حوالے کر دے۔ راجہ نے کہا کہ وہ کسی بھی ایسے شخص جو اس کی پناہ میں ہے کے ساتھ ایسا سلوک نہیں کرے گا۔ راجہ یہ بات جانتا تھا کہ ایسا کرنا موت کو دعوت دینا ہے اور وہی ہوا خلجی نے اس پر حملہ کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ اس نے پہلے اپنے ایک جرنیل ،الغ خان کو بھیجا جسے مقامی فوج نے شکست دے دی۔ بعد ازاں علاؤالدین نے اپنے ایک جبزل نصرت خان کو الغ خان کی فوج کو مدد کے لیے روانہ کیا۔ اس فوج کا انجام بھی عبرت ناک ہوا۔ اس جنگ میں نصرت خان بھی مارا گیا۔

اس موقع پر ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس کی مثال پورے ہندوستان کی تاریخ میں ملنا ناممکن ہے۔ اس واقعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس وقت کے بادشاہ ہندو ہو یا مسلمان جنگ جیتے کے بعد عورتوں سے کیسا سلوک کرتے تھے۔ اس واقعے کا تذکرہ داشاراتھا شرما نے اپنی کتاب Dunsties Chauhan Early میں تفصیل سے کیا ہے۔ شرما نے لکھا کہ نصرت خان کی موت کے بعد بڑی تعداد میں مسلمان عورتیں رنتھمبور کے راجہ کے ہاتھوں گرفتار ہوئیں۔ راجہ نے انھیں مجبور کیا کہ وہ ریاست کے مختلف حصوں میں جا کر گھر گھر مکھن فروخت کریں تا کہ عوام کو پتہ چلے کہ راجہ نے خلجی کی مسلمان فوج کو شکست دے دی ہے۔ ان حالات کو دیکھتے ہوئے علاؤالدین خود رنتھمبور آگیا۔ ایک طویل محاصرے کے بعد جب قلعے کے لوگ قحط کا شکار ہو گئے اور ایک مایوس کن صورتحال پیدا ہو گئی تو راجہ اور اس کے وفادار ساتھی قلعے سے باہر نکل آئے اور ہتھیار ڈالنے کی بجائے لڑ کر مرنے کو ترجیح دی۔ اس دوران ہندو عورتوں نے رانی کی قیادت میں جوہر کی رسم نبھائی۔

میرے علم کے مطابق یہ پہلا موقع تھا کہ خلجی سے بغاوت کرکے آنے والے لوگوں جو مسلمان تھے نے بھی واضح شکست کو دیکھ کر اپنی عورتوں کو جوہر کی رسم ادا کرنے کا کہا۔ ان عورتوں نے آگ میں جلنے کی بجائے اپنے مردوں کے ہاتھوں قتل ہونا

پسند کیا۔ یہ وہ مقام تھا جہاں پہلی مرتبہ مسلمان عورتوں نے بھی جوہر کا ارتکاب کیا۔ میں نے جب اس کے بارے میں مزید جانا تو پتہ چلا کہ اس کے بعد کئی بار مسلمان عورتوں نے انتہائی ذلت سے بچنے کے لیے اجتماعی خود کشی کی۔ حتیٰ کہ مغل عورتوں نے بھی ایسا کیا۔

قدیم شیپور قلعہ اور بنگالی راجپوت حکمران

شیپور قلعہ کتنا پرانا ہے ؟ کوئی نہیں جانتا۔ ایک اندازے کے مطابق یہ قلعہ گیاوریں صدی کے شروع میں بنایا گیا تھا۔ ایک تاریخ کے مطابق بادشاہ اجے پال نے تیرہویں صدی میں شیپور کو اپنا دارالحکومت قرار دیا تھا۔ 1301ء میں علاؤالدین خلجی نے شیپور قلعے پر بھی قبضہ کرلیا۔ اس وقت اس علاقہ پر ہمیر دیو حکومت کرتا تھا۔ پھر ایک وقت آیا کہ شیر شاہ سوری نے شیپور قلعہ پر قبضہ کیا۔ اس نے یہاں پر ایک عید گاہ اور اپنے کمانڈر، منابر خان کی یاد میں ایک عظیم الشان مقبرہ بھی تعمیر کروایا۔ جو فن تعمیر کی ایک شاندار مثال ہے۔ اس کے بعد ایک مقامی راجہ سرجن سنگھ ہڈا نے شیپور قلعے پر قبضہ کرلیا۔ بعد ازان اکبر نے اس قلعے پر قبضہ کرلیا۔ اس جنگ میں گوالیار کے مہاراج، مادھو راؤسندھیا نے مغلوں کی مدد کی۔ اس کے بدلے اکبر نے انھیں اس علاقے کی حکمرانی دے دی۔ بعد ازاں اس علاقے پر ایک اور راجپوت ہندو راجہ گورز نے بھی حکومت کی۔

مدھیہ پردیش کے ایک سرکاری Madhya Pradesh, District Gazetteers: Morena میں (صفحہ 359) میں اس شہر کے بارے میں کافی کچھ لکھا ہوا ہے۔ جس کے کہ اس علاقے میں ایک ایسا خاندان بھی حکومت کرتا رہا ہے جس کا تعلق بنگال سے تھا، تو مجھے بے حد عجیب لگا۔ اب تک جو میں نے پڑھا اس کے مطابق صرف مراٹھے ہی جنوب سے آکر شمال میں حملہ آور ہوئے تھے لیکن یہ میرے لیے بھی ایک نئی بات تھی کہ بنگال سے بھی لوگوں نے آکر یہاں ایک ریاست کی بنیاد رکھی۔ اس کا ایک مختصر تذکرہ پیش خدمت ہے۔

راجپوتوں کی تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ گورز راجپوت ،ہندوستان میں راجپوتوں کے چالیس بڑے قبیلوں میں شامل ہے۔ان کا یہ دعوی ہے کہ وہ ہندو، سورج دیوتا سے تعلق رکھتے ہیں۔ کچھ لوگ یہ بھی لکھتے ہیں کہ بنگال کے ایک علاقے میں گورا دیش کے نام سے ایک شہر بھی آباد تھا۔ اس بات کا ذکر کئی تاریخی کتابوں میں ملتا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ پال خاندان کے نام سے بھی جانے جاتے تھے جسے گورز راجپوت بھی کہتے ہیں۔ یہ خاندان موجودہ بنگال اور بنگلہ دیش پر حکمرانی کرتا تھااور آٹھویں صدی میں یہ لوگ شمالی ہندوستان ، وسطی ہندوستان اور موجودہ پاکستان کے کئی علاقوں تک پہنچ گئے۔ قطب الدین ایبک کے ترک فوجی جنرل ، بختیار خلجی کے ان پر حملے نے انھیں نقل مکانی پر مجبور کیا تھا۔ سلاطین دلی کی مخالفت میں انھوں نے مغلیہ حکمرانوں کا ساتھ دیا اور اکبر نے شیپور کا قلعہ فتح کرنے کے بعد انکی وفاداری کے صلے میں انھیں اس علاقے کا راجہ بنا دیا۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ بنگال سے تعلق رکھنے والے ایک اور راجپوت خاندان جو سین خاندان کے نام سے پہنچانے جاتے تھے نے بھی شمالی ہندوستان میں کئی جگہوں پر اپنی ریاستیں قائم کر رکھی تھیں۔

یہ سب جاننے کے بعد مجھے اس بات کا یقین ہو گیا کیا دور کیا نزدیک کسی نے بھی ہندوستان پر حملہ کرنے میں غفلت نہیں برتی۔ اس کے ایک وجہ تو ہندوستان کی خوشحالی اور دوسری یہاں کسی مرکزی طاقت کا نہ ہونا اور عام لوگوں کا غیر جارحانہ رویہ۔ یہ میرا خیال ہے۔آپ کو اختلاف کا پورا حق ہے۔

باران، گپتا دور، لاہور جیسی بادشاہی مسجد

تاریخ میں باران کا پرانا نام وڑہ نگاری اور انپور نا نا گری بھی ملتا ہے۔ یہ شہر گپتا سلطنت کے دوران بھی موجود تھا۔ بعد ازاں اس پر ایودھیا حکمران بھی قابض رہے جن کا مرکز اترپردیش کا بلند شہر تھا۔ سترہویں صدی میں مغلوں نے اس شہر پر کنٹرول حاصل

کرلیا۔ مغلوں نے یہاں "شاہ آباد" نام کا ایک قلعہ بھی تعمیر کروایا۔ ایک مرتبہ اورنگزیب نے بھی اس قلعے کا دورہ کیا۔ یہ قلعہ اپنے فنِ تعمیر کی وجہ سے بے حد مشہور ہے۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ نویں صدی کا بنا ہوا قلعہ ہے جو ایک چوہان راجپوت نے بنایا تھا اور پھر مغلوں نے اسے فتح کیا اور اس میں کئی نئی عمارتیں بنا کر اور اس کا نام بدل کر شاہ آباد رکھ دیا۔ اس شہر میں ایک بادشاہی مسجد بھی موجود ہے جو اورنگزیب نے بنوائی تھی۔ اس مسجد کی تصاویر دیکھ کر مجھے لگا جیسے میں لاہور میں واقع بادشاہی مسجد ہی دیکھ رہا ہوں۔ ان میں بہت ہی زیادہ مماثلت محسوس ہو رہی تھی۔ نام بھی ایک جیسا، بنانے والا بھی ایک ہی حکمران، تو مماثلت تو یقینی تھی۔

دھول پور جاٹ ریاست، تحریک آزادی ہند کے ہیرو

بھرت پور کے جنوب مشرق میں ستر کلو میٹر کے فاصلے پر دھول پور واقع ہے۔ اس کی تاریخ پڑھتے ہوئے مجھے دو نئی باتوں کا پتہ چلا۔ جن میں سے ایک کی وجہ سے میرے ذہن میں کئی سوالوں نے جنم لیا۔ دوسرا یہ پتہ چلا کہ یہاں کے ایک گاؤں والوں نے کس طرح آزادیِ ہند کے لیے اُس پولیس سے گولیاں کھائیں جن کا تعلق بھی اسی ہندوستان سے تھا جس کی آزادی کی جنگ وہ لڑ رہے تھے۔ ان دونوں باتوں کا مختصر ذکر آپکی خدمت میں پیش ہے۔ امپیریل گزٹ آف انڈیا میں اس ریاست کے بارے میں کافی معلومات درج ہیں۔ ان کا خلاصہ پیش خدمت ہے[49]۔

[49] *Imperial Gazetteer of India*, v. 11, p. 324.

Dhol Pur Palace Photo Credit:
https://ajatwarriorruler.wordpress.com

دھول پور، راجستھان کے مشرقی حصے میں واقع ایک شہر ہے جو کبھی دھول پور ریاست کا صدر مقام بھی تھا۔ دھول پور ریاست کی بنیاد 1806ء میں ایک ہندو جاٹ مہا رانا کیرات سنگھ نے رکھی۔ میں نے ہندوستان کی تاریخ پڑھتے ہوئے کئی جگہ یہ دیکھا کہ کسی شخص کے نام کے ساتھ جاٹ بھی لگا ہوتا اور رانا بھی اس کے نام کا حصہ ہوتا۔ میرے علم کے مطابق رانا کا لفظ راجپوت لوگوں کے لیے مخصوص ہے۔ کیا ایسا ہی ہے؟ اگر ایسا ہے تو دھول پور کے راجہ جو ایک ہندو جاٹ تھا کے نام کے ساتھ مہارانا کیوں لگا ہوا ہے؟ میں نے اس بارے میں اپنے ایک انتہائی قریبی دوست جناب امجد وڑائچ صاحب سے بھی بات کی۔ اس کے علاوہ بھی کئی جگھوں سے اسے جاننے کی کوشش کی۔ اور میں اس نتیجے پر پہنچا کہ رانا لفظ ایک تعظیمی لفظ ہے اور اس کا ذات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ بات کہاں تک درست ہے؟ اس کے لیے مجھے آپ کی رائے درکار ہے۔ امپیریل گزٹ آف انڈیا کے صفحہ 324 پر لکھا ہوا ہے کہ یہاں کے لوگوں نے مسلمان حکمرانوں کے خلاف مقامی ہندوؤں کی حمایت کی تھی جس کے صلہ میں ایک مقامی ہندو راجہ نے انھیں رانا کا خطاب دیا تھا۔

گزٹ سے یہ بھی ملتا ہے کہ دھول پور شہر پانچویں صدی سے آباد ہے۔ اس وقت اس علاقے میں بامرولیا رانا جاٹوں کی حکومت تھی۔ اس کے جنوب میں مدھیہ پردیش، مغرب میں راجستھان کا ضلع کرولی، مشرق میں اترپردیش اور مدھیہ پردیش واقع ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اس کی تاریخ گوتم بدھ کے عہد سے ملتی ہے۔ کسی زمانے میں موریان حکمرانی کے دوران یہ موریان سلطنت کا حصہ بھی رہا ہے اور ایک دور میں غوری بھی اس پر قابض رہا ہے

پانی پت کی جنگ کے بعد بابر، ہندوستان کا پہلا مغل حکمران بنا۔ اس سے پہلے اس علاقے کو ابراہیم لودھی نے 1501ء میں قبضے میں لے کر ایک مسلمان گورنر کو یہاں اپنا نائب بنایا تھا۔ ابراہیم لودھی کی موت کے بعد متعدد ریاستوں نے آزادی کا اعلان کیا تو اس علاقے کے گورنر نے بھی اپنی آزاد ریاست بنانے کا اعلان کر دیا۔ نئے راجہ کا نام محمد جیفون تھا۔ بابر کی آمد کے بعد قلعہ دھولپور بھی بابر کے قبضے میں آگیا اور وہ 1707ء تک مغلیہ سلطنت کا حصہ رہا۔

اورنگزیب کی وفات کے بعد راجہ کلیان سنگھ نے دھولپور پر قبضہ کر لیا اور اس کے خاندان نے 1761ء تک اس علاقے پر حکمرانی کی۔ پھر ایک وقت آیا کہ بھرت پور کے جاٹ حکمران مہاراجہ سورج مل نے اس علاقے کو اپنی ریاست میں شامل کر لیا۔

1803ء میں انگریزوں اور مراٹھوں کے مابین ہونے والی دوسری جنگ میں انگریزوں کو فتح حاصل ہوئی۔ اس جنگ میں جاٹوں نے انگریزوں کی مدد کی۔ بعدازاں انگریزوں نے جاٹوں کے ساتھ ایک معاہدہ کیا اور اس معاہدے کی رو سے گوالیار کو اپنے پاس رکھا، گوہد کو مراٹھوں کے حوالے کیا اور دھول پور کے علاقے جاٹوں کے سپرد کر دے۔ اس طرح تین سو سال سے گوہد میں قائم جاٹوں کی حکومت ختم ہو گئی اور اس کے بدلے انھیں ایک نئی ریاست دھول پور کا حکمران بنا دیا گیا۔ یہ سب مراٹھوں کے

خلاف جنگ میں انگریزوں کی مدد کرنے کا صلہ تھا۔ یوں گوہاد کا مہارانا کیرات سنگھ اس ریاست کا پہلا حکمران بنا۔ اس شہر کا ذکر بابر نے بابر نامہ میں بھی کیا ہے۔ جس کے مطابق اس نے گوالیار کے آخری سفر پر جاتے ہوئے یہاں ایک باؤلی بھی تعمیر کروائی۔

دھول پور کے بارے میں ایک اور کتاب جسے جان زبر سکی نے The Mysterious Mr Jacob: Diamond Merchant, Magician and Spy کے نام سے لکھی ہے۔ یہ ایک دلچسپ کتاب ہے اور اس میں اس دور کے بارے میں بہت کچھ جاننے کو ملا۔

دھول پور سے ستائیس کلو میٹر کے فاصلے پر ایک بڑی جھیل بھی موجود ہے۔ ا س علاقے میں شاہ جہاں شکار کے لیے آتا تھا۔ اسی وجہ سے اس کا نام شاہی جھیل ہے۔ اس کے علاوہ اس شہر میں شیر شاہ سوری نے ایک قلعہ بھی تعمیر کروایا تھا۔ جس کا نام اس نے اپنے نام پر "شیر گڑھ" رکھا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ قلعہ سولہویں صدی میں راجہ مال دیو نے پہلی مرتبہ تعمیر کروایا۔ 1540ء میں شیر شاہ نے قلعے میں کئی نئی عمارتیں بنوائیں اور حسب روایت اس کا نام بھی اپنے نام پر رکھ لیا۔ جو اب تک اسی نام سے جانا جاتا ہے۔ ادھے بھان سنگھ اس ریاست کا آخری حکمران تھا جس نے تقسیم ہند کے بعد بھارت میں شامل ہونے والی دستاویزات پر دستخط کیے۔

Dholpur Jat Sardar Photo Credit: https://www.alamy.com/nobles-dholepore

تسیمو کے ویر شہید

شہید ایک عربی لفظ ہے جو عام طور پر مسلمانوں کے لیے مخصوص کیا جاتا ہے لیکن ہندو اور سکھ بھی اسے استعمال کرتے ہیں۔ ملک کو آزاد کروانے کے لیے بہت سے لوگوں نے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا۔ ایسا ہی دھول پور کی تاریخ میں بھی ہوا۔ اپریل 1947ء میں برٹش حکومت نے کسی بھی جگہ ترنگا ہندوستانی پرچم لہرانے پر پابندی عائد کر رکھی تھی۔ دھول پور کے قریب ایک گاؤں کے مقامی لوگوں نے ایک نیم کے درخت کے نیچے جلسہ منعقد کرنے کا فیصلہ کیا اور اس درخت پر ترنگا جھنڈا لہرایا۔ اسی دوران مقامی پولیس اور فوجی بھی آ گئے۔ انھوں نے جھنڈا اتارنے کے لیے کہا۔ گاؤں والوں نے انکار کر دیا۔ پولیس نے گولی چلانے کی دھمکی دی۔ لوگوں نے اسکی بھی پرواہ نہ کی۔ اس پر پولیس والے خود آگے بڑھ کر جھنڈا اتارنے کی کوشش کرے لگے۔ اس دوران ایک مقامی شخص جس کا نام ٹھاکر چھتر سنگھ تھا فوجیوں کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ پولیس نے ٹھاکر چھتر سنگھ کو گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ اس کے بعد ایک اور مقامی پنچم سنگھ کشواہا آگے آیا اور پولیس نے اسے بھی گولی مار دی۔ جیسے ہی دو لوگ زمین پر گرے تو لوگوں میں خوف کی بجائے جوش پیدا ہوا اور ایک ہنگامے کی صورت پیدا ہو گئی سب نے کہا کہ ہم سب مرنے کے لیے تیار ہیں لیکن جھنڈا نہیں اتارنے دیں گے۔ بھارت ماتا کے نام کی پکار سن کر پولیس نے وہاں سے جانے میں ہی عافیت سمجھی۔ آزادی پسند جنگجوؤں کی اس قربانی کی وجہ سے تسیمو گاؤں نہ صرف راجستھان بلکہ پورے ہندوستان کی تاریخ میں جانا جاتا ہے۔ میں نے یہ بات کئی لوگوں سے سنی ہے لیکن باجود کوشش کے میں کسی بھی کتاب میں اس کا حوالہ نہ ڈھونڈ سکا۔

تین سو سال پرانی کرولی راجپوت ریاست

کرولی شہر بھرت پور سے سو کلو میٹر کے فاصلہ پر جنوب مغرب میں واقع ہے۔ یہ شہر کبھی ریاست کرولی کی راجدھانی ہوا کرتا تھا۔ اس ریاست کی کہانی بھی دلچسپ ہے۔ میں نے اپنے پاس موجود کتاب میں پڑھا کہ کرولی ریاست کا قیام تین سو سال قبل وجود میں آیا تھا۔ یہاں پر موجود شاہی محل کی ایک الگ ہی پہچان ہے۔ جب میں نے یہاں کی مختلف تصاویر دیکھیں تو اس ریاست کا ایک مختصر تعارف آپکی خدمت میں پیش کرنے کا فیصلہ کیا۔

جب ہم اس علاقے سے گزر رہے تھے تو صبح ہو رہی تھی۔ ایک صاحب جن کا نام سوہن لال تھا وہ ایک پبلشنگ ہاؤس سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ اپنے ہاتھ میں ایک کتاب جو ہندی میں تھی لیکن تصاویر سے کوئی تاریخی کتاب محسوس ہو رہی تھی تھامے میرے ساتھ ہوا خوری کے لیے کیبن سے باہر آ گئے۔ ان سے سلام دعا کے بعد ایک طویل مکالمہ ہوا جو دو گھنٹے سے زائد جاری رہا جس کی تفصیل اگلے صفحات میں بیان کی جائے گی۔ فی الحال ریاست کرولی کا ایک تعارف۔

کرولی راجستھان کے شمال مشرقی حصے میں واقع ہے۔ اس کے مغرب میں داوس، جنوب مغرب میں سوئی مادھو پور، شمال مشرق میں دھول پور، شمال مشرق میں بھرت پور اور مشرق میں ریاست مدھیہ پردیش واقع ہے۔ تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ اس ریاست کا تعلق ماتھورا کی ریاست سے بھی ہے۔ اس کی بنیاد دسویں صدی کے ایک راجپوت، راجا بیجا پال نے رکھی تھی اور کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ ارجن دیو نے 1348ء میں اس ریاست کی شروعات کی اور وہی اس کا پہلا راجہ تھا۔ یہ بات بہت حد تک درست ہے کہ یہ ایک چھوٹی ریاست تھی۔ جس نے ہمیشہ لڑائی سے پرہیز کیا اور علاقے میں موجود بڑی طاقت کی ماتحتی میں امن سے رہنا پسند کیا۔

Karuli Rajasthan Palace Photo Credit:
http://www.rajasthantourstoindia.com

کرولی کا مہاراجہ راجپوتوں کے جادون قبیلے کا سربراہ تھا۔ یہ لوگ خود کو لارڈ کرشنا کی اولاد بتاتے ہیں۔ بارہویں صدی میں یہ لوگ ایک بڑے علاقے کے حکمران تھے جس میں الور، بھرت پور، کرولی اور دھول پور شامل تھے۔ بارہویں صدی میں غوری نے اس علاقے پر حملہ کیا تو اس وقت کا راجہ کنور پال حملہ آور غوریوں کے ہاتھوں اپنی ریاست نہ بچا سکا لیکن اس کی اولاد نے اپنی کچھ آبائی زمینوں کو کسی طریقے سے بچا کر کرولی شہر کی بنیاد رکھی۔ اب اس ریاست کا رقبہ کافی کم ہو چکا تھا۔ بعدازاں سلاطین دلی اس علاقے پر حملہ آور ہوئے تو انھوں نے یہاں قبضہ کر لیا اور صدیوں سے قائم ایک ہندو ریاست کا خاتمہ کر دیا۔ جب مغلیہ سلطنت کا قیام عمل میں آیا تو ان لوگوں نے مغلوں کی بے حد مدد کی، جس سے خوش ہو کر مغلیہ شہنشاہ اکبر نے گوپالداس کو کرولی کا مہاراجہ بنا دیا۔ اس ریاست کے والی، راجپوت حکمرانوں نے مغل حکمرانوں کی ہر لحاظ سے مدد کی۔ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے آگرہ قلعے کی تعمیر میں بھی بے حد اہم کردار ادا کیا۔

مجھے لگتا ہے کہ مقامی ریاستیں خاص طور شمالی ہندوستان کی راجپوت ریاستیں سلاطین دلی کے ہاتھوں تباہ ہوئیں۔ جب مغلوں نے سلاطین دلی کے ساتھ لڑائی شروع

کی تو ان لوگوں نے مغلوں کو اپنا نجات دہندہ سمجھا اوران کی دل و جان سے مدد کی اور مغلیہ سلطنت کے قیام میں ایسا اہم کردار ادا کیا جو مغلوں اور مقامی راجپوتوں کے درمیان دیرپا تعلقات کی شکل میں تاریخ میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ میں یہ رائے رکھتا ہوں، جو ممکن ہے درست نہ ہو۔ آپ اختلاف کا حق رکھتے ہیں۔

مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد اس علاقے پر مراٹھے قابض ہو گئےاور وہ اس وقت تک قابض رہے جب تک انھیں انگریزوں نے شکست نہ دی۔ 1817ء میں انگریزوں نے کرولی کے حکمران کے ساتھ ایک معاہدہ کیا اور یوں تین سو سال سے قائم ایک راجپوت ریاست کسی غیر ملکی حکمران کی طفیلی ریاست بن گئی۔ انگریز، سلاطین دلی، مغلوں اور مراٹھوں کے بعد یہاں کا چوتھا حکمران تھا۔ مہاراجہ گنیش پال دیو اس ریاست کا آخری راجہ تھا۔ تقسیمِ ہند کے بعد یہ ریاست بھی بھارت کا حصہ بن گئی۔

کرولی کا راول پیلس اس ریاست میں بنائی گئی ایک ایسی عمارت ہے جو خوبصورتی میں اپنی مثال آپ ہے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ تیرہویں صدی میں یہ محل سرخ اور سفید پتھر سے بنایا گیا تھا۔ اس وقت تک مغل آرٹ متعارف نہیں ہوا تھا۔ اس کی تصاویر حیران کر دینے والی تھیں۔

تیمنگر قلعہ بھی اسی علاقے میں موجود ہے۔ ایک روایت کے مطابق یہ قلعہ 1241ء میں اُس وقت کے ہندو راجہ نے تعمیر کروایا تھا۔ اس قلعے کی ایک خوبی یہ ہے کہ اس کے چاروں طرف 5 فٹ چوڑا اور 30 فٹ اونچا حفاظتی بند ہے۔ یہ بات بھی انوکھی ہے کہ اسے اس طرح بنایا گیا تھا کہ اس میں ایک مکمل شہر سما سکے۔ اس کے علاوہ یہاں پر انٹ گیری فورٹ بھی موجود ہے جسے مغلوں نے فتح کیا اور یہاں اپنی رہائش بھی رکھی۔ یہاں ایک سو فٹ اونچی آبشار بھی ہے جس کا پانی براہ راست شیو گنگا ہندوؤں کا

ایک مقدس برتن پر گرتا ہے۔ ان عمارتوں کی تصاویر دیکھ کر اس علاقے کے لوگوں کے ذوق کی داد دینا بنتا ہے۔

ایک مشکل مکالمہ: جو مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر گیا

ہنوز دلی دور نیست۔۔۔کے مصداق ہم دہلی کے قریب پہنچنے والے تھے۔ ابھی کافی سفر باقی تھا۔ لوگ آہستہ آہستہ نیند سے بیدار ہو رہے تھے۔ یہ ہمارے سفر کا آخری حصہ تھا۔ اب اپنے سامان سمیٹنے کی باری تھی اور ایک دوسرے سے جدا ہونے کی بھی۔ ہماری خوشی دگنی تھی کیونکہ ہمیں اگلے ہی روز پاکستان روانہ ہونا تھا۔ پچھلے دو ہفتوں سے ہم بھارت میں تھے اور مسلسل سفر جاری تھا۔ موبائل فون کی سہولت نہ ہونے کی وجہ سے گھر والوں سے رابطہ بھی کم ہی ہوتا تھا۔

سورج طلوع ہو رہا تھا۔ سوہن لال صاحب اور میں چائے سے فارغ ہو چکے تھے۔ ہم دو خالی نشستوں پر آمنے سامنے بیٹھ گئے۔

مجھے پتہ چلا کہ وہ دلی کے قریب ایک چھوٹے قصبے میں رہتے تھے اور دلی میں واقع ایک پبلشنگ ہاؤس سے وابستہ ہیں۔ ان کے والد صاحب محکمہ تعلیم سے تعلق رکھتے تھے اور طویل عرصے تک ایک کالج میں پڑھاتے رہے۔ سوہن لال صاحب کی تعلیم بھی مناسب تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ انھیں کتابیں پڑھنے کا بھی بہت شوق تھا۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ تاریخ اور معاشرتی علوم سے متعلق کتب ان کی پسندیدہ ہیں۔ اس طرح ان کا علم ہندوستان اور دیگر قریبی ممالک کے بارے میں بھی کافی زیادہ تھا۔ انھوں نے مجھ سے کہا کہ میں آپ سے پاکستان اور اس کے ساتھ ساتھ ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کے بارے میں کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے انھیں جواب دیا کہ مجھے بھی یہ مضمون بے حد پسند ہے۔ وہ الگ بات ہے کہ میں نے گریجویشن ٹیکسٹائل انجینئرنگ میں کی ہے لیکن اس کے باوجود مجھے تاریخ اور معاشرتی علوم میں کافی دلچسپی ہے۔

لال صاحب ایک بہت ہی منجھے ہوئے اور دھیمے مزاج کے آدمی تھے۔ انھوں نے مجھے خبر دار کیا کہ مشتاق جی میرے سوالات آپ کے لیے ناپسندیدہ بھی ہو سکتے ہیں۔ یہ طے ہے کہ اس گفتگو کے نتیجے میں نہ آپ اپنے خیالات کو بدل پائیں گے اور نہ میں ہی اپنے اندر کوئی بڑی تبدیلی لا سکوں گا۔ میں نے پوچھاکہ پھر اس گفتگو کا فائدہ کیا ہوگا؟ انھوں نے جواب دیا کہ جو تاریخ میں نے پڑھی ہے اس سے متعلق میرے ذہن میں چند سوالات ہیں اور میں چاہتا ہوں کہ آپ ان سوالات کے جواب دیں تاکہ میری چند غلط فہمیاں دور ہو سکیں۔ میں نے بھی ان سے اتفاق کیا اور کہاکہ میں بھی چاہتا ہوں کہ میں بھارت کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جانوں اور اپنے ذہن میں موجود سوالات کا جواب حاصل کر سکوں۔

بات شروع کرنے سے پہلے انھوں نے یہ بھی کہاکہ میں یہ چاہوں گا کہ ہم جو بھی بات کریں اس کا کوئی مناسب حوالہ ضرور ہو صرف جذباتی باتیں نہ ہوں۔ میں نے ان کی اس بات سے بھی اتفاق کیا۔

ان کا پہلا سوال تقسیم ہند کے بارے میں تھا۔ انھوں نے مجھ سے پوچھاکہ آپ تقسیم ہند کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟

میں نے جواب دیا کہ میں وہی کہتا ہوں جو ہمارے قائد محمد علی جناح نے کہا تھا کہ ہندوستان میں دو قومیں بستی ہیں، جو ایک دوسرے سے بہت مختلف ہیں۔ اسے انھوں نے نظریہ پاکستان کا نام دیا جسے دو قومی نظریہ بھی کہا جاتا ہے۔ اس کے لیے انھوں نے کوشش کی کہ مسلمانوں کی اکثریت والے علاقوں پر مشتمل ایک الگ ملک بنایا جائے۔ تاکہ مسلمان اپنے نظریات کے مطابق زندگی گزار سکیں۔ اسی لیے پاکستان بنایا گیا ۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ مقصد بھی تھا کہ ہم پاکستان میں اسلام کو صحیح معنوں میں نافذ کرکے دنیا کو بتا سکیں کہ اقوامِ عالم کے مسائل حل کرنے میں اسلام بہترین رہنمائی فراہم

کرتا ہے۔ اسی لیے ہم نے یہ نعرہ بھی لگایا، پاکستان کا مطلب کیا لا الہ الا اللہ۔ جب میں یہ جواب دے رہا تھا تو وہ خاموشی سے میرا جواب سنتے رہے۔

میری بات سن کر انھوں نے پوچھا کہ کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ قوم مذہب سے بنتی ہے۔ میں نے کہا جی آپ نے درست سمجھا اسی لیے ہم یہ کہتے ہیں کہ ہندوستان میں مسلمان اور ہندو دو الگ الگ قومیں ہیں۔ سوہن لال صاحب نے بھی یہی کہا کہ میرے مطابق بھی قوم مذہب سے ہی بنتی ہے اور میں آپ کی اس بات سے اتفاق کرتا ہوں لیکن آپ مجھے اس بات کا جواب دیں کہ اگر آپ کی بات کو درست مان لیا جائے تو اس کا ثبوت تاریخ میں کہاں ملتا ہے جب قوم مذہب سے بنی ہو اور مذہب کی بنیاد پر بننے والی قوم کو ایک الگ جگہ پر بسایا جائے اور دوسری قوموں کو کسی دوسری جگہ پر؟ میں نے کہا کہ جو کچھ میں نے پڑھا ہے اس کے مطابق یہ بات درست ہے کہ ایک ہی ملک کے اندر مختلف قومیں آباد ہوتی ہیں۔ جیسے پاکستان میں بے شمار مذاہب کے لوگ آباد ہیں۔ وہ الگ قوم ہیں لیکن ایک ہی ملک میں رہتے ہیں۔ میری یہ بات سن کر انھوں نے کہا کہ اگر مختلف قومیں ایک ملک میں رہ سکتی ہیں اور وہ ہزاروں سال سے ایک ہی ملک میں رہ بھی رہیں تھیں تو پھر اچانک اس بات کی کیا ضرورت پیش آئی کہ مسلمانوں کے لیے ایک الگ ملک ہونا چاہیے؟

میں نے جواب دیا کہ اس بات کی ضرورت اس لیے پیش آئی کے مسلمانوں کو یہ خوف تھا کہ انگریزوں کے جانے کے بعد ہندو اپنی اکثریت کے بل بوتے پر مسلمانوں کے ساتھ ظالمانہ سلوک کریں گے۔ جس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ ایک دفعہ انگریزوں کے دور میں ایک حکومت بنائی گئی جس میں ہندو اور مسلمان دونوں شامل تھے۔اس وقت ہندو وزیروں نے بہت ہی جانبدارانہ رویہ رکھا۔ اِس بات نے مسلمانوں کو اپنا الگ وطن حاصل کرنے کی جدوجہد کو مزید تیز کرنے پر مجبور کر دیا۔

سوہن لال صاحب نے کہا کہ میں آپ کی اس بات سے ہی اتفاق کرتا ہوں لیکن مجھے یہ بتایئے کہ کیا اس کا علاج ایک علیحدہ ملک ہی تھا؟ کیا جمہوریت میں رہتے ہوئے ہم اس طرح کے مسائل حل نہیں کر سکتے تھے؟ میں نے کہا کہ ہمارے مسلمان لیڈروں کا کہنا تھا کہ ہندوؤں کی تنگ نظری اور اکثریت کا زعم مسائل حل کرنے میں رکاوٹ ثابت ہوگا۔ اس لیے ایک علیحدہ ملک ہی اس کا صحیح اور دیرپا حل ہے۔

Two Nation Theory Photo Credit:
https://netmag.pk

میری بات سن کر انھوں نے جواب دیا کہ مشتاق جی، مختلف قومیں مل کر ایک سماج بناتی ہیں اور ایک معاشرے کو تشکیل دیتی ہیں۔ اس معاشرے میں مختلف قومیں جو آپ کے بقول مذہب کی بنیاد پر بنتی ہیں مل جل کر رہتیں ہیں۔ اسی سماج میں غریب اور امیر بھی رہتا ہے، اسی سماج میں کمزور اور طاقتور بھی رہتا ہے۔ پڑھا لکھا اور ان پڑھ بھی اسی سماج کا حصہ ہوتے ہیں۔ سماج کو تقسیم کرنا ممکن نہیں ہے۔ یہ سماج کا حسن ہے کہ اس میں آپ کو ایک طرف مندر نظر آیا ہے دوسری طرف مسجد نظر آئے۔ آگے دیکھیں تو گوردوارہ اور پیچھے دیکھیں تو چرچ نظر آئے۔ ہر آدمی اپنے نظریے کے مطابق عبادت کے لیے اپنی پسندیدہ جگہ پر جا رہا ہو۔

سوہن لال صاحب نے بتایا کہ کیا آپکو معلوم ہے کہ تقسیم ہند کی مخالفت میں ہندو، عیسائی، اینگلو انڈین، پارسی، سکھ، جین لوگوں کے ساتھ ساتھ مسلمان بھی پیش پیش تھے۔ خان عبدالغفار خان نے تقسیم ہند کی تجویز کو غیر اسلامی قرار دیا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ مسلمان ایک ہزار سال سے بھی زیادہ عرصے سے ہندوستان میں رہ رہے ہیں اوراسے اپنا آبائی وطن سمجھتے تھے۔ اس لیے مذہب کی بنیاد پر تقسیم نہیں ہونی چاہیئے۔ انھوں نے مزید کہا کہ مشتاق جی آپکو یہ بھی معلوم ہوگا کہ دیوبندی مکتب فکر کے علماء کی ایک بڑی تعداد بھی اس تقسیم کی مخالف تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ تقسیمِ ہند در حقیقت برطانیہ کی ایک سازش ہے۔ وہ " تقسیم کرو اور حکومت کرو " پالیسی پر عمل پیرا ہیں۔ میں نے جواب میں کہا کہ ایسا نہیں تھا۔ ہم کسی کے ایجنڈے پر کام نہیں کر رہے تھے۔ البتہ میں آپ کی اس بات سے متفق ہوں کہ دیوبندی علماء کے علاوہ دیگر مسلمان رہنما بھی اس کے مخالف تھے۔ جن میں خاکسار تحریک کے علامہ مشرقی بھی شامل تھے۔

Quaid-e- Azam Muhammad Ali Jinnah and Mahatma Gandhi Photo Credit https://pakistan.gov.pk/

Quaid/pakistan_movement.html:

مشتاق جی کیا آپ کو اس بات کا پتہ ہے کہ جو لوگ مغربی پنجاب سے آئے وہ سب کے مشرقی پنجاب بھارت میں آباد میں ہیں۔ جو لوگ مشرقی پنجاب سے مغربی

پنجاب میں گئے ان میں سے اکثر تو آپ کے پنجاب میں آباد ہوئے لیکن انوکھی بات یہ ہوئی کہ وہ تمام لوگ جو دہلی اور اس کے ارد گرد رہنے والے تھے جن کی مادری زبان اردو تھی وہ سب کراچی یا سندھ کے کچھ بڑے شہروں میں آباد ہوئے۔ ان میں سے شاید ہی چند لوگ ہوں جو صوبہ سرحد میں آباد ہوئے ہوں۔ بہت سے اردو بولنے والوں کو ایک شہر میں اکٹھا کیا گیا اور پھر اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہاں پر آباد مہاجروں نے اپنی ایک سیاسی جماعت بھی بنائی اور اردو اسپیکنگ ہونے کی بنا پر آپ کے ملک کی سیاست میں بھی بے حد اہم کردار ادا کیا۔ ایسا کیوں کیا گیا؟ ان لوگوں کو تو لاہور قریب پڑتا تھا۔ جو لوگ راجستھان یا جنوبی ہندوستان سے ہجرت کرکے گئے ان کی بات تو سمجھ آتی ہے کہ وہ کراچی یا سندھ میں آباد ہوں لیکن اتنی بڑی تعداد میں اردو بولنے والوں کو ایک شہر میں بسانے کی کوئی وجہ تو ہوگی؟ میرے پاس اس سوال کا جواب نہیں تھا۔

میں نے کچھ سوچ کر کہا کہ اس وقت کراچی پاکستان کا کیپیٹل تھا اور وہاں پر انڈسٹری بھی تھی، سرکاری دفاتر کے ساتھ ساتھ کاروباری دفاتر بھی کثیر تعداد میں موجود تھے اور اردو بولنے والوں میں اکثر پڑھے لکھے لوگ تھے۔ ہو سکتا ہے کہ اس وجہ سے انھیں کراچی موزوں لگتا ہو۔ میری بات سن کر سوہن لال صاحب ہنس پڑے اور بولے کہ ایسا نہیں تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ اس میں آپ کے قومی سطح کے کئی اردو بولنے والے رہنماؤں کا مفاد شامل تھا۔ انھیں معلوم تھا کہ پاکستان میں اردو بولنے والوں کی تعداد بہت کم ہے۔ اس لیے انھیں اپنی زبان بولنے والوں کے ووٹ درکار تھے۔ اگر یہ ووٹ بکھر جاتے تو انھیں منتخب ہونے میں مشکل پیش آتی جس سے ان کی سیاسی قوت میں بھی کمی آتی۔ اس وجہ سے ان رہنماؤں نے اردو بولنے والوں کو ایک شہر میں اکٹھا کیا اور اس کا فائدہ اٹھایا۔ تحریک پاکستان کو بھی یہی لوگ لے کر چل رہے تھے۔ آپ کے پنجاب اور سرحد کے بہت کم لوگ اس تحریک کا حصہ تھے۔ وہ لوگ تو اس وقت شامل ہوئے جب انھیں یقین ہو گیا کہ پاکستان بن جائے گا اور وہ ہر صورت پاکستان کا حصہ ہوں

گے اسی لیے پاکستان بننے کے بعد اس میں شریک ہوئے۔ یہ بات آپکو تاریخ سے بھی مل جائے گی۔

Migartion scene in 1947 Photo Credit:Outlook India

سوہن لال صاحب نے مزید کہا کہ مجھے معلوم ہے کہ آپ میری بات سے اتفاق نہیں کریں گے۔اسی لیے میں ثبوت کے طور پر آپ سے یہ کہوں گا کہ تقسیمِ ہند کے بعد آپ کے اردو بولنے والے سیاسی رہنماء اسی شہر سے منتخب ہوتے آئے ہیں۔ کبھی بھی ان لوگوں میں سے کوئی بھی پاکستان میں کسی اور جگہ سے منتخب نہیں ہوا۔ آخر میں، میں نے ان سے کہا کہ میں آپ کی اس بات سے متفق نہیں ہوں۔ وجہ وہی ہے جو میں نے پہلے بیان کی۔ اس پر سوہن لال صاحب نے کہا اتفاق کرنا یا نہ کرنا آپ کا حق ہے لیکن حقیقت یہی ہے جو میں نے بیان کی ہے۔ اس کے بعد ہم نے اس موضوع پر مزید بات کرنے سے گریز کیا۔

میں نے اس سے کہا کہ آپ جو کشمیر میں کر رہے ہیں، کیا دنیا میں اس کا کوئی جواز ملتا ہے۔ تقسیمِ ہند کے وقت جو فارمولا تیار کیا گیا تھا، اس کے مطابق ہر ریاست کو

تین طرح کا راستہ منتخب کرنے کا اختیار تھا۔ بھارت کے ساتھ شامل ہوں، پاکستان میں شمولیت اختیار کریں یا آزاد بھی رہ سکتے تھے۔ ہندوستان میں کئی ریاستیں ایسی تھیں جہاں اکثریت ہندوؤں کی تھی لیکن حکمران مسلمان تھے جیسے حیدرآباد اور کچھ ایسی بھی تھیں جہاں اکثریت مسلمانوں کی تھی لیکن حکمران ہندو تھے۔ جب جوناگڑھ اور حیدرآباد ریاستوں نے جن کے حکمران مسلمان تھے لیکن لوگوں کی اکثریت ہندو تھی کے حکمرانوں نے پاکستان سے ملنا چاہا تو آپ لوگوں نے فوج کے ذریعے ان پر زبردستی قبضہ کر لیا۔ اس کے برعکس جب کشمیر کے لوگوں نے پاکستان کے ساتھ ملنا چاہا تو آپ نے ایسا نہیں ہونے دیا اور اب تک کشمیر میں قتل و غارت کر رہے ہیں۔ لاکھوں لوگ شہید ہو چکے ہیں اور آپ کی چھ لاکھ سے زائد فوج وہاں لوگوں پر ظلم و ستم ڈھا رہی ہے۔ یہ کہاں کا انصاف ہے؟

وہ میری بات سن کر کچھ دیر کے لیے خاموش رہے پھر کہنے لگے کہ میں آپ کی باتوں کا باری باری جواب دیتا ہوں لیکن اس سے پہلے میں آپ سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں۔ میں نے کہا "حاضر جناب"۔

سوہن لال صاحب نے کہا کہ آپ کے علم میں ہوگا بلوچستان کی ریاست قلات اور مکران نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ الگ رہیں گے اور پاکستان میں شامل نہیں ہوں گے اور انھوں نے اسمبلی کا اجلاس بھی بلایا۔ بھارتی رہنماؤں سے ان کے رابطے بھی تھے۔ جب حکومت پاکستان کو اس بات کا علم ہوا تو انھوں نے پاکستان بننے کے فوراً بعد قلات پر چڑھائی کر دی اور زبردستی انھیں پاکستان میں شامل ہونے پر مجبور کیا۔ ایسا کرنے سے بے شمار لوگوں کو قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کرنا پڑی اور اب تک آزاد بلوچستان کی تحریک چل رہی ہے۔ کیا میں آپ سے پوچھ سکتا ہوں کہ آپ نے ان کے علیحدہ رہنے کے حق کو تسلیم کیوں نہیں کیا؟ میں نے جواب میں کہا کہ ایسا کرنا پاکستان کے مفاد میں نہیں تھا تو انھوں نے کہا کہ جوناگڑھ کی پاکستان میں شمولیت بھی بھارت کے مفاد میں

نہیں تھی۔ ہم دونوں کو اپنے اپنے ملک کا مفاد عزیز تھا۔ میں نے پھر دوبارہ سے پوچھا کہ کشمیر کے مسئلے پر آپ جواب کیوں نہیں دیتے؟

اس پر سوہن لال صاحب نے کہا کہ ہاں میں اس بات کے حق میں ہوں کہ دنیا بھر میں ہر جگہ عوام کو حق خودارادیت ہونا چاہیے اور میں ان کے ساتھ کھڑا ہوں۔ میرے ذاتی خیال میں کشمیریوں کا حق خودارادیت کے لیے جدو جہد کرنا ان کا حق بھی ہے۔ وہاں پر رائے شماری ہونی چاہیے اور اس کے مطابق فیصلہ ہونا چاہیے۔ میں تو یہ بھی کہوں گا کہ جس طرح بھارت نے جوناگڑھ میں فوج کے ذریعہ قبضہ کیا، پاکستان کا بھی حق بنتا تھا کہ وہ بھی ایسا ہی کرتا لیکن پاکستان ایسا نہ کر سکا۔ البتہ چند ہزار لوگوں نے کشمیر کا کچھ حصہ ضرور قبضے میں کیا جو اب پاکستان کے کنٹرول میں ہے۔ حقِ خودارادیت کی تحریک اگر سیاسی جدوجہد کا روپ اختیار کرتی تو میں اس کے ساتھ کھڑا ہوتا لیکن ایسا نہیں ہوا۔

اس سے پہلے کہ میں موجودہ صورت حال کے بارے میں کچھ بتاؤں، میں چاہوں گا کہ آپ کو کشمیر کی ایک مختصر تاریخ سے آگاہ کیا جائے۔ یہ مجھے سوہن لال صاحب نے کہا۔

میں نے سننے کے لیے اپنے کان آگے کر دیے۔ انھوں نے بتایا کہ کشمیر کے علاقے پر قبضے کے بعد انگریزوں نے اسے ایک ریاست بنا کر سکھوں کے حوالے کرنا چاہا۔ اس کام کے لیے انھوں نے سکھ دربار لاہور کو سات لاکھ پچھتّر ہزار روپے دینے کو کہا جو وہ نہ دے سکے۔ اس علاقے میں پہلے سے موجود گلاب سنگھ نے اپنی طرف سے یہ رقم ادا کر دی۔ جس کے بدلے اسے جموں ،لداخ اور وادیٔ کشمیر پر مشتمل ایک ریاست کا والی بنا دیا گیا۔ اب کشمیر ریاست پوری طرح انگریزوں کی طفیلی ریاست تھی۔

اب صورت حال یہ تھی کہ لوگوں کی اکثریت مسلمان تھی جب کہ راجہ ہندو تھا۔ مسلمانوں نے راجہ کے مظالم کے خلاف ایک طویل جدوجہد کی۔ جو تاریخ کا ایک حصہ

ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے سیاسی میدان میں بھی اچھی کارکردگی دکھائی اور جنوری 1947ء میں ریاست کی قانون ساز اسمبلی کے لیے انتخابات میں اکیس مسلم سیٹوں میں سے مسلم کانفرنس کے سولہ نمائندے کامیاب ہوئے۔ یہ ان کی مقبولیت کا منہ بولتا ثبوت تھا۔

تقسیمِ ہند کے وقت ایک مشکل صورت حال پیدا ہو گئی۔ اگست 1947ء میں پاکستانی فوج نے کشمیر کو اپنے ساتھ رکھنے کے لیے ایک فوجی کارروائی کا آغاز کیا۔ اُس کا نام آپریشن گلمرگ تھا۔ صوبہ سرحد کے قبائلی لوگ کامیابی سے کشمیر میں داخل ہو گئے۔ اسی دوران سردار عبد القیوم کی سربراہی میں بھی کارروائی شروع ہو گئی۔ اس طرح کشمیر کو پاکستان کے ساتھ رکھنے کے لیے ایک لڑائی کا آغاز ہوا۔ اسی دوران مسلم کانفرنس نے پاکستانی وزیر اعظم لیاقت علی خان کو مداخلت کے لیے خط لکھا اور مدد کی اپیل کی۔

دوسری طرف بھارتی حکومت بھی اپنا کام کر رہی تھی، جس کے نتیجے میں شیخ عبد اللہ اور ان کے ساتھی ہندوستان کی آئین ساز اسمبلی میں شامل ہو گئے۔ ہندوستانی دستور ساز اسمبلی نے جموں و کشمیر کی خصوصی حیثیت اور داخلی خود مختاری کو یقینی بناتے ہوئے ایک قانون بنایا جسے آرٹیکل 370 کہا جاتا ہے۔ اس قانون کے تحت بھارتی حکومت کا اختیار صرف دفاع، امور خارجہ اور مواصلات تک محدود کر دیا گیا۔ یہ ایک طرح سے داخلی خود مختاری کے مترادف تھا۔ اس کے بعد کئی الیکشن ہوئے جس میں کشمیر کے مسلمانوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ یو این او نے بھی ایک قرار داد کے ذریعے کشمیریوں کے حق خود ارادیت کو تسلیم کیا۔ پاکستان بھی اسی حق میں تھا۔ میرے نزدیک پاکستان کو اس پر راضی نہیں ہونا چاہیے تھا بلکہ جوناگڑھ والا کام کرنا چاہیے تھا۔ اس غلطی کی سزا پاکستان اور کشمیری اب تک بھگت رہے ہیں۔

اس دوران کئی الیکشن ہوئے اور کشمیری مسلمان ان میں حصہ بھی لیتے رہے۔ بہت سے موجودہ کشمیری رہنما ان اسمبلیوں کے ممبر بھی رہے۔ پھر ایک خطرناک موڑ آیا۔ افغانستان پر سوویت تسلط کے خاتمے کے بعد عسکریت پسندوں کی بڑی تعداد پاکستان کی طرف سے کشمیر میں داخل ہوئی اور یہ پاکستان کی مرضی اور مدد کے بغیر ممکن نہ تھا۔ اس وقت سے اب تک پچھلے دس سال سے یہ جنگ جاری ہے۔ یہ بات 1999ء کی ہے اب 2022ء ہے اور یہ جنگ ابھی بھی جاری ہے اور بھارتی فوج کا ظلم و ستم پورے زوروں پر ہے۔

میں بڑے غور سے یہ سب سنتا رہا۔

سوہن لال صاحب نے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا کہ جب سیاسی جدوجہد کو پاکستان کی حکومت نے فوجی جدوجہد میں بدلا اور اپنے ملک سے بہت سے لوگوں کو کشمیر میں بدامنی کے لیے بھجوایا تو حکومتِ بھارت کو بھی ان کے مقابلے میں فوجی اقدامات کرنے پڑے۔ ایسے موقع پر ظلم و زیادتی ہونا سمجھ میں آنے والی بات ہے لیکن میں اس ظلم و زیادتی کے حق میں بھی نہیں ہوں۔ میرا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جو بھارتی فوج کے مظالم کے خلاف آواز بلند کرتے رہتے ہیں۔

آپ کو بھی ٹھنڈے دماغ سے سوچنا ہوگا کہ جب آپ کے بلوچستان میں سیاسی جدوجہد کو فوجی جدوجہد میں بدلا گیا تو آپ نے بھی اُن کے ساتھ وہی سلوک کیا جو ہم کشمیر میں ان کے ساتھ کر رہے ہیں۔ یہ سب ان کے خلاف ہے جو بندوق لے کر کشمیر کی آزادی کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ ہم تو ہندو ہیں اور ہمارے سامنے مسلمان ہیں لیکن بلوچستان میں دونوں طرف مسلمان ہیں۔ کئی مقامات پر دونوں طرف بلوچ اور پٹھان ہیں۔

اس لیے میں آج بھی اس بات کے حق میں ہوں کہ کشمیریوں کو حق خودارادیت ملنا چاہیے۔ یہ ان کا حق ہے لیکن اگر یہ سب سیاسی جدوجہد کے ذریعے ہوتا تو

بہت اچھا تھا۔ جب اسے فوجی طریقوں میں بدلا گیا تو پھر فوج کا مقابلہ فوج ہی کرتی ہے۔ اِن کی لڑائی کے دوران ان گنت بے گناہ لوگ مارے گئے جس کا مجھے بے حد افسوس ہے اور میں اب بھی یہ کہتا ہوں کہ کشمیر کا معاملہ جب بھی حل ہو گا بات چیت سے ہی حل ہو گا۔ وہ کبھی بھی فوجی مداخلت سے حل نہیں ہو گا۔ یہ میری سوچی سمجھی رائے ہے۔

میں نے کہا کہ ہمارا خیال ہے کہ بلوچستان میں جتنی بھی بدامنی ہوئی اس کے پیچھے بھارت کا ہاتھ ہے۔ انھوں نے کہا میں آپ کی اس بات سے اتفاق کرتا ہوں۔ آپ بھی اس بات سے اتفاق کریں کہ کشمیر میں ہونے والی تمام تر بدامنی کی وجہ بھی پاکستان ہے۔ آخر میں انھوں نے افسوس سے کہا کہ دونوں اطراف ارباب اختیار تو اپنے آرام دہ کمروں میں بیٹھے ہیں اور ان کے سامنے جو میدان جنگ میں لڑ رہے ہیں، اصل ظلم تو ان لوگوں کے ساتھ ہو رہا ہے، چاہے وہ کشمیر میں ہو یا بلوچستان میں۔ اس موقع پر وہ مزید بات کرنے سے گریزاں تھے۔

Kashmir Agitation Photo Credit:First Post

ایک دفعہ تو انھوں نے اس موضوع پر بات ختم کر دی پھر نجانے کیا یاد آیا اور کہنے لگے.

مشتاق جی میری تمام تر ہمدردیاں کشمیریوں کے ساتھ ہیں۔ لیکن ان کے ساتھ ظلم صرف بھارت نے نہیں کیا بلکہ پاکستان نے بھی کیا ہے۔

میرے لیے یہ بات بہت ہی حیران کن تھی میں نے کہا یہ آپ نے کیا بات کہہ دی؟

ہمارے تو نوجوانوں نے کشمیر میں بھارتی فوجیوں کے ساتھ جنگ کی ہے اور شہید ہوئے ہیں۔ میرے اپنے خاندان کے جوان بچے بھی کشمیر میں شہید ہوئے ہیں۔ ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ کئی ہزار پاکستانی نوجوان کشمیر میں کشمیر کی آزادی کی جنگ میں اپنی جان کی بازی ہار گئے ہیں اور آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ ہم نے ان پر ظلم کیا! میں یہ بات کیسے تسلیم کرلوں؟

انھوں نے کہا ایک دفعہ پھر تسلی سے بیٹھ جائیں میں آپ کو بتاتا ہوں پاکستان نے اپنے مفاد کی خاطر کس طرح سے کشمیر کو استعمال کیا ہے اور آج کشمیر میں ہونے والا تمام ظلم و ستم اسی پاکستان کی پالیسی کا حصہ ہے۔

اب گفتگو ایک دلچسپ مرحلے میں داخل ہو چکی تھی اور ہم ایک مرتبہ پھر تسلی سے بیٹھ گئے۔ میرے تمام نظریات اور خیالات کو شدید چوٹ لگ رہی تھی۔ میں کافی مشکل صورتحال میں تھا۔ لیکن میں نے بات سننے کا وعدہ کیا تھا۔ اس لیے خاموش رہنے کو ترجیح دی۔

سوہن لال نے کہا کہا نوے کی دہائی سے پہلے کشمیر کی تمام تحریک ایک سیاسی انداز سے چل رہی ہیں۔ لوگ الیکشن میں حصہ بھی لیتے تھے اسمبلی میں بھی جاتے تھے اور دنیا بھر کے فورمز پر خودارادیت کے لیے بات بھی کرتے تھے۔ پوری دنیا ان کی اس بات کے پیچھے بھی کھڑی تھی۔ لوگ ان کے حامی بھی تھے۔ بہت سے ادارے بھارت کو اس بات پر مجبور کر رہے تھے کشمیریوں کو حق خودارادیت دے۔

لیکن کیا ہوا کہ سب بازی الٹ گئی!

افغانستان میں روس کو شکست ہوئی اور ہزار ہا نوجوان مجاہدین جو برس ہا برس سے وہاں جنگ میں مصروف ان کے اندر شہادت اور فتح کا نشہ بھی عروج پر تھا۔ اس دور میں پاکستان کو ان لوگوں کو سنبھالنے کا فکر پیدا ہوا۔ جیسے ہی روس افغانستان سے گیا تو وہاں مقامی گروہوں میں لڑائی ہونے لگ گئی۔

مشتاق جی ! آپ کو بھی یاد ہوگا کے سات بڑے گروپوں کا ایک اتحاد تھا جو روس کے خلاف جنگ کر رہا تھا۔ ان گروپوں میں مذہبی اختلافات بھی تھے اور لسانی اختلافات کے ساتھ ساتھ قبائلی عصبیت بھی موجود تھی۔ لیکن جنگ نے ان سب کو اکٹھا کیا ہوا تھا۔ ایسی صورتحال میں ان تربیت یافتہ مجاہدین کو جنہیں کوئی کام نہیں آتا تھا حکومت پاکستان اور خاص طور پر افواج پاکستان کے لیے یہ لوگ مسئلہ بن رہے تھے۔ ان کی تعلیم و تربیت میں بھی بہت بڑا ہاتھ پاکستان فوج کا تھا اور وہی ان سے رابطے میں تھے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا ان لوگوں کو کسی طریقے سے فوج میں شامل کر لیا جاتا جہاں ان کی روزی روٹی کا بندوبست بھی ہو جاتا اور ان کی طاقت سے بھی پاکستان فائدہ اٹھاتا۔

لیکن فوج نے ایسا نہیں کیا !

انھوں نے الگ سے ان لوگوں کی تربیت کا بندوبست کیا اور ہزاروں کی تعداد میں کشمیر بھیج دیا۔ یہ وہ موقع تھا کشمیر کی سیاسی جدوجہد ایک بڑی فوجی جدوجہد میں تبدیل ہو گئی۔ اس کے لیے پاکستان نے مختلف کیمپ بھی قائم کیے جن کی نشاندہی بھارت نے کی لیکن پاکستان ہمیشہ ہی اس سے انکار کرتا رہا۔ وہ لوگ جو کشمیر میں مارے گئے ان کی نماز جنازہ پاکستان میں ادا کی جاتی تھی اور بتایا جاتا تھا کہ یہ وہ لوگ ہیں پاکستان کے فلاں قصبے سے تھے اور سرحد پار کر کے کشمیر گئے تھے۔ ان کی شہادت کی داستانیں بھی بڑھا چڑھا کر بیان کی جاتی تھیں اور بھارت کے خلاف نفرت میں اضافہ کیا جاتا تھا۔ پاکستان بھر میں

کشمیر کے حوالے سے دن بھی منائے جاتے تھے۔ ایک مذہبی جماعت اس کام کی قیادت کر رہی تھی۔

Beatingofan old man inKashmir

Photo Credit:Naya Dour TV

یہ تمام باتیں اس بات کا بین ثبوت تھیں کہ پاکستان کی سرزمین کشمیر میں فوجی جدوجہد کے لیے استعمال کی جارہی ہے اس میں پاکستان کے لوگ بھی شامل ہیں۔ پاکستان کے پاس اس کا جواب یہ تھا کہ یہ لوگ پاکستان سے نہیں ہیں کشمیری لوگ ہیں۔ اپنے کشمیری بھائیوں کے لیے جنگ کر رہے ہیں۔ اور اگر کوئی کیمپ کشمیر میں موجود ہے اس کا کوئی لینا دینا پاکستان سے نہیں ہیں۔ پاکستان ان کی صرف اخلاقی اور سیاسی حمایت ہی کر رہا ہے۔

یہ سب کہنے کی باتیں تھیں۔ جبکہ حقیقت اس کے برعکس تھی۔

بھارت نے یہ تمام باتیں اٹھائیں اور پوری دنیا میں اس کا پروپیگنڈا کیا اور سب کو یہ باور کروایا کے کشمیر میں ہونے والی تمام تر بدامنی کی ذمہ داری پاکستان سے آنے والے وہ مجاہد ہیں جنہیں پاکستان کی فوج نے تربیت دیکھ کر بھیجا ہے۔ جب ایسا ہوا تو پھر دنیا

نے کشمیر میں ہونے والی جدوجہد کو ایک فوجی جدوجہد سمجھنا شروع کیا اور اپنی حمایت بھی واپس لے لی اور بھارت کے ساتھ بھی اس معاملے میں بھی نرمی برتی۔ اس میں صرف یورپ اور امریکہ ہی شامل نہیں تھے بلکہ عرب مسلمان ممالک بھی اس معاملے میں بھارت کے ساتھ کھڑے تھے۔

میرے خیال میں یہ بات کشمیری لوگوں کے لیے بہت بڑا دھچکا تھی۔ اب وہ جتنا بھی چاہیں کہ اس تحریک کو ایک سیاسی تحریک میں بدل لیں۔ اب یہ ممکن نہیں ہے۔

سوہن لال نے ایک اور بات بھی کہنا چاہ رہے تھے جو ان سے کافی مشکل سے کہی جا رہی تھی۔

لیکن انھوں نے کہہ ہی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ مشتاق جی آپ کا کیا خیال ہے چند ہزار لوگ صرف کلاشنکوف کی مدد سے ہندوستان کی لاکھوں کی فوج جس کے ساتھ پوری ریاست کی ہمدردی بھی شامل ہو اور وسائل بھی ہوں کو شکست دے سکتے تھے ؟

ایسا ممکن ہی نہیں تھا۔ آپ کے ملک میں بھی جب بھارت نے بلوچستان میں اس طرح کا کوئی کام کیا اور ان کو تربیت دے کر ہنگامے کروائے۔ ایک جنگ کی کیفیت پیدا کی تو ان کو بھی کبھی بھی کامیابی نہیں ہوئی۔ نہ ہی کوئی کامیابی ہو سکتی تھی۔ اسی طرح سے یہ بھی ممکن نہیں تھا کہ پاکستان سے آ کر چند ہزار لوگ محدود اسلحہ کے ساتھ ایک گوریلا جنگ لڑ کے بھارت کی فوج کو شکست دے سکیں گے۔ البتہ یہ ضرور ہے وہ مستقل درد سر رہیں گے۔ لیکن کامیابی کبھی بھی ان کا مقدر نہیں ہو گی۔

یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئے اور میں کافی دیر تک کسی سوچ میں مبتلا رہا کہ جس جنگ کی جیت کا کوئی ایک فیصد بھی امکان نہ ہو اس جنگ میں میرے بھانجوں کو بھیجنا اور ان کو شہید کروانا کیوں ضروری تھا؟

صرف میرے بھانجوں کو ہی نہیں نوجوانوں کو جن کی تعداد ایک لاکھ کے قریب ہے کی شہادت کے بعد بھی ہم وہیں پر کھڑے ہیں جہاں سے چلے تھے اور اس کے ساتھ الٹا نقصان یہ ہوا پوری دنیا ہمارے ساتھ تھی وہ بھی پیچھے ہٹ گئ۔

سوہن لال کا یہ کہنا تھا کہ جب تک یہ سیاسی تحریک تھی میں اس کا حمائیتی تھا۔ لیکن جب یہ ایک جنگی کیفیت میں تبدیل ہو گئ تو میں بھی اس کا حمائیتی نہیں رہا۔ اب عام بھارتی بھی کشمیریوں کا حمائیتی نہیں رہا۔ دوسرے ملک میں ہتھیار بند لوگوں کے ذریعے گوریلا جنگ کرنے کی کوئی بھی اجازت نہیں دیتا اور آج نتیجہ یہ ہوا ان کے معاملے پر دنیا ہمارے ساتھ ہے، عرب بھی اور عجم ہمارے ساتھ ہے۔

میری خاموشی کو دیکھ کر سوہن لال نے کہا مشتاق جی کشمیر کو بھارت کے خلاف استعمال کیا گیا ہے پاکستان فوج کا یہ خیال تھا کہ کشمیر میں بھارتی فوج کو مصروف رکھنے سے بھارت کو بہت زیادہ نقصان ہو گا اور وہ پاکستان پر حملہ کرنے کا سوچے گا بھی نہیں۔

سوہن لال کا آخری فقرہ بہت ہی تکلیف دہ تھا۔

انھوں نے کہا مشتاق جی آپ کی فوج نے پاکستان بچا لیا اور کشمیر قربان کر دیا۔ اب کشمیر کبھی بھی پاکستان کا حصہ نہیں بن سکے گا اس کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے کشمیر کی تحریک کو ایک جنگی تحریک میں بدل دیا گیا ہے۔ اس کی ذمہ دار پاکستان کی فوج ہے۔

یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئے اور میری کیفیت بھانپنے لگے۔

میں کھڑکی سے باہر دیکھنے لگ گیا اور یہ سوچنے لگ گیا کے۔ یہ سب سن کر کے میری کیفیت مزید بگڑ گئی اور میں یہ سوچنے لگا ایک لاکھ سے زائد نوجوانوں کی شہادتیں، بے شمار ماؤں بہنوں کی عزتوں کی قربانی۔۔۔

اس سب کے بعد ہم دو قدم آگے جانے کی بجائے چار قدم پیچھے ہٹ آئیں ہیں۔ کوئی تو ہو جو اس کا جواب دے۔

یہ سوچتے ہوئے میں نے اپنی جیب سے رومال نکالا اور وہ چند آنسو نکلے ان کو اس میں جذب کیا تا کہ سوہن لال کو محسوس نہ ہو کہ میں کس کیفیت سے گزرا ہوں۔

سوہن لال صاحب نے جب یہ دیکھا میری حالت کوئی بہت بہتر نہیں ہے اور ان کی باتیں سن کر مجھے سخت دھچکا لگا ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ یہ سب دیکھ کر ضرور سوچتے ہوں گے کی انھوں نے کیوں اتنی سیدھی سیدھی باتیں کیں؟

چند لمحوں کے بعد وہ مجھے کہنے لگے کہ آپ کے کشمیر کے بارے میں کیا خیالات ہیں؟

میں نے کہا کہ میں نے آپ کی بات پوری تسلی سے سنی ہے آپ کو بھی میری بات کو غور سے سننا ہوگا۔ جس کی انھوں نے حامی بھر لی۔

میں نے کہا سوہن لال صاحب جب ہندوستان میں مسلمانوں نے حملے شروع کیے تو انھوں نے سب سے پہلے مغربی سرحدی علاقہ جات پھر پنجاب اور اس کے ساتھ ساتھ جموں کشمیر پر بھی قبضہ کیا۔ بعد میں وہ دلی، بنگال، راجستھان اور بے شمار علاقے بھی ان کے قبضہ میں تھے۔ تاریخ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ باقی ہندوستان کی طرح کشمیر میں ہندو اور بدھ ہی رہتے تھے۔ ان کی یہاں حکومت بھی تھی، راجہ بھی انھی کا راج بھی انھی کا۔

ساتویں صدی میں ہندوؤں کے چند سنتوں نے ایک نئے دھرم کی بنیاد رکھی جسے شیوازم کہا جاتا ہے۔ اس دھرم کے مطابق شیوا ہی سے سے بڑی طاقت ہے۔ اس دور میں بدھ ازم کے ماننے والوں کا قتلِ عام کیا گیا اوران کی آبادی نہ ہونے کے برابر ہو گئی۔ جو ہندو بن گیا اسے چھوڑ دیا گیا جو نہ مانا اسے قتل کر دیا گیا۔ اس واقعہ کی تردید ممکن نہیں ہے۔ ایسا کرنے میں ہندو بادشاہ میہر کولہ کا سب بڑا ہاتھ ہے۔

میرے علم کے مطابق کسی بھی مسلمان بادشاہ نے ہندوؤں یا بدھوں کے ساتھ ایسا سلوک کبھی نہیں کیا۔ یہ تمام تر ظلم کشمیر میں ہوا۔ یہ بھی آپ کو علم ہونا چاہیے کہ پنجاب کے شمال میں واقع طویل پہاڑی سلسلہ تبت، لداخ سے لیکر گلگت، ہنزہ کے ساتھ ساتھ وادی کشمیر اور جموں کے علاقے آپس میں ملے ہوئے تھے۔ جس نے اس علاقے پر حکمرانی کی وہ کم و بیش ان تمام علاقوں پر ہی قابض ہوتا ہے۔ اس لیے اگر میں کشمیر کا لفظ استعمال کروں تو اس سے مراد یہ تمام تر علاقے ہی ہیں۔ سوہن لال صاحب نے اس سے اختلاف نہیں کیا بلکہ کہا یہ بات میرے علم میں نہیں تھی۔

پھر وہ دور آتا ہے جب مختلف علاقوں سے مسلمان صوفی اس علاقے میں آتے ہیں۔ ایران سے شیعہ مسلک کے لوگ آئے، وسطی ایشیاء سے آغا خانی عقیدہ کے لوگ آئے اور ہندوستان کے مرکزی علاقوں سے سنی عقیدہ کے لوگ کشمیر میں آئے۔ لیکن ان کی اکثریت انفرادی طور پر ہی کام کرتی رہی۔ ہندوؤں کے مظالم کی وجہ سے عام لوگوں میں نفرت پیدا ہوتی گئی۔ آہستہ آہستہ مسلمانوں کی آبادی میں اضافہ ہوتا گیا۔ میں نے سوہن لال صاحب سے کہا یہ کام کسی بادشاہ نے نہیں کیا تھا اور نہ زور کے ذریعے کیا گیا۔ یہ مسلمان صوفیہ کا اخلاق تھا اور ہندوؤں کے ظلم و ستم کا نتیجہ تھا کہ عام لوگوں نے اسلام کے دامن میں پناہ لی۔

میں نے سوہن صاحب سے کہا کہ پھر تاریخ میں ایک اہم واقعہ پیش آیا جس کا علم ہونا کشمیر کی تاریخ سمجھنے کے لیے ضروری ہے۔

چودہویں صدی کا آغاز میں صدرالدین کشمیر کا پہلا مسلمان حکمران بن گیا۔ یہ کون تھا؟ اس بارے میں یہ اہم ترین بات ہے کہ یہ بدھ مت خاندان میں پیدا ہوئے تھے۔ کوئی غیر ملکی حملہ آور نہیں تھے بلکہ کشمیر کا رہنے والا ایک بدھ مذہب کے ماننے والا تھا۔

یہ کیسے ہوا اور کب ہوا؟ سوہن صاحب نے پوچھا۔ میں نے جواب دیا وہ کچھ یوں تھا۔

کشمیر کا آخری غیر مسلم حکمران رنچین تھا۔ جو ایک بدھ مذہب سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کی حکومت 1320ء سے لیکر 1323ء تک رہی۔ اس دوران وہ بلبل شاہ ایک مسلمان صوفی کے ہاتھوں مسلمان ہوا۔ اس سے آپ یہ سمجھ سکتے ہیں کہ کشمیر میں اسلام ایک صوفی کے ذریعے آیا اور اس وقت کے راجہ نے اسلام قبول کیا اور اپنا نام سلطان صدرالدین رکھا۔ صدرالدین کوئی غیر ملکی نہیں تھا اس علاقے کا ہی رہنے وال تھا۔ اس لیے یہ کہنا کہ پورے ہندوستان میں باہر سے آکر ہیں مسلمانوں نے حکومت کی شاید مناسب نہ ہوگا اس کی ایک مثال سلطان صدرالدین بھی ہے۔

ایسا کیسے ہوا یہ جاننے کے لیے ہمیں تاریخ کے مدد لینا ہوگی۔

تاریخ سے پتہ چلتا ہے رنچین سے پہلے یہاں کے حکمران کا نام راجا سوحادیو تھا۔ جس نے رنچین کو اپنا وزیر مقرر کیا اور اور سوات سے آنے والے ایک مسلمان شاہ میر کو بھی ایک اعلیٰ عہدہ پر فائز کیا۔ اسی دوران منگولوں نے کشمیر پر حملہ کیا۔ راجہ شکست کھا کر تبت کی طرف چلا گیا۔ اب گدی خالی تھی اور راجہ کے ایک اعلیٰ عہدے دار رام چندر نے گدی پر قبضہ کر لیا۔ رام چندر نے بھی رنچین کو اپنا وزیر مقرر کیا۔ چندرا بھی ایک جنگ

میں مارا گیا۔ اب رنچین ہی سیاہ و سفید کا مالک تھا۔ رنچین نے رام چندر کی بیٹی سے شادی کی اور اس طرح سے وہ کشمیر کا راجہ بن گیا۔

یہ وہی دور ہے جب صوفی بھی کشمیر میں آنا شروع ہوئے۔ انھی بزرگوں میں شامل بلبل شاہ کے ہاتھوں رنچین نے اسلام قبول کیا اور اپنا نام سلطان صدرالدین رکھا۔ اس طرح سے وہ 1320ء میں کشمیر کا پہلا مسلمان حکمران بنا۔ شاہ میر اس کا بہترین اور قابلِ اعتماد دوست تھا۔ صدرالدین نے مرتے وقت اپنے خاندان کی ذمہ داری بھی شاہ میر کو سونپنی تھی۔

شاہ میر کون تھا؟ اس بارے میں تاریخ دانوں کی مختلف رائے ہے۔ کچھ کا کہنا ہے کہ یہ فارسی بان تھے اور سوات میں آکر ٹھہر گئے تھے کچھ کا کہنا ہے کہ یہ وسطی ایشیا سے آئے تھے اور سوات میں ٹھہرے تھے۔ کیا صحیح ہے معلوم نہیں۔ بہر حال ایک بات سب میں مشترک ہے کہ یہ ایران یا وسط ایشیاء سے آنے والے لوگوں میں سے تھے اور انھوں نے براستہ سوات کشمیر کا رخ کیا۔

سلطان صدرالدین نے اسلام قبول کرنے کے بعد سری نگر میں ایک بہت بڑی مسجد بھی بنائی۔ یاد رہے کہ کشمیر میں بننے والی یہ پہلی مسجد تھی۔ جس شخص نے بنائی وہ پیدائشی بدھ تھا بعد میں جس نے اسلام قبول کیا۔ اس نے اپنے مرشد بلبل شاہ کی یاد میں کئی عمارتیں بھی بنوائیں اور ایک لنگر خانہ بھی قائم کیا۔

ایک جنگ میں سلطان صدرالدین مارا گیا، اس کے خاندان کی عورتوں نے کچھ عرصہ تک گدی کو سنبھالنے کی کوشش کی، لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔ اس دوران ایک مرتبہ پھر منگولوں نے حملہ کیا اسے روکنے کے لیے شاہ میر کی مدد لی گئی۔

پھر جس نے مدد کی وہ طاقتور تھا اور خاندان کمزور۔

اس طریقے سے وہ وقت آیا کہ جب 1339ء میں شاہ میر نے شاہ میر خاندان کی ریاست کی بنیاد رکھی جو اڑھائی سو سال تک قائم رہی۔ اب تک میں نے جتنا بھی مسلمان ریاستوں کے متعلق پڑھا ہے، ان میں چند خاندان ہی اتنے عرصہ تک حکمران رہ پائے۔ حتیٰ کہ مغل خاندان بھی سوا تین سو سال سے آگے نہیں گیا۔ ان اڑھائی سو سال میں کسی بھی غیر ملکی کو کشمیر پر حملہ کرنے حوصلہ نہیں ہوا۔ نیک دل حکمرانوں اور مسلمان صوفیا کی مدد سے کشمیر جو کبھی ہندو اور بدھ اکثریت کا علاقہ تھا آہستہ آہستہ مسلمان اکثریت کا علاقہ بن گیا۔

یہ سب جان کر سوہن صاحب نے کہا یہ بات تو درست ہے۔ ہمیں جو تاریخ پڑھائی جاتی ہے وہ تو ڈوگرہ راج سے ہی شروع کی جاتی ہے۔ ڈوگرہ راج سے پہلے یہاں کون تھا؟ وہ کون لوگ تھے جنہوں نے پرامن طریقے سے حکومت کی۔ ان کی حکومت کے دوران کبھی بھی کسی بھی ہندو یا بدھ کے ساتھ کوئی ظلم نہیں ہوا۔

یہ سب جان کے سوہن صاحب کی دلچسپی میں بے حد اضافہ ہوا اور انھوں نے پوچھا شاہ میر خاندان کی ریاست کا خاتمہ کیسے ہوا؟ میں نے جواب میں کہا کہ ایک مسلمان حکمران کے ہاتھوں۔ یہ کیسے ہوا؟ سوہن صاحب کا سوال تو بنتا تھا۔

کشمیر کی خوبصورتی ہی اس اس کی تباہی کی وجہ بنی۔ محمود غزنوی نے جب ہندوستان پر حملے شروع کیے اس نے کشمیر کو بھی اپنے ماتحت کرنے کی کوشش کی۔ اس وقت کشمیر پر ایک طاقتور ہندو خاندان کی حکومت تھی۔ غزنوی اس میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کے علاقہ خوبصورت تھا لیکن اتنا امیر نہیں تھا جتنا وسطی اور جنوبی ہندوستان۔ ممکن ہے اسی لیے اس کی دلچسپی خوبصورتی سے زیادہ زیادہ سومنات کی طرف تھی جہاں بے شمار مال و دولت حاصل کرنے کے مواقع تھے۔

سلاطین دلی نے بھی کشمیر فتح کرنے کی کوئی خاص کوشش نہیں کی۔ پہلی مرتبہ ہمایوں نے اس علاقے پر اپنی فوج بھیجی لیکن کوئی علاقے فتح نہ کر سکا۔ مغل کشمیر کے بغیر اپنی حکومت کو نامکمل سمجھتے تھے۔ اکبر کشمیر کی خوبصورتی سے بے حد متاثر تھا اس نے 1586ء میں کشمیر کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا اور اسے صوبہ کابل کا حصہ بنا لیا۔ سری نگر ان کا سب سے پسندیدہ مقام تھا جنہوں نے شالامار باغ کے علاوہ بے شمار باغات اور مساجد بھی تعمیر کیں۔ یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہا جب تک سلطنت مغلیہ مضبوط رہی۔

جیسے ہی سلطنت مغلیہ کمزور ہوئی افغانستان سے نادر شاہ اور پھر اس کے بعد احمد شاہ ابدالی نے ہندوستان پر حملے شروع کیے۔ احمد شاہ ابدالی نے کئی حملہ کیے اور ہر دفعہ جانے سے پہلے یہاں پر افغانی لوگوں کو اپنا نمائندہ بنا کر چھوڑ جاتا تھا۔ اسکے بعد سے کشمیر پر حکمرانی افغانوں کی تھی۔ ان کے خلاف بہت دفعہ بغاوت بھی ہوئی۔ لیکن کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔

یہ ایک لمبی تاریخ ہے پھر وہ وقت آیا کہ جب 1819ء میں رنجیت سنگھ نے کشمیر پر حملہ کیا اور اسے اپنی ریاست کا حصہ بنا لیا۔ اس طرح سے 1320ء سے لے کر 1819ء تک پورے پانچ سو سال تک یہ علاقہ مسلمان حکمرانوں کے تحت رہا اور یہاں کی آبادی کا ایک بڑا حصہ مسلمان تھا۔ ان ادوار میں گلگت بلتستان کی مقامی ریاستیں بھی دلی دربار کے ساتھ اپنی وفاداری کا اظہار کرتی تھی۔ یقینی طور پر وہ بہت سے معاملات میں خود مختار تھیں کیونکہ ان کا فاصلہ دلی سے بہت دور تھا اور راستہ بھی مشکل تھا۔

سوہن صاحب سے میں نے کہا کہ آپ بتایئے کہ پانچ سو سال سے قائم ایک مسلمان ریاست کو آپ کس طریقے سے ایک ہندو ریاست میں بدل سکتے ہیں؟ سوہن صاحب کا جواب بھی شاندار تھا۔ انھوں نے کہا کہ اس کی کیا وجہ تھی کہ یہ ایک مسلمان اکثریت کا علاقہ اتنی آسانی سے سکھوں کے ہاتھ چلا گیا؟ پھر خود ہی جواب دیا کہ لگتا ہے

اہلِ کشمیر لڑائی فساد سے دور رہے اور خوبصورت مناظر اور پر سکون زندگی نے انھیں تن آسان بنا دیا تھا جس سے ان کے اندر لڑنے کی صلاحیت نہیں تھی۔ جبکہ ان کے مقابلہ میں سکھ ایک جنگ جو قوم کے طور پر ابھر رہے تھے۔ اس لیے اہل کشمیر ان کی مقابلہ نہیں کر سکے۔

میں نے سوہن لال صاحب سے کہا کہ میرے خیال میں مغل دور کے خاتمے تک کشمیر ایک پر امن خطہ رہا ہے۔ لیکن جیسے ہی افغان لوگوں نے حملے شروع کیے جو ایک طرح سے مغلوں کی مدد کے لیے آئے تھے لیکن مدد کے ساتھ ساتھ انھوں نے اپنی بھی حکمرانی قائم کی اسی دور میں کشمیر پر بھی وہ قابض تھے ،اس دور میں کئی لڑائی ہوئی۔ مقامی ہندو لوگوں نے بھی ان کے خلاف بغاوت کی۔

لیکن پھر ظلم کا ایک دور شروع ہوتا ہے جو ایک سو اٹھائیس سال تک جاری رہا۔ رنجیت سنگھ نے مقامی ہندو ڈوگرہ قوم سے مل کر 1819ء میں کشمیر پر قبضہ کیا۔ رنجیت سنگھ کی وفات 1839ء میں ہوتی ہے۔ اس کے بعد سے لے کر 1947ء تک یہاں پر ڈوگرہ خاندان نے حکومت کی۔ اس کا ذکر بڑے تلخ انداز سے تاریخ میں کیا جاتا ہے کہ کس طرح سے ایک وسیع علاقے کو جو جموں سے شروع ہوتا تھا اور گلگت بلتستان بھی اس کا حصہ تھا کو انگریزوں نے ایک ظالم ڈوگرا راجہ گلاب سنگھ کو فروخت کیا۔ یہ ڈوگرہ راج کشمیری مسلمانوں پر کیسے گزرا اس کی داستان بہت ہی تکلیف دہ ہے۔

سوہن صاحب میں آپ کو یہ بھی بتاتا چلوں ڈوگرہ خاندان کے مظالم صرف مسلمانوں پر ہی نہیں تھے بلکہ ہندو بھی ان کے نشانے پر تھے۔ سوہن صاحب کیا تاریخ میں کبھی ہمیں ایسا بھی پڑھنے کو ملتا ہے کہ بادشاہ سلامت پوری ریاست میں واقع تمام تر زمین کے مالک ہوں گے اور تمام رعایا ان کی ملازم!

ایسا شاید دنیا میں کہیں نہیں ہوا لیکن ان ڈوگرہ لوگوں نے ایسا ہی کیا۔

Text Of Treaty

(Source:

https://kashmircampaign.com/history/kashmir-

history/treaty-of-amritsar-british-slave-trade-in-bulk/)

Treaty of Amritsar March 16, 1846

The treaty between the British Government on the

one part and Maharajah Gulab Singh of Jammu on the other

concluded on the part of the British Government by Frederick

Currie, Esq. and Brevet-Major Henry Montgomery Lawrence,

acting under the orders of the Rt. Hon. Sir Henry Hardinge,

G.C.B., one of her Britannic Majesty's most Honorable Privy

Council, Governor-General of the possessions of the East

India Company, to direct and control all the affairs in the East

Indies and by Maharajah Gulab Singh in person — 1846.

Article 1 The British Government transfers and makes

over for ever in independent possession to Maharajah Gulab

Singh and the heirs male of his body all the hilly or

mountainous country with its dependencies situated to the

eastward of the River Indus and the westward of the River

Ravi including Chamba and excluding Lahol, being part of the

territories ceded to the British Government by the Lahore

State according to the provisions of Article IV of the Treaty of Lahore, dated 9 March 1846.

Article 2 The eastern boundary of the tract transferred by the foregoing article to Maharajah Gulab Singh shall be laid down by the Commissioners appointed by the British Government and Maharajah Gulab Singh respectively for that purpose and shall be defined in a separate engagement after survey.

Article 3 In consideration of the transfer made to him and his heirs by the provisions of the foregoing article Maharajah Gulab Singh will pay to the British Government the sum of seventy-five lakhs of rupees (Nanukshahee), fifty lakhs to be paid on or before the 1st October of the current year, A.D., 1846.

Article 4 The limits of territories of Maharajah Gulab Singh shall not be at any time changed without concurrence of the British Government.

Article 5 Maharajah Gulab Singh will refer to the arbitration of the British Government any disputes or question that may arise between himself and the Government of Lahore or any other neighboring State, and will abide by the decision of the British Government.

Article 6 Maharajah Gulab Singh engages for himself and heirs to join, with the whole of his Military Forces, the British troops when employed within the hills or in the territories adjoining his possessions.

Article 7 Maharajah Gulab Singh engages never to take to retain in his service any British subject nor the subject of any European or American State without the consent of the British Government.

Article 8 Maharajah Gulab Singh engages to respect in regard to the territory transferred to him, the provisions of Articles V, VI and VII of the separate Engagement between the British Government and the Lahore Durbar, dated 11 March 1846.

Article 9 The British Government will give its aid to Maharajah Gulab Singh in protecting his territories from external enemies.

Article 10 Maharajah Gulab Singh acknowledges the supremacy of the British Government and will in token of such supremacy present annually to the British Government one horse, twelve shawl goats of approved breed (six male and six female) and three pairs of Cashmere shawls.

This Treaty of ten articles has been this day settled by Frederick Currie, Esq. and Brever-Major Henry Montgomery Lawrence, acting under directions of the Rt. Hon. Sir Henry Hardinge, Governor-General, on the part of the British Government and by Maharajah Gulab Singh in person, and the said Treaty has been this day ratified by the seal of the Rt. Hon. Sir Henry Hardinge, Governor-General. Done at Amritsar the sixteenth day of March, in the year of our Lord one thousand eight hundred and forty-six, corresponding with the seventeenth day of Rubee-ul-Awal (1262 Hijri).

دلچسپ بات یہ بھی ہے کہ اس معاہدہ پر ہجری تاریخ بھی لکھی ہوئی ہے۔ جس کے مطابق یہ معاہدہ سترہ ربیع الاول کو لکھا گیا۔

میں یہ داستاں سنا کر ان کو مزید افسردہ نہیں کرنا چاہتا ہے۔ لیکن ایک بات میں آپ کو ضرور بتانا چاہوں گا۔

یہ تو آپ کے علم میں ہے ہندوستان میں واقع چھ سو کے قریب چھوٹی موٹی ریاستوں میں سوائے چند کے وہاں کے حکمران جس مذہب سے تعلق رکھتے تھے ان کی عوام کی اکثریت بھی اسی مذہب سے تعلق رکھتی تھی۔ کشمیر میں ستر فیصد سے زائد مسلمان تھے اور کچھ علاقوں میں تو نوے فیصد سے مسلمان آباد تھے۔ میرے علم کے مطابق تقسیم ہند سے پہلے کسی بھی ریاست میں ریاست سے آزادی کے لیے کوئی تحریک نہیں چلی۔ اگر کوئی آزادی کی تاریخ چل رہی تھی تو وہ انگریزوں کے خلاف تھی اور ان

علاقوں میں تھی جن کا قبضہ براہ راست انگریزوں کے پاس تھا۔ یہ حصہ ہندوستان کا تقریبا نصف کے قریب تھا۔ لیکن کشمیر وہ واحد ریاست تھی جہاں پر مسلمانوں نے آزادی کے خلاف کی تحریک چلارکھی تھی، ایسا کسی اور جگہ نہیں تھا۔

سوہن صاحب نے یہ سن کر کہا کہ اس کا مطلب یہ ہے یہ جو آج آزادی کی تحریک چل رہی ہے اس کا آغاز تو کوئی سو سال پہلے ہو گیا تھا۔ میں نے کہا بالکل آپ نے درست جانا۔ آج کی آزادی کی تحریک نہیں ہے بلکہ اس کا آغاز تو ڈوگرہ دور میں ہی ہو گیا تھا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ ڈوگرہ خاندان کے مظالم تھے۔

سوہن صاحب نے کہا کہ میرے علم میں کوئی ایسا علاقہ نہیں ہے ہاں ایک سو سال سے لوگ تحریک چلا رہے ہو اور انھیں ابھی تک کامیابی نہ ملی۔ میں نے کہا کامیابی تو دور کی بات ظلم و ستم کی ایسی داستان رقم کی گئی ہے جس کی کوئی مثال ملنا ممکن نہیں ہے۔

میں نے کہا سوہن صاحب اگر وقت ہوتا تو میں آپ کو بتاتا کہ تقسیم ہند کے وقت کشمیر کے راجہ نے آزاد رہنا پسند کیا تھا۔ لیکن دو افراد نے مل کر وہ ظلم کیا جس کی مثال ملنا ممکن نہیں۔

ایک پنڈت جواہر لال نہرو جس کا آبائی تعلق کشمیر سے تھا وہ کشمیری برہمن خاندان سے تعلق رکھتا تھا اور وہ سمجھتا تھا کہ اب اگر کشمیر کو ہندوستان کے ساتھ نہ ملایا تو پھر کبھی موقع نہیں مل سکے گا۔ اس کا ایک جذباتی تعلق کشمیر سے سمجھ آنے والی بات ہے۔ اور دوسرا لارڈ ماؤنٹ بیٹن جو اس وقت وائسرائے تھا اور تقسیم ہند کا ذمہ دار۔

تاریخ میں یہ لکھا ہے کہ جب جواہر لال نہرو صاحب کو یہ کہا گیا کہ کشمیر آزاد رہے گا تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ پھر یہی آنسو ماؤنٹ بیٹن کو بھا گئے اور گرداس پور کو بھارت میں شامل کیا گیا جو بھارت سے کشمیر جانے کا واحد راستہ تھا اور اس کے ساتھ ساتھ ڈوگرہ راجہ کو حکم دیا گیا کہ وہ ہندوستان کے ساتھ الحاق کا اعلان کریں۔ اسے

کوئی دوسری آپشن ہی نہیں دی گئی تھی اور یوں کشمیر کا الحاق بھارت سے کیا گیا اور آج تک اس الحاق کے خلاف ایک تحریک چل رہی ہے۔

میں نے سوہن صاحب سے کہا کہ میرا موقف وہی ہے جو ریاست پاکستان کا ہے۔ ہمارے مطابق تقسیم ہند کا ایجنڈا ابھی تک نامکمل ہے۔ یہ اس دن میں مکمل ہوگا جب کشمیریوں کو حق خود ارادیت دیا جائے گا۔ میں آپ کی بات سے اتفاق کرتا ہوں کشمیر کی تحریک کو فوج انداز سے چلانے سے نقصان پہنچا ہے اور بھارت اس سے فائدہ اٹھا رہا ہے۔ لیکن میں آج یہاں پر ان لوگوں کا موقف بھی آپ کو ضرور بتانا چاہوں گا جو یہ تحریک چلا رہے ہیں، ان کا یہ کہنا ہے کہ اگر ہم خاموش ہو جائیں تو صرف چند ماہ میں دنیا کشمیر کے مسئلہ کو بھول جائے گی۔ یہ ہمارا خون ہی ہے جو کشمیر کے مسئلہ کو دنیا میں زندہ رکھ رہا ہے۔ اس لیے ہم اس تحریک کو زندہ رکھنے کے لیے یہ سب کچھ کرتے رہیں گے۔

میں نے سوہن لال صاحب سے کہا سوہن جی. برا نہ منایئے گا۔

فلسطین میں یہودی اور کشمیر میں ہندو دونوں ایک ہی کام کر رہے ہیں دونوں کا ایجنڈا بھی ایک ہی کی ہے اور دونوں آپس میں گہرے دوست بھی ہے۔

ظلم کب تک چلے گا؟

معلوم نہیں لیکن کبھی تو وہ سورج بھی طلوع ہوگا جس دن کشمیر کو اپنی قسمت کا فیصلہ کرنے کا موقع ملے گا۔

یہ سب سن کر سوہن صاحب کچھ دیر کے لیے خاموش ہوئے اور کہا کہ مجھے آپ کی باتوں سے اصل حقیقت کا پتہ چلا ہے اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ میری آج کی آپ کے ساتھ نشست ایک انتہائی قیمتی تھی۔ ہمیں جو پڑھایا گیا وہ بہت ہی مختلف ہے۔ اس واقعہ کے ذمہ داروں کی فہرست میں ان لوگوں کے نام بھی آتے ہیں جنہیں ہم اپنے نیتا مانتے

ہیں اور ان کے نام کی مالا جپتے ہیں۔ ان کی یہ کوشش ہے کہ لوگوں کو حقیقت کا پتہ نہیں چلنا چاہیے۔ اگر ایسا ہو گیا تو چوکوں میں لگے ہوئے ان کے مجسمے گرا نہ دیے جائیں۔

کچھ وقفہ کے بعد میں نے پوچھا کہ بنگلہ دیش کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے ؟ اسے بنانے میں بھی بھارتی فوج اور بھارتی ریاست مکمل طور پر ذمہ دار ہے۔ اس پر سوہن لال صاحب نے کہا کہ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا لیکن ایسا کیوں ہوا؟ اس کی کئی وجوہات ہیں۔ ان وجوہات کے باوجود بھی بھارت کو یہ حق نہیں پہنچتا تھا کہ وہ ایک آزاد ملک کے معاملات میں مداخلت کرتا۔ بات اتنی سادہ بھی نہیں ہے۔ در حقیقت یہ سب ایک دیرینہ دشمنی کی بناء پر ہوا۔ آپ کو معلوم ہے کہ بھارت کے لوگ قیام پاکستان کے خلاف تھے، اس لیے وہ ہمیشہ اسی کوشش میں رہتے کہ کسی طرح وہ پاکستان کو کمزور کر سکیں۔ مشرقی پاکستان کو بنگلہ دیش بنانا بھی اسی دشمنی کی ایک شکل ہے۔

یہاں تک تو بات ٹھیک ہے لیکن آپ کو بھی سوچنا چاہیے کہ کیسے پورا ملک یک آواز ہو کر شیخ مجیب کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ آخر ایسا کیوں ہوا؟ جس مسلم لیگ نے پاکستان کے لیے جدو جہد کی اس کا قیام بھی اسی علاقے میں ہوا تھا اور اس امر میں بنگالی لوگوں نے بے پناہ قربانیاں بھی دیں۔ سوہن لال صاحب نے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا کہ جہاں تک میں نے پڑھا ہے، اس کے مطابق مغربی پاکستان کی سیاسی اور فوجی قیادت نے بنگالیوں کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔ یہ سب اس کا ردِ عمل تھا جس سے بھارت نے بھی فائدہ اٹھایا۔

انھوں نے آخری بات کہہ کر اپنی بات کو ختم کر دیا۔ انھوں نے کہا کہ آپ کو علم ہے کہ سکھوں نے اندرا گاندھی کے خلاف ایک تحریک شروع کر رکھی تھی۔ اندرا گاندھی کا قتل بھی اسی تحریک کی وجہ سے ہوا۔ اب بھی سکھ خالصتان کا نعرہ بلند کیے ہوئے ہیں اور پاکستان ان کی بھرپور مدد کر رہا ہے۔ یہ ان کا بنگلہ دیش بنانے میں بھارت کی مدد

کا جواب ہے۔ جب تک دونوں ایک دوسرے کو تسلیم نہیں کرتے، اس طرح کے معاملات چلتے رہیں گے۔

وہ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولے کہ میں نے اسلام کا بہت زیادہ مطالعہ کیا ہے۔ اور کوشش کی ہے کہ موجودہ دور کی کتابوں کی بجائے آپ کے قرآن کا ترجمہ اور تشریح پڑھوں، اس کے ساتھ ساتھ میں نے آپکے نبی ﷺ کی باتوں کو بھی دلچسپی سے پڑھا ہے۔ میں آپ کو بہت سے ایسے حوالے دے سکتا ہوں جس میں آپ کے نبی ﷺ نے یہ حکم دیا ہے کہ کسی کی عبادت گاہ کو نہ گرایا جائے، کسی کو زبردستی مسلمان نہ کیا جائے، ہر کسی کی جان اور مال کی حفاظت کی جائے اور میں نے تو یہ بھی پڑھا ہے کہ مسلمان تو وہی اچھا ہے جس کے شر سے اس کے پڑوسی محفوظ ہوں۔

میں نے کہا کہ آپ نے درست پڑھا ہے، ایسا ہی لکھا ہوا ہے۔ سوہن لال صاحب نے جواب میں کہا کہ اگر ایسا ہی ہے تو میں آپ کو یہ بھی بتا دینا چاہتا ہوں کہ ہمارے ہندو دھرم میں بھی کسی دوسرے دھرم کی حفاظت اور اس کا احترام اتنا ہی لازم ہے جتنا اپنے دھرم کا کیا جاتا ہے۔ میں نے کہا کہ آپ کی بات درست ہو سکتی ہے لیکن آپ کے لوگوں نے جس طرح سے بابری مسجد کو شہید کیا، میں یہ کیسے مان جاؤں کہ آپ کسی دوسرے کی عبات گاہ کا احترام کرتے ہیں۔

یہ سن کر سوہن لال صاحب نے کہا کہ آپ نے جس واقعہ کا حوالہ دیا ہے میں اس کی مذمت کرتا ہوں اور صرف میں نہیں بلکہ عام ہندو بھی اس واقعے کی مذمت کرتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کچھ انتہاء پسند ہندو بھی موجود ہیں جنھوں نے یہ کام کیا لیکن یہ بات بھی یاد رکھیں کہ یہ کام بھارتی حکومت نے نہیں کیا۔ اس واقعے کے بعد بھارتی حکومت نے یہ طے کیا کہ اس بات کا فیصلہ عدالت کرے گی کہ کیا اس جگہ پر کبھی مندر تھا، جسے گرا کر مسجد بنائی گئی یا نہیں۔ اگر ایسا ہوا تو یقیناً مسلمانوں نے ظلم کیا ہوگا اور

اگر ایسا نہ ہوا تو ہندوؤں کا وہ قدم ظلم پر مبنی تصوّر ہو گا۔ یاد رہے ان دنوں بابری مسجد کا مقدمہ عدالت میں تھا۔

جب 2019ء میں اس کیس کا فیصلہ ہوا تو عدالت نے فیصلہ دیا کہ بابری مسجد کو مسمار کرنا قانون کی خلاف ورزی ہے۔ مزید یہ بھی حکم جاری کیا گیا کہ اس جگہ کو ایک ہندو ٹرسٹ کے حوالے کیا جائے اور مسجد کی تعمیر کے لیے حکومت پانچ ایکڑ اراضی سنی ٹرسٹ کو دے۔ تکلیف دہ بات یہ ہے کہ جنہوں نے قانون کی خلاف ورزی کی، اُن کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی گئی۔

سوہن لال صاحب نے مجھے یہ بھی بتایا کہ پورے ہندوستان میں یہ واحد مسجد ہے جس سے متعلق پچھلی تین صدیوں سے ہندوؤں کا یہ ماننا ہے کہ یہاں پر رام مندر تھا۔ اسی سلسلے میں ہندوؤں نے 1885ء میں فیض آباد سب جج کے سامنے ایک مقدمہ بھی دائر کیا تھا۔ اس وقت مسلمانوں کا مؤقف تھا کہ پوری زمین مسجد کی ہے۔ مسلمان وہ مقدمہ ہار گئے۔ بعدازاں اس کی اپیل کی گئی۔ اگلی عدالت نے بھی اُس فیصلے کو برقرار رکھا لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ یہ بہت ہی پرانا واقعہ ہے لہٰذا اسے اسی حالت میں رہنے دیا جائے۔ اس کے باوجود ہندوؤں نے اسے حاصل کرنے کی کوشش جاری رکھی اور 1992ء میں شدت پسند ہندوؤں نے اس مسجد پر حملہ کر دیا۔ اب معاملہ عدالت میں ہے اس لیے ہمیں عدالت کے فیصلے کا انتظار کرنا ہو گا۔ یہ کہہ کر سوہن لال صاحب کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گئے۔

تھوڑی دیر خاموشی کے بعد انھوں نے کہا کہ کیا آپ کے علم میں ہے ہندوستان میں کتنے مندروں کو عام مسلمانوں نے نہیں بلکہ مسلمان حکمرانوں نے گرایا تھا؟ میں نے کہا کہ چند ایک کا تو مجھے علم ہے۔

سوہن لال صاحب نے کہا کہ تاریخ میں کم از کم ایک سو ایسے مندر ملتے ہیں جنہیں غزنوی سے لے کر اورنگزیب تک مسلمان حکمرانوں نے تہس نہس کر دیا۔ انھوں نے مجھ سے پوچھا کہ کیا آپ نے قطب مینار دیکھا ہے؟ میں نے کہا جی میں نے دیکھا ہے۔ اس کے پاس ایک پرانی مسجد بھی آپ نے دیکھی ہو گی، اس مسجد کا نام قوت الاسلام رکھا گیا تھا۔ اسے قطب الدین ایبک نے تعمیر کروایا۔ اسے شمالی ہندوستان کی سب سے پہلی مسجد ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔

سوہن لال صاحب نے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا کہ آپ نے اس کے برآمدوں میں لگے ہوئے ستون بھی دیکھے ہوں گے؟ میں نے جواب میں کہا کہ جی دیکھے ہیں۔ پھر انھوں نے کہا کہ ان پر بنے ہوئے مورتیوں کے نشان بھی آپ کی نظروں کے سامنے تو آئے ہوں گے۔ میں نے کہا جی ہاں ایسا ہی ہے۔ سوہن لال صاحب نے پوچھا کہ کیا آپ کو معلوم ہے کہ اب اس مسجد میں اب نماز پڑھنے کی اجازت نہیں ہے اور یہ بھارت کی واحد مسجد ہے جس کے بارے میں یہ حکم ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس مسجد کی تعمیر کے لیے ایک مسلمان بادشاہ نے کئی مندروں کو تباہ کیا تھا۔ میں نے کہا ایسا نہیں ہوا ہو گا۔ جواب میں انھوں نے کہا کہ اگر آپ تاریخ کو ایک طرف رکھیں تو پھر بھی اس مسجد کے ستون ہی گواہی کے لیے کافی ہیں۔ پھر میں خاموش ہو گیا۔

سوہن لال صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ کیا اس وقت کا مسلمان بادشاہ اتنا غریب تھا کہ وہ مسجد بنانے کے لیے مندروں کے ستون اٹھا کر لے آیا؟ میں نے کہا یقیناً وہ اتنا غریب تو نہیں ہو گا۔ پھر انھوں نے مجھ سے پوچھا کہ اس نے ایسا کیوں کیا؟ جس پر خود ہی جواب بھی دیا کہ مشتاق جی! یہ کام کسی عام مسلمان کا نہیں تھا اور نہ ہی کبھی کسی عام مسلمان نے کسی مندر کو نقصان پہنچایا ہے۔ اِکا دُکا واقعات کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ یہ سب کام مسلمان بادشاہوں کے تھے۔ جو اسلام کے صحیح مفہوم سے آگاہ نہ تھے۔ وہ صرف

بادشاہ اور مسلمان تھے۔ انھوں نے اپنے ہی دھرم کی خلاف ورزی کی۔ انھوں نے یہ سب مقامی لوگوں کو دبانے اور مال و متاع اکٹھا کرنے کے لیے کیا۔ یہاں ایک مثال سومناتھ کے مندر کی بھی ہے جو مال و دولت حاصل کرنے کے لیے تباہ کیا گیا۔ سوہن لال صاحب نے بات سمیٹتے ہوئے کہا کہ ان مسلمان بادشاہوں نے کئی مساجد کو بھی نقصان پہنچایا۔ جب ان مساجد کو ان کے مخالفین نے سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کیا۔

میں نے سوہن لال صاحب سے کہا کہ مسلمانوں پر یہ الزام بھی لگایا جاتا ہے کہ انھوں نے ہندوستان میں تلوار کے زور پر ہندوؤں اور دیگر مذاہب کے لوگوں کو مسلمان کیا۔ میرے خیال میں ایسا نہیں تھا لیکن پھر بھی ہندو لوگ یہی کہتے ہیں۔ ماضی قریب میں شدھی کی تحریک بھی چلائی گئی جس کا مقصد تھا کہ وہ لوگ جو ہندو مذہب سے تعلق رکھتے تھے اور مسلمان ہو گئے تھے، انھیں دوبارہ ہندو مذہب میں لایا جائے۔ آپ کا اس بارے میں کیا خیال ہے؟ ان کا جواب میرے لیے بہت ہی عجیب و غریب تھا۔

سوہن لال صاحب نے کہا کہ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہندوؤں کو زبردستی مسلمان بنایا گیا وہ ہندو دھرم کے ساتھ دشمنی کر رہے ہیں۔ وہ ہندوؤں کے دوست نہیں ہیں۔ اس لیے کہ تاریخ ہمیں بتاتی ہے، اکا دکا واقعات کے علاوہ، کہ کسی بھی جگہ پر مسلمان بادشاہوں نے یا تو ایسی کوشش ہی نہیں کی کہ ہندوؤں کو مسلمان کرے یا اگر کی بھی ہو تو ہندوؤں نے مرنا پسند کیا لیکن اپنا دھرم نہیں بدلا۔ آپ کو یاد ہوگا کہ بہت ساری جگھوں پر شکست کی صورت میں ہندو عورتوں نے اجتماعی خودکشی کی۔ یہ سب اس لیے کیا گیا کہ شکست کی صورت میں مسلمان انھیں اپنے ساتھ نہ لے جائیں اور انھیں اپنی بیویاں نہ بنالیں۔ اس طرح وہ اپنا دھرم کھو بیٹھیں گیں۔ اپنے دھرم کی حفاظت کے لیے انھوں نے اجتماعی خودکشی کو ترجیح دی۔

سوہن لال صاحب نے مجھے بتایا کہ اگر آپ تاریخ کا جائزہ لیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ دلی اور اس کے قریبی علاقوں میں دسویں صدی میں پہلی مرتبہ ایک مسلمان جنگجو غزنوی آیا تھا اور اس کے بعد سے جب تک مغلوں کی حکومت رہی اور انگریز مکمل طور پر قابض نہیں ہوئے اس علاقے پر مسلمانوں کی حکومت ہی رہی۔ یہ آٹھ سو سال کا عرصہ بنتا ہے۔ اتنے طویل عرصے کے باوجود آج بھی دلی اور اس کے قرب و جوار میں مسلمان پندرہ فیصد سے زائد نہیں ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اتنی دیر تک قائم مسلمان حکومت بھی ہندوؤں کی ایک کثیر تعداد کا دھرم نہیں بدل سکی۔ یہ جو پندرہ فیصد مسلمان ہیں ان میں سے بھی بہت سے لوگ ایسے ہیں جو پہلے سے مسلمان تھے اور ہندوستان کے باہر سے آکر یہاں آباد ہوئے۔ ان میں عرب، افغانی اور وسط ایشیاء سے آنے والے سبھی لوگ شامل ہیں۔ ان لوگوں کی تعداد بہت کم ہے جو پہلے کبھی ہندو تھے اور انھوں نے بعد میں اپنا دھرم بدلا۔ یہ لوگ مسلمان کیسے ہوئے؟ اس پر بات کرتے ہیں۔

آپ بھی اس بات سے اتفاق کرتے ہیں کہ ہندوستان کے شمال میں مسلمان حملہ آور سب سے زیادہ مرتبہ آئے۔ ان میں سے کچھ وسطی ہندوستان تک بھی پہنچے لیکن جنوبی ہندوستان میں شاید ہی ان میں سے کوئی گیا ہو مگر وہاں شمال سے بھی زیادہ مسلمان موجود ہیں۔ اس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ میرے نزدیک اس کی وجہ مسلمان بزرگوں کی تبلیغ اور ان کا مقامی لوگوں کے ساتھ حسن سلوک تھا۔ وہ لوگ ہندوستان میں صرف اسلام کی تبلیغ کے لیے آئے تھے۔ انھوں نے اپنے اخلاق اور کردار سے لوگوں کو متاثر کیا اور بے شمار خاص طور پر معاشرے میں کچلے ہوئے لوگوں نے اسلام قبول کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ کئی راجاؤں نے بھی اسلام قبول کیا۔ انھوں نے کہا کہ جنوبی ہندوستان میں آپ کے نبی ﷺ کے دور کی مسجد بھی موجود ہے۔ آج بھی ان بزرگوں کے مزاروں پر جہاں مسلمانوں کی ایک بہت بڑی تعداد منت ماننے کیے لیے جاتی ہے وہیں

ہندو اور سکھ بھی کثرت سے جاتے ہیں۔ یہ اس بات کی گواہی ہے کہ یہ لوگ مسلمانوں کے علاوہ ہندوؤں اور سکھوں کے نزدیک بھی قابل احترام ہیں۔

یہ بات بھی شاید آپ کے لیے حیران کن ہو گی کہ اکثر مسلمان بزرگوں کے مزارات پر گوشت نہیں بلکہ دال سبزی ہی پکائی جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہندو گوشت نہیں کھاتے تھے۔ اس لیے بزرگوں نے انھیں بھی اپنے قریب کرنے کے لیے لنگر خانے میں گوشت بند کیا ہوا تھا۔ سوہن لال صاحب نے پوچھا کہ لاہور میں آپ کے ہاں داتا صاحب کے مزار پر لنگر چلتا ہے، کیا اس میں گوشت ہوتا ہے؟ میں نے کہا کہ دال روٹی سے ہی سب لوگوں کی سیوا کی جاتی ہے۔ سوہن صاحب نے بتایا کہ سکھوں نے بھی یہی روایت اپنائی اور وہاں بھی گوشت نہیں پکایا جاتا۔

سوہن لال صاحب نے مزید بات کرتے ہوئے کہا کہ موجودہ بنگلہ دیش میں بھی اکثریت مسلمانوں کی ہے لیکن وہاں پر کبھی کوئی مسلمان جنگجو نہیں گیا، صرف مسلمان بزرگ یا ان کے ساتھ عرب تاجر ہی گئے اور بنگال کے بے شمار لوگوں نے اسلام قبول کیا۔ اس لیے یہ کہنا کہ ہندوستان میں رہنے والے ہندوؤں نے تلوار کے خوف سے اسلام قبول کیا، درست نہیں ہے۔ میں نے ان کی بات سے مکمل اتفاق کیا۔

اس دوران کئی دوسرے لوگ بھی ہمارے پاس آ گئے، کوئی بیٹھ گیا، کوئی کھڑا رہا۔ وہ سب مقامی تھے۔ ان میں سے ایک آدھ نے بات کرنے کی کوشش بھی کی، جس پر سوہن لال صاحب نے کہا کہ آپ خاموش رہیں۔ اب دن بھی چڑھ چکا تھا۔ وقاص صاحب اور عمر صاحب بھی تیاری کر رہے تھے کیونکہ ہماری منزل قریب آ رہی تھی۔ میں نے سوہن لال صاحب سے کہا کہ میرا آخری سوال یہ ہے کہ تقسیم ہند کے وقت جو بے گناہ مسلمانوں، ہندوؤں اور سکھوں کا قتلِ عام کیا گیا، اس کا ذمہ دار کون تھا، اس سے کس کو

فائدہ ہوا؟ میں نے مزید کہا کہ میرا خاندان بھی اس سے متاثر ہوا۔ آپ اس بارے میں کیا کہتے ہیں؟

میرا یہ سوال سن کر انھوں نے کہا کہ اگر آپ یہ سوال نہ پوچھتے تو میں آپ سے پوچھ لیتا کہ لاکھوں کی تعداد میں ہندو اور سکھ پنجاب، سندھ بلوچستان ، اور صوبہ سرحد چھوڑنے پر کیوں مجبور ہوئے؟ وہ لوگ تو وہاں پر صدیوں سے رہ رہے تھے اور ایک مطمئن زندگی گزار رہے تھے۔ وہ لوگ اقلیت میں بھی تھے اور آپ کو ان سے کوئی خوف بھی نہیں تھا۔ مسلمان تو بہت بڑی اکثریت میں تھے، اس کے باوجود آپ نے انھیں وہاں سے نکال دیا۔ وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر بھارت آنے پر کیوں مجبور ہو گئے؟ میں ان سے اس بات کی توقع نہیں کر رہا تھا لیکن ان کی بات سن کر مجھے بہت کچھ یاد آ گیا۔

مجھے یہ بھی یاد آیا کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ میں جس گھر میں میری پیدائش ہوئی وہ بھی ایک ہندو کا چھوڑا ہوا گھر تھا اور جس گھر میں ہم بڑے ہوئے وہ بھی ایک ہندو کا تھا۔ غلہ منڈی میں جتنی بھی دکانیں تھیں سوائے ایک کے وہ سب ہندوؤں کی تھیں۔ ہماری گلی میں ایک بھی گھر ایسا نہ تھا جو کسی مسلمان نے بنایا ہو جس سکول میں میں نے پہلی جماعت میں داخلہ لیا، وہ ایک بڑے سرکاری سکول کی ایک برانچ تھی جو غلہ منڈی کے پاس ایک عمارت میں قائم تھی۔ اس عمارت کو "جنج گھر" کہتے تھے۔ یہ اس دور کا شادی ہال تھا۔ اس کے نچلے حصے میں سکول اور اوپر والے حصے میں ایک مدرسہ چل رہا تھا۔ میں جس سکول میں چھٹی سے دسویں تک پڑھتا رہا ، اس کے ساتھ ایک ہاسٹل بھی تھا اور وہ سب ہندوؤں کی ہی عمارتیں تھیں۔ وہاں بے شمار گاؤں ایسے بھی تھے جہاں سکھوں کی ایک بڑی تعداد بستی تھی۔

کاروبار ہندوؤں کے پاس تھا اور سکھ زیادہ تر کھیتی باڑی کو ترجیح دیتے تھے۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ جہاں ہندوؤں اور سکھوں کی بڑی آبادی تھی، اب ایک بھی ہندو یا سکھ باقی نہیں

رہا۔ وہ سب لوگ یہاں سے کیوں گئے اور کیسے گئے؟ اس پر ہم نے کبھی بات نہیں کی۔ ہم نے جب بھی بات کی تو یہ کی کہ ہم ہندوستان کی ریاست پٹیالہ کے ایک شہر سرہند میں رہتے تھے اور بڑے خوش حال تھے، ہمیں وہاں سے کیوں نکالا گیا؟ ہمارے لوگوں کو کیوں قتل کیا گیا؟ ہماری عورتوں کو کیوں اغوا کیا گیا؟ ان میں ہمارے خاندان کی عورتیں بھی شامل تھیں، جن میں ایک میرے والد صاحب کی منکوحہ بھی تھی۔

میرے لیے سوہن لال صاحب کا سوال بالکل غیر متوقع تھا۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ پہلے میرے سوال کا جواب دیں بعد میں میں دیکھوں گا کہ میں آپ کے سوال کا جواب کیسے دیا جا سکتا ہے۔

سوہن لال صاحب نے کہا کہ غیر منقسم صوبہ پنجاب کی مجموعی آبادی تین کروڑ سے زائد تھی جس میں پینتالیس فیصد کے قریب ہندو اور سکھ رہتے تھے۔ اگر پنجاب تقسیم نہ ہوتا تو یہ تقسیم کے اصول کے مطابق پاکستان کا حصہ ہوتا کیونکہ یہ طے ہوا تھا کہ مسلم اکثریتی علاقے پاکستان میں شامل ہوں گے۔ بنگال کی بھی یہی صورتِ حال تھی۔ ان دونوں صوبوں کی اسمبلیوں نے تقسیم کے حق میں فیصلہ دیا کیونکہ سکھ اور ہندو پاکستان کے ساتھ نہیں رہنا چاہتے تھے۔ تقسیم کے بعد متحدہ پنجاب کے کچھ علاقے پاکستان کے پاس چلے گئے۔ پہلے یہ طے ہوا تھا کہ تقسیم اضلاع کی بنیاد پر ہو گی لیکن بعد میں وہ تحصیل کی سطح پر ہوئی۔ اس کی ایک مثال ضلع ہوشیار پور کی ہے، جس کی ایک تحصیل پاکستان اور باقی بھارت کا حصہ بن گئیں۔ اگر تقسیم صوبے کی بنیاد پر ہوتی تو نقل مکانی کا کوئی اندیشہ نہیں تھا۔ اگر یہ ضلع کی بنیاد پر ہوتی تب بھی نقل مکانی کم ہوتی۔ پاکستان کی قیادت چاہتی تھی کہ پنجاب تقسیم نہ ہو لیکن یہ سب ہندوؤں اور سکھوں کی وجہ سے ہوا۔ ایسا کیوں کیا گیا؟ مجھے اس کی اصل وجہ تو معلوم نہیں لیکن اس تقسیم کے نتیجے

میں جو قتل و غارت ہوئی اس کی ذمہ دار صرف اور صرف اس وقت کی ہندو اور سکھ قیادت ہے۔

تقسیمِ ہند کے دوران ایک اندازے کے مطابق دس سے بیس لاکھ انسانی جانیں ضائع ہوئیں جبکہ دو کروڑ کے قریب لوگوں کو نکل مکانی کرنا پڑی۔ صحیح تعداد کا اندازہ تو کسی کو نہیں ہے، البتہ مختلف لوگوں نے مختلف تعداد لکھی ہے لیکن زیادہ تر نے یہی تعداد بتائی ہے۔ میں اسے نقل مکانی نہیں بلکہ نسلی صفائی کا نام دوں گا۔ جس کے نتیجے میں مغربی پنجاب میں ہندوؤں اور سکھوں کا صفایا ہوا اور مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کی موجودگی کے سارے نشانات مٹا دیے گئے۔ آپ یہ سب موجودہ آبادی کے اعداد و شمار سے بھی جان سکتے ہیں۔ سوہن لال صاحب نے پوچھا کہ آپ یہ بتائیں کہ اس وقت لاہور میں کتنے ہندو اور سکھ آباد ہیں۔ یقیناً بہت ہی کم، نہ ہونے کے برابر۔ یہی حال مشرقی پنجاب کا ہے جہاں کبھی مسلمان بیس فیصد رہتے تھے آج دو فیصد سے بھی کم ہیں۔

سوہن لال صاحب نے مزید کہا کہ تقسیم ہند کی تو وجہ سمجھ آتی ہے مگر تقسیم پنجاب کی کوئی وجہ نہ تھی۔ اس کی اصل وجہ صرف وہی تھی کہ پنجابی ہندو، مسلمان اور سکھ اپنے صوبے کو متحد رکھنے پر راضی نہ ہوسکے۔ پنجاب میں ہونے والے تشدد کی وجہ سوائے اس کے کچھ نہ تھی کہ لوگوں کو اپنی حکمرانی قائم کرنے کے لیے اپنے ہم مذہب لوگوں کی اکثریت درکار تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ غیر یقینی صورتِ حال، سیاسی رہنماؤں کے مابین بات چیت کا نہ ہونا اور انگریزوں کے جانے کے بعد پیدا ہونے والے بڑے خلا کا نتیجہ یہ ہوا کہ برصغیر پاک و ہند کی تاریخ کا سب سے بڑا انسانی المیہ رونما ہوا۔ نقل مکانی کے دوران مغربی پنجاب اور صوبہ سرحد میں بڑے پیمانے پر ہندوؤں اور سکھوں کا قتلِ عام ہوا جبکہ مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کا بے دریغ قتل کیا گیا۔ مجموعی طور پر مسلمان زیادہ تعداد میں قتل ہوئے۔ سندھ سے ہندوؤں کی نقل مکانی میں زیادہ

فسادات نہ ہوئے۔ اسی طرح جنوبی ہندوستان سے جانے والے مسلمان بھی بغیر کسی بڑے نقصان کے پاکستان پہنچ گئے۔

آخر میں سوہن لال صاحب نے کہا کہ ظلم تو دونوں طرف ہی ہوا تھا۔ یہ سب عدم اعتماد، بے یقینی کی کیفیت اور ان لوگوں کی نیتوں کا نتیجہ تھا جو ہم پر حکمرانی کرنا چاہتے تھے۔ ان کے خیال میں وہ اپنے ہم مذہب لوگوں پر باآسانی حکومت کر سکتے تھے۔

اب ہم دلی کے پاس پہنچ رہے تھے اور سب لوگ اپنا سامان سمیٹ رہے تھے۔ مجھے بھی اپنا بیگ سنبھالنا تھا۔ باتیں تو اور بھی بہت سی تھیں لیکن گفتگو کو کبھی تو ختم کرنا ہوتا ہے۔ آخر میں سوہن لال صاحب نے ایک ایسی بات کہی جس پر میں نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا۔

پاکستان کی تحریکِ آزادی میں ہندوؤں، سکھوں اور مسلمانوں کے تین بڑے رہنماؤں کے نام آتے ہیں۔ ہندو رہنما مہاتما گاندھی، مسلمانوں کے رہنما محمد علی جناح اور سکھوں کے رہنما ماسٹر تارا سنگھ۔ یہ حقیقت ہے کہ تینوں ہم عمر تھے۔ قائدِاعظم 1876ء میں پیدا ہوئے، مہاتما گاندھی 1869ء میں پیدا ہوئے، ماسٹر تارا سنگھ 1885ء میں گوجر خان، راولپنڈی میں پیدا ہوئے۔ قائدِ اعظم کے والد ایک کاروباری آدمی تھے اور وہ خود ایک وکیل تھے۔ مہاتما گاندھی کے والد جوناگڑھ میں دیوان تھے اور وہ بھی ایک وکیل تھے۔ ماسٹر تارا سنگھ کھتری خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور وہ سکھوں کے سکول میں ٹیچر تھے۔

سوہن لال صاحب نے کہا کہ میں ان تینوں کے درمیان ایک قدر مشترک دیکھتا ہوں کہ تینوں نے ہی اپنی اپنی قوم سے بے حد وفاداری نبھائی، اور اپنی قوم کے لیے زیادہ سے زیادہ فائدے سمیٹنے کی کوشش کی لیکن وہ تینوں اپنی قوم کے علاوہ دوسری اقوام کا خیال رکھنے میں ناکام ثابت ہوئے۔ انھوں نے ہندوستان کے مجموعی مفاد کو پسِ پشت

ڈالا۔ اگر تقسیمِ ہند نہ ہوتی تو آج ہندوستان ایک سپر پاور ہوتا جس کی آبادی دنیا کا بیس فیصد ہے۔ وہ چاہتے تو تقسیم کی بجائے فیڈریشن کے کسی فارمولے پر متفق ہو سکتے تھے۔ اس کی ایک مثال امریکہ کی صورت میں اس وقت بھی ان کے سامنے تھی لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا۔ تقسیمِ ہند دراصل مستقبل کی ایک سپر پاور کی تقسیم تھی۔

میری معلومات کے مطابق جناح صاحب فیڈریشن کے کسی بھی فارمولے کے حق میں بھی تھے لیکن ہندوؤں اور سکھوں کی ہٹ دھرمی نے ان کی ایک نہ چلنے دی۔ تقسیم کے وقت بھی عقلمندی سے کام لیا جاتا تو لاکھوں جانوں کا قتلِ عام ہونے سے بچایا جا سکتا تھا۔ میں ان تینوں کو ان سب معاملات کا قصور وار سمجھتا ہوں۔

ذمہ دار وہی ہوتا جو اس وقت فیصلے کرتا ہے۔ تینوں ہی فیصلے کرتے تھے لٰہذا تینوں ہی ذمہ دار ہیں۔ اس سے پہلے کہ میں کوئی تفصیلی جواب دیتا، میں نے صرف اتنا کہا کہ سوہن صاحب وقت بہت بیت چکا ہے۔ اور اب ان سے متعلق کچھ کہنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ اب ہمیں آگے کا سوچنا چاہیے تاکہ مزید نقصان سے بچا جا سکے۔

میں نے ان سے ایک اور سوال پوچھا جو بھارت میں مسلسل مسلم کش فسادات کے بارے میں تھا۔ جن میں زیادہ نقصان مسلمانوں کا ہی ہوتا ہے۔ میں نے کہا کہ کیا مسلم کش فسادات آپ کے بیان کردہ تمام تر فلسفے جس کے مطابق متحدہ ہندوستان ہی بہتر تھا کی نفی نہیں کرتے؟

اس کے جواب میں انھوں نے کہا کہ میں اس بات سے انکار نہیں کرتا کہ بھارت کے مختلف شہروں خاص طور پر شمالی علاقہ جات میں ہندو مسلم فسادات ہوتے رہے ہیں لیکن یاد رکھیں کہ ان فسادات کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ یہ تقسیم ہند سے پہلے بھی ہوتے تھے۔ اگر آپ تاریخ پڑھیں تو آپ کو بنوں اور کوہاٹ میں ہونے والے

فسادات کا ذکر بھی ملے گا۔ تقسیم کا فیصلہ ہونے کے بعد بھی آپ کو بڑے پیمانے پر فسادات کی خبریں پڑھنے کو ملیں گیں۔

میں آپ کو یہ بھی یاد دلاتا چلوں کہ آپ کے پاکستان میں بھی مذہبی بنیادوں پر کئی فسادات ہوئے ہیں جنہیں آپ سنی شیعہ جھگڑا کہتے ہیں۔ اس کے علاوہ پاکستان کے شہر کراچی میں سندھی، مہاجر، پٹھان اور پنجابی لوگوں کے درمیان بھی فسادات ہوتے ہیں۔ ان تمام تر فسادات میں سے کسی کی پشت پر بھی ریاست نہیں ہوتی بلکہ ریاست ایسے فسادات کو روکتی ہے کیونکہ یہ فسادات ریاست کو کمزور کرتے ہیں۔

اسی طرح بھارت میں بھی فسادات ہوتے ہیں۔ میں آپ کے سامنے ایک بہت بڑے المیے کا ذکر کرنا چاہتا ہوں، آپ کے علم میں ہے اندرا گاندھی کا قتل سکھوں کے ہاتھوں ہوا اور اس کے بعد اسی دن شہر میں موجود سکھوں کو قتل کرنا شروع کر دیا گیا۔ وہ سب کے سب بے گناہ تھے۔ کوئی ٹیکسی چلا رہا تھا، کوئی مزدوری کر رہا تھا۔ وہ اپنی شکل و صورت سے پہچانے جاتے تھے اور انھیں اسی بناء پر قتل کر دیا جاتا تھا۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ سکھوں نے ہر موقع پر ہندوؤں کا ساتھ دیا۔ سکھوں کا سربراہ بھی ایک ہندو خاندان میں پیدا ہوا تھا۔ ایک مدت تک ہندو انھیں اپنا ہی ایک فرقہ مانتے تھے۔آپ کو اب بھی بہت سے مندروں میں جہاں ہندوؤں کے بڑوں کی تصاویر ملتی ہیں وہیں بابا گرونانک کی تصاویر بھی ملتی ہیں لیکن اس کے باوجود بھی سکھوں کو قتل کر دیا گیا کیونکہ ایک سکھ نے سرکاری وردی میں سرکاری بندوق کے ساتھ اندرا گاندھی کو قتل کیا تھا۔ اس کے بعد پنجاب میں ہندوؤں کا رہنا مشکل ہوگیا اور پنجاب کے سکھوں نے انھیں قتل کرنا شروع کر دیا۔ بڑے پیمانے پر ہندو، سکھ فسادات ہوئے۔

اسی طرح سے ہندو مسلم فسادات بھی کسی واقعے کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ یہ بھارتی حکومت کی پالیسی نہیں ہے۔اس بات میں کوئی دو رائے نہیں کہ عام آدمی بھی ایسے

فسادات کو پسند نہیں کرتا۔ تقسیمِ ہند کے وقت ہونے والے فسادات میں بھی ایسے افراد ملوث تھے جو معاشرے کے ناپسندیدہ لوگوں میں شمار ہوتے تھے اور وہ مالی مفادات کے لیے ایسا کرتے تھے۔ ایسے ہی لوگ پاکستان میں بھی ہوں گے جنہوں نے یہ کام کیے اور ویسے ہی بھارت میں بھی تھے۔

میں نے ان سے ایک اور سوال پوچھا کہ میں نے کہیں پڑھا ہے کہ آپ کے غریب لوگوں میں پچاس فیصد سے زیادہ تعداد مسلمانوں کی ہے، اس کی کیا وجہ ہے کہ مسلمانوں کی کثیر تعداد غربت کا شکار ہے؟ جواب میں انھوں نے کہا کہ اس کا جواب تو وہی دے سکتے ہیں۔ جہاں تک تعلیمی معاملات یا سرکاری نوکری کا تعلق ہے اس میں کہیں بھی مذہب کی بنیاد پر، مسلم اور غیر مسلم میں کوئی تمیز نہیں ہے۔ یہ سب کے لیے ایک سے مواقع ہیں۔ یہ تو یہاں کی مسلم قیادت کو سوچنا چاہیے کہ کس طریقے سے مسلمانوں کو تعلیم کے میدان میں آگے لایا جائے تاکہ وہ بھی معاشی میدان میں آگے بڑھ سکیں لیکن آپ کی بات بالکل حقیقت ہے کہ مسلمان معاشی اعتبار سے کافی پیچھے ہیں۔

اٹھنے سے پہلے میں نے ان سے یہ بھی پوچھا کہ ذات پات کے نظام پر بھی بے حد سوالات اٹھائے جاتے ہیں اور اسے ناپسند بھی کیا جاتا ہے؟ اس کے جواب میں انھوں نے بتایا کہ یہ بات درست ہے کہ ہندو دھرم میں ذات پات کا نظام موجود ہے لیکن اب یہ ختم ہوتا جا رہا ہے۔ اب نچلی ذاتوں کے لوگ بھی بڑے کاموں میں آگے آ رہے ہیں۔ آپ نے دیکھا ہے کہ ہمارے ملک کی صدارتی کرسی پر بھی ایسے لوگ آئے ہیں جو چھوٹی ذات تو کجا ہندو بھی نہیں تھے۔

کسی زمانے میں مسلمان اور ہندو پانی کی آوازیں سنائی دیتی تھی۔ ایسا نہیں ہے۔ ہندو اور مسلمان مل جل کر ہی رہتے ہیں۔ دفاتر میں اکٹھے کام بھی کرتے ہیں ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کھانا بھی کھاتے ہیں۔ اب لوگ اس بات کو ناپسند کرتے ہیں

لیکن میں اس بات کا اعتراف کرتا ہوں کہ ذات پات کی یہ تقسیم ہمارے ہاں اب بھی کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے۔

میں نے ان سے یہ بھی پوچھا کہ بھارت کے مختلف علاقوں میں جو آزادی کی تحریکیں چل رہی ہیں ان کی کیا وجہ ہے؟ سنا ہے کہ بیس سے زیادہ مقامات پر یہ تحریکیں چل رہی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ آپ کی بات درست ہے۔ بھارت سے علیحدہ ہونے کی تحریکیں چل رہی ہیں لیکن ان تحریکوں کا کامیاب ہونا ناممکن ہے۔ دوسرا، انھیں کسی نہ کسی غیر ملکی طاقت کی پشت پناہی بھی حاصل ہوتی ہے۔

آپ کے ہاں بھی تو پختونستان، آزاد بلوچستان اور سندھو دیش کی تحریکیں وقت کے ساتھ ساتھ دم توڑ گئیں اور کوئی بھی کامیاب نہ ہو سکی۔ ہاں بہت ساری تحریکیں جو زبان کی بنیاد پر چلیں تاکہ ان کو ایک علیحدہ اسٹیٹ کا درجہ ملے وہ کامیاب بھی ہوئیں۔ میں نے کہا کہ آپ نے پنجاب کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے جس سے مجھے یوں لگتا ہے کہ آپ نے ہندوؤں اور سکھوں کے علاقوں کو مذہب کی بنیاد پر تقسیم کیا ہے، تو کیا میں اسے آپ کی تقسیم ہند کی مخالفت کی بنیاد کے خلاف نہ سمجھوں؟ وہ جواب میں خاموش رہے اور خدا حافظ کہنے کے لیے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا اور ہم ریل سے اترنے کی تیاری کرنے لگے اور میں اپنا بیگ اٹھانے کے لیے اپنی سیٹ کی طرف چل پڑا۔ دس دن کا ایک لمبا سفر طے کرنے کے بعد ہم دلی پہنچ گئے تھے۔

جب ہم نے اپنی گفتگو ختم کی تو ہمارے ساتھیوں نے بتایا کہ ہماری منزل بستی نظام الدین قریب ہی ہے اور یہ آپ اپنی گفتگو ختم کریں کرے اور سامان سمیٹیں اور اپنے سفر کا اختتام کریں۔

یہ تھا ہمارا سفر جو ہم نے لے دہلی سے شروع کیا تھا اور آدھے بھارت چکر کاٹ کر واپس دہلی آ گئے تھے۔

میں نے دہلی میں بہت سے لوگوں سے اس بات کا ذکر کیا کہ ہم نے 4959 کلومیٹر طویل سفر کیا ہے۔ اکثر نے کہا کہ یہ وہ علاقے ہیں جو ہم نے بھی ابھی تک نہیں دیکھے۔ آپ خوش قسمت ہیں کہ آپ نے شمالی، مشرقی، جنوبی، اور وسطی بھارت کو جی بھر کر دیکھا ہے۔

میری اب بھی یہ خواہش ہے کہ موقع ملے تو میں بھارت کا مشرقی اور جنوبی حصہ یعنی بنگال، بہار، اڑیسہ وغیرہ ضرور دیکھنے جاؤں۔

مولانا ابوالکلام آزاد: ایک دور اندیش مسلمان رہنما

ہم فروری 1999ء کے اوائل میں بھارت میں تھے۔ پچیس دسمبر کو قائد اعظم کی برسی کے حوالے سے پاکستان میں کئی ٹی وی پروگرام کیے جاتے ہیں، انھی دنوں بھارتی ٹی وی پر بھی قائد کے بارے میں بے شمار پروگرام دیکھنے کو ملے۔ اپنے قیام کے دوران میں نے بھارتی ٹی وی پر کئی ایسے مذاکرے سنے جو پاکستان کے بانی جناب قائد اعظم محمد علی جناح سے متعلق تھے۔ مختلف لوگ جس موضوع پر زیادہ گفتگو کر رہے تھے، وہ دو قومی نظریہ تھا۔ قائد کی ذات کے بارے میں کوئی بات بھی زیرِ بحث نہیں تھی۔ ایک پروگرام میں مولانا ابوالکلام آزاد صاحب کے بارے میں ایک صاحب نے بات کرتے ہوئے کہا کہ آزاد صاحب تقسیم ہند کے مخالف تھے۔ ان کی اس رائے کے پیچھے ہندوؤں سے زیادہ مسلمانوں کی خیر خواہی شامل تھی۔ اس کے علاوہ ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ پاکستان کا قیام نہرو کی بے جا ضد کا نتیجہ ہے۔ میں اس سلسلے میں بات کرنے کے لیے کسی ایسے شخص کی تلاش میں تھا جن سے اس بارے میں مزید جان سکوں۔

میں نے بیرا جی کے ایک کزن کنیا لال سے رابطہ کیا۔ ان سے پہلے بھی میری ملاقات ہو چکی تھی۔ ان سے ملاقات کا ذکر میں نے بھارت کے سفر نامے کے پہلے حصے میں تفصیل سے کیا ہے۔ وہ سیاسی معاملات پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ ہمارے پاس ایک دن

باقی بچا تھا، لہٰذا مجھے اک بار پھر ان کے دفتر جا کر بات کرنے کا موقع مل گیا۔ ان سے کافی تفصیل سے بات چیت ہوئی۔ اس گفتگو کا خلاصہ پیش خدمت ہے۔ اس سے پہلے کہ کنیا لال صاحب سے کی گئی گفتگو کا خلاصہ پیش کروں میں مولانا ابوالکلام آزاد کا ایک مختصر تعارف آپ کی خدمت میں پیش کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

مولانا ابوالکلام آزاد کا اصل نام سید محی الدین احمد تھا۔ لوگوں نے ان کی علمی صلاحیتوں کی وجہ سے انھیں ابوالکلام کا خطاب دیا تھا۔ ان کے والد محمد خیر الدین 1857ء کی جنگ آزادی کے دوران مکہ چلے گئے تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے والد افغان نسل کے بنگالی سیّد عالم تھے۔ مولانا 1888ء میں مکہ معظّمہ میں پیدا ہوئے۔ والدہ کا تعلق مدینہ سے تھا۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم والد سے حاصل کی۔ پھر جامعہ اظہر، مصر چلے گئے۔ ایک پورا زمانہ مولانا ابوالکلام آزاد کی علمی حیثیت کا معترف ہے۔ جس کی تفصیل یہاں مناسب نہیں ہے۔ ان کے بارے میں یہ بات سو فیصد درست ہے کہ وہ واقعی ابوالکلام تھے۔ اردو ادب میں ان کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔

کنیا لال سے میرا پہلا سوال یہ تھا کہ تقسیم ہند پر مولانا ابوالکلام آزاد کیا موقف کیا تھا؟ اس پر انھوں نے بتایا کہ ان کے علم کے مطابق مولانا ابوالکلام آزاد کے بارے میں پاکستانی لوگوں کا علم بہت ہی کم ہے۔ آپ کی درسی کتب میں انھیں قیامِ پاکستان کے مخالف کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ کنیا لال نے کہا کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ مولانا ابوالکلام آزاد ایک پائے کے عالم تھے لیکن میرے نزدیک ان کی اصل پہچان ایک سیاسی رہنما کی ہے۔ ان کی سیاسی بصیرت کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوگا کہ انھیں پینتیس سال کی عمر میں ہندوستان کی سب سے بڑی سیاسی جماعت جس میں ہندوؤں کی اکثریت تھی نے ایک

سے زائد بار اپنا صدر منتخب کیا۔ اب تک کی تاریخ کے مطابق وہ کانگریس کے سب سے کم عمر ترین صدر مانے جاتے ہیں۔

میں نے کنیا لال سے پوچھا کہ آپ مولانا ابوالکلام آزاد کے تقسیم ہند کے موقف کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟ انھوں نے بتایا کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ کانگرس کے جس اجلاس میں تقسیم قبول کرنے کی قرارداد پیش کی گئی تھی وہ اس میں موجود تھے لیکن وہ تقسیم کے حق میں کبھی بھی نہیں تھے۔ انھوں نے جواہر لال نہرو کو متنبہ بھی کیا تھا کہ تقسیم ہند پورے خطے کے لیے نقصان دہ ثابت ہوگی۔ پاکستان اور ہندوستان کبھی بھی ایک دوسرے کو دل سے تسلیم نہیں کریں گے اور ہمیشہ ایک جنگ کی سی کیفیت برقرار رہے گی۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی نظر میں صوبوں کی آزادی مسئلے کا ایک بہترین حل موجود تھا لیکن پنڈت نہرو ایک کمزور مرکز کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ اس لیے انھوں نے شعوری طور پر تقسیم کے عمل میں ایک اہم کردار ادا کیا۔ وہ اسے ہر صورت روکنا چاہتے تھے لیکن روک نہ سکے۔

کنیا لال نے بتایا کہ مولانا آزاد نے رام گڑھ کے اجلاس میں کانگریس کے سب سے کم عمر صدر کی حیثیت سے اپنے صدارتی خطاب میں کہا تھا کہ میں کسی صورت اس وقت تک ہندوستان کی آزادی قبول نہیں کروں گا جب تک ہندو اور مسلمان متحد نہ ہوں۔ ان کا یہ فقرہ بھی بے حد مشہور ہوا کہ اگر ہندوستان کو آزادی نہ ملی تو یہ ہندوستان کا نقصان ہوگا لیکن اگر ہندو اور مسلمان متحد نہیں ہوئے تو پوری انسانیت کا نقصان ہوگا۔

میں نے کنیا لال سے پوچھا کہ اس سے تو ظاہر ہوتا ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد ایک بہت بڑے قوم پرست ہندوستانی سیاسی رہنما تھے۔ کیا میرا یہ خیال درست ہے؟ اس پر انھوں نے جواب دیا کہ بالکل یہ بات سو فیصد درست ہے۔ اگر آپ مولانا ابوالکلام آزاد کی ابتدائی زندگی کا جائزہ لیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اپنی وہ طبیعت کی بناء پر ایک آزاد

ہندوستان کے لیے تو ہمیشہ کوشش کرتے رہے ہیں لیکن کبھی بھی دو قومی نظریے کی بنیاد پر تقسیم ہند کی بات نہیں کی۔

میں نے کنیا لال سے یہ بھی پوچھا کہ سنا ہے مولانا ابوالکلام آزاد کا یہ کہنا تھا کہ تقسیم ہند مسلمانوں کو ہندوستان میں کمزور کر دے گی اور جہاں وہ صدیوں سے ایک حکمران کی حیثیت سے رہے ہیں اور اپنی ایک منفرد ثقافت رکھتے ہیں، کھو بیٹھیں گے۔ کیا یہ بات درست ہے؟ گر درست ہے تو کیا ایسا ہی ہوا؟

میرے سوال کے جواب میں انھوں نے بتایا کہ اس کے لیے آپ کو اس وقت کے سیاسی حالات کا جائزہ لینا ہوگا۔

کنیا لال نے مزید بتایا کہ 1941ء کی مردم شماری کے مطابق ہندوستان کی کل آبادی 38 کروڑ تھی۔ جن میں تیس کروڑ برٹش انڈیا (وہ علاقے جو انگریزوں کے براہِ راست کنٹرول میں تھے) کی جبکہ آٹھ کروڑ سے زائد ہندوستان میں موجود ریاستوں کی تھی۔ مسلمان برٹش انڈیا کی آبادی کا ستائیس فیصد تھے اور ان کی آبادی آٹھ کروڑ کے قریب تھی جبکہ ریاستوں میں مسلمان آبادی کا چوبیس فیصد تھے اور ان کی آابادی تقریبا سوا کروڑ تھی۔ پانچ صوبے ایسے تھے جہاں مسلمان اکثریت میں تھے۔ ان میں شامل سرحدی صوبہ (موجودہ کے پی کے) نوے فیصد کے ساتھ سرِ فہرست تھا۔ اسکے بعد بلوچستان کا نمبر آتا تھا جہاں مسلمان ستاسی فیصد تھے۔ سندھ میں ستر جبکہ متحدہ پنجاب میں ستاون فیصد اور سب سے کم متحدہ بنگال میں، چون فیصد تھے۔

جناح صاحب کا یہ مطالبہ تھا کہ ان پانچ صوبوں کو ملا کر ایک الگ آزاد ملک پاکستان بنایا جائے جبکہ مولانا ابوالکلام آزاد کا یہ کہنا تھا کہ اگر یہ مسلمان اکثریت والے علاقے الگ ہو گئے تو بھارت میں شامل علاقوں میں مسلمانوں کی تعداد ساڑھے تین کروڑ ہو گی اور پاکستان میں مسلمانوں کی تعداد چھ کروڑ ہو گی۔ ایسی تقسیم کے بعد بھارت

کی کل آبادی انتیس کروڑ ہو جائے گی جس میں مسلمان صرف ساڑھے تین کروڑ ہوں گے اور اس طرح وہ کل آبادی کا صرف پندرہ فیصد ہوں گے اور وہ بھی بکھرے ہوئے۔ ایسی صورت میں مسلمان اقلیت میں چلے جائیں گے۔ تقسیم نہ ہونے کی صورت میں وہ ہندوستان کی کل آبادی کا تیس فیصد حصہ ہوں گے اور ایسی صورت میں وہ کم تو ضرور ہوں گے لیکن اقلیت نہیں ہوں گے۔ کسی بھی مسئلے میں ان کی بات کو رد کرنا آسان نہ ہوگا۔ (اس وقت بھی پوری دنیا میں بسنے والے مسلمانوں کی کل آبادی کا تیس فیصد ہندوستان میں رہتا تھا)۔ اس کے ساتھ ساتھ ہندوستان میں مسلمانوں کے بے شمار مدارس بھی تھے۔ ایک لحاظ سے ہندوستان اسلام کا علمی مرکز بھی تھا۔ یہ 1999ء کی بات ہے، اس وقت بھارت کی آبادی ایک ارب چار کروڑ، پاکستان کی آبادی چودہ کروڑ اور بنگلہ دیش کی آبادی تیرا کروڑ تھی۔ ان تینوں ممالک میں مسلمانوں کی تعداد اکتالیس کروڑ تھی۔ سن دو ہزار میں دنیا میں مسلمانوں کی تعداد سوا ارب سے زائد تھی۔ ان تین ممالک میں بسنے والے اکتالیس کروڑ مسلمان کل مسلمان آبادی کے تیس فیصد سے بھی زائد تھے، یعنی ہر تیسرا مسلمان برِ صغیر میں رہتا ہے۔

کنیالال نے مزید بتایا کہ مولانا ابوالکلام آزاد کا یہ بھی کہنا تھا کہ تقریباً ایک ہزار سالہ دور میں مسلمانوں نے بھارت مسلم ثقافت اور تہذیب کے کئی اہم مراکز بھی تعمیر کیے ہیں اور اقلیت میں ہونے کی وجہ سے مسلمان ان کا تحفظ کرنے میں ناکام رہیں گے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ ایسا ہونے سے صدیوں سے حکمرانی اور برتری کے احساس کے ساتھ زندہ رہنے والے لوگ ایک کمزور طبقے میں تبدل ہو جائیں گے اور یہ بات ان کی معاشی اور معاشرتی ترقی میں بہت بڑی رکاوٹ ثابت ہوگی اور وہ نفسیاتی طور پر ایک کمزور گروہ کی شکل اختیار کرلیں گے۔ اس کے بر عکس مسلمان اکثریت والے صوبوں میں (جو بعد میں پاکستان کا حصہ بنے) ہندوؤں اور سکھوں کی تعداد سوائے بنگال اور پنجاب کے ،کافی کم ہوگی۔ اس لیے اگر تقسیم نہیں بھی ہوتی تب بھی ان میں جہاں مسلمان اکثریت

میں ہیں وہاں مسلمان ہی اکثریت میں ہوں گے اور جمہوری طرز حکومت میں بھی ان ہی کی حکومت ہو گی۔

میں نے پوچھا کہ تقسیم سے پہلے 1937ء میں ہندوستان میں جو الیکشن ہوئے تھے۔ ان میں کانگرس کو واضح اکثریت ملی اور اس طرح تین صوبوں کے علاوہ آٹھ صوبوں میں ہندوؤں کی حکومت قائم ہوئی۔ اس دوران ہندوؤں کے رویے کی وجہ سے مسلمان یہ سوچنے پر مجبور ہوئے کہ ہندو اپنی اکثریت کے بل بوتے پر انھیں ان کا حق نہیں دیں گے، اس لیے مسلمانوں کیلیے ایک الگ ملک ہونا چاہیے۔ اس پر آپ کیا کہتے ہیں؟ اس کے جواب میں انھوں نے جو کہا اس کا خلاصہ پیش خدمت ہے۔

کنہیا لال صاحب نے بتایا کہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935ء کے تحت الیکشن لازمی قرار دیے گئے تھے۔ اس وقت ہندوستان میں گیارہ صوبے تھے اور انتخابی نقطہ نظر سے ہندوستان کو تین مختلف حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ پہلا حصہ موجودہ پاکستان اور افغانستان کے درمیان قبائلی علاقوں پر مشتمل تھا جہاں الیکشن نہیں کروائے گئے ۔ دوسرے علاقے وہ تھے جہاں ریاستیں قائم تھیں اور وہاں پر بھی الیکشن نہیں ہوئے۔ تیسرا بڑا حصہ برٹش انڈیا کے علاقوں پر مشتمل تھا، جہاں الیکشن کروائے گئے۔ الیکشن کے نتیجے میں پنجاب میں یونینسٹ پارٹی کامیاب ہوئی، سندھ میں یونائیٹڈ پارٹی نے الیکشن جیتا، صوبہ سرحد میں کانگرس نے حکومت بنائی اور بنگال میں ایک مخلوط حکومت بنی۔ باقی آٹھ صوبوں میں کانگرس کی اکثریت تھی اور انھوں نے اپنی حکومتیں بنائیں - جس کی تفصیل کچھ یوں ہے۔

انتخابات کے حتمی نتائج کا اعلان فروری 1937ء میں کیا گیا۔ الیکشن کے نتیجے میں کل 1585 سیٹوں میں کانگرس کی 707، مسلم لیگ کی 109 اور یونینسٹ پارٹی کی 101 سیٹیں تھیں۔ باقی یا تو آزاد حیثیت میں الیکشن جیتے تھے یا کسی علاقائی جماعت

کے رکن تھے۔ پنجاب میں مسلم لیگ کی صرف ایک سیٹ تھی۔ کامیاب دو افراد ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک صاحب نے مسلم لیگ چھوڑ کر حکومتی پارٹی میں شمولیت اختیار کر لی تھی۔ سندھ اور صوبہ سرحد میں مسلم لیگ کی کوئی سیٹ نہیں تھی۔ البتہ بنگال میں مسلم لیگ کی 37 سیٹیں تھیں۔ اس کے علاوہ مسلم لیگ نے زیادہ تر سیٹیں ان علاقوں سے حاصل کیں جو مسلم اکثریت کے علاقے نہیں تھے، جیسا موجودہ اتر پردیش کے علاقے ہیں جس کا صدر مقام لکھنئو تھا سے 26 سیٹیں، ممبئی سے 18 اور مدارس سے نو سیٹیں۔

پنجاب میں سکندر حیات خان کی سربراہی میں یونینسٹ پارٹی نے حکومت بنائی۔ اس حکومت کو خالصہ نیشنل بورڈ اور ہندو الیکشن بورڈ کی حمایت بھی حاصل تھی۔ سکندر حیات خان نے اپنی وفات تک اس مخلوط حکومت کی قیادت کی۔ ان کی وفات کے بعد ان کی جگہ ملک خضر حیات ٹوانہ نے لی جو تقسیم ہند کے وقت متحدہ پنجاب کے وزیرِ اعلیٰ تھے۔

سندھ قانون ساز اسمبلی کے ارکان کی تعداد 60 تھی۔ سندھ یونائیٹڈ پارٹی نے 22 نشستوں پر کامیابی حاصل کی جبکہ کانگریس نے آٹھ نشستیں حاصل کیں۔ اگرچہ 34 نشستیں مسلمانوں کیلیے مخصوص تھیں، لیکن مسلم لیگ ان میں سے کسی بھی سیٹ پر کامیاب نہ ہوئی۔ یونائیٹڈ پارٹی کے سینئر رہنما اللہ بخش سومرو سندھ کے وزیرِ اعلیٰ بنے۔

صوبہ سرحد میں کانگرس کی 19 سیٹیں تھیں، سکھ ہندو اتحاد کی سات جبکہ باقی 24 لوگ آزاد تھے۔ اپریل 1937ء میں عبد القیوم خاں وزیرِ اعلیٰ بنے لیکن چند ماہ بعد عبد الجبار خان (ڈاکٹر خان) کو وزیرِ اعلیٰ بنایا گیا جو عبد الغفار خان کے بھائی تھے۔ کانگریس کی اس کامیابی میں غفار خان صاحب کا بڑا اہم کردار تھا۔ اسی لیے انھیں سرحدی گاندھی بھی کہا جاتا ہے۔

بنگال میں کانگرس سب سے بڑی پارٹی تھی، اس کی 54 سیٹیں تھیں۔ اس کے باوجود وہ حکومت بنانے میں ناکام رہی۔ اے کے فضل الحق، کرشک پرجا پارٹی اور مسلم لیگ کی حمایت سے مخلوط حکومت تشکیل دینے میں کامیاب ہو گئے۔ بلوچستان میں زیادہ تر ریاستی علاقوں کی وجہ سے الیکشن نہ ہو سکے۔

کنیالال نے یہ سب بتانے کے بعد کہا کہ ان کے خیال میں اس الیکشن میں مسلم لیگ کی کارکردگی نے انھیں اپنی پالیسی بدلنے پر مجبور کر دیا۔ اس کے ساتھ ساتھ مرکز میں بھی کانگریس کی اجارہ داری قائم ہو چکی تھی۔ اس دوران کانگریس کے وزراء کی جانبداری کی شکایتیں بھی سننے کو ملیں۔ ان سب نے مل کر مسلمانوں میں عدم تحفظ کے احساس کو پہلے سے کہیں زیادہ بڑھا دیا۔ میرے خیال میں الیکشن، پاکستان بننے کی وجہ ثابت ہوئے۔ یہ کہہ کر کنیالال نے بات ختم کرنے کی کوشش کی لیکن میں ابھی مزید کچھ بھی پوچھنا چاہتا تھا۔

میں نے کنیالال سے پوچھا کہ اس الیکشن کے بعد مسلم لیگ کی پالیسی میں کیا تبدیلی رونما ہوئی۔ جس پر انھوں نے بتایا کہ اب مسلم لیگ کا نعرہ مسلمان اور اسلام تھا ان کے لیے ہندوستان کے مشرقی اور شمال مغربی علاقوں پر مشتمل ایک بہت حد تک آزاد یونٹ تشکیل دیا گیا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر وہ یہ بات الیکشن سے پہلے کرتے تو جنوبی ہندوستان سے کوئی بھی ان کے ساتھ نہ ہوتا۔ اسی بنیاد پر لاہور میں مسلم لیگ نے اپنا ایک بڑا جلسہ منعقد کیا اور اس میں بنگال، پنجاب، سندھ، بلوچستان اور صوبہ سرحد کے لوگوں کی ایک کثیر تعداد نے شرکت کی وہاں انھوں نے ایک قرارداد کے ذریعے مسلم اکثریتی علاقوں پر مشتمل ایک آزاد اور خود مختار علاقے کا مطالبہ کر دیا۔ یاد رہے اس قرارداد میں ایک الگ وطن کی مانگ نہیں کی گئی۔ کچھ بھی ہو عام آدمی نے اسے ایک الگ وطن کی مانگ ہی سمجھا اور مسلم لیگ نے اس کے بعد پورے زور و شور سے مسلمانوں کے لیے

مسلم اکثریتی علاقوں پر مشتمل ایک ملک کی جدو جہد شروع کر دی۔ اس تحریک کے درمیان کئی تجاویز بھی آئیں کہ کسی طرح تقسیم ہند کے بغیر دیں مسلم لیگ کا مطالبہ مان لیا جائے۔ اس کے لیے مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی کوشش کی لیکن وہ بھی کامیاب نہ ہو سکے۔

یہ سب کہنے کے بعد کنیا لال کچھ دیر کے لیے خاموش رہے۔ اس کے بعد گویا ہوئے اور کہنے لگے کہ صرف یہ رائے مولانا ابوالکلام آزاد کی ہی نہیں تھی بلکہ بڑی تعداد میں مذہبی رہنما بھی ان کے ساتھ شامل تھے جن میں دیوبند کے علماء سب سے نمایاں تھے۔ ان سب کا خیال تھا کہ پاکستان کا مطالبہ دراصل ہندوستانی مسلمانوں کی شکست کے مترادف ہے۔ اس سے یوں محسوس ہوگا کہ ہندوستانی مسلمان ہندوستان میں اپنا قبضہ برقرار نہیں رکھ سکتے اور انھیں خاص طور پر ہندوستان کے ایک کونے میں دھکیلا جا رہا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کا یہ کہنا تھا کہ وہ بحیثیت مسلمان ایک لمحے کے لیے بھی تقسیم کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں اور پورے ہندوستان کو اپنا ملک سمجھتے ہیں۔ اس ملک کی ترقی کے لیے ان کے آباؤاجداد نے اپنی سی کوشش کی ہے۔

ان کی بات کا لب لباب یہ تھا کہ پاکستان بننے سے مسلمانوں کو کسی بھی طرح کا کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا۔ اس کا نتیجہ لازمی طور یہ ہوگا کہ ہندوستان دو ریاستوں میں تقسیم ہو جائے گا، ایک مسلمانوں کی اکثریت اور دوسری ہندوؤں کی۔ ایسی صورت میں ہندوستان میں مسلمانوں کا جینا حرام ہو جائے گا اور جو ہندو یا سکھ پاکستان میں ہوں گے وہ بھی کبھی چین کی نیند نہیں سو سکیں گے۔ تقسیم ہند سے اکٹھے رہنے کے تصور کو بھی نقصان پہنچے گا اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے علیحدگی کا تصور پروان چڑھے گا۔ یہ سب کہنے کے بعد کنیا لال نے مزید بتایا کہ تقسیم کو اب پچاس سال ہو گئے، اب وقت ہے کہ پاکستان کے لوگ اس بات کا جائزہ لیں کہ کیا مقاصد پاکستان حاصل ہوئے ہیں یا نہیں؟

میں نے کنیالال سے پوچھا کہ آخر اس مسئلے کا حل کیا تھا؟ انھوں نے جواب دیا کہ میرے خیال میں یہ مسئلہ ہی نہیں تھا۔ اصل مسئلہ انگریزوں سے آزادی حاصل کرنا تھا۔ اس کے بعد کیا ہونا تھا، یہ جمہوری نظام سیاست کے ذریعے ہی حل ہونا تھا۔ البتہ مولانا ابوالکلام آزاد نے ہندوستانی فیڈریشن کی ایک اسکیم پیش کی تھی۔ جس میں بہت سے مسائل کا حل موجود تھا۔

میں نے کنیالال صاحب کی طویل گفتگو سننے کے بعد کہا کہ کنیا جی مسئلہ اتنا سادہ ہوتا تو آسانی سے حل ہو سکتا تھا لیکن مسئلہ اتنا سادہ نہیں تھا۔ یہ ایک طرح سے مسلمانوں کی بقاء کا مسئلہ تھا اور اس کے ساتھ ساتھ یہ اسلام کی بقاء کا سوال بھی تھا۔ ہندو رہنماؤں کے رویے یہ بتا رہے تھے کہ انگریزوں کے جانے کے بعد ان کے ساتھ ہندو اکثریت کیا سلوک کرے گی۔ اسی خوف نے پورے ہندوستان میں مسلمانوں میں بیداری کی ایک لہر پیدا کر دی ۔قیام پاکستان کی جدو جہد میں ان علاقوں کے لوگ بھی پیش پیش تھے جن کے بارے میں یہ طے تھا کہ وہ کبھی بھی پاکستان کا حصہ نہیں بن سکیں گے۔ اس جدو جہد میں علی گڑھ کے طلبہ کا کردار بے حد اہم رہا ہے۔ وہ سب پڑھے لکھے لوگ تھے اور یہ جانتے تھے کہ علی گڑھ کبھی بھی پاکستان کا حصہ نہیں بن سکتا لیکن ۔انھوں نے جس انداز سے جناح صاحب کا استقبال کیا اس کی مثال ملنا بھی مشکل ہے۔ میری اس گفتگو کے بعد کنیا صاحب کسی بحث میں نہیں پڑنا چاہتے تھے۔ انھوں نے بات ختم کرتے ہوئے کہا کہ تقسیم ہند ایک ایسی بات ہے جس سے تقسیم در تقسیم کا عمل شروع ہوا جو اب تک جاری ہے۔

میں نے آخر میں کنیالال سے پوچھا کہ جب کیبنٹ مشن پاکستان آیا تھا تو اس وقت مولانا ابوالکلام آزاد کانگریس کے صدر تھے۔ وہ تقسیم کے خلاف تھے، گاندھی بھی تقسیم کے خلاف تھے، تو پھر کانگریس تقسیم پر کیسے راضی ہو گئی؟ مولانا ابوالکلام آزاد کی

فیڈریشن کی بات کیوں نہیں مانی گئی؟ کنیا جی نے جواب دیا کہ نہرو مولانا ابوالکلام آزاد کے بعد کانگریس کے صدر بنے، ان کا خیال تھا کہ جس قدر اختلافات مسلمانوں کی نمائندہ مسلم لیگ (مسلم لیگ میں ہندو شامل نہیں تھے، جبکہ کانگریس میں مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد شامل تھی) اور ہندوؤں کی نمائندہ کانگریس کے درمیان ہیں، ان دونوں کا جھگڑا کبھی ختم نہیں ہوگا۔ اس لیے تقسیم ہی اس کا حل ہے۔

میں نے ان سے اجازت لینے سے پہلے کہا کہ کنیا جی اب بہت وقت گزر چکا ہے۔ اب تو آپ ہمیں تسلیم کر لیں اور ہمارے ساتھ برابری کی سطح پر بات کریں۔۔۔ اس کے جواب میں انھوں نے کہا کہ ابھی نہیں۔ ہم میں سے کئی شدت پسند ہندوؤں کو ابھی تک وہ سب یاد ہے کہ ایک ہزار سال تک اس ملک کے اصل باسیوں کے ساتھ جن کی ایک واضح اکثریت بھی تھی کس طرح کا سلوک کیا گیا تھا۔ اسے بھولنے میں ایک وقت تو لگے گا۔۔۔

میں نے میزبانی کا لحاظ ایک طرف رکھتے ہوئے کہا کہ ہم سے بھی بہت کچھ چھینا گیا، بھولا ہمیں بھی نہیں۔۔۔ وہ مشرقی پاکستان بھی ہے اور کشمیر بھی ۔۔۔ اور سرکاری سطح پر مسلمانوں کا بڑے پیمانے پر قتل عام بھی، تاکہ ان کی ہر نشانی مٹادی جائے۔ اس کی ایک مثال پنجاب اور ہریانہ ہے جہاں کبھی پچیس فیصد مسلمان آباد تھے اور آج وہ آبادی کا ایک فیصد بھی نہیں ہیں۔۔۔ اسے دنیا اقلیتوں کے صفایے کے نام سے یاد کرتی ہے۔

کنیا لال نے بات سمیٹتے ہوئے کہا کہ میرا ذاتی خیال ہے اور میں اس پر یکسو بھی ہوں کہ مسلم لیگ کو کسی نا کسی فارمولے پر راضی کیا جا سکتا تھا لیکن کانگریس کی لیڈرشپ میں موجود چند ہندو رہنما ایسا نہیں چاہتے تھے۔ پھر وہی ہوا، تقسیم ہند، بربادی ہند، تباہی ہند، دو ایٹمی طاقتیں آمنے سامنے، مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان ایک گہری

خلیج، جو مقامی سطح سے انٹر نیشنل معاملات تک پہنچ چکی ہے، لاکھوں لوگوں کا قتل عام اور نقل مکانی، روزِاول ہی سے جنگیں اور ہر دم جنگی حالات، غربت ختم کرنے، تعلیم عام کرنے، لوگوں کو بہتر سہولتیں دینے کی بجائے، دفاع پر بے بہا خرچ، دوستی میں کوئی ایک قدم آگے بڑھاتا ہے اور دوسرا چار قدم پیچھے لے جاتا ہے۔

ہم ہمسائے ہیں لیکن ہماری دوستیاں امریکہ، یورپ، چین اور روس کے ساتھ ہیں آپس میں تجارت اور تعلقات کو بہتر کرنے کی بجائے اپنی مارکیٹ سمندر پار لوگوں کو پیش کر رہے ہیں پنجاب اور ہریانہ میں مساجد ویران ہیں تو پاکستان میں مندر اجڑے پڑے ہیں یہ سب تو اوپر والے کی پوجا کے لیے تھے۔ بھارت اور پاکستان کا میچ ہو تو یوں لگتا ہے کی جنگ ہو رہی ہے اور سب سے بڑھ کر مسئلہ کشمیر جو پچھلے پچاس سال سے پاکستان اور بھارت کے درمیان سب سے اہم غیر حل شدہ مسئلہ ہے اور اس کے حل ہونے کے امکانات بھی کم ہی نظر آتے ہیں بھارت اور پاکستان نے اسے اپنی انا کا مسئلہ بنایا ہوا ہے بے گناہ کشمیری ہر روز مارے جا رہے ہیں ہمارے ہاں بھی انتہا پسند، آپ کے ہاں بھی کم نہیں۔۔۔

یہ سلسلہ کب اور کہاں رکے گا۔ معلوم نہیں۔۔۔اس کے بعد کنیا لال خاموش ہو گئے اور میں بھی یہ کہہ کر کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گیا۔۔۔اس موقع پر مجھے مظفر رزمی کے یہ چند اشعار یاد آ گئے۔

اس راز کو کیا جانیں ساحل کے تماشائی
ہم ڈوب کے سمجھے ہیں دریا تری گہرائی
جاگ اے مرے ہمسایہ خوابوں کے تسلسل سے
دیوار سے آنگن میں اب دھوپ اتر آئی

چلتے ہوئے بادل کے سائے کے تعاقب میں
یہ تشنہ لبی مجھ کو صحراؤں میں لے آئی
یہ جبر بھی دیکھا ہے تاریخ کی نظروں نے
لمحوں نے خطا کی تھی صدیوں نے سزا پائی
کیا سانحہ یاد آیا رزمیؔ کی تباہی کا
کیوں آپ کی نازک سی آنکھوں میں نمی آئی

ہم پچھلے دس دن سے سفر میں تھے اوراس دوران ہم نے تقریباً پانچ ہزار کلومیٹر سفر طے کیا اور بھارت کی نو ریاستوں، جن میں ہریانہ، اتر پردیش، مدھیہ پردیش، آندھراپردیش، تلنگانہ، کرناٹکا، مہاراشٹرا، گجرات اور راجستھان شامل ہیں سے گزرتے ہوئے واپس دلی پہنچ گئے۔ ہم سب نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ ہمارا سفر بخیر وعافیت پورا ہوا۔ ہمیں بہت کچھ جاننے، سننے اور پڑھنے کا موقع ملا۔ ہم صبح دس بجے کے قریب دلی پہنچ گئے۔ ہمارا قیام اپنے سابقہ ہوٹل میں ہی تھا۔ اگلے دن ہم لاہور واپس آ گئے۔ ہمارے اہل خانہ نے ایئر پورٹ پر ہمارا استقبال کیا اور ہم سب نے اللہ کا شکرادا کیا کہ ہمیں سیاحت کا موقع بھی ملا صحت اور تندرستی کے مسائل کا سامنا بھی نہیں کرنا پڑا۔

اس تمام سفر کی رُوداد میں نے آپ کے سامنے پیش کی، وقاص بھائی بھی اس سفر کے دوارن نوٹس بناتے تھے۔ جب میں نے یہ سفر نامہ لکھنا شروع کیا تو انھوں نے بھی مجھے اپنی لکھی ہوئی تحریر بجھوائی جسے میں نے اسے سفر نامے میں شامل کیا۔ اُس سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ یہ سفر کتنا دلچسپ تھا۔ آخر میں میں بس اتنا ہی کہنا چاہوں گا کہ آپ کو جب بھی موقع ملے تو سیاحت کے لیے ضرور جانا چاہیے۔
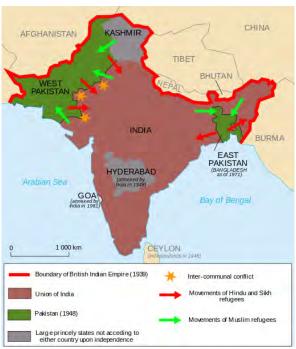
Ploiitical and Geogrphical Map before The Parition Photo Credit: https://scholarblogs.emory.edu

The Hindustan Times

KASHMIR ACCEDES TO INDIA

PLEBISCITE SOON ON RULER'S DECISION

SHEIKH ABDULLA TO FORM INTERIM GOVT.

UNION TROOPS RUSHED FOR PROTECTION OF STATE

Kashmir... Forced to Accedes to India, Photo Credit:
https://www.andrewwhitehead.net
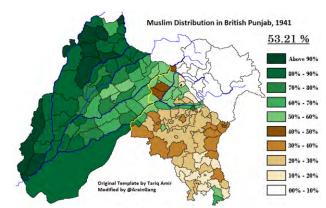
Muslim population in United Punjab (1941) Photo Credit:
https://araingang.medium.com
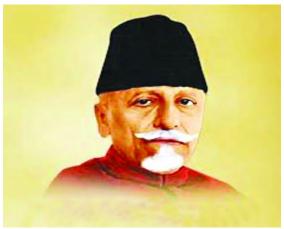
Maulana Abu kalam Azad A Great Visionary Leader,
Photo Credit: https://www.dailypioneer.com
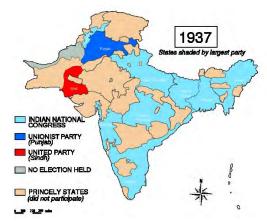
1937 Election Results, Photo Credit:
https://commons.wikimedia.org

اللہ اکبر

میثاق رکنیت آل انڈیا مسلم لیگ

لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ (القرآن)

میں مسلم لیگ کا ممبر ہونا چاہتا ہوں۔ اور بحیثیت مسلمان اقرار کرتا ہوں کہ۔

(۱)۔ میں آل انڈیا مسلم لیگ کے نصب العین یعنی "آزاد ہندوستان کے ساتھ آزاد ملت اسلام" یعنی براعظم ہند میں، اجلاس آل انڈیا مسلم لیگ مدراس کی تصریحات کے مطابق آزاد مسلم سلطنتوں اور آزاد مسلم وطنوں کی تعمیر اور قومیت ملت اسلامیۂ ہند کے کامل استقلال و آزادی کے قیام اور مسلمانوں کے حقوق و مفاد کی سارے براعظم ہندوستان کے اندر مکمل حفاظت پر عقیدہ رکھتا ہوں۔

(۲)۔ میں ملت اسلامیۂ ہند کو براعظم ہند کے اندر ایک مستقل قومیت یقین کرتا اور فکر اسلامی کا مسلک قبول کرتا ہوں۔ اور عہد کرتا ہوں کہ میں تمام فکروں پر فکر اسلامی کو اور تمام مفادوں پر، مفاد اسلامی کو اور تمام وفاداریوں پر۔ وفاداریٔ اسلام کو بدرجہ غالب و مقدم رکھوں گا۔

(۳)۔ میں مسلم لیگ کے اصول، اغراض و ضوابط کے ماتحت لیگ کے فیصلوں اور حکموں کی پوری تائید کروں گا۔ اور لیگ کے پروگراموں کی کامیابی کے لئے خلوص سے کام کروں گا۔

وما توفیقی الا باللہ

دستخط (پورا نام) ممبر ____________________

صوبہ ____________ ضلع ____________

پتہ ممبر ____________________

دستخط سکریٹری ____________________

تاریخ رکنیت ____________________

Muslim membership Form, Photo Credit: https://www.pitribe.com/posts.

Poet and philosopher Muhammad Iqbal (third from left) with AIML members in 1930. Photo Credit: https://www.dawn.com/news/1310662

بھارت یاترا : سید وقاص انجم جعفری کے قلم سے

رپورٹنگ اور نان رپورٹنگ ویزا

پاکستان میں جب انڈین ویزا کے حصول کے حوالے سے کوشش کی گئی تو معلوم ہوا کہ ویزا دو اقسام کا ہوتا ہے۔ رپورٹنگ اور نان رپورٹنگ۔ پنجاب یونیورسٹی کے پروفیسر جہانگیر تمیمی صاحب سے جب میں نے اُن کے سابقہ تجربات کی روشنی میں رہنمائی چاہی تو انھوں نے فرمایا کہ ایک مرتبہ مجھے بھی نان رپورٹنگ ویزا مل رہا تھا مگر میں نے خود نہیں لیا کیونکہ یہ میری پاکستانیت کی شناخت تھی کہ اسی بنیاد پر پاکستان کے شہریوں کو پولیس رپورٹ کرنا پڑتی ہے ورنہ دیگر ممالک کے شہری اس پابندی سے مستثنیٰ ہیں۔ پاکستان کے اکثر لوگوں) جن میں زیادہ تعداد ان کی ہے جن کے اُعزِا و اقربا دونوں ممالک میں ہیں (کو رپورٹنگ ویزا ملتا ہے۔ جس کی رُو سے ایسے تمام افراد کو بھارت کے ہر شہر میں آنے کے ۲۴ گھنٹے کے اندر اندر یا شہر چھوڑنے سے ۲۴ گھنٹے قبل کمشنر آفس میں پولیس کو بتا کر تحریری اجازت لینا ہوتی ہے۔ دنیا بھر میں عموماً ملکوں کا ویزا ہوتا ہے مگر پاک و ہند تعلقات اس نہج پر پہنچے ہوئے ہیں کہ یہ دونوں ممالک ایک دوسرے کے شہریوں کو ملک (Country) کے بجائے شہروں (Cities) کا ویزا دیتے ہیں۔ عام طور پر دونوں ممالک کے شہریوں کو تین شہروں کا' وزٹ ویزہ ملتا ہے۔ انڈین ہائی کمیشن اسلام آباد کے ویزا اتاشی نے ہماری درخواست اور سفر کی نوعیت کے پیشِ نظر بآسانی نان رپورٹنگ ویزا دینے پر آمادگی ظاہر کر دی۔ اگلے روز عمر فاروق صاحب جب ویزے لے کر لاہور پہنچے تو معلوم ہوا کہ مشتاق مانگٹ صاحب اور شیخ عمر فاروق صاحب کو نان رپورٹنگ جبکہ مجھے رپورٹنگ ویزا ملا ہے۔ میرے لیے سفر سے پہلے ہی یہ بد شگونی تھی۔ میاں مقصود احمد صاحب کے الفاظ میرے دماغ میں گونجنے لگے کہ ''وقاص صاحب! کشمیر کے تاریخی تنازعہ کی وجہ سے پاکستان اور جماعت اسلامی کے ساتھ ہندوستان کا عناد کوئی ڈھکا چھپا نہیں اور آپ تو جمعیت کے ناظمِ اعلیٰ ہونے کے حوالے سے پریس میں معروف رہے

ہیں اس لیے محتاط رہیے گا"۔دل میں چونکہ کھٹکا تھا اس لیے اتفاقی واقعہ نے) جس کا اندازہ بعد میں جا کر ہوا (خواہ مخواہ ایک خلش سی پیدا کر دی۔ایک مسئلہ یہ بھی ہوگا کہ میری وجہ سے ان دونوں حضرات کو پابند ہونا پڑے گا۔

بہر حال دلی اترتے ہی پہلی صبح ہم تینوں کمشنر آفس گئے جہاں کوئی ایک ڈیڑھ گھنٹے کی کارروائی کے بعد ہمیں اجازت نامے جاری کیے گئے۔اس فرق کے ساتھ کہ مجھے ہر شہر میں رپورٹ کرنا پڑے گی جبکہ باقی دو اس سے مستثنیٰ ہوں گے۔دلی سے چنائے) سابقہ مدراس (کے لیے مجھے ایک بار پھر ڈرائیور کے ساتھ انٹری کرانے جانا پڑا۔اب چنائے پہنچنے کے بعد معلوم کرنے پر پتہ چلا کہ کمشنر آفس چنائے کے علاقے ،ایگمور میں ہے۔گذشتہ روز کے ایکسیڈنٹ سے پہلے جب میں وہاں پہنچا تو معلوم ہوا کہ تمام عملہ پاک بھارت ہاکی سیریز کے لیے سٹیڈیم تعینات ہے لہٰذا شام کو آئیں۔شام کو جا کر مدراس میں رہنے کے لیے مہر لگوائی۔چونکہ یہ شہر انڈیا کے بڑے مراکز سے دور ہے اسلیے نہ صرف یہ کہ رَش کم تھا بلکہ معمول نہ ہونے کی وجہ سے عملہ محتاط بھی تھا۔ریکارڈ میں اندرراج اور فارم گویا انگلی پکڑ پکڑ کر بھروائے جا رہے تھے۔پاسپورٹ کی کاپی، تصاویر، اجازت نامے کی کاپی وغیرہ وغیرہ۔چونکہ رپورٹنگ کی بات چل نکلی ہے تو ممبئی کمشنر آفس کا تذکرہ ہو جائے جو اگرچہ چند دن بعد کا ہے مگر اسی عنوان کے تحت آتا ہے۔اس مرتبہ شیخ عمر فاروق صاحب میرے ہمراہ تھے۔ ممبئی کا پولیس رپورٹنگ سنٹر دلی اور چنائے کی نسبت صاف ستھرا تھا مگر دفتریت ، روایتی کاہلی اور سُرخ فیتہ کے مظاہرے کم و بیش وہی تھے جو برِ صغیر کے تمام روایتی سرکاری دفتروں کا عموم ہے۔دفتر کا عملہ دو خواتین کو مخصوص انداز میں گھیرے ہوئے اپنے روایتی ہتھکنڈوں سے قیمت بڑھانے میں مصروف تھا۔کوئی مرد نہ ہونے کی بناء پر ان خواتین کو مشکل پیش آرہی تھی مجبوراً ایک پختہ عمر خاتون نے دوسری عورت اور اس کی گود میں موجود بچے کو دفتر چھوڑا اور عملے کی جانب سے لگائے گئے اعتراضات کو رفع کرنے کے لیے روانہ ہو گئی۔ایک اور

صاحب نے یہ بتا کر ہمیں مزید تشویش میں مبتلا کر دیا کہ یہ لوگ تو ہر کام کرانے کے پیسے مانگتے ہیں خدا خدا کر کے ہماری باری آئی۔ ہمارا مؤقف یہ تھا کہ اس شہر میں قیام صرف دو دن کا ہے پرسوں ہماری روانگی ہے اسلیے بزنس ویزہ اور ہماری مجبوری کا خیال رکھتے ہوئے ہمیں ابھی داخلہ اور اخراج دونوں دے دی جائے تاکہ ہمارا چکر بچ جائے۔ایک صاحب کاغذات کی پڑتال میں مصروف تھے، دوسرے بظاہر اپنے کام میں مگن مگر کان ان کے بھی ہماری طرف لگے ہوئے تھے جبکہ تیسرے نے سلسلہ کلام شروع کرتے ہوئے ہمارے ساتھ پوری ہمدردی کا اظہار اور ہمارے مؤقف سے اتفاق کیا اور کہا کہ ہم نہ صرف آپ کو یہ سہولت دیں گے بلکہ ایسا انتظام کر دیں گے کہ آپ کو دلی رپورٹ بھی نہ کرنا پڑے بلکہ آپ سیدھا ایئرپورٹ جا سکیں۔ ہمارے اطمینان اور خوشی کی اس سے بڑی بات کیا ہو سکتی ہے ہم دل ہی دل میں ان کے تعاون کو دُعائیں دے رہے تھے کہ وہی صاحب گویا ہوئے کہ اس کام کے لیے مبلغ 1000/-روپے دینے ہونگے گویا کہ مبلغ 1250/- پاکستانی روپے۔ میں نے دل ہی دل میں کہا کہ ہم اتنے بڑے کاروباری اور مصروف بھی نہیں کہ کمشنر آفس کا ایک چکر بچانے کے لیے ایک ہزار یا ڈیڑھ ہزار حرام میں لُٹا دیں۔ ہم نے معذرت کے ساتھ ان کی پیشکش واپس کر دی اور اگلے دن دوبارہ آنے کے لیے روانہ ہو گئے۔

دلی، چنائے اور ممبئ کے پولیس انٹیلیجنس دفاتر میں یہ حاضری اگرچہ وقت کا ضیاع اور ذہن کے لیے بار ضرور ثابت ہوئی مگر اس سے یہ ضرور تجربہ ہوا کہ دونوں ممالک کے عام شہریوں کو کس طرح ان دفاتر میں پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔اگر مجھے بھی نان رپورٹنگ ویزا ملتا تو تجربے اور مشاہدے کی اس جہت سے میں قطعی لاعلم اور انجان رہتا۔

دلیؔ میں آمد

دن کے سوا ایک بجے ہم لاہور ائیر پورٹ پر پہنچ چکے تھے۔ عامر، ثاقب اور شاہد الوداع کہنے کے لیے ساتھ تھے۔ نمازِ جمعہ ائیر پورٹ مسجد میں بالکل تیار تھی۔ نماز پڑھ کر سلام پھیرا ہی تھا کہ مشتاق مانگٹ صاحب نظر میں آ گئے جو عامر چیمہ صاحب سے مل کر ابھی یا یسین خان کے ہمراہ ائیر پورٹ پہنچے تھے۔ ڈیپارچر لاؤنج کے باہر شیخ عمر فاروق صاحب اپنی فیملی کے ہمراہ مل گئے۔ یوں ہندوستان کے اس سفر کے لیے ہماری مثلث پوری ہو گئی۔ ساتھیوں سے رخصت ہونے کے بعد امیگریشن کے کاؤنٹر پر میانوالی کے رہنے والے ظفر اللہ روکھڑی سے ملاقات ہو گئی جو FIA میں ملازم تھے۔ میں نے شیخ صاحب سے کہا کہ علاقہ کی نسبت بھی ایک تعصب سے کم نہیں جو اجنبیت کے پردوں کو فوراً ختم کر دیتی ہے۔ یہ بات تو ڈیپارچر لاؤنج میں داخل ہوتے ہی معلوم ہو گئی تھی کہ جہاز 45 منٹ لیٹ ہے۔ روانگی میں مزید 45 منٹ تاخیر ہوئی اور یوں تین بجے کی پرواز ساڑھے چار بجے روانہ ہوئی، لاؤنج میں لوگ زیادہ تر پاکستان انڈیا کے کرکٹ اور ہاکی میچ دیکھنے میں مصروف تھے۔ جبکہ انگریز اپنی مخصوص بے نیازی کے ساتھ مطالعہ میں مگن۔۔۔ بیرون ملک سفر کے دوران یہ بات میں نے اکثر نوٹ کی ہے کہ یورپین لوگ اور جاپانی بھی فارغ اوقات بالخصوص سفر کے دوران اپنے آپ کو مطالعہ میں مصروف رکھتے ہیں خواہ وہ اخبار ہو یا میگزین، فکشن ہو یا کوئی اور۔۔۔۔ پی آئی اے کی دلی فلائٹ ایک درمیانے درجے کی فلائٹ ہے۔ مشتاق صاحب نے دوران سفر بتایا کہ اس روٹ پر پی آئی اے کے علاوہ کوئی فلائٹ نہیں چلتی۔ لاہور سے دلی 240 کلومیٹر کے زمینی فاصلہ پر ہے۔ جہاز نے یہ سفر 50 منٹ میں طے کیا۔ جب ہم اندرا گاندھی انٹر نیشنل ائیر پورٹ پر پہنچے تو مقامی وقت کے مطابق شام کے 6 بج چکے تھے۔ امیگریشن پر حسب توقع لمبی قطاریں تھیں۔ انڈین عملے کا رویہ بھی معمول کے مطابق تھا اس لیے کہ یہ ایک ہی

براعظم کے ممالک ہیں۔ مذاہب کے تفریق کے باوجود کلچر میں خاصی مماثلت ہے۔ ائیر پورٹ کے معمولات سے فارغ ہوئے تو دن رخصت ہوا چاہتا تھا اور ایک ٹیکسی کے ذریعے ہم پہاڑ گنج) شیواکانٹی نینٹل (پہنچ گئے۔ اس ہوٹل کا انتخاب ٹیکسی ڈرائیور انیل نے کیا تھا، جو ہمیں ائیر پورٹ سے لے کر آرہا تھا۔ راستے میں اندھیرے کے باعث اور کچھ تو نہ دیکھ سکے البتہ سڑکوں، چوراہوں، گاڑی کے ماڈلوں کو زیر بحث لاتے رہے۔ 45 منٹ کے سفر میں ٹیکسی ڈرائیور کے ساتھ مذہب سے لے کر ریلوے اور صنعت سے لے کر جنرل نالج تک سبھی موضوعات پر بات چیت ہوتی رہی۔

ہماری خواہش تو جامع مسجد دلی کے ارد گرد کسی ہوٹل میں رہنے کی تھی، مگر ڈرائیور نے اندرون شہر جانے سے اس لیے معذرت کی کہ ٹریفک جام کی وجہ سے آنے جانے میں بہت دقت ہوگی لہٰذا طے پایا کہ پہاڑ گنج کا علاقہ رہائش کے لیے مناسب ہوگا جو کہ پرانی دلی سے ملحق علاقہ ہے۔ بالکل اس طرح جیسے لاہور میں نسبت روڈ وغیرہ۔ ائیر پورٹ سے ہوٹل تک کے سفر میں ہندوستانی صنعت کی بہتری کا تاثر اس لیے بھی ذہن پر نقش ہو گیا کہ اکثر ٹیکسی اور موٹر وہیکلز مقامی طور پر تیار کردہ تھے۔ TATA یہاں کی معروف موٹر ساز کمپنی ہے۔ گاڑیوں کی قیمتیں ظاہر ہے اسی عنصر کی بناء پر کم تھیں۔ ہوٹل کے بالکل سامنے ایک بارات بلکہ روایتی بارات گزر رہی تھی۔ دولہا معہ شہ بالا گھوڑی پر سوار ڈھول تاشے، شادیانے، دوستوں کا رقص والہانہ اور نوٹوں پھولوں کا نچھاور کیا جانا، یہ سب تو ہمارے ہاں بھی ہوتا ہے۔ اس روایت میں جدت کیمرہ مین کی تھی جو اس سارے پروگرام کی ویڈیو ریکارڈ کر رہا تھا۔ ایک منفرد یا یوں کہیے عجیب چیز اس بارات میں یہ تھی کہ بارات کے ایک طرف دس کے لگ بھگ افراد ٹیوب لائٹ سٹینڈ اٹھائے ہوئے تھے) جس طرح ہمارے ہاں شادی کے گھر کے اطراف میں روشنی اور خوبصورتی کے لیے روشنی آویزاں کرتے ہیں (بارات کے آخر میں ایک آدمی ایک چھوٹی سی ریڑھی پر

جبز یٹر لیے چل رہا تھا۔ یہ منظر ہمارے لیے بالکل نیا تھا۔ ہوٹل کی بالکونی سے ہم نے یہ منظر دیکھا اور تحریر میں لانے کے لیے حافظہ میں محفوظ کرلیا۔

نماز مغرب عشاء اکٹھے پڑھنے کے بعد کھانا تلاش کرنے کے لیے ہم باہر نکلے۔ ہمارے سامنے سب سے بڑا مسئلہ حلال فوڈ کا تھا۔ قرب و جوار میں کوئی مسلم ہوٹل نہیں نظر آیا۔ طے پایا کہ بھوک کو Suppress کرنے کے بجائے کھانے کو سبزیوں تک محدود کرلیا جائے اس لیے چاول کے سوپ اور مچھلی پر ہی اکتفا کیا۔ یوں رات 12 بجے کے قریب پرانی دلی میں ہمارے پہلے دن کی مصروفیات اپنے اختتام کو پہنچیں۔

شکر اور فکر

رات ساڑھے گیارہ بجے کا وقت تھا جب ہوٹل میں ہم لوگ سونے کی تیاری کر رہے تھے کہ چینل گھماتے گھماتے نظریں ایک منظر پر پیوست ہو گئیں۔ یہ غالباً نیشنل جیو گرافک چینل تھا اور ہندومت کے حوالے سے ایک ڈاکومنٹری پیش کی جارہی تھی۔ ایک بہت بڑے پہاڑ کو تراش کر بنایا گیا ایک مجسمہ تھا جس کے قدموں کو دودھ کے ساتھ دھویا جارہا تھا بلکہ ایسے ہی، جیسے ہمارے ہاں اولیاء کے مزارات کو غسل دیا جاتا ہے۔ بُت، مجسمہ، بھگوان یا دیوتا اتنا بڑا تھا کہ زائرین بمشکل اس کے پاؤں کو ہی بآسانی دھو سکتے تھے۔ سین تبدیل ہوتا انٹرویو کرنے والے کے ساتھ کیمرہ ایک ایسے گھر میں داخل ہوتا ہے جہاں ایک دوشیزہ اپنی پوری زندگی بھگوان کے لیے دان یعنی وقف کرنے کا اعلان کرتی ہے۔ علاقے کی خواتین اس مذہبی رسم کی ادائیگی کے لیے ایک گھر میں جمع ہیں۔ ان کی آنکھوں میں رشک کے جذبات اور زبانوں پر دوشیزہ کے لیے فخر کے الفاظ ہیں۔ ماں نے پوچھنے پر بتایا کہ اگرچہ مجھے اپنی بیٹی کی جدائی کا غم ہے مگر میں اس کے فیصلے پر پوری طرح مطمئن ہوں۔ دوشیزہ کو نئے کپڑے اور زیور پہنایا جاتا ہے اور ناظرین کو بتایا جاتا

ہے کہ وہ اپنی زندگی میں آخری مرتبہ آراستہ کی جارہی ہے۔ایک جلوس کی صورت میں اسے مندر لے جایا جاتا ہے اس سے آگے کا منظر کراہیت انگیز اور خوفناک ہے۔

مندر میں متعدد ایسے سادھو یا پروہت نظر آئے جن کے تمام تر بال سفید تھے مگر سب سے زیادہ عجیب چیز یہ تھی کہ ان کے پورے جسم پر کپڑا نام کی کوئی چیز نہ تھی۔ان کے ہاتھوں میں مور چھل ٹائپ کی کوئی چیز تھی۔دوشیزہ کو ان سادھوؤں کے درمیان لا کر بٹھا دیا جاتا ہے۔کچھ منتر،اشاروں اور ادائیگی کے بعد جو کام شروع کیا جاتا ہے وہ بلا شبہ رونگٹے کھڑے کر دینے والا ہے۔تمام سادھو باری باری اپنے ہاتھوں سے عورت کے دراز بالوں کو نوچ نوچ کر ڈھیر لگائے جاتے ہیں۔چند منٹوں بعد عورت کے سر پر ایک بھی بال باقی نہیں رہتا۔اس کی نوچی گئی زلفوں کو محفوظ کر لیا جاتا ہے اس سارے عمل میں ہمراہ آئی عورتوں کے چہرے پر کرب کی تحریر واضح پڑھی جارہی تھی مگر دوشیزہ معلوم نہیں کس عمل یا جذبے کے زیرِ اثر تھی کہ اس کا چہرہ کسی بھی تاثر سے خالی تھا۔ٹنڈ منڈ کرنے کے بعد اس عورت کو کسی مخصوص چیز سے نہلایا جاتا ہے دیگر عورتیں اس کے گرد ایک چادر سے پردہ کر دیتی ہیں چند لمحوں بعد دوشیزہ ایک سفید لباس میں نمودار ہوتی ہے اور اب تمام عمر اس کا یہی لباس ہوگا۔مذہبی تقریب تمام ہوئی۔داسی کے سر پر تاج سجایا جاتا ہے اور جلوس اس پر پھول نچھاور کرتا ہوا روانہ ہو جاتا ہے۔

فلم ختم ہونے کے بعد بھی تحیرّ،خوف کے لہر ہم تینوں پر طاری تھی۔سچی بات ہے اس لمحے صدق دل کے ساتھ بار بار اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ اس نے اسلام جیسی نظام اور دین ہمیں عطا کیا۔انسان اپنے فطری جذبۂ عبودیت 'پاکیزہ،فطری،معقول نعمت کی تسکین کے لیے کن کن نا معقول ہستیوں اور عقائد کے آگے اپنے آپ کو ذلیل کر رہا ہے۔گذشتہ ایک ہفتے سے ہم ہندو مذہب کے مراکز، مندروں اور عقائد کا کثرت سے

مشاہدہ کر رہے ہیں۔ اس تقابلی مطالعہ کے بعد معلوم ہو رہا ہے کہ اسلام کیا ہے؟ دریافت کے بغیر اسلام بھی محض ایک پیدائشی مذہب ہے۔ کاش یہ ہماری اور دیگر مسلمانوں کی زندگی میں اتفاق (by chance) کے بجائے انتخاب (by choice) دوسرا بن جائے۔ تاثر یہ ہے کہ ان لوگوں کی فکر کون کرے یا کر رہا ہے یا کس کو کرنا چاہیے جو شرک، معصیت اور انسانی جان کے ساتھ ظلم کی تاریکیوں میں ٹامک ٹوئیاں مار رہے ہیں۔ بلا شبہ اس کے مخاطب ہم ہیں، مسلم قیادت ہے۔ جس کی یہ ذمہ داری ہے کہ اس دولت کو اُن محروم طبقات تک پہنچائیں جو محض تعصب کی بناء پر اس سے اجنبیت برت رہے ہیں۔ مختلف ممالک اور معاشروں میں انفرادی طور پر تو کچھ مسلمان جماعتیں اس کام کو کر رہی ہیں مگر حکومت اور ریاست کی سطح پر یہ کام نہ ہونے کے برابر ہے۔ بس انھی خیالات میں غلطاں و پیچاں ہمیں نیند آگئی۔

کنول مندر (Lotus Temple)

مشتاق صاحب کے ساتھ نمازِ فجر کے بعد صبح کی سیر سے ہم نے ہندوستان میں اپنے پہلے مکمل دن کا آغاز کیا۔ پہاڑ گنج کا یہ علاقہ گنجان آباد ہونے کے ساتھ ساتھ خاصا گندا اور آلودہ ہے۔ گندی دیواریں، جانوروں کی غلاظت، ٹریفک جام، فٹ پاتھ پر منہ ہاتھ دھوتے اور ناشتہ کرتے ہوئے لوگ۔ انڈیا میں آپ کو جا بجا پیپل کے درخت نظر آئیں گے جن کے نیچے مندر بنے ہوئے ہیں۔ پیپل ہندوؤں کے نزدیک ایک مقدس درخت ہے۔ پیپل سے متعلق ایک اور خاص چیز اس کا Disposables استعمال ہے۔ یہاں کھانے کے لیے تھوڑی مقدار میں جو چیز دی جاتی ہے وہ پیپل کے پتے یا پتوں سے بنی ہوئی کٹوری میں ملتی ہے۔

ناشتے سے فارغ ہو کر ہم نے ایک Van کرائے پر لی۔ اسے آپ سوزوکی بولان کا چھوٹا ماڈل سمجھ لیجیے، جسے یہاں اومنی کا نام دیا گیا ہے۔ اگلے چند دنوں میں معلوم ہوا

کہ یہاں پر یہ گاڑی بہت معروف ہے۔ آج کا شیڈول قطب مینار، جامع مسجد دلی اور شاہی قلعہ (لال قلعہ) کی سیر پر مشتمل تھا۔ شرما ہمارا ڈرائیور بلکہ کسی حد تک گائیڈ بھی، ہمیں سب سے پہلے کنول مندر Temple Lotus دکھایا گیا۔ کنول کے پھول کے ڈیزائن پر مشتمل یہ خوبصورت عمارت بہائی فرقے نے بنائی ہے۔ جو سیاحوں کے وزٹ کے ساتھ ساتھ اُن کے مذہب کی تبلیغ کا عنوان بھی ہے۔ یہ عمارت ایک وسیع رقبے پر پھیلی ہوئی ہے۔ چاروں طرف وسیع باغ، درمیان میں پانی کی جھیل کے اوپر دو منزلہ کنول کے پھول سے مشابہ عمارت۔ بالکل جس طرح مینار پاکستان کی بنیاد میں پانی کی ایک نہر چاند کی صورت میں موجود ہے۔ عمارت کے باہر اور ارد گرد شور و غل بھی تھا اور فوٹو گرافی بھی۔ کیونکہ سکول کے بچے بڑی تعداد میں آئے ہوئے تھے۔ ہال میں داخلے کے لیے نہ صرف ہمیں جوتے اتارنے پڑے بلکہ یہ بھی ہدایت دی گئی کہ یہاں فوٹو گرافی ممنوع اور گفتگو پر پابندی ہے۔ ہال کے مختلف اطراف میں بہائی مذہب کے بانی بہاالحق کے اقوال ہندی، انگریزی اور اُردو میں درج تھے۔ ہال کے درمیان میں خوبصورت بنچ موجود تھے جس پر بیٹھ کر لوگ نہ صرف ہال کے حسن سے مسحور ہو رہے تھے بلکہ اپنی تھکن کو اُتارنے کا سامان کر رہے تھے۔ ایک جانب بہت سادہ مگر نہایت دیدہ زیب روسٹرم تھا جو غالباً فائبر کی کسی اعلیٰ قسم سے بنایا گیا تھا۔

قطب کمپلیکس

قطب مینار کے متعلق ذہن میں یہ خاکہ تھا کہ کسی بڑے احاطے میں باغ کے وسط میں ایک مینار ہو گا مگر یہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ یہ تو ایک پورا کمپلیکس ہے جس میں التمش کا مقبرہ، مسجد قوت الاسلام، علائی مینار اور خِلجی کا تعمیر کردہ مدرسہ موجود ہے۔ امتدادِ زمانہ نے قطب مینار کے علاوہ باقی عمارات کو بہت حد تک متاثر کر دیا ہے۔ قطب مینار کی تزئین و آرائش کا کام بھی کئی سالوں سے جاری ہے۔ مسجد قوت الاسلام اور التمش

کے مزار کا اپنا ایک رُعب اور شکوہ ہے اس ایک احاطے میں کئی مسلمان حکمرانوں کی یادگاریں اوراِن کے فن تعمیر کا ذوق نظر آتا ہے۔ قطب مینار بلاشبہ اس سے کہیں زیادہ کشش اور تعریف کا حق رکھتا ہے جو تصویروں میں دیکھنے سے نظر آتا ہے۔ اُس وقت تک کی سیر نے جسموں میں تھکان اور معدے میں اشتہاء، بیدار کردی تھی۔ شرکاء سے ہمارا مطالبہ تھا کہ وہ ہمیں کسی حلال خوراک والے ہوٹل تک لے جائیں جو مہرولی یا جامع مسجد دلی کے ارد گرد ہی آتا تھا۔ چلتے چلتے ایک سرسری سا دورہ انڈین انسٹیوٹ آف ٹیکنالوجی IIT کا بھی کیا جو مربعوں پر پھیلا ہوا ایک بین الاقوامی شہرت کا حامل ادارہ ہے۔ ہندوستان میں اتوار اور ہفتہ کو سرکاری تعطیل ہوتی ہے اس لیے اس ادارے کی بیرونی سیر کرکے ہم جلدی واپس نکل آئے۔

راشٹرپتی بھون

ہندوستان کا دار الحکومت نیو دلی ہے۔ پارلیمنٹ ہاؤس اور ایوان صدر نیو دلی میں واقع ہے۔ پاکستان ٹیلی وژن پر جب بھی نیو دلی کی کوئی رپورٹ آتی ہے تو گنبدوں سے مزین طویل ستونوں والی ایک عمارت نیوز اینکر کی آواز کے پس منظر میں نمایاں ہوتی۔ بتایا گیا کہ اسی پُر شکوہ عمارت کو راشٹرپتی بھون کہتے ہیں۔ ایوان صدر سے ایک وسیع و عریض سڑک جس کے دونوں اطراف میں ایک جیسی عمارات ہیں پارلیمنٹ ہاؤس کو اپنے پہلو میں لیے ہوئے انڈیا گیٹ تک جاتی ہے۔ ۲۶ جنوری کو منایا جانے والا یوم جمہوریہ ہر سال اسی مقام پر ہوتا ہے۔ انگریزوں کی بنائی ہوئی یہ عمارتیں خوبصورت فنِ تعمیر کا شاہکار ہیں۔

انڈیا گیٹ

نئی دلی کی تعمیر کی نشانی کے طور پر یہ باوقار گیٹ تعمیر کیا گیا ہے۔ 1931ء میں جس آرکیٹیکٹ نے اسے ڈیزائن کیا ہے وہی نئی دلی کی اکثر عمارات کا موجد ہے۔ انڈیا گیٹ ایسی جگہ ہے جہاں اکثر غیر ملکی سربراہان اور وفود، جنگِ آزادی کے ہیروز کو خراجِ عقیدت پیش کرنے آتے ہیں۔ یہ گیٹ در حقیقت ان سپاہیوں اور ان رجمنٹس کی یاد میں حکومت برطانیہ نے تعمیر کیا تھا جنہوں نے دنیا میں مختلف محاذوں پر برٹش گورنمنٹ کے استحکام کے لیے اپنی جانیں قربان کیں اس گیٹ کی خاص بات اس کی تعمیر کے ساتھ ساتھ یہ ہے کہ اس سینکڑوں فٹ بلند و بالا گیٹ کے ہر بلاک) اینٹ (پر اُن سپاہیوں کے نام کندہ ہیں جنہوں نے اپنی جانیں برطانوی ہند کے پرچم کو سر بلند کرنے کی خاطر قربان کیں۔ اس سے معلوم ہوا سامراجی طاقتیں اپنے مخلص سپاہیوں کو کس قدر Motivation دیتی ہیں، انڈیا گیٹ اس کی ایک نمایاں مثال ہے۔ ایک سامراجی قوت نے غیر مذہب اور غیر علاقائی افراد کو نہ صرف بھرتی کیا بلکہ ان میں اس قدر جذبہ بھر دیا کہ وہ بسا اوقات اپنے ہم مذہب اور ہم قوم لوگوں سے بھی لڑنے سے نہیں چُوکے۔ اس موقع پر شرما نے بڑی دل لگتی بات کہی "صاحب ! دلی میں عمارتیں اور یادگاریں یا تو مسلمانوں نے قائم کیں یا انگریزوں نے، ہم ہندو لوگ تو یہاں آکر رہ رہے ہیں۔" اگرچہ نیو دلی میں مندر، گردوارہ، چرچ سب موجود ہیں مگر اُن میں وہ عظمت، شان اور رفعت نہیں پائی جاتی جو ان متذکرہ بالا عمارات کا حصہ ہے۔

GangDaryaatLunch

بھوک چمک چکی تھی۔ ڈرائیور سے ہم نے کہا کہ کسی حلال فوڈ والے ہوٹل پر ہمیں لے جاؤ۔ انڈیا میں ہر چھوٹے بڑے ہوٹل میں Vegetarian اور Non-Vegetarian کی تخصیص ہے۔ ہندو مذہب میں نہ صرف گائے بلکہ ہر طرح کا گوشت

منع ہے یہی وجہ ہے کہ مذہبی طور پر مضبوط ہندو گھرانے صرف سبزیوں اور دال پر گزارہ کرتے ہیں۔ شرمانے تو یہاں تک بتا کر ہمیں حیران کر دیا کہ ہم تو انڈہ وغیرہ بھی نہیں کھاتے۔ گویا سبزی دال تو آپ کو ہر ہوٹل پر مل جائے گی۔ گائے کا گوشت فروخت کرنا یا کھانا مذہبی احترام کی وجہ سے ممنوع ہے۔ چکن اور مٹن ہوٹلوں پر دستیاب ہے مگر پہلے آپ کو معلوم کرنا پڑے گا کہ وہ حلال طریقہ سے ذبح بھی کیا گیا ہے یا نہیں؟ جامع مسجد دلی سے نصف میل کے فاصلے پر سڑک کے کنارے، ایک آہنی فلائی اُوور کے نیچے ایک مسلمان کی دکان مل گئی جس نے اپنے ایمانی اعلان کے طور پر "اللہ" کا بورڈ آویزاں کیا ہوا تھا۔ وہاں نہ صرف ہم نے کھانا کھایا بلکہ ہوٹل کے مالک سے مسلمانوں کی حالت، حالیہ انڈو پاک کرکٹ میچ سمیت مختلف موضوعات پر بات چیت کی۔ اس کے لہجے میں روایتی مسلمانی کا فخر واضح جھلکتا تھا۔ دلی کے تمام باسیوں کی طرح اس کی گفتگو میں فریق ثانی (ہندوؤں) کے لیے کسی حد تک تحقیر کا عنصر بھی پایا جاتا تھا۔ مدراس کرکٹ میچ جیتنے پر وہ بہت خوش تھا جبکہ دلی کے حالیہ میچ میں متوقع شکست کے متعلق اس کا دلچسپ تبصرہ یہ تھا کہ پاکستانی ٹیم کی ناقص کارکردگی اور میچ کی صورتحال دیکھتے ہوئے "ہم نے تو کلمہ پڑھ لیا ہے" گویا ذہنی طور پر پاکستان کی شکست کے لیے تیار ہو گئے ہیں۔ اگرچہ ان دنوں میں ہماری زیادہ مسلمانوں سے گفتگو نہیں ہوئی مگر محسوس یہ ہوا کہ انڈیا کے عام مسلمان ہندو نیشنلزم کی عمومی لہر کے باوجود پاکستان سے ایک جذباتی یا مذہبی وابستگی ضرور رکھتے ہیں۔ ہوٹل کے مالک نے بھی ہمیں بتایا کہ پاک انڈیا میچ میں مسلمان پاکستان کو سپورٹ کرتے ہیں۔ گویا یہ کہا جاسکتا ہے کہ جذباتی طور پر ان کے دل پاکستان کے ساتھ دھڑکتے ہیں۔

جامع مسجد دلّی

جامع مسجد دلّی مسلمانوں کی مذہبی یا سیاسی قوت کے اظہار کا ذریعہ سمجھی جاتی ہے۔ اس کا مقام انڈیا میں وہی ہے جو ہمارے ہاں بادشاہی مسجد کا ہے، یہاں کے امام کو شاہی امام کہا جاتا ہے۔ یہ ہندوستان میں مسلمانوں کے تحفظ کی علامت ہے۔ یہاں کے امام عبد اللہ بخاری متعدد بار پاکستان آچکے ہیں۔ مختلف حوالوں اور متنازعہ بیانات کی بازگشت میڈیا اور پارلیمنٹ میں سنائی دیتی ہے۔ آج کل عبد اللہ بخاری صاحب کے بیانات سیٹیلائٹ چینل اور اخبارات کی زینت اس لیے بھی ہیں کہ سلمان رشدی کی بھارت آمد متوقع ہے حکومت ہند کی طرف سے دورے کی اجازت ملنے پر امام عبداللہ بخاری برہم ہیں۔ دلّی کی جامع مسجد کے مقام، احترام اور تاریخ سے قطع نظر اسے دیکھ کر ہمیں کچھ ٹھیس پہنچی۔ تنگ و تاریک گزر گاہیں) مسجد تک پہنچنے کے لیے (سیڑھیوں پر بھکاریوں کی ان گنت قطاریں، جوتوں اور کیمروں کی فیس۔ حسبِ معمول اور حسبِ توقع زیر تعمیر/زیر مرمت کے بورڈز، کبوتروں کی گندگی اور صفائی کی کمیابی۔ قصہ مختصر یہ کہ جو شکوہ، بادشاہی مسجد لاہور کا ہے وہ یہاں دیکھنے میں نہیں آیا۔ مسجد میں داخل ہوئے تو نمازِ عصر شروع تھی۔ جس تالاب سے ہم نے وضو کیا وہ بھی آلودہ تھا۔ اگرچہ مسجد اللہ کی عبادت اور ذکر کرنے کی جگہ ہے۔ یہاں رنگ و روغن اور آرائش و زیبائش سے زیادہ اللہ کی جلالت، ہیبت اور عظمت کا سکہ بیٹھنا چاہیے مگر یہاں تو "الطھور من الایمان" سے لے کر "ذروالبیع" تک سب کی خلاف ورزی نظر آرہی ہے۔ ہمیں اس محرومی کا احساس اس لیے بھی زیادہ تھا کہ آج صبح ہم Temple Lotus کی سیر کرکے آئے ہیں جو نظافت اور صفائی سے لے کر طرزِ تعمیر تک ہر لحاظ سے ممتاز و منفرد تھا۔ اگرچہ بہائیوں کا یہ مرکز عمارتی حسن کے پردے میں مذہب کی تبلیغ تھا) کیونکہ ان کے پاس عقل، ضمیر اور دل کو قائل کرنے والے وہ دلائل موجود نہیں ہیں جو اسلام کے پاس ہر دور میں ہر ایک کے

لیے ہوتے ہیں (۔ ہم نے یہ سوال اپنے ذہن میں محفوظ کر لیا تاکہ اس دورے کے دوران کسی مسلمان رہنما سے اس کا جواب پوچھا جاسکے کہ انڈین مسلم کی موجودہ نفسیات کیا ہے؟ انڈیا کے معروضی حالات میں مسلمانوں کے لیے کس طرح کی لیڈر شپ بہتر ہے؟ اور موجودہ چیلنجز میں کس قسم کی قیادت ان کو درست رہنمائی فراہم کر سکتی ہے؟

جامع مسجد دلّی، لال قلعہ کے قریب واقع ہے۔ جامع مسجد کا مرکزی دروازہ ،لال قلعہ کے لاہوری دروازہ) جو آج کل آمد و رفت کے لیے استعمال ہوتا ہے (کے بالکل سامنے ہے اگرچہ ان دونوں عمارتوں کے درمیان لگ بھگ دو کلومیٹر کا فاصلہ حائل ہے۔ جامع مسجد کے قرب وجوار میں چاندنی چوک، اُردو بازار) نئی سڑک (اور حوضِ خاص کے علاقے ہیں۔ ہم نے مسجد کے چاروں اطراف موجود علاقوں کا پیدل دورہ بھی کیا۔ نئی سڑک کتابوں کی بہت بڑی مارکیٹ ہے۔ ہوٹل واپسی سے قبل ہم نے انصاری روڈ پر ایک بُک سیلر سے کتابوں کی خریداری کی۔ رات کا کھانا ایک چھوٹے سے خوبصورت ہوٹل مغلائی دربار سے کھایا۔ مشتاق مانگٹ صاحب پنیر کے دلدادہ ہیں جبکہ میں اپنے دیس سے باہر عموماً چاول کو ترجیح دیتا ہوں، مجھے کم از کم بنگلہ دیش اور ترکی کا دورہ یہی بتاتا ہے کہ اگر کسی غیر ملک کی خوراک آپ کو نہ بھائے یا سمجھ نہ آئے تو آپ کے لیے چاول سب سے بہتر انتخاب ہیں۔ عمر فاروق صاحب ہم دونوں میں ''بیچ کی راس'' ہیں وہ جو صبر شکر سے ہر چیز کھا لیتے ہیں۔

شرما ڈرائیور نے ہماری خواہش پر ایک دوسرے ہوٹل کا انتخاب کیا۔ آج رات ہم Hotel Omni گزاریں گے جو قرول باغ میں واقع ہے۔ یہ ہوٹل پہلی نظر میں گذشتہ سے معقول دکھائی دیا۔ استقبالیہ پر موجود عملہ کا رویہ بھی بہتر اور مؤدبانہ تھا۔ ابھی تک ہوٹلز میں ہمارا معمول یہ تھا کہ ہم دو یا تین علیحدہ کمرے لینے کے بجائے اضافی بیڈ کے ساتھ ایک ڈبل روم لیتے تھے۔ اس سے نہ صرف تبادلہ خیال کی سہولت ہوتی بلکہ

اوقات کو بہتر استعمال کیا جاسکتا تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد ہوٹل کی Keeping House میڈم رینو یہ معلوم کرتی ہمارے کمرے میں آگئی کہ آپ میں سے میانوالی کا کون ہے؟ تفصیل پوچھنے پر معلوم ہوا کہ اس کے والدین کا تعلق میانوالی کے محلّہ عالم خیل سے تھا جو 1947 میں انڈیا آگئے۔ وطن سے دور دلی شہر میں ایک علاقائی شناسائی ہاتھ آگئی۔ جس طرح پاکستان کے باسی انڈیا میں موجود اپنے علاقوں کے متعلق ایک Thirst Imagination رکھتے ہیں ویسا ہی حال ان لوگوں کا ہے جو پاکستان کے علاقوں سے ہجرت کرکے انڈیا آئے ہیں۔

تاج محل آگرہ

آج کا پروگرام ایک ٹورسٹ کمپنی کے ساتھ طے شدہ ہے۔ ہم نے اپنے سفر اور شوق کی باگیں ایک ٹریولنگ ایجنسی کے ہاتھوں میں تھمادیں ہیں۔ آگرہ اور اس کے نواح کی ایک روزہ سیر صبح ساڑھے چھ بجے شروع ہوئی۔ جب ٹورز اینڈ ٹریولرز نامی کمپنی کی گاڑی ہوٹل سے ہمیں لینے آئی۔ آگرہ دلی سے لگ بھگ 200 کلومیٹر ہے مگر جگہ جگہ سیّاحوں کو لینے، درمیان میں ناشتے کے وقفہ کے ساتھ ہم خدا خدا کرکے ساڑھے پانچ گھنٹے میں آگرہ پہنچے۔ آگرہ سے پہلے ہی پرانے قلعے، اونچے دروازے اور بڑے بڑے مزارات اس کی آمد کی خبر دے رہے تھے۔ کم از کم میری شدید خواہش تھی کہ ان تمام جگہوں پر جایا جائے مگرTour Guidedمیں یہ ممکن نہیں۔ مشتاق مانگٹ صاحب کی پختہ رائے ہے کہ تاریخی عمارات اور نئے مقامات کی سیر کیلیے گائیڈ کو ضرور ہمراہ لینا چاہیے۔ اس لیے کتابی معلومات اور موقع پر موجود رہنمائی کے باوجود ایک گائیڈ کے ہمراہ آپ ان مقامات سے صحیح اور مکمل واقف ہو سکتے ہیں ویسے بھی کتابوں اور سرکار کی رہنمائی سے زیادہ معلومات افراد کے پاس ہوتی ہے جبکہ میرا مؤقف یہ تھا کہ گائیڈز کی اکثریت کے پاس رٹی رٹائی معلومات ہوتی ہیں جسے آپ کتابوں سے بھی معلوم کر سکتے ہیں۔ اس سے بھی بڑی وجہ یہ

ہے کہ گائیڈ کی ہدایات اور رہنمائی آپ کے مشاہدے کو محدود اور لطف کو مسدود کر دیتی ہیں۔ یہاں جاؤ اور یہاں نہ جاؤ۔ اتنے وقت سے قبل واپس آجاؤ، یہ کھاؤ اور وہ مت کھاؤ، وغیرہ وغیرہ۔ جب آپ کی لگامیں کسی اور کے ہاتھوں میں ہوں تو سمت اور وقت دونوں آپ کے اختیار سے باہر ہوجاتے ہیں بہرحال دونوں آراء کی اپنی اپنی اہمیت ہے۔ ابھی تک دیکھے گئے مقامات میں ایک مسئلہ یہ بھی پیش آتا رہا کہ حکومت ہند یا ریاست کی طرف سے مختلف آثارِ قدیمہ پر رہنمائی اور معلومات ضرورت سے بھی کم دستیاب تھی۔ مسلمانوں کے تاریخی مقامات، حکومتِ ہند کی آمدن کا ایک بہت بڑا ذریعہ ہیں۔ لاکھوں سیّاح ہر سال دنیا کے طول و عرض سے ان مقامات پر کھنچے چلے آتے ہیں لیکن چند ایک مقامات کے سوا اکثر جگہوں پر دیکھ بھال، تعمیرِ نو اور سیّاحوں کی بہتر انداز میں رہنمائی کا موقع کم ہی نظر آیا۔ اگرچہ پاکستان میں بھی صورتحال کم و بیش ایسی ہی ہے مگر پاکستان کے مقابلے میں ہندوستان کے پاس تاریخی سرمائے کا زیادہ بڑا حجم اور تنوع پایا جاتا ہے۔

شاہی قلعہ آگرہ

شاہی قلعہ آگرہ دو کلومیٹر کے رقبے پر پھیلا ہوا ہے۔ جس کا دو تہائی انڈین آرمی کے زیرِ استعمال ہے جبکہ قابلِ دید حصہ میں ایک معقول حصہ بالخصوص موتی مسجد زیر مرمت ہے،۔۔۔ مقامی گائیڈ نے بتایا کہ جہانگیر کی متعدد بیویوں میں سے ایک کا محل اس قلعے کا حصہ رہا ہے۔ قلعے کے جھروکوں سے تاج محل کا نظارہ کیا جو تقریباً دو تین کلو میٹر کے فاصلے پر دریائے جمنا کے کنارے واقع تھا۔ برصغیر میں موجود مسلمانوں کے اکثر قلعوں کی طرح آگرہ کے قلعے میں بھی آرکیٹکچر، سہولیات، اندرونی تقسیم اور زینت وآرائش کا ایک جیسا انداز اختیار کیا گیا تھا جن میں دیوانِ عام ''دیوانِ خاص، شیش محل، موتی مسجد، بیگمات کے محلات'' وغیرہ شامل تھے۔

روایتی ہندی کھانا

آگرہ کینٹ کے ایک ہوٹل میں ہم نے تھالی فوڈ کا انتخاب کیا ایک ٹرے میں چھوٹی چھوٹی چار پانچ تھالیاں ڈیزائن کی گئیں تھیں جن میں دال، چاول، سبزی ،دہی، سلاد اور روٹی سبھی کچھ موجود تھا۔40سے 45روپے ایک ٹرے کی قیمت تھی۔ ہندوؤں کے کھانے کے مخصوص انداز کو ٹیلی ویژن پر تو کئی بار دیکھا مگر آج اس کا عملی تجربہ بھی ہو گیا۔ بچپن سے سنا تھا کہ چھوت چھات کے پیشِ نظر ہر ہندو اپنی تھالی میں علیحدہ کھاتا ہے۔ان کے برتن بھی چھوٹے چھوٹے ہوتے ہیں جبکہ مسلم ثقافت میں لوگ مل کر کھاتے ہیں اور اجتماعی کھانے کو تحسین کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے، مجھے اس طرح کے کھانے سے یہ تاثر ملا کہ ہر فرد خود غرضی سے کھانا کھائے، ہمارے ہاں دوسرے کا اکرام کیا جاتا ہے بہر حال یہ بھی ایک مشاہدہ/ تجربہ تھا۔

تاج محل

غالباًساحر لدھیانوی یا کسی اور نے کہا تھا کہ

اک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر

ہم غریبوں کی محبت کا اڑایا ہے مذاق

اس میں مختلف افراد کی مختلف رائے ہو سکتی ہے۔ مگر یہ ایک آنکھوں دیکھی حقیقت ہے کہ تعمیر میں تاج محل اپنی مثال آپ ہے۔ اگرچہ اس کا سفید پتھر گہنا چکا ہے۔ مگر تعمیر کے سینکڑوں سال گذرنے کے باوجود دیکھنے کی لذّت باقی رہتی ہے۔

لوٹ جاتی ہے ادھر کو بھی نظر کیا کیجیے

اب بھی دلکش ہے ترا حسن مگر کیا کیجیے

سیاحوں بالخصوص غیر ملکی سیاحوں کا ایک ہجوم تھا جو محبت، حسن تعمیر اور مغل سلطنت کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے آیا ہوا تھا۔اتوار کی وجہ سے معمول سے زیادہ سیّاح موجود تھا۔پورے ہندوستان میں ہفتہ اور اتوار دو تعطیلات ہوتی ہیں جبکہ جمعہ کے دن ان مقامات) خواہ دلی میں ہوں یا کہیں اور (کی زیارت بلا معاوضہ ہوتی ہے کیونکہ مسلمانوں کا یہ مؤقف ہے کہ آثار قدیمہ اور تاریخی مقامات ہونے کے ساتھ ساتھ یہ جگہیں ہمارے اسلاف کے مقابر اور مساجد بھی ہیں۔اس لیے حکومت ہند نے جمعہ کے دن ان مقامات کو ٹکٹ سے مستثنیٰ کیا ہے۔ایک اندازے کے مطابق تاج محل کی حدود میں ایک منٹ میں ہزاروں فوٹو گراف لیے جا رہے تھے۔فلیش کی چکا چوند، کیمروں کی آوازیں آپ کو ہر کونے کھدرے میں سنائی دیں گی۔

مشتاق مانگٹ صاحب کی رائے یہ تھی کہ جس وقت مغل بادشاہ ہندوستان میں مقبروں کی آرائش و تعمیر میں لگے ہوئے تھے اس وقت یورپ علمی ترقی، تعلیمی اداروں کے قیام اور جدید تحقیقات کے لیے پر تول رہا تھا۔یہی وجہ ہے کہ مغلوں کے بعد جو زوال آیا تو پھر ساری مغل سلطنت ایک ایک کرکے انگریزوں کے ہاتھوں فتح یاب ہو گئی۔یہ ایک ایسا موضوع ہے جس پر بات کی جا سکتی ہے، لکھا جا سکتا ہے، اختلاف کیا جا سکتا ہے ۔بادشاہت کا بھی اپنا مزاج ہوتا ہے۔تاج محل سے باہر ایک بڑا مزار) جو کم عالیشان نہیں تھا (ممتاز بیگم کی سہیلی کا تھا۔اسی طرح معلوم ہوا کہ ہمایوں کے مقبرے کے برابر ہی اس کے نائی کا مزار ہے، جس کا گنبد دور سے ہی نظر آتا ہے۔

ماتھورا اور ورندہ بن

آگرہ سے واپسی پر ہماری بس ہندو مذہب کے دو مقدس مقامات سے گزری۔ماتھورا جو کہ ہندو بھگوان کرشنا کی جنم بھومی ہے دوسرا برندہ بن یا ورندہ بن جہاں 4 ہندو جوگیوں نے 14 برس ریاضت کرکے کرشنا کا بُت زمین سے برآمد کیا تھا۔

ورندہ ہندی میں تُلسی کو اور بن جنگل کو کہتے ہیں۔ میرے لیے کسی بھی مندر کی تفصیلی سیر کا یہ پہلا موقع تھا اس لیے میں پُر جوش بھی تھا۔ ماتھورا کا مندر ایک پہاڑی پر تعمیر شدہ ہے جو تین منزلوں پر مشتمل ہے۔ ہم تقریباً ایک گھنٹہ یہاں موجود رہے۔

آج صبح سے ہم جس بس میں سوار تھے اس میں 40 کے لگ بھگ ٹورسٹ تھے۔ ان میں سے کچھ مسلمان تھے اور باقی دلّی سے آگرہ کے رُوٹ پر رہنے والے مقامی افراد تھے۔ ٹورسٹ کی اکثریت سے چند باتیں ظاہر ہوتی ہیں۔ (1) انڈیا میں یہ سیاحت کا سیزن ہے۔ (2) ہندوستان بذاتِ خود اتنا بڑا ملک ہے کہ اس کی بہت بڑی آبادی نے ابھی تک اپنے ملک کے قابلِ ذکر مناظر اور آثار کو نہیں دیکھا۔ ہمارے ساتھ ممبئی کا ایک نوجوان رام سفر کر رہا تھا جو 24 سال میں پہلی مرتبہ تاج محل دیکھنے آیا تھا۔ ہم تین پاکستانیوں کے علاوہ ایک مسلمان جوڑا جسے مشتاق صاحب نے Couple Unmatched کا نام دیا تھا، ہمارے شریک سفر تھا۔ یہ ایک بڑی عمر کے عرب مرد اور نوجوان ہندوستانی لڑکی پر مشتمل تھا۔

ماتھورا سے برندہ بن کی طرف روانگی شروع ہوتے ہی گائیڈ نے سماں باندھ دیا۔ برندہ بن، ماتھورا سے 15 منٹ کے فاصلے پر ہے۔ انڈیا کے سفر میں ہمیں یہ پہلا گائیڈ نظر آیا جو نہایت چرب زبان، زِیرک اور حاضر جواب تھا۔ چونکہ بس میں ہندوؤں کی اکثریت تھی اس لیے اس نے اپنی زور دار، پُر اثر اور مذہبی گفتگو سے لوگوں کو خوب Exploit کیا۔ گائیڈ نے بتایا کہ اورنگزیب نے اس مندر پر حملہ کیا، ماتھورا کے مندر پر قبضہ کرنے کے بعد جب برندہ بن پہنچا تو اندھا ہو گیا۔ یہاں سے پجاری، بھگوان کے بُت کو پہلے ہی جے پور لے جا چکے تھے۔ عالمگیر نے معافی مانگی تو کہیں جا کر اس کی بینائی واپس آئی۔ اس موقع پر اس نے شکرانے کے طور پر ایک ہیرا بھگوان کو دان کیا جو آج بھی کرشنا کی تھوڑی (Chin) پر جڑا ہوا ہے۔ آگرہ کے قلعے میں گائیڈ کی غلط بیانی کے بعد یہ دوسرا موقع تھا جب مجھے محسوس ہوا کہ ان سارے بیانات کی تحقیق ہونی چاہیے۔ بس سے اُتر کر

گائیڈ نے تمام زائرین کو مندر کے آداب اور احترام سے آگاہ کیا۔ میں نے مندر کے اندر جانے سے قبل کچھ ہچکچاہٹ کا اظہار کیا تو مشتاق صاحب نے کہا کہ یہ بھی تجربہ اور مشاہدے کا حصہ ہے۔

بھگوان کے سامنے حاضری اور پوجا کا بھی پورا ماحول بنایا گیا، پہلے بس کے اندر گائیڈ اور پھر بھگوان کے درشن سے قبل مہا پجاری نے مکمل Orientation دی۔ لوگوں کو باور کرایا کہ وہ اپنی خوش قسمتی پر ناز کریں کہ انھیں یہاں آنے کا موقع ملا۔ یہاں کسی قسم کی قربانی زبردستی نہیں کی جاتی۔ مگر اس کے باوجود مہا پجاری نے اس طرح کا ماحول بنا دیا کہ بھگوان کے درشن کے بعد لوگوں کو چاروناچار کچھ نہ کچھ دینا ہی پڑا۔ برہمن نے 'انفاق' کے لیے مختلف آپشن رکھے جن میں 260 روپے سے لے کر 1500 روپے تک شامل تھے۔ قربانی کا بڑا Incentive روحانی تسلّی کے ساتھ ساتھ یہ تھا کہ مندر کی دیوار پر خیرات کرنے والے اور اس کے ماں باپ، بچوں کے نام کی تختی آویزاں کر دی جائے گی۔ مندر کے اندر دیواروں پر اس نوعیت کی ہزاروں تختیاں نصب تھیں۔ برہمن کے بقول اس مندر کے زیرِ انتظام دو ہزار بیواؤں کے قیام و طعام کا انتظام ہے جو ان لوگوں کے لیے دن رات دعائیں کرتی ہیں، جو مندر کی تعمیر کے لیے خرچ کرتے ہیں جبکہ پانچ ہزار گائیں گاؤشالہ میں موجود ہیں جن میں ایسی گائیں بھی ہیں جو کمزوری کی وجہ سے اٹھ بھی نہیں سکتی) ہندو مذہب میں گائے کو مارنا سخت گناہ ہے (برہمن کا بھاشن سننے کے بعد ہم باہر نکلے تو ایک اور پروہت نے مجھے ٹیکا لگانے اور ماتھا ٹیکنے کو کہا، میں نے یہ کہہ کر اپنی جان چھڑائی کہ میں الحمد اللہ مسلمان ہوں۔ ہندوؤں کی عبادت گاہیں ان کے مذہب کی عکاسی کرتی ہیں۔ تنگ و تاریک کمرے، کمرے کے اندر کمرہ اور اس کے اندر ایک اور کمرہ اور اس کے آخر میں رکھا گیا شیو شنکر، گنیش، ہنومان یا کرشن وغیرہ۔ ننگ دھڑنگ پنڈت، منہ کے بل گرے ہوئے پجاری۔ تیل کے الاؤ سے کالی ہونے والی

دیواریں۔۔۔۔یہ تھے مذہبی مراکز کے مظاہرءَارباٌبٌ متفرقون خیرٌاَواَمِ اللّٰہِ الواحد القہار)کیا یہ سب متفرق معبود بہتر ہیں یا ایک واحد قہار اللہ۔(

رات کا کھانا مشتاق صاحب کے دوست، رنبیر سنگھ مانگٹ صاحب کے ہمراہ کھایا جو کئی دنوں کی کوشش اور رابطوں کے بعد بالآخر آج مل ہی گئے۔رات کا کھانا کھانے کے لیے انھوں نے ''پنڈی ریسٹورنٹ'' کا انتخاب کیا، تفصیل جاننے پر معلوم ہوا کہ ہوٹل کے ہندو مالک کا تعلق خطۂ پوٹھوہار، راولپنڈی سے تھا۔ کھانا بلا شبہ مزیدار، لاجواب اور بھر پور تھا دوران سفر میں نے پہلی مرتبہ خوب پیٹ بھر کر کھانا کھایا۔رات دلی سے مدراس کے لیے ہماری ٹرین ساڑھے دس بجے تھی۔ کھانے سے قبل ہم تھوڑی دیر کے لیے نظام الدین اولیاء کے مزار پر فاتحہ اور زیارت کے لیے گئے۔نظام الدین اولیاء کی درگاہ پر ہم نے وہ سب کچھ ہوتے دیکھا جو ہمارے ہاں سیّد علی ہجویری کے مرقد مبارک پر ہوتا ہے۔ جس طرح برندہ بن کے مندر میں ہندو پروہت رجسٹر لے کر لوگوں کو خیرات کے عوض نروان کی نوید سُنا رہے تھے۔یہاں بھی متعدد مذہبی پیشہ ور مستحق اور غریبوں میں کھانا تقسیم کرنے کی سہولت کا اعلان کر رہے تھے۔مزار سے چند سو فٹ ادھر چھوٹے سے احاطے میں ایک قبر نظر آئی۔احاطے کے اندر جانے والے دروازے پر تالا لگا ہوا تھا۔شاید اس لیے کہ بھکاری اور نشہ آور افراد گندگی نہ پھیلا دیں۔پوچھنے پر معلوم ہوا کہ یہ اس شہنشاہ غزل غالب کی آخری آرام گاہ ہے جس کا طوطی آج بھی بولتا ہے۔وہ غالب جس کے تغزّل کا لوہا مولانا مودودیؒ اور اقبال نے بھی تسلیم کیا ہے۔اس حالت میں کیا محو خواب ہے کہ:

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

مزارِ غالب سے چند قدموں کے فاصلے پر غالب اُردو اکیڈمی ہے جس کے کُتب خانے میں مجھے دیوانِ غالب کا کوئی ایسا نسخہ نہ مل سکا جسے میں اس کی نشانی کے طور پر پاکستان لے جاسکوں۔

ہمایوں کا مزار

نظام الدین اولیاء کے مزار مبارک کے بالمقابل تقریباً پیدل فاصلے پر ہمایوں کا مقبرہ موجود ہے۔مزار ایک بہت بڑے احاطے میں ہے۔مرکزی دروازے سے اندر داخل ہوتے ہی شیر شاہ سوری کے گورنر موسیٰ کا مقبرہ نظر آتا ہے جو ہشت پہلو ہے اسے چھوڑ کر مزید آگے بڑھتے ہیں تو دائیں طرف ایک بڑی مسجد کے گنبد استادہ ہیں۔ مسجد خود تو اللہ کی تکبیر کا اظہار ہے مگر مسلمان حکمرانوں کے مقابر کے گرد موجود اکثر مساجد اب بے آباد اور ویران ہیں۔حکومتِ ہند کو مساجد کی دیکھ بھال سے زیادہ مقابر کی فکر ہے جو سیاحوں کی آمدورفت کے سبب آمدن کا ذریعہ ہیں مسلمان اگر موجود بھی ہیں تو کم، کمزور اور بکھرے ہوئے۔ان دونوں آثار کے بعد ایک بڑے دروازے سے داخل ہوتے ہیں۔تو دو منزلہ عمارت نظر کے راستے دِل میں اُتر جاتی ہے۔کہنے والے کہتے ہیں کہ تاج محل دراصل مقبرہ ہمایوں کے ڈیزائن کی توسیع اور تکمیل ہے اور یہ بات درست ہی نظر آتی ہے۔ ہمایوں کا مزار کیا ہے، حکمران خاندان کا ایک قبرستان ہے۔جس میں ڈیڑھ سو کے لگ بھگ مزار ہیں۔ان مزارات میں ہمایوں کی بیگم، بیٹیوں سے لے کر دار اشکوہ تک کے مدفن شامل ہیں۔مقامی سیاح ہمایوں کی قبر کے پہلو میں ہمیں ایک چھوٹے کمرے میں لے گیا یہ وہ حجرہ تھا جہاں آخری مغل فرمانروا بہادر شاہ ظفر نے لال قلعہ سے بھاگ کر پناہ لی تھی۔ یہیں پر اُس کے سامنے اس کے بیٹوں کے سروں کو طشت میں ڈال کر لایا گیا تھا شاید یہی وجہ ہے مقبرہ ہمایوں کے بالکل سامنے جو دروازہ ہے اسے خونی دروازہ کہا جاتا ہے۔یہ دروازہ اب دو بڑی سڑکوں کے درمیان ’’گرین بیلٹ‘‘ پر آتا ہے۔

دلی میں آخری دن

آج کے دن کا غالب حصہ وزراتِ داخلہ کے متعلقہ سیکشن میں گذر گیا۔ میری خواہش تھی کہ مجھے باقی شہروں کیلیے پولیس رپورٹ نہ کرنی پڑے۔ یہاں آکر معلوم ہوا کہ یہ دفتر بھی برِ صغیر کے روایتی دفتروں کی ٹھیک ٹھیک نمائندگی کرتا ہے۔ صبح 10:30 بجے مجھ سے تحریری درخواست لے لی گئ اور دوپہر 2:30 بجے بتایا گیا کہ پولیس رپورٹ سے استثنیٰ تو صرف پاکستان میں موجود انڈیا ہائی کمیشن سے مل سکتا ہے حالانکہ یہ بات مجھے صبح ہی بتائی جا سکتی تھی۔ مشتاق صاحب اور عمر فاروق صاحب اس دوران IIT اور پرگتی میدان چلے گئے۔ انڈین انسٹیوٹ آف ٹیکنالوجی، ہندوستان کے انجینئرنگ کے بڑے اداروں میں سے ہے۔ برٹش دور میں یہ ادارے انڈیا سمیت مختلف ممالک میں بنائے گئے تھے۔ IIT قطب کمپلیکس کے قریب ایک بہت بڑے قطعہ اراضی پر مشتمل ہے جس میں کیمپس، ہوسٹلز، رہائشی کالونی وغیرہ شامل ہیں۔ اس ادارے میں انجینئرنگ کے کئ شعبے قائم ہیں۔ پرگتی میدان کرکٹ میچز کے لیے معروف فیروز شاہ کوٹلہ سٹیڈیم سے زیادہ دُور نہیں جو سارا سال کانفرنسوں، نمائشوں اور سیمیناروں کا مرکز ہوتا ہے۔ اس میدان میں جو خود بہت وسیع ہے متعدد گراؤنڈز اور آڈیٹوریم ہیں گذشتہ دنوں یہاں ٹیکسٹائل ایکسپو ختم ہوئی ہے اور آئندہ چند دنوں میں آٹو موبائیلز کی نمائش شروع ہونے والی ہے۔ میری کم نصیبی یہ رہی کہ دفتری بابوؤں کی ٹال مٹول، ناز برداری کے سبب میں ان دونوں مقامات کی سیر سے محروم رہا۔

انڈین ریل

انڈ ریل، انڈین ریلوے کا مخفف ہے۔ ہندوستان کی ریلوے سے غائبانہ تعارف بہت پرانا ہے۔ چند سال قبل میں جمعیت کے کسی پروگرام میں شرکت کے لیے شالیمار ٹرین کے ذریعے لاہور سے سکھر جا رہا تھا۔ گرمی کے موسم میں جب ٹرین کے AC نے کام

کرنا بند کر دیا تو میری ساتھ والی نشست پر بیٹھے مسافر نے پاکستان ریلوے کو صلواتیں سنانے کے بعد بتایا کہ اسے کاروبار کے سلسلہ میں دلّی سے مدراس جانا پڑا، شدید گرمی کے موسم میں 30 گھنٹے کے سفر میں اس ٹرین کا AC اس قدر جاندار تھا کہ اُسے بار بار جسم کا درجہ حرارت نارمل کرنے کیلیے دروازے پر آنا پڑتا۔ بعد میں کئی شناسا احباب نے ہندوستانی ریلوے کے حوالے سے اس تاثر کی تصدیق کی۔

آج ہندوستان کی سر زمین پر مجھے ریل کے پہلے سفر کا سامنا تھا ، لہٰذا Fascination ایک لازمی امر تھا۔ سب سے پہلے تو میں یہ جان کر مرعوب ہو گیا کہ نیو دلی کے سٹیشن پر 12 سے زیادہ پلیٹ فارم ہیں۔ آر ایس مانگٹ صاحب کے ہمراہ ریلوے بک اسٹال سے جا کر جب ٹائم ٹیبل Glance at a Railway Indian لے کر ابتدائی مطالعہ کیا تو متاثر ہونے کا ابتدائی تاثر مزید پختہ ہو گیا۔ انڈین ریلوے دنیا کی دوسری بڑی ریلوے لائن ہے۔ جس پر 7000 سے زائد ریلوے سٹیشن پائے جاتے ہیں۔ ہمارا سفر نیو دلی سے مدراس) حالیہ چنائے (جو 33 گھنٹے اور تقریباً 2200 کلو میٹر پر مشتمل تھا) یہ لاہور سے کراچی تک دو گنا سفر بنتا ہے (۔ یہ تامل ناڈو ایکسپریس ہے۔ ریلوے کا تمام تر نظام کمپیوٹرائزڈ ہے۔ مدراس میں جب ہمیں ممبئی کے لیے بکنگ کرانا پڑی تو معلوم ہوا کہ واقعی یہ نظام بہت پھیلا ہوا، منظّم اور موٴثر ہے۔ تامل ناڈو ایکسپریس 33 گھنٹے بعد ٹھیک وقت پر چنائے پہنچی۔ ہم چونکہ AC کلاس کے مسافر تھے اس لیے راستے میں مکمل بستر گاڑی والوں نے فراہم کیا۔ پاکستان ریلوے کی طرح خوانچہ فروشوں کی کوئی لوٹ مار نہ تھی۔ خرید کا تمام کام کیٹرنگ والوں کی ذمہ داری تھا۔ ہمیں بتایا گیا کہ راجدھانی ایکسپریس)فرسٹ کلاس کیٹگری کی ٹرین (میں بستر کے ساتھ ساتھ کھانا بھی ہوائی جہاز کی طرح ٹکٹ میں شامل ہوتا ہے۔ نشستیں بے حد مناسب تھیں۔ کوئی بھی سٹاپ 10 منٹ سے زیادہ نہ تھا۔ تامل ناڈو ایکسپریس ہریانہ، مہاراشٹرا، آندھراپردیش، مدھیہ پردیش سے ہوتی ہوئی تامل ناڈو کے صوبے میں داخل ہوئی۔

ریل کے بڑے ڈبے کے چھوٹے سے کیبن میں ہم تینوں کے علاوہ تین افراد مزید تھے۔ سردار صاحب جو پوٹھوہار کی زمین سے تعلق رکھتے تھے، بھوپال اتر گئے جبکہ پردیپ سکینہ اور پرتھوی بھٹہ چاریہ مدراس) چنائی (تک ہمارے ہمسفر رہے۔ سفر اس قدر لمبا تھا کہ باتیں، کتابیں، نیند اور مشاہدہ ختم ہو گیا مگر سفر جاری رہا۔ میں تو جمعیت کی زندگی میں مسلسل سفر کا عادی رہا ہوں۔ مشتاق صاحب ہر حال میں Adjust کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں جبکہ عمر فاروق صاحب کو مشکل ضرور پیش آ رہی تھی مگر انھوں نے ضبط اور صبر کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔

ہندوستانی سماج

انڈین سوسائٹی کے متعلق ابتدائی اندازہ تو نیو دلی کے ریلوے سٹیشن پر اترتے ہی ہو گیا تھا کہ مشرقی ، روایتی اور پر اسرار علوم کی زمین ہندوستان کی نئ نسل اندھا دھند مغرب، مغربی اقدار اور معیارات کی طرف بگٹٹ دوڑ رہی ہے۔ اعلیٰ اخلاقی اقدار، اجتماعی زندگی کو جو حسن، ترتیب اور اعتماد دیتے ہیں وہ ہندو مذہب کی نا معقولیت کی وجہ سے ویسے ہی ناپید ہے۔ ہندو مت جدید انسانی ذہن کو مطمئن کرنے سے قاصر ہے اس لیے ہندوستانی سماج پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑتی جا رہی ہے۔ سڑکوں پر روایتی ساڑھیوں سے زیادہ بلیو جینز میں ملبوس لڑکیاں نظر آئیں گی۔ ہندوستان کے سیٹلائٹ چینل ، مغربی میڈیا کا بالکل اسی طرح چربہ معلوم ہوتے ہیں جس طرح ہمارا PTV آج کل سٹار، ذی چینل کی کاپی کرنے میں کسی سے پیچھے نہیں۔ اگرچہ معیشت پاکستان کے مقابلے میں خاصی بہتر ہے۔ پاکستانی روپے کی قدر انڈین روپے سے خاصی گر چکی ہے۔ اس کے باوجود غربت کے آثار نمایاں ہیں۔ کمزور صحت، معمولی لباس، فٹ پاتھ پر زندگیاں معمول کے مظاہر ہیں۔ سیاسی طور پر آئے دن کوئی نہ کوئی جوار بھاٹا آیا ہی رہتا ہے۔ کبھی کوئی الحاقی پارٹی ناراض ہو جاتی ہے تو کبھی کوئی ریاست ناراض ہو جاتی ہے، کہیں صدارتی راج لگ

جاتا ہے تو کہیں اسمبلی تحلیل ۔ مگر اس کے باوجود حیرت ہوتی ہے کہ اتنی بڑی مملکت جو 63 ریاستوں ،ایک ارب سے زائد افراد ، کئی زبانوں اور متعدد مذاہب کا مجموعہ ہے، کس طرح گزشتہ 50 سال سے یکجا ہے۔

معلوم یہ ہوتا ہے کہ سیاسی اعتبار سے ہندوستان کی سیاسی جماعتوں، مقتدر قوتوں اور جمہور کا ایک اجماع/اتفاقِ رائے بن چکا ہے۔ سیاسی انتشار ، ناراضگیوں ، فتح و شکست کے باوجود کوئی فریق اس اجماع کو نظرانداز کرنے کے لیے تیار نہیں۔ خود ہمارے چند روزہ قیام کے دوران ایک صوبے میں گورنر راج نافذ ہوا۔ ایک صوبے میں کانگریس نے اپنے وزیراعلیٰ کو تبدیل کر دیا ، ایک یا دو دیگر ریاستوں میں بھی تبدیلی ہوئی مگر سیاسی انداز میں ۔ کسی سطح پر ہماری طرح نہ تو فوج کی طلب جاہ کی خواہش نظر آئی نہ بیوروکریسی کی محلاتی سازش ، گزشتہ دو سال میں اندر کمار گجرال ، دیو گوڈا اور واجپائی یکے بعد دیگرے وزیراعظم بنے جو اکثریت کھو بیٹھا وہ خاموشی سے مسند چھوڑ دیتا اور میدان میں آکر فریق مخالف کا مقابلہ کرتا ۔ بی جے پی اگر پارلیمنٹ کی اکثریتی پارٹی بنی تو زیادہ عرصہ کانگریس اُس کا راستہ نہ روک سکی اور اسے بی جے پی کی وزارت عظمیٰ کے لیے جگہ خالی کرتے ہی بنی۔ ہمارے پاکستان کی طرح نہ ہوا کہ منظور وٹو صاحب 17 نشستوں کے ساتھ دوسال کے لگ بھگ ملک کے سب سے بڑے صوبے میں وزارت اعلیٰ کے مزے لوٹتے رہے۔

دلی اور مدراس میں چند مقامی افراد اس بات کو تسلیم کرتے پائے گئے کہ اب انڈین سیاست بھی مالی کرپشن سے آلودہ ہوتی جارہی ہے ۔ نرسمہاراؤ جدید دور میں اس کے مجدد ہیں موجودہ حکومت میں جے للیتا کے خلاف کئی کیس عدالتوں میں زیر سماعت ہیں۔ منتخب اراکین اسمبلی میں ایسے لوگ بھی منتخب ہو کر آئے ہیں جن کا ماضی مشکوک ،

داغ دار اور منفی ہے۔ اس کے باوجود پاکستان کی نسبت اب بھی ہندوستان میں سیاسی کرپشن اور بدعنوانی اتنے عروج پر نہیں۔

مدراس سے چنائے تک

33 گھنٹے اور 2200 کلومیٹر کے اس پورے سفر کے دوران ہم تینوں انڈین ریلوے سے متاثر بلکہ مرعوب ہو چکے تھے۔ وہ ریلوے جو اپنے وطن میں آخری سانسیں لے رہی ہے، اس وسیع و عریض ملک میں اب بھی اپنا ایک مقام اور وقار رکھتی ہے۔ ایک صبح بیدار ہوئے تو بھوپال سٹیشن آ چکا تھا۔ نیچے اترنے پر ہٹو بچو کی صدائیں سنائی دیں ۔ معلوم ہوا کہ سابق وزیر اعلیٰ دلی سے بھوپال اسی ٹرین میں ہمارے ہمسفر تھے۔ اگلے دنوں اخبار میں ایک تصویر دیکھی کہ بہار کے گورنر دلی کے سٹیشن پر اتر رہے ہیں۔ قصہ مختصر ٹرین 33 گھنٹے کے طویل سفر کے باوجود مدراس) چنائے (میں اس کی آمد بالکل بروقت تھی۔ اس یادگار سفر میں ہم نے ایک ایک لمحہ دلچسپی کے ساتھ اور لطف کے ساتھ معلومات کو کشید کیا۔ پردیپ سکینہ ، کھیل ، انجینئرنگ ، ہندوستانی سیاست کے موضوع پر ہماری معلومات میں اضافہ کررہے تو پرتھوی بھٹہ چاریہ کمپیوٹر سائنس ، نئی نسل ،جدید تعلیم ، موسیقی اور فلم جیسے عنوانات کو نبھا رہے تھے۔ عمر فاروق نے ایک موقع پر دوران گفتگو کہا کہ آپ تو ہمارے ہاں بہت مشہور ہیں۔ پرتھوی کی حیرت اور استعجاب کے جواب میں انھوں نے بتایا کہ انڈیا کے پرتھوی اور اگنی میزائل کے جواب میں پاکستان نے حال ہی میں غوری میزائل کا تجربہ کیا ہے۔

چنائے چونکہ ہمارے لیے نیا لفظ ہے اس لیے زبان پر نہیں چڑھ رہا، ویسے بھی مدراس سے ہماری تاریخ اور حافظہ وابستہ ہے۔ دورِ طالب علمی میں سید سلیمان ندویؒ کی ”خطبات مدراس“ نے سیرتِ نبویﷺ کے مختلف گوشوں کو جس عقلی استدلال سے ذہن نشین کرایا تھا۔ اُس نے ”مدراس“ کو ہمارے نہاں خانۂ دل کو ہمیشہ کے لیے

عقیدت سے پیوست کر دیا تھا۔شاعرِ مشرق علامہ محمد اقبال کے مشہورِ زمانہ خطبات Islam in Thoughts Religious of Reconstruction بھی اس تاریخی شہر میں دیے گئے تھے۔انگریزی کے لیے Chennai جتنا موزوں ہے ، اردو کے لیے اتنا ہی غیر موزوں ،ریلوے سٹیشن سے باہر نکلتے ہی نظر ٹیکسٹائل کانفرنس کے ایک بڑے ہورڈنگ پر پڑی۔ عمر فاروق نے جھٹ پٹ اس کا مقام اور فون نمبر نوٹ کر لیے۔ گزشتہ روز انڈیا کی کرکٹ ٹیم نے پاکستان کو شکست دے کر نہ صرف)دلی میں شکست کا حساب بے باق کر دیا تھا، بلکہ ایک درجہ فوقیت لے لی وہ اس طرح کہ انڈین سپنر انیل کمبلے نے پاکستان کے دس کھلاڑیوں کو آؤٹ کر کے کرکٹ کی 112 سالہ تاریخ میں اپنا نام امر کر لیا۔ اس کی بازگشت مدراس میں بھی تھی۔ دو تین شاہراؤں پر مختلف اشتہاری کمپنیوں کے بورڈ نظر آئے۔ PakistanHumblesKumble

اس ہفتہ کے اکثر رسائل و جرائد نے ہندوستان کی اس تاریخی فتح کو ٹائٹل سٹوری بنایا۔ انیل کمبلے کی دس یادگار وکٹیں جو اس نے دو تین گھنٹے کے اندر حاصل کیں ،اس کے لیے عمر بھر کا حاصل بن گئیں۔ ائر انڈیا نے اسے اندرون ملک سفر کی درجنوں ٹکٹیں مفت دے دیں تو اس کے آبائی شہر میں ایک سڑک اس کے نام موسوم کر دی گئی۔ کوئی کمپنی اسے ایک لاکھ دے رہی ہے تو دوسری اس کے لیے پلاٹ کا اعلان کر کے کسی سے پیچھے نہیں رہی۔ انڈیا میں کرکٹ سٹار پاکستان کی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ مشہور و معروف ہیں۔ ہندوستان کی فلم انڈسٹری کے بعد شاید وہاں کے کرکٹ سٹار سب سے زیادہ پسندیدہ ہیں۔یہی وجہ تھی کہ انڈو پاک کے میچ کے دوران ٹرین پر سفر کرنے والے افراد سے لے کر سڑک پر گزرنے والے عام آدمی تک کے ہاتھوں میں ریڈیو دکھائی دیتا تھا۔

چنائے میں ہمارا قیام ہوٹل Merry Land Inn میں تھا جو Kilpank کے علاقے میں واقع تھا۔ ہوٹل کی موزونیت کا کام مشتاق مانگٹ صاحب اور عمر فاروق صاحب کے ذمہ تھا جو کمروں کے ریٹ اور چیکنگ کے بعد طے کرتے کہ آیا ہوٹل قیام کے لیے موزوں ہے یا نہیں۔ ہوٹلوں میں قیام کا میرا تجربہ بہت محدود ہے۔ اس سے قبل میں بنگلہ دیش اور ترکی میں بحیثیت مہمان ہوٹل میں ٹھہرا تھا۔ بنگلہ دیش میں دونوں مرتبہ اتفاق سے ہوٹل وائٹ ہاؤس میں ہی قیام رہا جو مرکز شہر سے چند کلومیٹر دور شانتی نگر میں ایک چھوٹا مگر صاف ستھرا ہوٹل تھا۔ جبکہ ترکی میں IIFSO کی بین الاقوامی کانفرنس (1995) کی مناسبت سے ایک فائیو سٹار ہوٹل میسر آیا جو مرمرہ سمندر کے بالکل کنارے پر واقع تھا۔ انڈیا میں قیام کے سلسلے میں مشتاق صاحب ہی ہمارے امیر سفر تھے۔ سفر کے آغاز پر ان کی ہدایات بہت برمحل اور وسیع تجربہ کی عکاس تھیں۔ لاہور ائیرپورٹ لاونج پر انھوں نے تاکید کی کہ (1) عشاء کے بعد ہوٹل سے باہر نہیں نکلنا) (2 اپنے پاسپورٹ کی حفاظت، نقدی اور سامان سے بھی زیادہ کرنا (3) کفایت اور بچت کے خیال سے ارزاں ہوٹلوں کا انتخاب مناسب نہیں۔ لہٰذا عموماً ہوٹل ہزار سے پندرہ سو روپے کی رینج میں منتخب کیے گئے۔ دلی میں شیوا کانٹی نینٹل اور قرول باغ کا اومنی ہوٹل تین دن ہمارا مسکن رہا۔ چنائے میں میری لینڈ ان جبکہ ممبئی میں ہوٹل گلستان چنائے تامل ناڈو کا ہیڈ کوارٹر ہے۔ 60 لاکھ کے لگ بھگ آبادی پر مشتمل اس شہر کی اکثریت تامل ہے۔ ہم اکثر و بیشتر جن علاقوں میں رہے اور گزرے، اس سے ایک صاف ستھرے شہر کا تاثر ملا۔ لوگوں کی عمومی صحت کمزور اور رنگ سیاہی مائل تھے۔ یہاں اجنبیت کا تاثر زیادہ گہرا اس لیے بھی محسوس ہوا کہ مقامی لوگ ہندی)اردو (سے بھی ناواقف تھے۔ انگریزی ہی زیادہ تر رابطے کی زبان رہی۔ چنائے، خلیج بنگال کے جس کنارے واقع ہے، اسے کورومنڈل کوسٹ بھی کہا جاتا ہے۔ انٹرنیشنل ٹیکسٹائل کانفرنس یہاں 10 سے 13 فروری تک جاری رہے گی۔ مشتاق مانگٹ صاحب اور عمر فاروق

صاحب کے پہلے دن کی مصروفیات سے اندازہ ہوگیا کہ یہ لوگ روزانہ صبح جا کر بمشکل رات ہی کو واپس آسکیں گے۔ ویسے بھی ہم اسی کانفرنس کے ویزا پر تو آئے ہیں۔ عمر فاروق صاحب نے ILM کی نمائندگی کرنا ہے جبکہ مشتاق صاحب کا یہ فیلڈ) گارمنٹس اینڈ ہوزری (ہے۔ اس دورے کے پیشہ وارانہ فوائد کے حوالے سے وہ بہت Specific ہیں اور ایسا ہونا بھی چاہیے۔ انڈیا کے 15 دن قیام کے دوران تو اس کا اندازہ مجھے نہ ہو سکا لیکن واپسی پر جب تجزیہ کیا تو میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ اس مثلث میں سب سے گھاٹے میں میں ہی تھا۔

مشتاق صاحب کے پیش نظر کاروبار اور وزٹ تھا، عمر فاروق صاحب نے کانفرنس میں شرکت کرنا تھی۔وہ ٹیکسٹائل کی کتب جمع کرنے کے ساتھ ساتھ سیر کے بھی خواہاں تھے جبکہ میرے سامنے مشاہدہ اور سیر کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی موجودہ صورت حال کے تفصیلی مطالعہ کا ہدف تھا جو کچھ حقیقی وجوہات اور کچھ میری کوتاہی کی وجہ سے تشنہ رہا۔ 15 دن کی تقسیم کار کچھ اس طرح رہی۔ دلی 3 دن، مدراس 5 دن، ممبئی 3 دن، سفر اڑھائی دن) مع پانچ راتیں (۔آغاز سفر سے ہماری خواہش تھی کہ جماعت اسلامی کے زعماء سے ملاقاتیں ہو جائیں۔SIM اور SIO کے لوگوں کے ساتھ خیالات کا تبادلہ ہو کسی تعلیمی ادارے کا دورہ اور چند Intellectual سے گفتگو وغیرہ مگر 15 دنوں میں ان سب کو منظّم کرنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور تھا۔ مدراس کے علاوہ باقی شہروں میں قیام نہ صرف مختصر تھا بلکہ ہم تینوں ایک دوسرے کے پابند تھے۔ مدراس میں 4 دن میں بالکل فارغ رہا۔ ایک دو دن کی کوششوں کے بعد جماعت اور اس کی طلبہ تنظیم SIO کے دفاتر دریافت بھی ہوئے مگر زبان کی اجنبیت، وقت کی قلّت، اور جماعت اسلامی ہند کی نارتھ انڈیا کانفرنس کی مصروفیت)اس ریجن میں جماعت کے تمام قائدین اس کانفرنس کی تیاریوں میں مصروف تھے (حائل رہی۔ بہرحال اس میں کسی کو قصور وار قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اس محرومی کا احساس اس وقت اور زیادہ ہوا، جب روانگی والے

دن، ائیر پورٹ سے پہلے انتہائی مختصر وقت کے لیے بھاگتے دوڑتے جماعت کے مرکزی دفتر اور SIO کے سیکرٹریٹ جانا ہوا۔ حسرت رہی کہ وہاں کے عہدیداروں سے تفصیلی گفتگو کا موقع ہاتھ نہ آسکا۔

چنائے شہر۔ پہلا تاثر

مشتاق صاحب اور شیخ صاحب کے ہوٹل جانے کے بعد میں تیار ہو کر باہر نکلا۔ ارادہ یہ تھا کہ ریلوے سٹیشن کے سامنے واقع ٹورازم آفس سے Tours Conducted کی معلومات حاصل کروں گا۔ اکیلے سیر کرنا مجھے عجیب بھی محسوس ہو رہا تھا اور گراں بھی۔ یہاں چونکہ وقت کی فراوانی تھی۔ اس لیے میں نے بس کا انتخاب کیا۔ بسوں کا انتظام یہاں خاصا آرگنائز ہے۔ اگرچہ بسیں خاصی استعمال شدہ (Used) ہیں اور مقامی طور پر تیار شدہ بھی مگر باکفایت اور بروقت، مدراس میں قیام باقی شہروں کی نسبت زیادہ تھا اس لیے مختلف علاقوں، بسوں کے روٹ اور مشہور بازاروں کا خاصا علم ہو گیا اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ میں بس سٹاپ پر کھڑے لوگوں سے مطلوبہ مقام اور روٹ کی معلومات لے کر بس پر سوار ہو جاتا۔ کنڈیکٹر بڑے شائستہ اور شریف محسوس ہوئے۔ پہلے دن ریلوے سٹیشن اور ہوٹل کے باہر ملنے والے ٹیکسی ڈرائیور اور رکشہ ڈرائیور نے جو تاثر بنایا تھا وہ بس کنڈیکٹر کے رویے سے بہت بہتر ہو گیا۔ نہ صرف مدراس بلکہ دلی اور بمبئی میں ایک اور نمایاں چیز جو دیکھنے کو ملی وہ Subways ہیں۔ سڑکوں کے اوپر لوہے کے پل بنانے کے بجائے جا بجا انڈر پاس بنائے گئے ہیں جو لوگوں کی پیدل آمد و رفت کے لیے ہیں۔ پاکستان میں اکثر جگہ لوہے کے اوور ہیڈ پل ناکام ثابت ہوئے ہیں۔ لوگ سڑکوں کے درمیان لگے ہوئے جنگلے توڑ مروڑ کر گزرنے کے راستے بنا لیتے ہیں مگر پل کے ذریعے سڑک عبور کرنا پسند نہیں کرتے اس لحاظ سے مجھے یہاں کے لوگوں میں Civic Sense زیادہ محسوس ہوا۔ تمام Subways لوگوں سے کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے۔ اکثر

Subwaysپر دو دو جگہ داخلہ بنا ہوا تھا اور یوں لوگوں کی مداخلت کے بغیر ٹریفک جاری وساری رہتی۔ انڈیا میں اکثر مقامات پر ٹریفک سگنلز بھی درست نظر آئے۔ پورے چوک میں صرف ایک سپاہی ہوتا وہ بھی درمیان میں ایک چھوٹے سے برج پر متعین، مستعد .... ہم تو لاہور کے نیو کیمپس پل پر کبھی کبھی ایک اور اکثر دو سپاہیوں کو چار سڑکوں پر بھاگ بھاگ کر ٹریفک روکتے اور اسے رواں کرتے دیکھتے۔ اِدھر اس کی نظر بچی اُدھر تمام نظام درہم برہم، بے چارہ کبھی ایک سڑک کے بیچ میں ہاتھ پھیلا کر ٹریفک کو روکتا تو کبھی دوسری پر....

ایک حادثہ

مدراس ریلوے سٹیشن کے سامنے میں ایک سڑک کراس کرنا چاہ رہا تھا مگر ٹریفک کے اژدہام اور مسلسل لوہے کے درمیانی جنگلے کی وجہ سے میں ناکام تھا۔ ٹریفک سگنل کے سرخ ہونے پر تمام گاڑیاں جونہی رکیں تو میں نے مناسب سمجھا کہ اس درمیانی وقفے سے فائدہ اٹھایا جائے۔ چند گاڑیوں کو کراس ہی کیا تھا کہ اچانک ایک سکوٹر مجھ سے آ کر ٹکرایا۔ چند لمحے تو مجھے سمجھ ہی نہیں آیا کہ اچانک یہ کیا ہو گیا۔ ذرا اوسان بحال ہوئے اور اپنا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ میری ساری توجہ اس طرف تھی جہاں گاڑیاں جا رہی تھیں اگرچہ ٹریفک رکا ہوا تھا لیکن ایک سکوٹر اپنا راستہ بناتا ہوا آ رہا تھا۔ میں چونکہ گاڑیوں کے درمیان حرکت کر رہا تھا اچانک سکوٹر کے سامنے آ گیا اور اس حالت میں میری نظر اس کے مخالف تھی۔ قریب ہی سکوٹر سوار اپنے ساتھی کے ہمراہ گرا پڑا تھا۔ میرے پاؤں پر خاصی خراش آئی تھی جبکہ وہ بھی اپنے پاؤں سہلا رہا تھا۔ زبان سے عدم واقفیت کی بناء پر اس کے چہرے کے تاثرات اور چند غصیلے جملوں سے مجھے اچانک احساس ہوا کہ میں اس شہر میں اجنبی ہوں۔ زبان سے ناواقف اور مضروب جیسا بھی ہے بہر حال مجھ پر فوقیت رکھتا ہے۔ اس کے غصہ، معنی خیز نظروں سے میں گھبرا گیا اور فیصلہ کیا کہ مجھے نکل جانا

چاہیے۔ اس کا ساتھی سکوٹر کو سنبھالتے ہوئے سڑک کی دوسری طرف جارہا تھا میں نے مضروب کو رکشا لانے کا اشارہ دے کر سڑک پار کی اور ہجوم میں غائب ہوگیا۔ دائیں پاؤں پر خراشوں کے علاوہ میرا دایاں پنجہ بھی مڑ گیا تھا، محسوس ہوا کہ موچ آ گئی ہے بہر حال ہوٹل آ کر پاؤں کا معائنہ کیا۔ Killer Painاور Iodexکا مساج بھی کیا۔ لگ یہ رہا تھا کہ کم از کم مدراس کے قیام کے دوران اس چوٹ سے رفاقت رہے گی۔ رات جب دونوں حضرات واپس آئے تو انھیں بپتا سنائی گئی۔ مشتاق صاحب کا فی البدیہہ تبصرہ تھا کہ "میں اس قسم کے واقعہ کی توقع کر رہا تھا" توجیہہ طلب کرنے پر انھوں نے وضاحت کی کہ ابھی تک ہمارا سفر بڑا ہموار جارہا تھا لیکن کچھ نہ کچھ ہونے کی توقع تھی یہ بھی شکر کرنے کا مقام ہے کہ بات صرف معمولی حادثے تک محدود ہے، جو قابل برداشت ہے۔ رات دونوں ساتھیوں نے دلجوئی کے لیے پھل اور ادویات لا کر ہماری تیمار داری کے فرائض انجام دیئے۔

تامل ناڈو کے کھانے

دوپہر کے کھانے کے دوران تامل کھانوں سے کسی حد تک واقفیت ہوئی، ہوٹل سے تھوڑی دور واقع ایک چھوٹا سا ریسٹورانٹ پسند آیا۔ کھانوں کے تمام تر نام اجنبی تھے۔ چاول چونکہ انٹر نیشنل ڈش ہے اس لیے مینو میں رائس کا نام بھی تھا اور میزوں پر پیش بھی کیا جارہا تھا۔ چاولوں کی بھی خدا جانے کتنی اقسام تھیں۔ Rice Curd, Rice Lemon, Rice Vegetable وغیرہ وغیرہ۔ ایک نئی چیز جو یہاں نظر آئی وہ کیلوں کے پتوں کا استعمال تھا۔ اس ریسٹورانٹ کے دو حصے تھے ایک میں Tiffin Mealفراہم کیا جارہا تھا جو سب کے لیے ایک ہی تھا۔ اس حصے میں لوگوں کو پہلے کیلے کا ایک بڑا پتا فراہم کیا جاتا جسے وہ پانی سے صاف کرنے کے بعد سامنے میز پر پھیلا لیتے پھر چند ویٹر باری باری اس کیلے کے بڑے سے پتّے (Leaf) پر چاول اور دیگر چیزیں ڈال

دیتے۔ اس لنچ سے لطف اندوز ہونے والوں میں متوسط طبقہ کے مردوں کے علاوہ ورکنگ وومن بھی تھیں جو اکیلی ہونے کے باوجود پورے اعتماد سے کھانے سے انصاف فرمار ہی تھیں۔ ہم کھانے کے بعد مقامی چائے سے بھی لطف اندوز ہوئے جس کا ذائقہ اگرچہ ہماری روایتی چائے کی طرح تو نہ تھا البتہ اسے پیش کرنے کا انداز بہت اچھا لگا۔ سٹیل کے گلاس میں چائے، اس کے نیچے سٹیل ہی کی پلیٹ جبکہ ایک خالی سٹیل کا پیالہ چائے کو ٹھنڈا کرنے کے لیے۔ دیگر شہروں میں بھی مختلف ہوٹلوں میں جانے کا اتفاق ہوا۔ اکثر جگہ صفائی کا خیال رکھا گیا تھا۔ جراثیم کو دور کرنے والی ٹیوب لائٹ (Insect Repellent) جو ہمارے اچھے اچھے اداروں میں نظر نہ آتی تھیں، یہاں متوسط طبقے کے ہوٹلوں میں عام تھی۔ انڈیا کے اس دورے میں ہم نے ہر ورائٹی کا کھانا تناول کیا۔ 12 روپے کے لنچ سے لے کر 175 روپے فی کس کے طعام تک۔ آگرہ کینٹ کے ہوٹل میں تھالی لنچ سے لے کر آر ایس مانگٹ کی طرف سے دیئے جانے والے پُر تکلف اور بھرپور "پنڈی " ڈنر تک۔ مشتاق مانگٹ صاحب دلی میں پنیر فوڈ کو ترجیح دیتے جبکہ مدراس اور ممبئ میں دوسہ پسند کرتے جو چاولوں سے تیار کیا جاتا تھا۔ روٹی یہاں بہت مہنگی لگی۔ آگرہ جاتے ہوئے چھوٹے چھوٹے پھلکے جو ہمیں روٹی اور نان کے نام پر دیئے گئے 10 روپے کے حساب سے ملے۔ ممبئ میں بہر حال ہمیں وطن سے ملتی جلتی 'نان جویں' کی شکل نظر آئی۔

چنائے کی اجتماعی سیر

12 فروری کو میں اسے شش میں کامیاب ہو گیا کہ کسی نہ کسی طرح گائیڈڈ ٹور سے استفادہ کیا جائے۔ تامل ناڈو ٹورازم ڈیویلپمنٹ کارپوریشن TTDC کے دفتر سے دوپہر 1:30 بجے ایک بس روانہ ہو گی جو شہر کے منتخب مقامات کی سیر کا اہتمام کرے گی۔ ٹورازم ڈیپارٹمنٹ کا اس ٹور کا کرایہ معقول ہونے کے ساتھ ساتھ بس کی کیفیت دلی

سے آگرہ جانے والی بس سے بہت بہتر تھی۔ بس میں مائیک کے ذریعے سیاحوں کو معلومات دینے کا اہتمام بھی تھا اگرچہ سفری میزبان کا لہجہ اور بس ساؤنڈ پروف نہ ہونے کی وجہ سے پلّے بہت کم پڑ تا تھا اس سیر میں شاہ جارج پنجم کا قلعہ، سانپوں کا پارک، مصنوعات کی نمائش، نیشنل میوزیم اور مرینہ ساحل کی مختصر سیر شامل تھی۔

انٹر نیشنل ٹیکسٹائل کانفرنس گذشتہ رات کو ختم ہو گئی تھی۔ مشتاق مانگٹ صاحب اور عمر فاروق صاحب کے ساتھ میں نے بھی ایک صبح کے سیشن میں چند گھنٹے گزارے۔ تاج محل ہوٹل کی پورے ہندوستان میں چین ہے۔ مدراس کا ہوٹل تاج کو رومنڈل کہلاتا ہے جو مدراس کے عین مرکز میں برلبِ سڑک واقعہ ہے۔ ظاہر ہے یہاں وہ تمام سہولتیں موجود تھیں جو ایک پانچ ستاروں والے ہوٹل کا خاصہ ہوتی ہیں۔ لیکچرز تمام پروفیشنل ہی تھے۔ چائے کے وقفے کے دوران میں مشتاق صاحب کی اجازت سے سڑکیں ناپنے نکل آیا۔

صبح ناشتے کے بعد بازار جانے کا پروگرام طے تھا۔ ساؤتھ انڈیا ساڑھیوں اور سونے چاندی کے زیورات کے حوالے سے معروف ہے۔ ٹی نگر یہاں کا معروف کاروباری علاقہ ہے۔ جس میں عثمان روڈ کے نام سے ایک طویل بازار ہے جس میں گاڑیوں کے شوروم سے لے کر زیورات کے پلازہ تک ہر قسم کی اشیاء پائی جاتی ہیں ۔ ''شاپنگ کا شوق، مہارت اور انہاک "قدرت کی طرف سے دیا گیا وہ عطیہ ہے جو خواتین کو'' وافر'' عطا ہوا ہے۔ خریداری کرتے وقت اکثر میں اپنے آپ کو کنفیوژ اور متذبذب سمجھتا ہوں یعنی To be or Not to be، اگرچہ مجھے اپنے انتخاب اور معیار پر اعتماد تو ہے مگر وہ بھی اس وقت جب مجھے Free Survival کا موقع ملے۔ مدراس اگرچہ دلی، ممبئی اور کلکتہ نہیں ہے مگر اس کے باوجود شاپنگ سینٹرز اور بازاروں کی سج دھج، چمک دمک کسی سے کم نہیں، بالخصوص جیولری کی دکانیں۔ میرا خیال ہے مجھے پورے لاہور میں اس سطح

اور معیار کی جیولرز شاپ نظر نہیں آئیں جن کی معقول تعداد صرف عثمان روڈ پر موجود تھی بعض دکانیں دو اور تین منزلہ بھی تھیں۔اس علاقے کے نام سے معلوم پڑتا تھا کہ مسلمان یہاں خاص تعداد میں پائے جاتے ہیں۔اس کی تصدیق چند دکانوں اور اس کے مالکان سے بھی ہوئی۔آج کی شاپنگ کے دوران مشتاق مانگٹ صاحب کی قوتِ مشاہدہ کی گہرائی کا ایک مرتبہ پھر احساس ہوا۔جیولری کی دکانوں پر گھومتے ہوئے ہماری تمام تر توجہ زیورات اور ان کی خریداری پر تھی کہ ایک دکان میں داخل ہوتے ہی مانگٹ صاحب نے کہا کہ یہ دکان مسلمانوں کی معلوم ہوتی ہے۔وہ کیسے ؟ہم نے دریافت کیا تو ان کا جواب تھا کہ اس دکان پر کسی مورتی، بھگوان کی تصویر، مجسمہ، کیلنڈر یا نشان آویزاں نہیں ہے ورنہ اکثر ہندو بیوپاری اس کا اہتمام کرتے ہیں۔دکان دار سے ہم نے اس کی تصدیق چاہی اور پھر مشتاق صاحب کی نظر کی گہرائی کو داد دی۔دوپہر کا کھانا اسی بازار میں مسلمانوں کے ایک ہوٹل سے تناول کیا۔آج دھوپ کی شدّت تھی اس پر صبح سے پیدل مارچ۔ تھکن کا احساس غالب تھا اوپر سے آج شام ہماری ممبئ روانگی تھی۔شام 5 بجے ہمیں ممبئ کے لیے ممبئ میل پر سوار ہونا تھا لہٰذا ہوٹل واپسی کا ارادہ کیا۔

چنائے سے ممبئ

ہوٹل کا کمرہ ہم صبح شاپنگ پر جانے سے پہلے ہی خالی کر گئے تھے۔۵ بجے شام روانگی کے حساب سے جب ہم 4 بجے کے لگ بھگ سامان لینے ہوٹل پہنچے تو ایک نئ صورتحال سے واسطہ درپیش تھا۔ ممبئ میل، جس کے ذریعے ہم ممبئ جارہے تھے اس کا صحیح وقت روانگی 5 کے بجائے 9 بجے رات تھا۔ہوٹل کے عملے کی اخلاقیات اس وقت تک ہوتی ہیں جب تک آپ کا رشتہ بحثیت گاہک یا کنزیومر کے ہوتا ہے۔نمازِ ظہر اور عصر پڑھنے کے لیے انھوں نے ازراہِ عنایت ہمیں وہ تنگ سی کوٹھری عنایت کی جہاں کپڑوں کو سٹور کیا جاتا تھا۔اس وقت صبح والا عملہ بھی موجود نہیں تھا جو ہمارا خیال کرتا۔اب کیا کیا

جائے؟اچانک عمر فاروق صاحب کو یاد آیا کہ ٹیکسٹائل کانفرنس کے کچھ فوٹو گراف ایک جگہ سے وصول کرنا ہیں۔فون پر فوٹو گرافر کا گھر معلوم کرکے ہم نکل کھڑے ہوئے، مشتاق صاحب نے ہوٹل میں انتظار کرنے کا فیصلہ کیا۔ ٹیکسی نے ہمیں ایک مقام پر چھوڑ دیا، باوجود کوشش کے مکان نہیں مل پارہا تھا۔ایک سردار جی جو شکل سے تعلیم یافتہ دکھائی دیتے تھے۔ان سے ہم نے اپنی مشکل بیان کی انھوں نے نہ صرف ہماری رہنمائی کی بلکہ ٹیکسی ڈرائیور کو اپنی زبان اور سردارانہ لہجے کے ساتھ ڈانٹ ڈپٹ بھی کی۔ پیدل مکان کو تلاش کرنے میں 20 سے 25 منٹ مزید لگ گئے۔ بالآخر متعلقہ فرد سے ملاقات ہوگئی،ان لوگوں نے یہ مہربانی ضرور کی کہ ہمیں اپنی گاڑی میں ایک مین روڈ پر اتار دیا جہاں سے رکشہ لے کر ہم ہوٹل آگئے۔

ریلوے سٹیشن پر ممبئی میل ہماری منتظر تھی اس مرتبہ ہماراسفر نان ائیر کنڈیشنڈ فرسٹ کلاس میں تھا۔چنائے غالباًساؤتھ ایسٹرن ریلوے کا ہیڈ کوارٹر ہے ۔سٹیشن کی عمارت کے ساتھ ایک پر شکوہ بلڈنگ میں علاقائی سیکرٹریٹ قائم ہے۔گذشتہ دنوں جب میں بکنگ کے لیے ریلوے سٹیشن پہنچا تو معلوم ہوا کہ چنائے ریلوے سٹیشن کے پہلو میں 5 منزلہ ریزرویشن آفس ہے۔ تیسری منزل ہماری مطلوبہ جگہ تھی۔ مختلف کاؤنٹرز کے چکر لگانے کے بعد معلوم ہوا کہ ہم خواہش کے مطابق ایک دن دلی میں نہیں گذار سکیں گے جبکہ چنائے، ممبئی کے لیے بھی اچھی ٹرین کی تمام نشستیں پہلے ہی محفوظ ہوچکی ہیں۔ مشتاق مانگٹ صاحب اور شیخ عمر فاروق کانفرنس کی طرف چلے گئے جبکہ میں نے دونوں مقامات، ممبئی اور دلی کے لیے نشستیں محفوظ کروالیں۔آپ یہاں ائیر لائن کی طرح کسی بھی مقام سے پورے ہندوستان کے لیے کہیں بھی بکنگ کروا سکتے ہیں کیونکہ تمام نظام نہ صرف کمپیوٹرائزڈ ہے بلکہ Inter- Connected بھی۔۔۔۔

ممبئی میل انڈیا ریلوے کی معروف ٹرینوں میں سے ہے جس کا سفر کم و بیش 1400 کلومیٹر پر محیط ہے۔اس سفر میں ہمارے ہم سفروں میں ریڈی میڈ گارمنٹس کے دو تاجر اور ایک ہاؤس وائف شامل ہیں۔خاتون اگرچہ ایک گھریلو عورت تھی مگر بات چیت، تبادلہ خیال کے اعتبار سے بہت تیز۔انگلش بول چال پر انھیں اچھا عبور حاصل تھا۔گارمنٹس کے بیوپاری خالص کاروباری لوگ تھے۔تھوڑی دیر بعد ان دونوں نے ہمارے سامنے اپنی پراڈکٹس کے ڈھیر لگا دیے غالباً تین سے چار بوریاں مختلف شرٹس سے بھری ہوئی تھیں۔مشتاق صاحب نے ان سے ایک درجن کے لگ بھگ شرٹس خرید لیں۔ہمارا یہ سفر دو مکمل راتوں اور ایک مکمل دن پر محیط رہا۔یہ علاقہ آبادی کے اعتبار سے گنجان تھا مگر اکثر شہروں کے ناموں سے ہم نامانوس تھے۔راستے میں اگرچہ بہت بڑے شہر آئے مگر ہمارے لیے صرف رائے پور اور پونا معروف تھے۔پونا کے نام سے ہم پاکستان میں ہی شناسا تھے جبکہ رائے پور امیر جماعت اسلامی ہند مولانا سراج الحسن صاحب کا شہر ہے۔انڈین ریلوے ہمارے لیے قدم قدم پر حیرت کے در وا کر رہی تھی۔ہر قابل ذکر سٹیشن پر نہ صرف صفائی بہتر تھی بلکہ مسافروں کے لیے دیگر سہولیات کا وافر اہتمام تھا۔اِن دنوں پاکستان میں تو بڑے بڑے سٹیشنوں پر بمشکل ایک یا دو پبلک کال آفس نظر آتے ہیں۔یہاں لوکل، نیشنل اور انٹر نیشنل فون تک رسائی بالکل آسان ہے۔
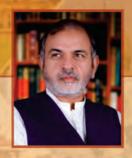
تقسیم ہند کے بعد پیدا ہونے والی صورتِ حال نے کئی خاندانوں کو اُنکے آبائی علاقوں سے ہجرت پر مجبور کر دیا اور اُنھی بد قسمت لوگوں میں ایک میرا خاندان بھی شامل تھا جو موجودہ بھارت کی ریاست پٹیالہ کے شہر سرہند سے ہجرت کر کے ٹوبہ ٹیک سنگھ سکونت پذیر ہوئے۔ میری پیدائش 15 مارچ 1958ء کو ٹوبہ ٹیک سنگھ میں ہوئی۔ میں نے ٹوبہ ٹیک سنگھ اور فیصل آباد میں انٹرمیڈیٹ تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم کیلئے Textile کے شعبے کا انتخاب کیا اور 1981ء میں نیشنل کالج سے Textile Engineering کی ڈگری مکمل کی۔ اپنی مہارت کو مزید تقویت دینے کیلئے میں نے مختلف ملازمتوں سے تجربہ حاصل کیا اور 1992ء کے بعد سے اپنے ذاتی کاروبار کا آغاز کیا۔ مسلسل سیکھنے کے اصول پر کارفرما رہتے ہوئے میں نے اپنے انتہائی مصروف اوقات میں سے وقت نکال کر 2001ء میں University of Management Technology سے MBA میں گولڈ میڈل بھی حاصل کر لیا۔

علم کا اشتیاق بڑھا تو 2008ء میں The University of Manchester سے MPhil اور 2012ء میں Czech Republic کی معروف یونیورسٹی سے Textile میں PhD بھی کر لی۔ کاروباری مصروفیات کے ساتھ ساتھ میں کئی فلاحی اداروں (غزالی ایجوکیشن ٹرسٹ، الخدمت فاؤنڈیشن پاکستان اور تعاون فاؤنڈیشن) سے بھی منسلک رہا اور یہ سلسلہ آج تک قائم ہے۔

اس کتاب کا مواد کئی مُستند تاریخی حوالوں سے حاصل کیا گیا ہے اور حتی الامکان کوشش کی گئی ہے کہ اُنھی حالات و واقعات کو بیان کیا جائے جن پر اجماع کثیر ہو لیکن پھر بھی اگر کسی تاریخ یا واقعے میں کوئی تضاد پایا جائے تو ہر حال میں اسکی اصلاح کی گنجائش موجود ہے۔

ISBN 978-996-9522-54-1

اس کتاب سے حاصل ہونے والی تمام آمدنی غزالی ایجوکیشن ٹرسٹ کے بچوں کی تعلیم و تربیت پر خرچ کی جائے گی۔ انشاءاللہ